# The Drinched Book

**text fiy book**

# فہرست مضامین

بابت ماہِ جولائی ۱۹۲۸ء　　جلد ۱۴　　نمبر ۱

تصویر :- جہاز کا ایک سفر چاند تک



| نمبر شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جہاں نما | — | ۵۰۶ |
| ۲ | خطاب بہ ماہتاب (نظم) | حامد علی خاں | ۵۰۹ |
| ۳ | روما اور زمانۂ وسطیٰ | بشیر احمد | ۵۱۷ |
| ۴ | نشاط (نظم) | جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے - ایل ایل بی وکیل | ۵۲۰ |
| ۵ | کوہِ نور اور دریائے نور | جناب مولوی مہر محمد خاں صاحب شہاب | ۵۲۱ |
| ۶ | غزل | جناب سید علی اختر صاحب اختر | ۵۲۸ |
| ۷ | جنگل کی شاہزادی (نظم) | جناب فاخر ہریانوی | ۵۲۹ |
| ۸ | شاعر کی یاد | جناب محمد عبد الرحیم صاحب امین | ۵۳۱ |
| ۹ | کچھ جھوٹ کچھ سچ (ڈراما) | فلک پیما | ۵۳۱ |
| ۱۰ | بت خانہ (نظم) | جناب مولوی ابو الفاضل راز چاند پوری | ۵۴۳ |
| ۱۱ | نارنگی کے بیج (افسانہ) | جناب محمد حامد صاحب | ۵۴۴ |
| ۱۲ | شاعرِ تنہا (نظم) | جناب محمد ہادی حسین صاحب ایم اے | ۵۵۴ |
| ۱۳ | مشاہداتِ قدرت | جناب مسٹر فدا علی ملا علی بھائی صاحب | ۵۵۵ |
| ۱۴ | حسنِ خوابیدہ (نظم) | جناب ذوقی بی اے | ۵۵۸ |
| ۱۵ | یتیم (افسانہ) | منصور احمد | ۵۵۹ |
| ۱۶ | دل (نظم) | بو | ۵۶۳ |
| ۱۷ | کیا غربت کوئی ناگزیر حقیقت ہے | جناب مولوی غلام مصطفےٰ صاحب | ۵۶۴ |
| ۱۸ | غزل | جناب مولانا رضا علی صاحب وحشت | ۵۶۸ |
| ۱۹ | غزل | جناب مظفر احمد صاحب ظفر ہاشمی | ״ |
| ۲۰ | فلسفۂ نظر | جناب عبد العزیز خاں صاحب | ۵۶۹ |
| ۲۱ | حبیب لبیب سے (نظم) | جناب روشن صدیقی | ۵۷۰ |
| ۲۲ | محفلِ ادب | — | ۵۷۱ |
| ۲۳ | تبصرہ | — | ۵۷۵ |

# جہاںؔ نما

## پردہ اور ثریا خانم

علیا حضرت ملکۂ افغانستان نے پردے کے متعلق ایک نمائندۂ اخبار کے سامنے بعض نہایت اہم اور دلچسپ خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ہم اُن کا اقتباس یہاں درج کرتے ہیں:۔

"عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ زمانے کے گزرنے کے ساتھ رسم و رواج مذہبی فرائض کا درجہ حاصل کر لیتے ہیں۔ یہ بات دنیا کے ہر مذہب میں مشترک ہے۔ پردے کے معاملہ میں بھی یہی ہوا۔ ابتدا میں پردہ محض ایک قومی رواج تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ مذہب کا ایک جزو بن گیا۔ قرآنِ حکیم میں پردے کے متعلق جو کچھ کہا گیا ہے وہ تمدن اور اخلاق کی بنا پر ہے۔ یہ اُن احکام میں سے نہیں ہے جن کے نہ ماننے سے انسان مستوجب سزا قرار پاتا ہے۔ قرآنِ مجید میں پردے کے متعلق جو کچھ ارشاد ہوا ہے وہ مرد اور عورت دونوں کے لئے یکساں ہے۔ جس طرح اسلام نے عورتوں کے لئے پردہ کی حدود قائم کی ہیں اسی طرح مردوں کے لئے بھی اصولِ ستر مقرر کئے ہیں۔ پردہ اسلام کی ایجاد نہیں بلکہ ایسے احکام دنیا کے تمام مذاہب کی کتابوں میں موجود ہیں۔

قرونِ اولیٰ میں اسلامی معاشرہ کا یہ حال تھا کہ عورتیں مسجدوں میں جاتی تھیں، ایامِ حج میں خانۂ کعبہ میں جمع ہوتی تھیں، جنگوں میں شامل ہوتی تھیں اور خلیفہ کے انتخاب میں رائے دیا کرتی تھیں، گویا کہ ایسے تمام امور و معاملات کو مردوں کے پہلو بہ پہلو انجام دیا کرتی تھیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ موجودہ پردہ بالخصوص وہ پردہ جس کا رواج ہندوستان میں ہے اُس زمانہ میں رائج نہ تھا۔

تاریخ بتاتی ہے کہ پردہ اسلام سے بہت پہلے اکثر ممالک کے معزز طبقوں میں موجود تھا۔ توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانے میں بھی پردے کا رواج تھا۔ قدیم شاہانِ ایران اور فراعنۂ مصر پردہ کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ دورِ جاہلیہ کے آغاز سے پہلے چین اور جاپان کی شاہزادیاں بھی اپنے آپ کو چاند اور سورج کی بیٹیاں سمجھ کر عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہتی تھیں۔

جو پردہ آج مسلمانوں میں رائج ہے اُس کی ابتدا خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے اسے ایران سے اخذ کیا۔ اس کے برخلاف خلفائے امیہ نے ایسے پردے کو کبھی اختیار نہیں کیا۔ اُن کی خواتین مدارس عامہ میں پڑھنے

اور اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے تقریریں سننے جایا کرتی تھیں۔ اگر پردہ اسلام کے احکام و فرائض میں سے ہوتا تو اُس کی خلاف ورزی پر قانونِ اسلام میں ضرور کوئی سزا مقرر ہوتی جیسا کہ تمام جرائم کے لئے سزائیں مقرر ہیں۔

چند اہم رموز پر غور کرنے کی بہت ضرورت ہے۔ اگر پردے کے متعلق مشرقی اقوام میں بالخصوص مسلمانوں میں کوئی انقلاب رونما نہ ہوا تو اُن کے لئے ترقی کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ تہذیب و تمدن میں عورتوں کا بڑا حصہ ہے اور میں یہ کہنے کی جرأت کرتی ہوں کہ جب تک مشرق میں عورتیں زمانہ کی ضروریات کے مطابق تعلیم حاصل نہ کریں گی ترقی و تمدن کی راہیں اُس کے لئے مسدود رہیں گی جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ پردے میں رہ کر بھی تعلیم حاصل کی جا سکتی ہے وہ تعلیم کے صحیح مفہوم سے آشنا نہیں۔ کیونکہ تعلیم کے معنی صرف لکھنا پڑھنا نہیں ہیں۔

## بولنے والی کتابیں

مغربی تہذیب کے ظہور سے پہلے انسان اپنی بہت سی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے براہِ راست اپنے قوا اور اعضا سے کام لیتا تھا لیکن موجودہ تہذیب کا جو اپنے مادی پہلو کے اعتبار سے بھاپ اور بجلی اور کلوں کی تہذیب ہے عام میلان اس طرف ہے کہ انسان کے تمام "میکانکی" وظائفِ حیات نو ایجاد کلوں کے ذریعہ سے انجام دیئے جائیں "بولنے والی کتابیں" اس قسم کی ایک نئی مغربی اختراع ہیں جن کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ جو آنکھوں سے کام لینے کے نسبتہً زیادہ محنت طلب کام سے جی چراتے ہوں کانوں کی مدد سے مطالعہ کرسکیں۔ ایک امریکن موجد ہمیں امید دلاتا ہے کہ اس قسم کے کتب بینوں کو اب صرف یہ کرنا ہوگا کہ ایک بٹن گھما کر گراموفون کے توے کا سا ایک قرص چڑھا دیں اور جس اندازہ سے وہ مضمون کو اخذ کرسکتے ہوں اُسی کے مطابق اس کتاب خوان آلہ کی رفتار قائم کردیں۔ پھر مزے سے آرام کرسی میں لیٹ جائیں، ایک مہذب آواز اُنہیں ابنِ خلدون کا مقدمہ سنائے گی یا افلاطون کے نظریۂ مثل کی تشریح کرتی چلی جائے گی یا الف لیلیٰ کی مسحورکن اور پیچ در پیچ حکایات بیان کرنے لگے گی۔

## رازِ حیات

مشیگان یونیورسٹی کے شعبۂ طب کے ایک پروفیسر نے ایک تجربہ کے دوران میں محض اتفاقی طور پر ایک ایسی حقیقت کا انکشاف کیا ہے جس سے مسئلۂ حیات پر ایک نئے انداز سے روشنی پڑتی ہے۔

پروفیسر لوٹیرک ایک مینڈک کے دل پر جو کئی دن پہلے مینڈک کے جسم سے نکالا گیا تھا تجربہ کررہے تھے کہ ایک

ایسا واقعہ اُن کے مشاہدہ میں آیا جس نے اُنہیں محوِ حیرت کر دیا۔
جب انہوں نے مینڈک کے دل کو سمندری نمک کے محلول میں ڈالا تو یکایک اُس میں دھڑکن سی پیدا ہوگئی اور وہ اس طرح پھیلنے اور سکڑنے لگا جیسے زندہ ہے۔
پھر انہوں نے نمک کے پانی میں بھی تجربہ کرنا چاہا مگر دل میں زندگی کا کوئی نشان ظاہر نہ ہوا۔ پہلے اور دوسرے محلول میں قلویہ کی غیر موجودگی کا فرق تھا جو سمندر کی کھار میں پائی جاتی ہے۔
بہت جلد اس انکشاف کی اطلاع دوسرے حکماء کو بھی دے دی گئی اور اب کئی ایک فرانسیسی تجربہ خانوں میں اس تحقیقات کے تجربے ہو رہے ہیں۔

# پھانسی کی سزا

ڈین گرفتھ کا ایک مضمون "ڈیلی ہیرلڈ" میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے پھانسی کی سزا کے خلاف دس وجوہ پیش کی ہیں:۔

(۱) اس سے قتل کے اجتماعی اور انفرادی وجوہ کا اظہار نہیں ہو سکتا۔
(۲) حالات اور تجربہ ثابت کرتے ہیں کہ یہ طریقِ عمل لوگوں کو جرائم سے باز رکھنے میں کامیاب نہیں ہوا۔
(۳) جب ہم قاتل کو قتل کرتے ہیں تو قتل برقرار رہتا ہے۔
(۴) یہ سزا ظلم کے جذبات کو تقویت دیتی ہے اور لوگوں کو بے رحم اور سنگ دل بناتی ہے۔
(۵) اس سے ہمارے بعض بھائیوں (پھانسی دینے والا اور قید خانے کے افسر) کو نہایت وحشیانہ کام کرنا پڑتا ہے۔
(۶) اس سے قاتل کے بے گناہ رشتہ داروں کو سخت اذیت پہنچتی ہے۔
(۷) معاشرہ کو قتل سے بچانے کے لئے صرف یہی طریقِ عمل کافی نہیں ہو سکتا۔
(۸) ایک معنی میں یہ ایک اور قتل ہے . . . . . . ایک قانونی قتل۔
(۹) یہ اُس ترقی کے لئے باعثِ عار ہے جو ہم نے دوسرے شعبہ جات میں کی ہے۔
(۱۰) یہ ایک ناقابلِ تنسیخ تعزیر ہے جو اگر غلطی سے سرزد ہو جائے تو ناقابلِ تلافی ہے۔

# خطاب بہ ماہتاب

نُورِ ازل کا پرتو ہے اِک اِک جھلک تیری — حسنِ جاوید سے قسمت ہے مشترک تیری
تیری چشمِ جہاں بیں ہے ہر جلوے کی محرم — ظلمت کے سُرمے سے روشن ہے مردمک تیری

گردوں کے تارے! گو میں ہوں اک ذرہ خاک کا — لیکن آنسو ہوں تیری ہی چشمِ نمناک کا
اے وائے قسمت میری، یُوں ملنا تھا خاک میں! — اے وائے قسمت میری، یوں ہونا تھا خاک کا!

آغوشِ خور سے وہ تیرا میرا جدا ہونا — گزری ہوئی حکایت ہے، بھُولا ہُوا قصہ
داغِ جدائی سے اب تک روشن ہے دل تیرا — سوزِ غم سے ہے آج تک تاباں مرا سینہ

جلوہ گر اک ساحل پر تُو، اک پر میں افتادہ — حائل بیچوں بیچ ان دونوں کے ہجر کا دریا
اپنے وحشی تخیّل کے ٹوٹے جہازوں میں — اِس بحرِ بے پایاں کو میں گو بارہا پیرا

میرا دستِ کوتہ تیرا دامن نہ چھو سکا — ناچار، ناکامی نے نادم کر کے لوٹایا
یوں ہی تجھے بچپن میں بھی ہاتھوں میں لینے کو — میں بارہا شب بھر رویا، میں بارہا مچلا

اور یوں بچپن ہی میں تُو نے سمجھا دیا مجھ کو — اِس آرزو خانے میں جو وقفِ تمنّا ہو
حسرت اُس کی حرماں اُس کا، ناکامیاں اُس کی — بے جا ہے جو قسمت سے ہو کوئی گلہ اُس کو

اُٹھتی ہیں فرطِ شوق سے موجیں سمندر میں — جنبش کرتی ہیں پانی کی فوجیں سمندر میں
تیرے پابوس کی حسرت پوری نہیں ہوتی — ناچار گر پڑتی ہیں پھر موجیں سمندر میں

کب یہ دنیا اجڑے گی اور ہوگا پارہ پارہ — آکاس بادل کا منڈل تاروں کا گہوارہ؟
کب تک آخر چُکیں گے یہ جھگڑے مَن و تُو کے؟ — کب تک حسن و اُلفت دونوں اِک ہونگے دوبارہ؟

کیوں دسترس سے باہر ہے ہر پیکرِ خوبی؟ — کیا اِس رَم خوردگی ہی میں ہے دلبری اُس کی؟
موتی سمندر کی تہ میں، تارا ہے امبر پر — سبزہ ہے یکسر بیگانہ، موجِ ہوا وحشی!

حامد علی خاں

# کوہِ نُور اور دریائے نُور

## دنیا کے مشہور ترین ہیروں کی سرگذشت

ایک ایرانی فاضل کی تحقیقات کے نتائج اردو زبان میں

تقریباً ہر ایک شخص آج یہ جانتا ہے کہ مندرجۂ عنوان دو کلموں سے مراد کوئی نور کا پہاڑ یا دریا یا چشمہ نہیں ہے۔ بلکہ یہ دونوں کلمے الماس کے دو مشہور ٹکڑوں کے نام ہیں کہ آج اُن میں سے اول الذکر انگریزوں کے خزانہ میں ہے اور دوسرا ایران کے خزانہ میں۔ الماس کے یہ ٹکڑے دنیا کے چند مشہور ترین ہیروں میں سے ہیں۔ ان میں سے "کوہِ نور" ساری دنیا میں عموماً اور یورپ میں خصوصاً یہاں تک مشہور ہے کہ کارخانے اپنی پیداوار کو اُس کے نام سے نسبت دیتے ہیں۔ مثلاً "کوہِ نور سگریٹ" اور "کوہِ نور دیا سلائی" غرض ازیں قبیل بہت سی چیزیں ہیں جو اس نام کی نسبت کی وجہ سے ایک اہمیت و رواج پا جاتی ہیں۔ قبل اس کے کہ ہم ان دو مشہور اور پُربہا ہیروں کے متعلق کچھ بیان کریں بطور مقدمہ مختصراً خود الماس اور مشہور قطعاتِ الماس کے بارے میں کسی قدر تفصیل سے کام لیں گے

یہ بات سب کو معلوم ہے کہ یہ قیمتی معدنی سنگ ریزہ جو نہایت شفاف اور درخشندہ اور دیگر تمام موجودہ معدنی اشیا سے زیادہ مضبوط اور زیادہ صاف اور زیادہ چمکدار اور ضیابار ہونے کے علاوہ کسی ترکیب میں بھی حل نہیں ہوتا اور تمام دوسری مادی اشیاء کو کاٹ ڈالتا ہے اور کوئی دوسری چیز اس کو کاٹ نہیں سکتی اُس بے قیمت اور سیاہ کوئلہ کی قسم میں سے ہے جسے آگ کی ایک چنگاری راکھ اور خاکستر کا ڈھیر بنا دیتی ہے اور جس کی جھولی بھر مقدار کی قیمت ایک درہم سے بھی کم ہوتی ہے۔

الماس قدیم الایام سے ہی مشہور و معروف چیز ہے۔ جیسا کہ تورات میں بھی متعدد مقامات پر اس کا ذکر آیا ہے۔ مثلاً کتابِ مذکور میں یہودی قوم کے استحکام و استواری کو الماس اور ہیرے ہی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یونانی اور رومی "الماس"، "کو آداماس" کہتے تھے۔ اور لفظِ الماس کے الف اور لام کو اب بھی عرب الف ولامِ تعریف تصور کر کے اس کلمہ کو "ماس" سمجھتے اور اس یونانی لفظ "آداماس" سے مشتق بتاتے ہیں۔ اور خود یونانی زبان میں بھی یہ لفظ بمعنی "رام نشدنی" اور "ناقابلِ تسخیر" مستعمل ہوتا ہے جو اس پتھر کی مضبوطی اور غیر معمولی

سختی کی طرف اشارہ ہے۔ قدیم رومی مصنف "بلینیوس"[1] جو ہجرت سے ۵۵۰ سال قبل زندہ تھا اپنی کتاب میں جو اس نے علوم طبیعی کے بارے میں ۳۷ جلدوں میں لکھی ہے۔ الماس کے متعلق لکھتا ہے کہ الماس اُن تمام اشیا میں سے جو انسان کو معلوم ہیں زیادہ قیمتی ہے۔ مہر و محبت اور دشمنی کے ظاہر کرنے کے لئے خواص مخصوصہ رکھتا ہے۔ اس پر آگ اور لوہے کا کہ دنیا کی سخت ترین چیزوں میں سے ہیں کوئی اثر و نفوذ نہیں۔ البتہ فقط بکری کے خون سے اُس کا ٹوٹنا ممکن ہے۔ چنانچہ سنگتراش اُسے بکری کے گرم خون میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اُس سے ہر چیز پر جو اُس سے زیادہ سخت نہ ہو نقوش و تصاویر کندہ کرتے ہیں ......... اس کے علاوہ الماس میں تریاق کی خاصیت بھی ہے۔ اور یہ جنون کے لئے حفظ ماتقدم کے طور پر مفید ہے وغیرہ ذالک۔

سلاطین غزنی کے ہندوستان پر حملوں کے بعد ہی ممالک غرب و فرنگستان میں الماس کی شہرت و کثرت ہوئی ورنہ اس کے قبل تو بہت ہی کمیاب تھا۔ اس زمانہ میں الماس کی بہترین کانیں ہندوستان ہی میں تھیں۔ اور دوسرے معادن جو جنوبی امریکا کے ملک برازیل اور افریقہ اور جزائر اوقیانوسیہ میں آج کل معروف ہیں اس وقت دریافت نہ ہوئے تھے۔ چنانچہ سنہ ۱۱۴۱ء میں برازیل کے معادن الماس کے دریافت ہونے تک دنیا کے تمام الماس ہندوستان ہی سے آتے تھے۔

اس کے بعد جب فرنگستان میں علمی ترقیاں شروع ہوئیں تو وہاں کے کیمیا دانوں نے دوسری معدنیات کی طرح الماس کو بھی تجربہ و تجزیہ کی کسوٹی پر کسنا شروع کیا۔ اور سنہ ۱۶۹۰ء میں اٹلی کے دو کیمیا دانوں نے جن کے نام "آوارامی" اور "تاگلیونی"[2] تھے ثابت کیا کہ الماس جل سکتا ہے اور اس کو جلایا جا سکتا ہے اور پھر آہستہ آہستہ علم و معرفت کی ترقی اور بہت سے تجربوں کے بعد الماس کے بہت سے نئے نئے خواص بھی معلوم ہوئے۔ حتیٰ کہ بعد میں علمائے کیمیا ادنیٰ قسم کا الماس بنانے میں بھی کامیاب ہو گئے لیکن ان تفصیلات میں پڑنا ہمارے موجودہ موضوع بحث سے خارج ہے۔

آج دنیا کے مشہور ترین الماسوں کی تعداد اگر ان میں اُس الماس کو بھی شامل کر لیا جائے جو سنہ ۱۳۲۳ء میں جنوبی افریقہ کے ملک ٹرانسوال سے دستیاب ہوا اور جس کا وزن ۳۰۲۲ ½ قراط ہے) ۱۳ عدد ہے جن کی فہرست حسب ذیل ہے۔

---

[1] Pliny جو کتب اسلامی میں بلیناس کے نام سے معروف ہے۔ منہ [2] Averami et Taglioni

[3] دریائے نور فرنگستان میں بہ مغل اعظم، Legrand Mogal کے نام سے مشہور ہے

| نمبر شمار | اسم الماس | وزن بحساب قراط | اسم مالک |
|---|---|---|---|
| ۱ | کولینان | ۳۰۳۵،۵ (تقریباً ۱۰ سیر ایرانی) | دولتِ برطانیہ |
| ۲ | ایکسلیسر | ۹۷۱،۷۵ | دولتِ برطانیہ (؟) |
| ۳ | ؟ | ۳۶۷ (ناتراشیدہ) | راجہ ماتان (در جزیرہ بورنیو) |
| ۴ | ؟ | ۳۴۰ | نظام گولکنڈہ (ہندوستان) |
| ۵ | دریائے نور | ۲۸۰ | ایران |
| ۶ | اورلف | ۱۹۷ | روس |
| ۷ | فلورانسی | ۱۳۹،۵ | سلطنتِ اتریش |
| ۸ | اژان ذنائب (السلطنت) | ۱۳۶،۲۵ | دولتِ فرانس |
| ۹ | ستارۂ جنوب | ۱۲۵،۵ | ایک ہندوستانی مہاراجہ |
| ۱۰ | کوہِ نور | ۱۰۶ | دولتِ برطانیہ |
| ۱۱ | سانسی | ۵۳ | روس |
| ۱۲ | الماسِ آبی | ۴۴،۲۵ | امسٹرڈم |
| ۱۳ | الماسِ سبز | ۴۰ | یہ ہیرا جرمن کے ایک شہر درسد کے قصر سبز میں موجود ہے۔ |

مذکورہ بالا الماسوں میں سے ہر ایک الماس اپنی جداگانہ تاریخ رکھتا ہے۔ اُن جنگوں اور خدعہ کاریوں اور نیرنگیوں اور خونریزیوں کی داستانیں جو ان کے حاصل کرنے کے لئے مختلف ادوارِ تاریخ میں کی گئیں بہت طویل اور دلچسپ ہیں۔ مگر چونکہ ہمارے مضمون میں گنجائش کم ہے اس لئے ہم فقط ان دو ایک کے ذکر پر ہی کہ جن کا تعلق مشرق و ایران سے ہے۔ اکتفا کریں گے۔ جو لوگ ان دوسرے مشہور الماسوں کے واقعات اور تفصیلات جاننے کے شائق ہوں۔ وہ اُن کتابوں کی طرف رجوع فرمائیں جو اس موضوع پر لکھی گئی ہیں۔

مذکورہ بالا الماسوں میں سے تین قطعات الماس کہ جن کی تاریخ جاننا ہمارے اس مضمون کا موضوع ہے۔ یہ ہیں اول "کوہِ نور" دوم "اورلف" سوم "دریائے نور" جو فرنگستان میں "مغلِ اعظم" کے نام سے معروف ہے اور آج

خزانہ ایران میں موجود ہے دسویں صدی میں دستیاب ہوا تھا۔ اور شکل کے لحاظ سے نیم سیب کا شبیہ ہے۔ اس کا وزن ۲۸۰ قراط ہے اور اس کے متعلق مشہور ہے کہ تراشنے سے پہلے اس کا وزن ۸۰۰ قراط تھا۔ بدقسمتی سے یہ الماس کچھ زیادہ خوش آب اور خوش تراش نہیں ہے ۱۱۵۱ء میں جب نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر لشکرکشی کی اور محمد شاہ (رنگیلے) گورگانی کو شکست دی اس وقت یہ ہیرا اسے ملا تھا۔ یعنی پانی پت کرنال کے میدان میں جو دہلی سے ۲۵ فرسخ جانب شمال واقع ہے بروز سہ شنبہ بتاریخ ۱۵ ذی القعدہ سنہ مذکور میں دہلی کے مغلی لشکر نے افواجِ نادری سے شکست کھائی اور نادر بروز جمعہ ذی الحجہ کی تاریخ نہم کو دہلی میں داخل ہوا اور دوبارہ سلطنتِ ہندوستان محمد شاہ کو عطا کی۔ اُس وقت محمد شاہ نے بقول میرزا مہدی کے جو نادر کا منشی اور اس کے عہد کا مورخ ہے، سب خزانوں کی کنجیاں پیش کردیں۔ میرزا مہدی لکھتا ہے:۔

تمامی جواہر و خزائن و اثاثۂ پادشاہی و ذخائرِ سلاطینِ سلف را کہ در دستگالِ سلطنت موجود بود مفصل بمعرضِ عرض در آوردہ و برسمِ نیاز نثار و ایثار کرد۔ و ہرچند ہمتِ کان خاصیت بحرِ نوال خو بو بیہمال (یعنی نادر) نظرِ اعتنا بر آن کنوز و خزائن کہ جمعِ مخازنِ سلاطینِ روئے زمین با عشری از اعشارِ آن (۱) برابری نمی کرد نیفگندہ دامانِ نیاز ہندی از آنہا در چیدند اما بنا بر مبالغۂ پادشاہ والاجاہ آئینۂ این مسئول نقش پذیرِ قبول گشتہ معتمدانِ امین بضبطِ خزائن و بیوتات تعین فرمودند"

مورخین نے ان اموال و جواہر کی قیمت کا کم از کم اندازہ تین سو کروڑ تومان موجودہ سے کیا ہے (اور ایک تومان کو ہندوستان کے تین روپیہ کے برابر سمجھیے۔ شہاب) اور انہی جواہرات میں سے یہ تینوں ہیرے "دریائے نور" اور "کوہِ نور" اور "تاج ماہ" (؟) بھی ہیں۔

---

لہ اشتلس و آندرآس اپنی جرمن کتاب میں جس کا نام "ایران کے تجارتی حالات" ہے جو ناس ہانوہ" ایک انگریز تاجر کے قول کی بنا پر جو ۱۷۵۶ء سے ۱۷۶۱ء تک یعنی نادر کے اواخر عہد تک ایران میں تھا نادر شاہ کے تمام مالِ غنیمت کی قیمت جو اُس نے ہندوستان میں لوٹا جرمنی سکہ کے حساب سے ۲۲۵،۰۰۰،۰۰۰ مارک لکھی ہے منجملہ جس کے ۷۵،۰۰۰،۰۰۰ مارک سونا چاندی تھا اور بقیہ جواہرات اور آلات اور قیمت "تختِ طاؤس" اقل قلیل ۲۲۵،۰۰۰،۰۰۰ مارک بتاتا ہے اور چالیس سال قبل (بلکہ ساٹھ سال قبل) جب یہ کتاب لکھی گئی اس وقت ایک تومان کی قیمت تخمیناً ۷ یا ۸ مارک ہوگی (یہ جنگ سے پہلے کی باتیں ہیں) سر جان ملکم نے اپنی مشہور تاریخ ایران میں نادری غنیمت کی قیمت کے بارے میں لکھا ہے کہ مورخین نے اس بارہ میں اختلاف کیا ہے بعض نے ستر ملین پونڈ نقد و جنس بتایا ہے اور کم سے کم جو اندازہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ تیس ملین پونڈ سے کہیں زیادہ ہے جس میں بہت سے جواہرِ نفیسہ تھے۔

نادر کے بعد "دریائے نور" ظاہراً اُس کے پوتے شاہرخ کے قبضہ میں آگیا اور بالآخر شاہانِ قاچار کے ہتے چڑھا جن میں سے ناصرالدین شاہ کو اس گوہر گرانبہا سے بہت ہی دلچسپی تھی۔ کبھی تو وہ اسے اپنے جیغہ میں اور کبھی اپنی گھڑی میں لگاتا اور کبھی اپنے سینے پر آویزاں کرتا تھا حتی کہ اُس نے اپنے عہد میں "تولیتِ دریائے نور" کے نام سے ایک خاص عہدہ کا بھی تقرر کیا تھا۔ اور یہ عہدہ اپنی سلطنت کے بڑے بڑے اعیان واکابر کو عطا کرتا تھا۔ جیسا کہ ہم ۱۲۹۶ء کے واقعات کی ذیل میں کتاب "منتظمِ ناصری" میں پڑھتے ہیں۔ کہ اس سال میں "دریائے نور" کی تولیت "حاجی محمد رحیم خاں خازن الملک کو تفویض کی گئی تھی۔ اور اس کے بعد سنگِ مزار سلطنت کے میوزیم میں داخل کیا گیا۔ یہاں تک کہ جب ۱۳۲۶ھ میں محمد علی میرزا بغاوتِ روس کے ظلِ حمایت میں چلا گیا تو اس جواہر پارے کو بھی ہمراہ لے گیا اور اس کی ملکیت کا مدعی بن بیٹھا۔ قریب تھا کہ یہ شاندار یکتا گوہر ایران جو جہانگیری عہد نادری کی یادگار تھا روس کے قبضہ میں چلا جائے۔ لیکن لاکھوں ایرانیوں کی ہمت آڑے آئی اور ایران کی چیز ایران کو مل گئی "دریائے نور" بحیثیت قیمت کے چنداں گرانبہا نہیں ہے۔ ظاہری طور پر اس کی قیمت ۱۲،۰۰۰ پونڈ انگریزی سے بڑھ کر نہیں اور قدیم خیال کے مطابق ساٹھ ہزار تومان (۸۰۰۰۰۱ روپیہ کلدار) سے زیادہ نہیں ہے[۱]۔

وہ قطعۂ الماس کہ اب "اورلف" کے نام سے موسوم اور زینت دہ تاجہائے زارہائے روس ہے (رہا تھا) انہی جواہرات میں سے ہے جو ہندوستان سے نادرشاہ ایران لے گیا تھا۔ یہ الماس جو "دریائے نور" کا ہم شکل ہے آب وتاب کے لحاظ سے بہت بڑھا ہوا ہے۔ ہاں اس کی تراش وخراش چنداں خوبصورت نہیں۔ اور لف ۱۱۶۰ھ میں قتلِ نادرشاہ کے بعد ایک ارمنی کے ہاتھ بک گیا تھا۔ جس نے ۱۱۸۶ھ میں ۶۵۰،۰۰۰ منات چاندی اور ایک فرمانِ امارت کے بدلے میں روس کی ملکہ کیتھرائن ثانی (خورشید کلاہ) کے ہاتھ بیچ ڈالا۔

لیکن ان تمام الماسوں میں سے جو سب سے زیادہ مشہور ہے وہ "کوہِ نور" ہے جو درحقیقت جواہرات کا بادشاہ ہے اگرچہ بہت بڑا تو نہیں لیکن بحیثیت آب وتاب اور تراش وخراش کے بے نظیر ہے اور اپنی قدامتِ تاریخ کے لحاظ سے اس کی روداد بہت دل کش اور شنیدنی ہے۔ جیسا کہ اہلِ ہند کو دعویٰ ہے کہ آج سے ۵۰۰۰ ہزار سال قبل "کارنا" سورج دیوتا کا فرزند ہندوستان کا مشہور پہلوان کہ رستم کی طرح ہندوستان میں اُس کی شجاعت اور کارہائے نمایاں کے افسانے مشہور ہیں، اور ہندوستان کی مشہور داستانِ مہابھارت بھی اسی کے متعلق ہے، اپنی جنگوں میں "کوہِ نور" کو اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ ظاہراً تو کوہِ نور ولادتِ مسیح سے ایک صدی قبل ملکِ ہند کے ایک راجہ اجین (بتلفظ ایرانی اوجین Ujjain)

---

[۱] یہ تخمینہ قیمت جنگ یورپ سے پہلے ۱۳۲۶ء کا ہے لیکن اب تو جواہرات کی قیمت بہت بڑھ گئی ہے [۲] Karna

کی ملک میں تھا۔ لیکن صحیح تاریخی معلومات کے مطابق آٹھویں صدی عیسوی سے اُس کی داستان شروع ہوتی ہے۔ اور بطورِ یقین ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس زمانہ میں یہ الماس شمال غربی ہندوستان کے فرمانروایان مالوا کے قبضہ میں تھا۔

لیکن جب مسلمانوں نے ہندوستان کے اس حصہ ملک پر بھی تسلط حاصل کر لیا تو مالوا کا فرمانروا بھی ۷۰۹ھ میں مغلوب ہوگیا اور اس طرح "کوہِ نور" جلال الدین فیروز شاہ کے برادرزادہ اور داماد سلطان علاء الدین محمد خلجی شاہ دہلی (متوفی ۷۱۶ھ) کے ہاتھ آگیا۔ پھر اسی قسم کے انقلابات کے بعد جب ہندوستان کے مشہور بادشاہ ہمایوں پسر بابر (۹۱۳-۹۶۳) نے اس ملک پر قبضہ پایا تو کوہِ نور بھی اُس کے ہاتھ آیا۔ اور اُس نے اپنے باپ بابر کو جو سلاطین بابریہ کا مورثِ اعلیٰ تھا بطور ہدیہ پیش کیا۔ اور بابر نے جو کوہِ نور کی قیمت ساری دنیا کے محاصل کا نصف قرار دیتا تھا یہ ہیرا اپنے بیٹے ہی کو بخش دیا۔ اور اس طرح زمانہ دراز تک یہ ہیرا شاہانِ بابری کی ملکیت میں رہا۔ خاص کر شاہجہان اور اورنگ زیب تو اس کی بہت ہی قدر و قیمت سمجھتے تھے۔ لیکن جب ان کے بعد نادر شاہ افشار نے ہندوستان پر لشکر کشی کی تو جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے محمد شاہ رنگیلے نے مغلوب و مجبور ہو کر اپنا سارا خزانہ نادر کے سپرد کر دیا مگر کوہِ نور کو اپنی دستار میں چھپا لیا کیونکہ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اُسے اپنے سے جدا کرے مگر اس کی حرم سرا کی ایک لونڈی نے نادر کو یہ بات سمجھا دی۔ چنانچہ نادر شاہ نے ایک جشن کے موقع پر کہ محمد شاہ بھی وہاں موجود تھا اس عنوان سے کہ وہ محمد شاہ سے یگانگی اور برادری کا طالب ہے محمد شاہ کی دستار اٹھا کر اپنے سر پر اور اپنی کلاہ محمد شاہ کے سر پر رکھ دی۔ مشہور ہے کہ اس نازک موقع پر محمد شاہ نے ایسا سکون و وقار ظاہر کیا کہ نادر شاہ اس شک میں پڑ گیا کہ لونڈی کی رپورٹ غلط ہے۔ اور اس نے خیال کیا کہ ممکن ہے کہ الماس مذکور محمد شاہ کی دستار میں نہ ہو لیکن تنہا ہوتے ہی وہ دیکھنے بھالنے لگا۔ اور جب اُس کی نگاہ اس ہیرے پر پڑی تو خوشی کے مارے چلا اُٹھا "کوہِ نور" "کوہِ نور" اور سب یہیں سے یہ ہیرا اس نام سے مشہور ہوگیا۔

۱۱۶۰ھ میں نادر شاہ کے قتل کے بعد کوہِ نور اس کے پوتے شاہرخ کو ملا۔ لیکن ۱۱۶۲ھ میں جب شاہرخ بھی سرکش امرا کے ہاتھ سے قتل ہوا اور اُس کا ملک احمد خاں ابدالی (جو نادر کے اس جہان سے اُٹھ جانے کے بعد افغانستان کو فتح کر کے ان بادشاہوں کا سر سلسلہ ہوا جنہوں نے افغانستان میں مستقلاً حکومت کی) کے قبضہ میں آیا تو کوہِ نور بھی اُس کے قبضہ میں چلا گیا۔ اور اُسی کے خاندان میں رہا یہاں تک کہ اُس کا پوتا شاہ شجاع دوست محمد خاں کے ہاتھوں تنگ آکر کابل سے فرار ہوا اور جس طرح بنا "کوہِ نور" کو بھی اپنے ساتھ لے نکلا جب بعد میں اس کو اندھا کر کے ۱۲۲۶ھ میں کشمیر و لاہور کی طرف جلاوطن کر دیا گیا۔ اُس وقت بھی "کوہِ نور" اُسی کے قبضہ میں تھا۔ اور جب اُس کی تمام دولت

وحشمت میں سے اس کے پاس اس گرانبہا ہیرے کے سوائے اور کچھ نہ رہا تب بھی وہ اس ہیرے کو بہت ہی چاہتا اور اُسے الگ کرنے پر راضی نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ ان دنوں ہندوستان میں بحیثیت مہمان کے رہتا تھا لیکن درحقیقت سکھوں کے راجہ رنجیت سنگھ (۱۱۹۴-۱۲۵۵) کا قیدی تھا جو ان دنوں پنجاب اور اس کے قرب وجوار کا فرمانروا تھا رنجیت سنگھ نے کوہ نور کے حاصل کرنے کے لئے شاہ شجاع اور اس کی بیوی پر بہت سختی کی۔ آخر مجبور ہو کر شاہ شجاع کی بیوی نے رنجیت سنگھ سے یہ شرط کی کہ اگر وہ اس کے شوہر کو آزاد کردے تو وہ کبھی کوہ نور کو اس کے سپرد کردے گی لیکن جب شاہ شجاع کو اس نے آزاد کردیا تو شاہ شجاع کی بیوی نے کہا کہ "کوہ نور قندہار میں ایک تاجر کے پاس گرو رکھا ہوا ہے۔ آخر رنجیت سنگھ کی تہدیدات سے مجبور ہو کر شاہ شجاع نے وعدہ کیا کہ فلاں دن "کوہ نور" رنجیت سنگھ کو سپرد کردے گا۔ چنانچہ آخر کار ماہ جمادی الآخر ۱۲۲۸ھ میں نابینا شاہ شجاع نے یہ گوہر پارہ رنجیت سنگھ کو سونپ دیا جسے اُس نے سونے میں جڑوالیا اور بڑی بڑی تقریبات اور جشنوں وغیرہ پر اُس سے اپنے آپ کو زینت دیتا تھا۔ جس وقت رنجیت سنگھ بیمار ہوا اور لوگوں کو یہ خیال ہوا کہ اب اُس کی موت قریب ہے تو برہمنوں نے درخواست کی کہ وہ اس ہیرے کو وقف کردے تاکہ جگن ناتھ کی مورتی پر اس کو نصب کردیا جائے۔ اس کے اشارۂ انکار کے بعد وہ اس کوشش میں لگے کہ کسی طرح یہ ہیرا اڑانا چاہیے۔ لیکن رنجیت سنگھ کے خزانچی نے سخت مخالفت کی اور ہیرے کے دینے سے صاف انکار کردیا۔ اس طرح یہ سنگ پارہ رنجیت سنگھ کی اولاد میں منتقل ہوا اور یہ اسی خاندان میں تھا کہ اُس کا آخری جانشین دلیپ سنگھ ۱۲۶۳ھ میں انگریزوں اور ایسٹ انڈیا کمپنی کا مقہور ہوا اور اس کا خزانہ انگریزوں کے ہاتھ آیا۔ اور "کوہ نور" بھی اسی میں تھا۔ لارڈ ڈلہوزی وائسرائے ہند نے ۲۲۔ ربیع الثانی ۱۲۶۴ھ میں جب سلطنتِ پنجاب کا باقاعدہ طور پر خاتمہ کردیا اور دو انگریز افسروں کو مقرر کیا کہ وہ "کوہ نور" کو بطور ہدیہ ملکۂ وکٹوریہ کے حضور میں لندن پہنچادیں۔ اس طرح الماس مذکور ۲۲ رجب ۱۲۶۶ھ (۳ جون ۱۸۵۰ء) میں ملکۂ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ اور آج کے دن تک وہ انگلستان کے شاہی خاندان ہی میں موجود ہے

"کوہ نور" کا وزن ابتداءً جب کہ وہ تراشا نہیں کیا گیا تھا ۳/۸ ۷۹۳ قراط تھا۔ شاہ شجاع نے پہلے پہل اُسے ایک وینزی سنگ تراش موسوم بہ "بورگیو" سے ترشوایا۔ لیکن اس سنگ تراش کے کام سے وہ ایسا ملول اور غضبناک ہوا کہ اجرت نہ دینے کے علاوہ ایک ہزار روپیہ جرمانہ بھی اس سے وصول کیا۔ اس کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے لندن کے شاہی سنگ تراشخانہ میں اسے موجودہ شکل میں ترشوایا۔ اور اب اس کا وزن ۱/۱۶ ۱۰۶ قراط ہے۔

ہندوستانیوں میں مشہور ہے کہ کوہِ نور منحوس ہے اور فی الواقع تاریخ سے بھی کچھ ایسا ہی پتہ لگتا ہے۔ کیونکہ اس کا سب سے پہلا مالک "کارنا" جنگ میں قتل ہوا۔ راجۂ اجین جو بعد میں مالک ہوا اس کی سلطنت بھی ہاتھ سے گئی۔ یہی حال مالوا کا ہوا جس کا ذکر اوپر گذر چکا۔ نادر قتل ہوا۔ شاہرخ نابینائی کی حالت میں قتل ہوا۔ شاہ شجاع حالت کوری و اسیری میں دوسرے کو دے دینے پر مجبور ہوا۔ رنجیت سنگھ کے وارثوں میں کھڑک سنگھ مسموم ہوا۔ اور شیر سنگھ دربار میں گولی کا نشانہ بنا اور دلیپ سنگھ اُس کا آخری مالک ہیرے کے انگریزوں کے قبضہ میں جانے سے پہلے ہی تخت و تاج اور آبائی سلطنت سے دست بردار ہو گیا اس کے باوجود ستر سال سے یعنی جب سے کہ یہ ہیرا انگلستان کے شاہی خاندان کے قبضہ میں چلا آتا ہے۔ روز بروز یہ سلطنت رو بہ ترقی ہے لیکن اس مشاہدہ کے باوجود ہندوستانی خیال کرتے ہیں کہ اس ہیرے کی نحوست کا اثر انگلستان پر بھی پڑے گا اور ہندوستانی پھر سر اٹھا سکیں گے۔ اور حق بحقدار کے مطابق کوہِ نور اپنی اصلی سرزمین میں واپس آجائے گا۔ لیکن خدا کے سوا کون جانتا ہے کہ آئینۂ تقدیر سے کیا کیا جلوے ظاہر ہونگے۔ اور قضا کے بگولے تاریخ کی سرکش امواج کو کہاں سے کہاں لے اڑیں گے +

مہر محمد خاں شہاب

---

# غزل

تکمیل سے عاجز ہستی کی موجوں کے تھپیڑے کھانے دو
انساں کو امیدِ باطل کی کچھ اور سزائیں پانے دو

احساس کی وسعت کچھ نہ سہی، تسلیم کی خو آساں نہیں
اجزائے دلِ مضطر پھیلے، آنکھوں سے مگر بہ جانے دو

ہستی سے عدم تک چھائی ہوئی ہے بے خبری سی بے خبری
تخلیق کئے ہیں فطرت نے انساں کے لئے میخانے دو

ہر چند سہی امید غلط، داماںِ کرم محدود نہیں
گستاخ نگاہیں بڑھنے دو، شکووں کو زباں پر آنے دو

اختر

# "جنگل کی شاہزادی"

پھوٹتا ہے رنگ تیرے رخ پر شباب ہو کر | حل ہو گئی نظر میں مستی شراب ہو کر
عارض پہ تیرے زلفِ شبگوں بکھر رہی ہے | یا شام آسماں سے نیچے اُتر رہی ہے
حاصل نہیں ابھی یہ ندرت مرے سخن کو | حیراں ہوں کس سے آخر تشبیہ دوں دہن کو
کانِ جواہر اس کو دانتوں نے کر دیا ہے | قدرت نے چاند کا منہ تاروں سے بھر دیا ہے
دکھلا رہا ہے تجھ میں چہرہ شباب اپنا | چشمے میں دھو رہا ہے منہ آفتاب اپنا
جلووں کی ایک دنیا اس روئے پاک میں ہے | کیا جانے کس کا پرتو اک مشتِ خاک میں ہے

چہرے پر اس ادا سے ہر نقش اُبھر رہا ہے
گویا تمام چہرہ کچھ غور کر رہا ہے

یہ ندیاں جو شیریں نغمے سنا رہی ہیں | پھولوں میں بہ رہی ہیں اور مسکرا رہی ہیں
یہ جنگلوں کے قاصد ٹھنڈی ہوا کے جھونکے | پیغامبر گلوں کے بادِ صبا کے جھونکے
یہ گول گول خیمے سرسبز جھاڑیوں کے | یہ اودے ملگجے سے دامن پہاڑیوں کے
یہ شام کی سیاہی جو رات بن رہی ہے | بن باسیوں کو وجہِ آفات بن رہی ہے

بچپن سے ان مناظر کی گود میں پلی ہے
جنگل کی شاہزادی تو سب کی لاڈلی ہے

دیکھے جو تیرے تاباں رخسار بادلوں نے | دی مستعار اپنی رفتار بادلوں نے
قوسِ قزح نے چہرے میں رنگ بھر دیا ہے | عورت بنا کے تجھ کو اک چیز کر دیا ہے

لہروں کے زیر و بم نے لطفِ سرود بخشا
نوخیز خواہشوں کو شوقِ نمود بخشا

تاروں بھری فضا نے تعلیمِ خامشی دی
تجھ سی لطیف شے کو عورت کی زندگی دی

ہیں جمع تیرے رخ میں رنگینیاں سحر کی
سمٹی ہوئی ہے گالوں میں دھوپ دوپہر کی

یہ کہہ رہی ہے زلفِ شب فام کی سیاہی
ہے قید میرے حلقوں میں شام کی سیاہی

سو سو طرح سے تیرے فطرت نے ناز اٹھائے
چشموں نے گیت چھیڑے لہروں نے ساز اٹھائے

پھیلا کے ہاتھ تجھ کو ہر شاخ نے دعا دی
اک اک کلی وفورِ بہجت سے مسکرا دی

دزدیدہ تیرے رخ کو چوما کچھ ادا سے
کرتی ہی رہ گئی تو اُس کا گلہ ہوا سے

کچھ پھول تو نے اپنے دامن میں بھر لئے ہیں
دامن میں بھر لئے ہیں یا قید کر لئے ہیں

یہ دیکھ کر کہ ہیں سب شاخیں نہال تجھ سے
سبزے کی ہے یہ خواہش ہو پائمال تجھ سے

مہکا ہوا ہے جنگل گیسوئے مشکبو سے
اُٹھ اُٹھ کے دیکھتا ہے سبزہ کنارِ جُو سے

آتے نہیں اگرچہ تجھ کو پسند کانٹے
لپٹے ہوئے ہیں پھر بھی دامن سے چند کانٹے

اے کاش میں جہاں کو رنگینیوں سے بھر دوں
ہر شے کو رنگ دے کر تجھ سا حسین کر دوں

فطرت سے تیرے جلووں کو مستعار لوں میں
اور دل کے آئینے میں اُن کو اتار لوں میں

پھر ہو میرے تصور میں جلوہ گر یہ نقشہ
یعنی رہے ہمیشہ مدِ نظر یہ نقشہ

ہو جھٹپٹے کا عالم مسحور ہوں فضائیں
اِک سرمدی نشے میں مخمور ہوں فضائیں

کچھ ایسا سا عالم ہو سب پہاڑیوں پر
کچھ آخری شعاعیں رقصاں ہوں جھاڑیوں پر

ہو اک سکوت طاری خاموش وادیوں میں
یعنی پڑے ہوں چشمے مدہوش وادیوں میں

اِن سب کے درمیاں اِس عالم میں تو کھڑی ہو
آئینہ بن کے فطرت کے رُوبرو کھڑی ہو

فاخر ہریانوی

خوش قسمت یہ شخص ضرور ہے کہ آپ اس کی تعریف فرماتے ہیں" یہ کہہ کر اُس نے بات پلٹ دی میں تمہارا فوٹو ہیں رکھ کر ایک منٹ کے لئے پہلو کے کمرے میں گیا۔ دل میں یہ تھا کہ کیا دوبارہ وہ تمہارا فوٹو دیکھے گی۔ مگر مس ایمائی کچھ ایسی مستقیم الطبع واقع ہوئی ہے کہ اُس نے فوٹو کی طرف آنکھ تک نہ اُٹھائی۔

بدیعی۔ تو کیا یہ ردی شدہ خاکسار اب اپنے آپ کو کسی پیتل تانبے کے پوڈر سے ذرا چمکا لے؟

صریر۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم نے اس چھ سال میں جہالت میں کس قدر ترقی کی ہے۔

بدیعی بات یہ ہے کہ جہالت کا میدان وسیع ہے اور انسانی کوشش محدود۔ وہیں ہوں جہاں تھا۔

صریر۔ اسی لئے پوچھا تھا کہ آج چار کے بعد یہاں مناظرہ ہے۔ ایمائی، بندہ، مسز شان، مسٹر عقیدت تو بذاتہ موجود ہونگے اور چھ آرام کرسیوں پر چھ نمائندہ بکئے ہونگے۔ ایک شیخ صاحب، ایک نواب صاحب، ایک مولانا صاحب، ایک لالہ جی، ایک پنڈت جی اور ایک مہاتما۔ یہ چھ کے چھ حضرات ہیں تو اہل الرائے مگر چونکہ وہ لیڈر ہیں انہیں چند منٹ سے زیادہ سچ بولنا یا سچ سننا ناگوار گذرتا ہے اس لئے اُن کے جذبات کا احترام کرتے ہوئے انہیں مدعو نہیں کیا جاتا اور اُن کی کرسی پر اُن کے نام سے تکیہ رکھ دیا جاتا ہے اور موقع مناسب پر اسی تکیے کی طرف سے نہایت دیانت داری سے تقریر کر دی جاتی ہے، چونکہ ہم میں سے ہر ایک کو معلوم ہے کہ یہ بزرگ کسی خاص مصلحت کو مدنظر رکھیں گے اس لئے اُن کی جانب سے اظہار رائے میں غلطی کم ہوتی ہے اور ہمارا مناظرہ یک طرفہ نہیں رہتا۔ ہمارا مطلب بھی حل ہو جاتا ہے اور اُن لوگوں کے اقتدار میں بھی فرق نہیں آتا اور عریانیِ حق کے شعلہائے سوزاں سے بھی وہ لوگ بچے رہتے ہیں۔

بدیعی۔ ایمائی نے اپنا گڑیا کھیلنے کا شوق تم میں بھی ڈال دیا۔ خوب! تم اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے؟

صریر۔ بجائے اس کے کہ تم مجھے شادی پر کوئی تحفہ دو میں تمہاری شادی پر تحفہ دینے کو ترجیح دیتا ہوں۔

بدیعی۔ بڑے زبان کار ہو مگر ان مس ایمائی کا کچھ حلیہ تو بیان کر دو۔ کیا اُن کا فوٹو یہاں ہے؟

صریر۔ فضول باتوں سے مجھے نفرت ہے۔ اب تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ مس ایمائی مقررہ وقت سے صرف ایک منٹ پہلے آیا کرتی ہیں ڈیڑھ منٹ پہلے نہیں۔ چار بجے کا بلاوا ہے اور گول کمرے میں چار کے بعد بحث ہے۔

بدیعی۔ مضمون کیا ہے؟

صریر۔ محبت (مسٹر بدیعی ناک بھوں چڑھا کر اُٹھنے کو ہیں کہ صریر اُن کی طرف متوجہ ہو کر سوال کرتا ہے) تم سے خدائی خوار سے یہ پوچھنا تو فضول ہے کہ کتنے دن یہاں ہو مگر چھ سال کی جدائی کی تلافی چھ ہفتوں سے کم میں کیا ہوگی۔

بدیعی۔ دیکھا جائے گا۔

# دوسرا پردہ

(صریر کا گول کمرہ۔ وقت بعد دوپہر)

(مس ایمائی ٹھیک چار بج کر ایک منٹ بعد گول کمرے کے دروازے میں قدم رکھنے کو ہیں۔ ملازم دروازے کو کھول رہا ہے۔ اندر سے صریر استقبال کے لئے نکلنے کو ہے)

صریر۔ لیٹ، لیٹ، پورے دو منٹ۔ آج ہی تو حضور کا امتحان تھا اور آج ہی فیل۔

مس ایمائی (مسکراتے ہوئے ہاتھ ملا کر) خدا جانے کیوں مگر دل نے یہی کہا کہ آج محض تفریح کے لئے عادت بدل دو مگر کیسا امتحان؟ (کمرے کے اندر داخل ہوتی ہیں)

صریر۔ لیجئے مسٹر بدیعی سے ملئے۔ آج صبح بلا اطلاع وارد ہوئے۔ امتحان یہ کہ آپ کا ان سے غائبانہ تعارف کراتے ہوئے یہ کہہ دیا تھا کہ آپ حسبِ عادت وقتِ مقررہ سے ایک منٹ پہلے تشریف لائیں گی

مس ایمائی (بدیعی سے ہاتھ ملاتے ہوئے) آپ کا فوٹوگراف قطعی نااہل ہے۔ ہے نا صریر؟ کیا یہی وہ آپ کے مسٹر مقناطیسی ہیں؟

صریر۔ جی ہاں۔

بدیعی۔ مس ایمائی آپ صریر کی بکواس پر نہ جائیے۔ خودستائی کا یہ بھی ایک طریقہ ہے کہ انسان اپنے دوستوں کو بہت بڑھیا ظاہر کرے اور اس میں صریر صاحب کو کمال حاصل ہے۔ (صریر دروازے کی طرف مسز شان کے استقبال کے لئے بڑھتا ہے)

ایمائی (ہنس کر) تو کیا جو کچھ آپ سے صریر نے میرے متعلق تعریفی الفاظ استعمال کئے ہونگے اُن کو بھی آپ جھوٹ تصور کرتے ہیں؟

بدیعی۔ قطعی۔ آپ تو انسان ہیں یعنی اس معنی میں کہ

آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اور صریر نے لفظوں میں تو نہیں مگر لفظوں کے درمیانی سکوت میں آپ کو دیویوں کی دیوی ظاہر کیا تھا۔

مس ایمائی۔ (نہایت تمکنت سے) سمجھی۔

بدیعی۔ کیا؟۔

ایمائی - یہ کہ آپ شاعر ہیں (یہ کہہ کر مس ایمائی مسز شان کی طرف بصد اخلاق جھکتی ہیں)
مس ایمائی - (مسز شان سے ہاتھ ملاتے ہوئے) مجھے اپنی رائے غلط ماننی پڑے گی۔
مسز شان - کیا رائے؟
مس ایمائی - یہ کہ آپ کو زعفرانی ساڑھی زیادہ بھلی معلوم دیتی ہے اب جو اس گلابی کو دیکھتی ہوں تو کہنا پڑتا ہے کہ جو رنگ آپ کے قریب ہو جائے وہی معزز ہے۔
مسز شان (نہایت خلوص اور بھولے پن سے) ایمائی تمہاری خوشی کے لئے اگلی دفعہ ضرور زعفرانی ہی پہنوں گی میں نہیں چاہتی کہ تمہاری کوئی بھی رائے غلط ہو سکے۔

(مسٹر عقیدت آتے ہیں اُن سے بدیعی کا تعارف ہوتا ہے۔ چاء پر چہ میگوئیاں ہوتی رہتی ہیں اور آخر کار ملازم چاء کا سامان لے جاتے ہیں اور نشستوں کو ٹھیک کر کے کمرہ سے نکل جاتے ہیں۔ صرف چھ تکیے لاکر چھ کرسیوں پر رکھ دیتے ہیں۔ تکیہ پر پن سے نام کے پرچے لگے ہوئے ہیں۔ اتفاقِ رائے سے مسٹر بدیعی کو صدرِ جلسہ منتخب کیا جاتا ہے اور کارروائی شروع ہوتی ہے)

بدیعی - شرف صدارت جو مجھے بخشا گیا ہے اُس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں اور مس ایمائی سے درخواست کرتا ہوں کہ وہ اظہارِ خیالات سے ہماری خود تعلیمی کی کوششوں میں امداد کریں۔
مس ایمائی :-

اس سے پہلے جلسہ میں میری تقریر عبادت کے مضمون پر تھی اور سامعین کو یاد ہوگا کہ میری تقریر کا لب لباب یہ تھا کہ انسانوں کو فرداً فرداً بھی اور مجموعی طور پر بھی عبادت کی عادت سے زیادہ ذلیل کرنے والی اور ذلیل رکھنے والی اور عادات کم ہونگی مگر محبت کے مضمون پر غور کرتے ہوئے مجھے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محبت کی عادت عبادت کی عادت سے بھی کہیں زیادہ مضر ہے۔ یہ لازمی ہے کہ جو وجوہات میں اپنے اس نتیجہ کے ثبوت میں پیش کروں گی ان کو پرکھنے کے لئے آپ محبت کے جو معنے میرے مدنظر ہیں اُن کو غور سے سمجھ لیں۔ محبت سے میرا مطلب اس جذبہ سے ہے جو مرد اور عورت کے درمیان انگریزی لفظ Love سے بیان کیا جاتا ہے۔ وہ محبت میرے مدنظر نہیں جو بھائی کو بہن سے یا سہیلی کو سہیلی سے یا ماں کو بچے سے یا باہم مل کر کام کرنے والوں کو ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ محبت یا Love کا کوئی ادنیٰ پہلو بھی میرے مدنظر نہیں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ عورت اور مرد کے باہمی عشق کی اعلیٰ ترین صورت بھی ایسی ہی قابلِ نفرت ہے جیسی کہ اُس کی ادنیٰ ترین صورت۔ چونکہ مجھے ایک ایسے فطرتی انسانی جذبہ پر بحث

کرنی ہے جسے بعض شاعروں اور صوفیوں نے تمام روحانی ترقی کا راز قرار دے رکھا ہے اس لئے میرا فرض ہے کہ اپنے روکھے پھیکے الفاظ کو نہایت احتیاط سے استعمال کروں اور اب میں آپ سے ملتجی ہوں کہ جو وجوہات میں پیش کروں اُن کی آپ غور سے جانچ پڑتال فرمائیں۔

یہ امر بدیہی ہے کہ آغازِ شباب میں اور اس کے بعد کیا مرد کیا عورت بقائے نسل کی جبلی خواہش میں مبتلا ہو کر ایک دوسرے کی طرف ایک زبردست کشش میں گرفتار ہو جاتے ہیں مگر بچارے فریب خوردہ تصور یہ کرتے ہیں کہ زندگی کی شان اسی میں ہے کہ یہ گرفتاری جاری رہے اور تازہ ہوتی رہے گویا عقل یا شعور کو اس سے کچھ تعلق نہیں یہی وہ واردات ہے جس کو فارسی شاعر نے یوں ادا کیا ہے۔

ناصح مرا گذار کہ دیوانۂ بتاں

با صد ہزار مردمِ عاقل برابر است

یعنی صرف یہی نہیں ہوتا کہ گرفتارِ فطرت ذلیل ہو بلکہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اس ذلت کو اعلیٰ ترین دانشمندی بیان کرے مگر مجھے ابھی یہ ثابت کرنا ہے کہ sex love واقعی ذلت ہے۔ اگر اپنے آپ سے جھوٹ بولنا اور دانستہ اس جھوٹ پر جمے رہنا اور فریب سے اس جھوٹ کو معراجِ زندگی ظاہر کرنا موجبِ ذلت ہے تو یہ امر آسانی سے سمجھ میں آجائے گا کہ بچہ پیدا کرنے کی خواہش پر جوکنوں، چوہوں، چھپکلی اور مکڑی میں بھی اسی شدت سے ہے جس سے انسانوں میں ہے۔ ناز کرنا اور ناز کر کے اُسے مجموعۂ محاسن بیان کرنا ضرور ایک ذلیل حرکت ہے۔ یہ تو sex love کی اصلیت ہے۔ کون نہیں جانتا کہ تاریخی نورجہانوں اور دیول دیویوں کے حاصل کرنے کے ذرائع کیا ہیں یا اگر پسِ پردہ زندگی کو دیکھا جائے تو کس سے یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ بچے پیدا ہوتے رہتے ہیں اور وہ جذبہ جسے محبت کہا جاتا ہے مرتا رہتا ہے مگر میں ان پامال شدہ دقیانوسی وجوہات کو پیش کرتے ہوئے ہچکچاتی ہوں۔ میرا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ مردوں کا ظلم عورتوں پر ہے یا عورتوں کی جہالت سے مرد پامال ہیں۔ اس مضمون کے لئے مرد اور عورت کو ایک دوسرے سے جدا خیال کرنا ہی غلطی ہے۔ دونوں جیسے کہ ہیں اسی کشش میں گرفتاری کے باعث لچر اور پوچ ہیں اور تاوقتیکہ sex love کی جنسی ماہیت کو ہر فرد بشر پوری طرح ذہن نشین نہ کرے وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ اب مختصراً میں وہ وجہ پیش کرتی ہوں جس پر میری تمام بحث کا مدار ہے۔۔۔

کسی دلفریب باغ کے نہایت ہی خوبصورت کونے میں بادل کے سائے اور ہوا کی اٹھکھیلیوں سے متاثر ہو کر ایک بھولا بھالا نوجوان ایک نیک طینت لڑکی کو یقین دلاتا ہے کہ اُس لڑکی کے بغیر اُس کی زندگی عبث ہے

وہ لڑکی دل سے اُسے یقین کرتی ہے اور چند لمحوں کے لئے وہ نوجوان اور وہ دوشیزہ خوشی کے فلکِ ہفتم پر شاہنشاہی کرتے ہیں۔ بھولے پن سے ایک دوسرے کی محبت بھری نگاہوں کے نشہ سے سرشار ہونا اور اس نشہ میں دنیا و مافیہا کو محو کر دینا یہ ہے محبت کی بہترین تصویر۔ اگر محبت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے یہی ہے اور کوئی ناپسندیدہ نتائج اس سے برآمد نہ ہوں تو بھی میں کہوں گی کہ Romance سے زیادہ مخربِ اخلاق کوئی جذبہ نہیں کیونکہ اُس کا لازمی جزو یہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کو یقین دلاتا ہے کہ زندگی کا جزو کل سے فائق ہے۔ کسی خوددار ہستی کو کبھی یہ سننے کے لئے تیار نہیں ہونا چاہئے کہ کسی دوسری ہستی کی مدد یا خدمت کے بغیر اُس کی اپنی ہستی عبث ہے اور جو کسی اور کو ایسی بات کہے اُسے قانونی سزا ملنی چاہئے۔ انسانوں نے یہ قانون تو بنا لیا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص کے چار پیسے چُرا لے وہ قید کیا جائے مگر یہ قانون نہ بنایا کہ جو شخص کسی دوسرے شخص سے خودداری سرقہ کرے اُسے بھی قید یا جرمانہ ہو حالانکہ صاف ظاہر ہے کہ کسی کو کہنا کہ میری زندگی تمہارے بغیر عبث ہے اپنی خودداری کو بُری طرح کچلنا ہے اور سننے والے کی نسبت یہ فرض کر لینا ہے کہ وہ اس قدر بیہودہ اور سادہ لوح ہے کہ اس کے دل میں اس قسم کے اناپ شناپ کی عزت ہو سکتی ہے۔

اب آپ سمجھ گئے ہونگے کہ میں اظہارِ محبت کو بدترین اخلاقی جرم تصور کرتی ہوں۔ دل میں محبت پیدا ہونے سے تو فی الحال شاید مفر نہیں مگر اس کمزوری کو ہنس کر ٹال دینا دانشمندی سے زیادہ قریب ہے اور اس کا اظہار اخلاقی استواری کے لئے قطعی سم قاتل ہے۔

آپ نے ضرور سوچ لیا ہوگا کہ اس Debating society کے پہلے اصول کو کہ انسانی حالات پر بحث کرتے ہوئے ہمیشہ اعلیٰ ترین پہلو کو مدنظر رکھا جائے فراموش نہیں کیا گیا۔ ہماری اس زندگی میں کیا چیزیں اچھی ہیں؟ باغ، قلعے۔ پلیں۔ جہاز، ریلیں، سڑکیں، عجائب خانے، تجارت و زراعت کے کرشمے، نظامِ حکومت کے دفاتر اور ڈاک خانے اور اُن سب کو قائم و دائم رکھنے کے لئے ۔Romance کی جماعت ناکارہ ہے۔ جو شخص کسی اور کو کہہ سکتا ہے کہ تمہارے بغیر زندگی عبث ہے اور یہ کہے بغیر اس زمانے میں Romance کا دعوےٰ فضول ہے وہ اس قابل نہیں کہ کوئی ذمہ داری کا کام اس کے سپرد کیا جائے۔ Romance گویا ایک قسم کی اخلاقی موت ہے اور ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہمارے بس میں ہو اس مہلک وبا کو دبائے رکھیں۔ زندگی کا جو حصہ محبت اور عبادت میں برباد ہوتا ہے اسے اگر مفید کاموں میں صرف کیا جائے تو یہ دنیا کہیں سے کہیں پہنچ جائے

مسز شان۔ مجھے مس ایمائی کی تعزیر مطلقاً سمجھ نہیں آئی۔ ہماری سوسائٹی کا یہ بھی قاعدہ ہے کہ صرف

ان مضامین پر بحث ہو جو ہندوستان کے حسب حال ہوں۔ جہاں تک میری معلومات ہیں ہندوستان میں بچے خدا کے حکم
سے پیدا ہوتے ہیں اور بحث کو اُن کی پیدائش سے مطلقاً سروکار نہیں دوسرا امر جو قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ اگر عبادت
واقعی لچر اور پوچ ہے اور یہ امر مسلمہ ہے کہ ہندوستان میں عبادت کا وجود نہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہر بات میں ہمارا
ملک پیچھے ہے؟ ہمیں تو اگر سب سے آگے نہیں تو برابر تو ہونا چاہئے تھا۔ یورپ میں عبادت نہیں عبادت ہے یہاں
عبادت نہیں عبادت ہے گویا ایک بات میں ہم ذلیل ہیں ایک بات ہیں وہ پھر زندگی میں اس قدر فرق کیوں ہے

مہاتما جی۔ (بزبانِ صریر) محبت کے مضمون کو سمجھنے کے لئے انسان کو گیتا کے سمندر کا غواص ہونا چاہئے
کرشن جی مہاراج نے اپنی روحانی تعلیم سے محبت کو وہ شاندار مرتبہ دیا ہے کہ یورپ کے ماہرین بھی دنگ ہیں۔ جب تک
انسان گیتا کے معارف سے فیض یاب نہ ہو وہ خیال ہی نہیں کرسکتا کہ کن حالات میں خود اپنی بیوی سے ترکِ محبت بھی
عین عشق ہے۔ مس ایمائی اظہارِ محبت سے متنفر ہیں مگر انہیں کیا پتہ کہ بعض دفعہ عدمِ اظہار ہی بہترین اظہار ہے۔

**نواب صاحب** (بزبانِ مسٹر عقیدت) اگر مس ایمائی مرد ہوتیں اور اگر انہوں نے کسی مشہور گویا طوائف
گا نا سنا ہوتا تو یہ شبہ کرنے کی گنجائش ہو سکتی تھی کہ انہیں اس مضمون سے کچھ مس ہے۔ میری رائے میں انہیں اتنا بھی
پتہ نہیں کہ محبت میں اور فلسفہ محبت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ ان کی تقریر فلسفۂ محبت پر شاید کچھ روشنی ڈال سکے
محبت پر ہرگز نہیں۔

**مولانا صاحب** (بزبانِ مس ایمائی) عقایدِ اسلامی میں منکوحہ مرد و عورت کے مابین انصاف شرط ہے محبت
مذکور نہیں۔ باقی رہا اظہارِ محبت کا مضمون کسی امر کا بھی اظہار ہو وہ اچھے طریقے سے بھی ہو سکتا ہے اور بُرے طریقے سے بھی
اس نقطۂ خیال سے مس ایمائی کی تقریر چنداں معنی خیز نہیں۔ کثرتِ ازدواج کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بیویاں ایک دوسرے سے
طریقے والا اظہارِ محبت اخذ کریں۔

**پنڈت جی** (بزبانِ صریر) ہمارے متبرک شاستروں کی تعلیم سے اگر مس ایمائی کو کچھ واقفیت ہوتی تو اُن کی رائے میں
کچھ نہ کچھ تغیر ضرور ہوتا۔ سومبر کی رسم دنیا میں لاثانی ہے لفظی اظہار کی بجائے اظہارِ محبت بذریعہ انتخاب ہوتا ہے گویا مس
ایمائی کا اعتراض ہندو اضعان رسوم نے ہزار ہا سال سے پہلے ہی رفع کر دیا ہے۔

لالہ جی (بزبانِ مسز شان) مجھے مس ایمائی سے پورا اتفاق ہے محبت سے فضول خرچی کی عادت زیادہ ہوتی
اس لئے ہندو سوسائٹی نے شروع سے ہی یہ تخصیصی انتظام کر دیا ہے کہ سنِ شعور سے پہلے ہی دو چار بچے ہو جائیں جس
محبت پر مس ایمائی کو بجا اعتراض ہے اُس کا موقع ہی پیدا نہیں ہوتا۔

**شیخ صاحب** (بزبانِ مِس ایمائی) اگر مس ایمائی کی رائے کو تسلیم کیا جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ تمام اردو فارسی شاعری غلط ہے اور شیخ سعدی علیہ الرحمۃ کا کلام اور حافظ شیرازی کا دیوان گویا فضول ہیں۔ میری رائے میں عوام الناس میں اس قسم کی بدعت کا تذکرہ سخت خطرناک ہے۔

**صریر**۔ حسبِ عادت ہمارے شاندار لیڈروں نے نفسِ مضمون پر تو غور نہیں فرمایا اور ادھر اُدھر کی باتیں بنا دیں۔ سوال جو مس ایمائی نے اپنی نہایت دلپذیر تقریر میں پیدا کیا ہے صرف یہ ہے کہ کیا محبت، خودداری کے منافی ہے اور کیا اگر خودداری اولیٰ ترین انسانی فرض ہے تو اظہارِ محبت معیوب نہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ خودداری کے بغیر زندگی ناممکن ہے۔ میری یہ بھی رائے ہے کہ در اصل کسی اور سے محبت جتانا محض اپنے آپ سے زیادہ محبت کرنے کا ایک ذریعہ ہے اور اس لئے اگر لوگوں میں سچ بولنے کی عادت ہو تو عاشق کو معشوقہ کو مخاطب کرکے یہ کہنا چاہیئے کہ تمہیں دیکھ کر میری خود اپنے آپ سے محبت بڑھتی ہے۔ غالباً مس ایمائی کو اس طریقِ اظہارِ محبت پر چنداں اعتراض نہ ہوگا۔

**مس ایمائی**۔ چونکہ مسٹر عقیدت اس مضمون پر بحث کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں جواب میں صرف چند لفظ کہنا چاہتی ہوں۔ محبت چاہے انتخاب سے ظاہر کی جائے اور چاہے نفیِ اظہار سے اور چاہے مزید خود پسندی کی شان سے ہر حال میں تضیعِ اوقات ہے۔ زندگی نہ محبت کرنے کے لئے ہے نہ خودداری کے نشہ میں غرق رہنے کے لئے۔ خودداری ایک مفید مشین ہے مگر محض مشین۔ ایک قسم کی موٹر کار جس میں سوار ہو کر انسان خوشی خوشی کام کو جلدی سے جا سکے۔ جو لوگ عبادت یا محبت یا خودداری کو زندگی جانتے ہیں وہ اس انسان کی طرح ہیں جو اپنی موٹر کار کے گن گاتا رہے مگر اس میں سوار کبھی نہ ہو۔ قابلِ قدر زندگی صرف وہی ہے جو اپنے آپ سے آزاد ہو کر کسی ساخت میں مصروف ہو۔ اظہارِ محبت چونکہ ہر قسم کی ساخت میں حارج ہے اسی لئے معیوب ہے۔

**بدیعی**۔ آپ کے صدر ہونے کی حیثیت سے میرا فرض ہے کہ ہر ایک مقرر کا شکریہ ادا کروں مگر مشکل یہ آ پڑی ہے کہ میرا رونگٹا رونگٹا کارروائی کے اس حصہ کے برخلاف ہے کہ دو نکیوں کی طرف سے مسٹر صریر نے تقریر کر دی ایک کی طرف سے مسٹر عقیدت نے۔ دو کی طرف سے مس ایمائی نے۔ لاحول ولا قوۃ آپ کو کوئی حق نہیں کہ اکابرینِ قوم کا اس طرح مذاق اڑائیں۔ اگر کسی کو ان سے اختلاف ہے تو میدان میں کھلم کھلا اُن کا مقابلہ کیا جائے نہ یہ کہ گھر میں ایک فرضی ناٹک قائم کرکے تالیاں پیٹ لیں اور دل ہی دل میں خوش ہو گئے کہ ہمارے لیڈر ڈبل دقیانوسی ہیں۔ اس قسم کی کارروائی کو ہمیشہ کے لئے بند کرنا چاہیئے۔

ایک اور امر قابلِ ذکر ہے اور وہ یہ کہ محبت یا اظہارِ محبت کا ذاتی تجربہ سے کسی نے ذکر نہ کیا۔ تمام بحث فضول قسم کی

کتابی بحث تھی۔ چونکہ سچ بولنے کی ممانعت نہیں مجھے یہ کہنے کی جرات ہے کہ اصلی اور نقلی بیسیوں قسم کی محبت کی شاہراہیں طے کرچکا ہوں اور میرا تجربہ یہ ہے کہ جتنی مختلف قسم کی محبت کسی نے کی ہو اسی قدر وہ ساخت کے کاموں میں زیادہ مفید ہوتا ہے اور اس کی محبت قابلِ قدر ہوتی ہے۔ بغیر مشق کے گھاس چھیلنی تو آتی نہیں محبت کرنا کیسے آئے۔ فنونِ لطیفہ میں یہ بھی ایک فن ہے اور کوئی کوئی اس میں ماہر ہوسکتا ہے۔ اور فنون کی طرح اس کے لئے بھی بے انتہا محنت کوشش اور علم کی ضرورت ہے تب جاکر کہیں محبت کرنے کا اور محبت کروانے کا اصلی لطف حاصل ہوتا ہے۔ مس ایمائی نے بہت زور مارا تو باغ کے خوبصورت کونے میں لڑکے اور لڑکی کو بالمقابل کرکے چند سہی الفاظ اُن سے ادا کروا دیئے۔ انہیں اتنا بھی پتہ نہیں کہ ناتجربہ کار ایسے سینکڑوں موقعے ضائع کرکے تب کہیں لڑکھڑاتی زبان سے دو چار جملے بکنے ہیں اور پھر خود بخود ہی شرما جاتے ہیں۔ اس قسم کے الھڑپن کے اظہارِ محبت کو اصلی محبت سے وہی نسبت ہے جو بیل گاڑی کو موٹر کار سے ہے۔ میں اپنا قیمتی وقت اس مضمون پر زیادہ صرف کرنا پسند نہیں کرتا اور یہ کہہ کر ختم کرتا ہوں کہ اس قسم کی نکتہ چین تقریر سے میرا مدعا دل آزاری نہیں۔ محبت کی گھاتوں میں سے یہ بھی ایک گھات ہے۔ (جلسہ برخاست ہوتا ہے)

# تیسرا پردہ

(مصر کا گول کمرہ۔ وقت دس بجے رات کھانے کے بعد مصر آدھے گھنٹے کے لئے ضروری کام کو جاتا ہے، صرف مس ایمائی اور بدیعی بالمقابل کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ بدیعی کے ہاتھ میں سبز شراب کا گلاس ہے)

**بدیعی** (گلاس کو روشنی کے بالمقابل کرکے) آپ کے خوبصورت Emerald کا ہمزاد ہے۔

**ایمائی** ۔ کیا آپ کو شراب سے محبت ہے؟

**بدیعی** ۔ بے حد۔

**ایمائی** ۔ پھر آپ پیتے کیوں نہیں؟

**بدیعی** ۔ جس چیز سے محبت ہو اُسے آدمی نگلتا نہیں؟

**ایمائی** ۔ مجھے تو شراب سے عداوت ہے۔

**بدیعی** ۔ پھر تو جہاں ملے نہ چھوڑیئے۔

**ایمائی** ۔ ایسے اُلٹے فلسفے آپ ہی کو مبارک ہوں۔

بدیعی (گلاس رکھ کر نہایت ادب سے) صریر ہم دونوں کی شادی کی فکر میں ہے۔
ایمائی۔ مجھے بھی کچھ شبہ ہوا تھا۔ بچارا صریر۔
بدیعی۔ بچارا کیوں؟
ایمائی۔ آپ تو اُن کے دوست ہیں آپ کو سب پتہ ہوگا۔
بدیعی۔ واللہ باللہ کچھ مجھے علم نہیں۔ چھ سال ہوئے لنڈن میں ہم ایک دوسرے سے جدا ہوئے۔ اس کے بعد خط ضرور آتے رہے مگر کہاں حضور کا یہ حیدر آباد دکن کہاں مجھ غریب کا لاہور۔ صریر میرا ہیرو تھا اور ہے مگر نہ مل سکا پر نہ مل سکا۔ دو روز ہوئے کہ یک لخت دل میں ولولہ سا اُٹھا کہ اگر فوراً صریر کو نہ دیکھا تو چین حرام ہے ہمیں ایک دوسرے کی بابت سب کچھ علم ہے مگر نہ اُسے پتہ ہے کہ میں کیوں شادی نہیں کرتا نہ مجھے پتہ ہے کہ وہ کیوں اب تک آزاد ہے۔ اگر آپ کو علم ہو تو ضرور مجھے باخبر کیجیے۔
ایمائی۔ شکر ہے کہ ایک بات تو ہم دونوں کی مشترکہ ہے۔
بدیعی۔ کیا؟
ایمائی۔ یہ کہ صریر میرا بھی ہیرو ہے۔
بدیعی۔ خوش قسمت صریر۔
ایمائی۔ بچارا صریر۔
بدیعی۔ آخر کیوں؟
ایمائی۔ سنئے۔ صریر کو میری آپا سعیدہ سے اور آپا کو اُن سے بے انتہا محبت ہے، اُس سے بھی زیادہ جو اچھے سے اچھے افسانے میں مل سکے مگر اُن کی شادی نہیں ہوسکتی۔
بدیعی۔ کیوں؟
ایمائی۔ اس لئے کہ اُن دونوں نے ایک ہی انّا کا دودھ پی لیا تھا گو وہ ان سے تین سال چھوٹی ہیں۔
بدیعی۔ کیا اس کے یہ معنی ہیں کہ صریر کی اگر ایک خوشی پوری نہیں ہوسکتی تو دوسری بھی نہ ہو۔
ایمائی۔ یہ آپ صریر سے ہی پوچھئے۔ ہندوستان میں ابھی وقت نہیں آیا کہ لڑکیاں اپنی نسبت خود کریں اور کیا صریر سے آپ کو اس قدر محبت ہے کہ ان کا ذکر بیچ میں چھوڑ اپنا قصّہ شروع۔
بدیعی۔ اگر میں صریر کی جگہ ہوتا تو فوراً کسی اور ملک میں جا کر نکاح کر لیتا۔

ایمائی۔ یہی تو آپ میں اور اُن میں فرق ہے۔ وہ اوروں کا خیال کرتے ہیں آپ صرف اپنا۔

بدیعی۔ میں ایسا برا نہیں۔ میرا مذہب بغاوت ہے اور اپنی پیاری کی خوشی کے لئے ہر وقت ہر قسم کا جرم کرنے کو تیار ہوں۔ عاشق کو معشوقہ کی خوشی کے مقابلے میں دنیا اور خدا کسی کی بھی پرواہ نہیں ہونی چاہیئے مگر آپ عشق کو کیا سمجھیں۔

ایمائی (ممکنات کے تصور سے اُس کا چہرہ تمتمانے لگتا ہے) یہ آپ کی محض کہنے کی باتیں ہیں یا واقعی؟

بدیعی۔ پہلے اپنا نام بتاؤ؟

ایمائی۔ (غائبانہ طریقے سے) حمیدہ

بدیعی۔ حمیدہ! تمہارا اکھڑ پنجابی جو کچھ کہہ رہا تھا دل سے کہہ رہا تھا اور تمہارے لئے کہہ رہا تھا مگر تم تو اظہارِ محبت کو ذلیل خیال کرتی ہو۔

حمیدہ۔ وہ تو محض میرا جھوٹ تھا۔ صرف اس لئے کہ کسی طرح صریؔ آپا کا خیال چھوڑ دے۔ صرف ان دونوں کی خاطر محبت کو برا کہتی تھی ورنہ مجھ غریب کا محبت نے کیا نقصان کیا ہے کہ میں اسے مٹاؤں۔

بدیعی۔ میں نے بھی اپنی تقریر میں جو یہ کہا کہ عشق کے پختہ کاروں میں سے ہوں وہ جھوٹ تھا آؤ اب موٹر کی سیر کو چلیں۔

(صریؔ اور سعیدہ کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ صریؔ بدیعی سے آنکھیں ملا کر مسکراتا ہے۔ سعیدہ بدیعی کو نہیں دیکھتی اور بھاگ کر حمیدہ سے لپٹ کر کہتی ہے)

سعیدہ۔ حمو! حمو! سنو تو۔ وہ انّا والی بات غلط نکلی۔ صریؔ کی اور میری انّا ایک نہ تھی بلکہ دو توام بہنیں تھیں۔ یہ بات آج شام کو قطعی طور پر ثابت ہوگئی۔ ہماری نسبت بھی ہوگئی۔ حمو تمہیں کیا ہوا! تم تو کچھ خوش نظر نہیں آتی ہو۔

حمیدہ۔ آپا بے انتہا خوش ہوں صرف اس بچارے پنجابی پر رحم آتا ہے؟ (اس وقت بدیعی کا تعارف سعیدہ سے ہوتا ہے)

سعیدہ۔ معاف کیجئے آپ کو دیکھا نہ تھا۔

بدیعی۔ معاف کیجئے اس وقت تو معاف کرنے کی فرصت نہیں۔ حمیدہ اور میں موٹر میں سیر کو جا رہے ہیں لیکن اگر آپ کا دل چاہے تو ہمیں مبارکباد دے دیجئے ہماری بھی منگنی ہوگئی ہے۔

سعیدہ۔ سچ مچ۔

بدیعی۔ بھابھی اور آپا اور یہ سرد مہری (لپک کر سعیدہ کو خوب بھینچ کر گلے لگاتا ہے)۔ اب آیا یقین!

سعیدہ۔ صریؔ کہتے تھے کہ لندن میں تمہارا نام طوفان تھا، تم اب بھی وہی ہو۔

(فلک پیما)

# بُت خانہ

## (ایک اہلِ نظر کی نگاہ میں)

بُت خانہ راز کیا ہے؟ —— اک جلوہ زارِ فطرت
جلوے دکھا رہا ہے —— کثرت میں حسنِ وحدت
اہلِ نظر کہاں ہیں؟ —— آئیں اور اس کو دیکھیں
ہر بُت ہے ایک پرتو —— اُس مہرِ لم یزل کا
آنکھوں سے جو نہاں ہے —— لیکن ہے جلوہ فرما
بُت خانۂ جہاں میں —— جلوہ گہِ بُتاں میں

---

یا یُوں سمجھیے اُس کو —— ہر ایک بت سراپا
ہے پیکرِ خیالی —— صورت گرِ جہاں کا
اہلِ نظر نے جیسا —— جس شکل میں ہے دیکھا
ویسی ہی اُس کی صورت —— ہر ایک نے بنائی
جو کم نظر ہیں اُن کو —— تمثیل اک دکھائی
تا حسنِ معنوی کا —— سب کر سکیں نظارا

---

مانے نہ مانے کوئی —— لیکن یہ واقعہ ہے
کہتا ہوں بات دل کی —— میرا مشاہدہ ہے
وہ آذرِ حقیقی —— بُت خانہ سازِ ہستی
ہر بُت میں جلوہ گر ہے —— خود اس طرح سراپا
فانُوس میں ہو جیسے —— اِک شمع جلوہ آرا
بُت خانہ بھی ہے گویا —— اک عکسِ بزمِ معنیٰ

ابُو الفضل راز چاندپوری

# نارنگی کے بیج

تمام دن بارش ہوتی رہی۔ شام سے طوفان اور بھی زیادہ ہوگیا۔ شرلک ہومز تو انگیٹھی کے کنارے بیٹھا خیالات میں مستغرق تھا اور میں کلارک رسل کا ایک پرلطف ناول پڑھ رہا تھا۔

میں نے پوچھا "کیوں ابھی گھنٹی ہی بجی تھی نا؟ شاید تمہارا کوئی دوست ہوگا۔"

اُس نے جواب دیا "نہیں تو، میرا کوئی بھی دوست نہیں"

"تو پھر کوئی موکل ہوگا"

"اگر ایسا ہوا تو معاملہ بھی ذرا گہرا ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ مالک مکان کا کوئی ملاقاتی ہے۔"

شرلک ہومز غلطی پر تھا۔ کیونکہ چند ہی لمحوں کے بعد کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

اُس نے کہا "تشریف لائیے"

کوئی بائیس برس کا ایک نوجوان داخل ہوا۔ لیمپ کی روشنی میں وہ نہایت متفکر اور زرد نظر آتا تھا۔ ہومز نے پوچھا

"آپ غالباً جنوب و مغرب سے آرہے ہیں۔"

"جی ہاں، ہورشام سے۔"

"آپ کے جوتوں کی مٹی سے صاف عیاں ہے"

"مجھے مشورہ درکار ہے"

"وہ تو نہایت آسانی سے مل جائے گا"

"اور مدد"

"یہ ہمیشہ آسان نہیں ہوتی"

"مسٹر شرلک ہومز میں نے آپ کی بابت میجر پرینڈر گاسٹ سے سنا ہے کہ آپ نے کس طرح اُسے ٹنکارویل کلب سے نجات دلائی تھی"

"ہاں، اُسے تاش میں دھوکا دیا گیا تھا"

"وہ کہتا تھا کہ آپ ہر ایک مشکل حل کر سکتے ہیں۔"

"اوہ، یہ تو سراسر مبالغہ ہے۔"

"ہمیشہ مظفر رہتے ہیں۔"

"بالکل غلط، میں نے چار دفعہ زک اٹھائی، اس میں بھی ایک دفعہ ایک عورت کے ہاتھ سے"

"مگر خیر آپ کی کامیابیوں کے مقابلہ میں وہ بے حقیقت ہیں۔ اچھا آمدم بر سر مطلب ......"

"اپنی کرسی ذرا آگ کے نزدیک کر لیجئے اور پوری تفصیل سے بیان کیجئے"

اجنبی نے اپنی کرسی آگ کے قریب کھینچ لی اور کہا "میرا نام جان اوپن شاہ ہے۔ چونکہ یہ ایک وراثت کا معاملہ ہے اس لئے مجھے گذشتہ واقعات بھی بیان کرنے چاہئیں۔

"میرے دادا کے دو لڑکے تھے جوزف اور الیاس۔ جوزف یعنی میرے باپ نے ایک بائیسکل کا کارخانہ کھولا اور اُس کو ترقی دینا شروع کی۔

"چچا الیاس جوانی ہی میں امریکا چلا گیا اور وہاں اُس نے فلوریڈا میں ذریعۂ معاش پیدا کر لیا۔ لڑائی کے زمانہ میں اُس نے جیکسن کی فوج میں شامل ہو کر بہت کارہائے نمایاں انجام دیئے اور تھوڑے ہی عرصہ میں کرنل ہو گیا جب لی (Lee) نے ہتھیار رکھ دیئے تو پھر فلوریڈا واپس چلا گیا اور اپنے پیشے میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ۱۸۶۹ء میں انگلینڈ آیا اور سسیکس میں ایک چھوٹی سی زمینداری خرید لی۔ امریکا کو چھوڑنے کی وجہ محض جمہوری سلطنت کی بدنظمی بتاتا تھا۔ وہ حد درجہ تنہائی پسند تھا چنانچہ جب تک زندہ رہا شاید ہی کبھی مکان سے باہر گیا ہو۔ شراب کثرت سے پیتا تھا، اور دوستوں سے حتیٰ کہ اپنے بھائی سے بھی دور دور رہتا تھا۔

جب میں بارہ تیرہ برس کا تھا تو وہ مجھ سے بھی نہیں ملا کرتا تھا لیکن چند سال کے بعد ۱۸۷۸ء میں اُس نے میرے باپ سے درخواست کر کے مجھے مانگ لیا۔ میں اُس کے ساتھ رہنے لگا۔ وہ مجھ پر نہایت مہربان تھا۔ یہاں تک کہ سولہ برس کی عمر میں میں گھر کے کل سیاہ و سفید کا مالک ہو گیا۔ میرے پاس ہر جگہ کی کنجیاں رہتی تھیں۔ سوائے ایک چھوٹے سے کمرے کے میں جہاں چاہتا تھا جا سکتا تھا۔ اس میں کسی کو بھی جانے کی اجازت نہ تھی۔ مجھ کو اکثر راز جوئی کے خیال نے گدگدایا اور میں نے درزوں میں سے اندر دیکھنے کی کوشش بھی کی لیکن سوائے چند بوسیدہ صندوقوں اور کرم خوردہ بقچوں کے کچھ نظر نہ آیا۔

ایک روز صبح ایک لفافہ موصول ہوا۔ اس پر خارجی ملک کی مہر تھی۔ ہمارے یہاں خط کا آنا معمولی بات نہ تھی۔ کیونکہ میرے چچا کا کوئی دوست ہی نہ تھا اُس نے کہا "ہندوستان سے آیا ہے، پانڈیچری کی مہر! اس کا کیا مطلب ہے!" کھولنے پر اس میں سے نارنگی کے پانچ سوکھے ہوئے بیج نکل کر میز پر پھیل گئے۔ میں اس پر ہنسا لیکن میری ہنسی اُس کے چہرے کے نظارہ سے رُک گئی۔ وہ بالکل زرد پڑ گیا تھا اور اُس کے ہاتھ میں لفافہ کانپ رہا تھا۔ وہ زور سے چلایا "ک، ک، ک، میرے اللہ! میرے اللہ! اب مجھے اپنی خطاؤں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ میں نے پوچھا "یہ کیا ہے؟" کہا "موت" اور اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے لفافہ اُٹھایا اس کے اندر تین مرتبہ "ک" لکھا ہوا تھا۔ لفافہ رکھ کر میں زینہ کی طرف چلا وہ اتر رہا تھا۔ ایک ہاتھ میں ایک

زنگ آلود کنجی تھی اور دوسرے میں ٹین کی ایک صندوقچی اُس نے قسم کھا کر کہا وہ جو چاہیں کریں مگر شکست میں پھر بھی انہیں کو دوں گا۔ میری بہن سے کہو کہ میرے کمرے میں آگ جلائے اور وکیل کو بلواؤ۔

جب وکیل آیا تو مجھے بھی کمرے میں ٹھیرنے کے لئے کہا گیا۔ آگ جل رہی تھی اور جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ اِدھر اُدھر بکھر رہی تھی۔ ٹین کی خالی صندوقچی ایک طرف رکھی تھی۔ میرے تعجب کی کوئی انتہا نہ رہی، اس لئے کہ میں نے اُس پر بھی خوفناک 'ک' بنا ہوا دیکھا۔ اُس نے کہا 'جان' میں چاہتا ہوں کہ میری وصیت پر تم شہادت ثبت کرو۔ میں اپنی تمام جائداد مع فوائد و نقصانات کے اپنے بھائی کو دیتا ہوں۔ اس کے بعد یقیناً تم مالک بنو گے۔ اگر تم آسانی کے ساتھ اس سے فائدہ حاصل کر سکو تو اچھا ہے لیکن اگر اس کے خلاف ہو تو میری نصیحت ماننا اور اُسے اپنے جانی دشمن کے لئے چھوڑ دینا۔ اب مہربانی کر کے دستخط کر دو۔

میں نے وصیت نامہ پر دستخط کئے اور وکیل اُسے اپنے ساتھ لے گیا۔ ابتدا میں تو مجھے اس واقعہ سے بہت بے چینی رہی لیکن رفتہ رفتہ میری حالت درست ہونے لگی۔ میرے چچا کی زندگی میں زبردست انقلاب واقع ہوا۔ وہ معمول سے زیادہ شراب پیتا اور اپنا سارا وقت کمرے میں بند رہ کر گذار دیتا۔ لیکن کبھی کبھی ایک مدہوش شرابی کی طرح باغ کے اطراف میں پستول لئے گھومتا پھرتا اور کہتا جاتا کہ میں کسی سے نہیں ڈرتا اور ایک کتے کی موت کبھی نہیں مر سکتا۔ جب یہ جوش کسی قدر کم ہوتا تو اپنے کمرے میں دوڑ جاتا اور اندر سے بند کر لیتا۔ ایک رات اُس نے معمول سے زیادہ شراب پی اور پھر کبھی ہوش میں نہ آیا جب ہم نے اُس کی تلاش کی تو وہ ایک چھوٹے سے گڑھے کے اندر جس میں سڑا پانی جمع ہو رہا تھا اوندھے منہ پڑا تھا۔ وہاں لڑائی جھگڑے کے بھی کوئی آثار نہ تھے۔ جیوری نے اُسے خودکشی قرار دیا لیکن میں جانتا تھا کہ یہ خودکشی نہیں کوئی اور بات ہے۔

خیر معاملہ رفت گذشت ہو گیا اور میرے باپ کو اس کی جائداد اور تقریباً چودہ ہزار پونڈ نقد ملے۔

ہومز نے قطع کلام کر کے کہا "ذرا ٹھیریئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کا معاملہ نہایت گہرا ہے۔ کیا آپ کو لفافہ موصول ہونے کی اور آپ کے چچا کی فرضی خودکشی کی تاریخ یاد ہے؟"

"لفافہ ۱۰ مارچ ۱۸۸۳ء کو موصول ہوا اور اُس کی موت سات ہفتے بعد ۲ مئی کو ہوئی"

"شکریہ، آگے بیان کیجئے"

"میری درخواست پر اُس نے کرنل کی خلوت گاہ کا امتحان لیا۔ وہی ٹین کی صندوقچی میز پر رکھی تھی۔ اور اس کے اندر ایک چٹ چسپی ہوئی تھی جس پر تین مرتبہ 'ک' اور اُس کے نیچے یہ الفاظ "خطوط، روزنامچہ، رسیدیں اور ایک رجسٹر" درج تھے اس سے ہم سمجھے کہ جو کاغذات کرنل نے جلاتے تھے، یہاں انہیں کی طرف اشارہ ہے اور کوئی قابل ذکر شے نہ تھی۔ کچھ رجسٹر البتہ تھے جن میں اُس کے جنگ کے زمانے کے حالات لکھے ہوئے تھے ۱۸۵۰ء تک ہم نے نہایت اطمینان کے ساتھ

بسر کی نئے سال کے چوتھے دن ہم صبح کے وقت چائے پی رہے تھے کہ میرے باپ کے منہ سے خوف آمیز تعجب کے ساتھ ایک ہلکی سی چیخ نکلی اُس کے ایک ہاتھ میں لفافہ اور دوسرے میں وہی منحوس نارنگی کے پانچ خشک بیج تھے۔

قبل ازیں کرنل کے واقعات کی اہمیت اُس کے نزدیک ایک لغو کہانی سے زیادہ نہ تھی لیکن اس وقت وہ نہایت پریشان ہُوا۔ اُس نے پوچھا "جان، اس سے کیا مراد ہے؟ وہ غالباً ک، ک، ک ہے" اُس نے لفافہ کے اندر دیکھا اور چلایا۔ "ہاں وہی ہے مگر اس کا مطلب؟" میں نے اُس کے کاندھے پر سے جھک کر پڑھا "کاغذات کو دھوپ گھڑی پر رکھ دو"۔ اُس نے پوچھا "کون سے کاغذات؟ کون سی دھوپ گھڑی؟" میں نے جواب دیا "کاغذات تو یقیناً وہی ہونگے جو جلا دیئے گئے، دھوپ گھڑی باغ میں ہے"، وہ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہنے لگا "ہم ایک مہذب شہر میں رہتے ہیں۔ ہمیں اس قسم کی حماقت زیبا نہیں ——— یہ آیا کہاں سے ہے؟" میں نے کہا "ڈنڈی سے"۔

"اچھا خاصا مذاق ہے بھلا مجھے دھوپ گھڑی اور کاغذات سے کیا سروکار؟"

"میں پولیس میں رپورٹ کروں گا"۔

"اور لوگ مجھ پر ہنسیں گے۔ نہیں، کوئی بات اس قسم کی نہیں ہونا چاہیئے"۔

"تو پھر اس کے مطابق کرنے دیجئے"۔

"نہیں میں اجازت نہیں دیتا"، ——— وہ ایک خود رائے شخص تھا۔ اس لئے میں زیادہ بحث لاحاصل سمجھ کر وہاں سے ٹل گیا۔ لفافہ موصول ہونے کے تیسرے دن وہ اپنے پرانے دوست میجر فری بڈی کی ملاقات کے لئے گیا جو نزدیک ہی ایک قلعہ کا افسر ہے۔ دوسرے دن مجھے تار ملا کہ تمہارا باپ ایک گڑھے میں گر پڑا ہے اور اُس وقت سے برابر بیہوش ہے، جب میں وہاں پہنچا تو وہ مر چکا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ چاندنی رات میں فیرام سے لوٹ رہا تھا کہ لاعلمی سے کسی گڑھے میں گر گیا۔ گڑھے اُس قلعہ کے حواشی میں بے انتہا ہیں جیوری نے بغیر تامل کے فیصلہ کر دیا کہ محض حادثہ ہے۔

"اب یہ منحوس جائداد میرے قبضے میں آئی آپ سوال کریں گے کہ میں اُس سے دستبردار کیوں نہ ہو گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میری دانست میں کوئی واقعہ کرنل کی زندگی میں ایسا پیش آیا ہے جس کی رو سے میں کہیں بھی رہوں خطرہ میرے سامنے رہے گا۔ جنوری ۸۵ء میں میرے غریب باپ کا خاتمہ ہُوا۔ اُس وقت سے اب تک میں نے نہایت اطمینان سے زندگی بسر کی لیکن کل صبح وہ بلا پھر نازل ہوئی"۔

یہ کہہ کر اُس نے ایک لفافہ نکالا۔ اس پر مشرقی لندن کی مہر تھی۔ کھولا، تو اس میں سے نارنگی کے پانچ سوکھے ہوئے بیج نکلے۔ اُس کے اندر وہی خوفناک لفظ "ک، ک، ک" اور "کاغذات کو دھوپ گھڑی پر رکھ دو" درج تھے۔

ہومز نے دریافت کیا "تم نے اب تک کیا کیا ہے؟"

اُس نے جواب دیا "کچھ نہیں"

ہومز نے تعجب سے پوچھا "کچھ نہیں؟"

"اگر سچ پوچھئے تو میں خود کو بالکل بے یارومددگار سمجھتا ہوں۔ مجھے معلوم ہوتا ہے کہ میں کسی بلائے بے درماں کی گرفت میں ہوں"

"ہش میاں تم کو خطرہ کا بہادری سے مقابلہ کرنا چاہئے۔ ورنہ اپنا خاتمہ سمجھو۔ یاس کے لئے وقت نہیں ہے۔ ― تم فوراً میرے پاس کیوں نہیں آئے؟"

"مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔ آج ہی تو میجر نے بتایا ہے کہ آپکے پاس جانا چاہئے"

"دو دن ہو چکے ہیں۔ کارروائی اس سے پہلے شروع ہونی چاہئے تھی ―――― اور تو تمہیں کچھ معلوم نہ ہوگا؟"

"ایک چیز اور ہے" یہ کہکر اُس نے ایک کاغذ میز پر پھیلا دیا۔ اور کہا "یہ انہیں آتشزدہ کاغذات میں سے ایک ہے" یہ کسی ڈائری کا ورق معلوم ہوتا تھا اور حسبِ ذیل الفاظ اُس میں درج تھے:۔

مارچ ۱۸۶۹ء

"چہارم ―――― ہڈسن آیا۔ وہی پرانا پلیٹ فارم۔

" ہفتم ―――― موکالے، پیرا مور اور جان سوئین کے پاس بیج بھیجے گئے۔

" نہم ―――― موکالے ―――― مطلع صاف

" دہم ―――― جان سوئین ―――― مطلع صاف

" دوازدہم ―――― پیرامور ―――― ٹھیک

ہومز نے کہا "اچھا اب ہمیں ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کرنا چاہئے۔ گھر جاؤ اور فوراً کام شروع کردو"

"کیا کروں"

"پیتل کی صندوقچی میں یہ کاغذ اور ایک تحریر کہ کرنل نے سب کاغذات جلا دیئے فقط یہ باقی ہے، رکھ کر فوراً دھوپ گھڑی پر رکھ دو ―――― سمجھ گئے نا"

"اچھی طرح"

"انتقام کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کیونکہ ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ فی الحال تو ہمیں اس خطرے سے نجات پانا ہے"

"میں آپ کا نہایت احسانمند ہوں۔ آپ نے مجھ میں ایک نئی روح پھونک دی"

"وقت ضائع نہ کرو اور یہ بھی خیال رہے کہ تمہاری جان اب بھی محفوظ نہیں۔ نہ معلوم کب یہ برسر رسیدہ خطرہ وہا

بیٹھے ——— واپس کیوں کر جاؤ گے ؟"

"اسٹیشن واٹرلو سے، ٹرین پر"

"ابھی تو نہیں بجے۔ گلیوں میں آدمی بکثرت ہوں گے لیکن پھر بھی تمہاری حالت قابلِ اطمینان نہیں"

"میں مسلح ہوں"

"اچھی بات ہے، کل سے میں کام شروع کروں گا"

"تو میں ہور شام میں آپ کا انتظار کروں"

"نہیں تمہارے راز کا تو لندن سے تعلق ہے۔ یہیں سے شروع کروں گا"

"اچھا تو میں دو تین روز میں صندوقچی کی خبر لے کر آؤں گا" اُس نے ہم لوگوں سے مصافحہ کیا اور روانہ ہوگیا۔

ہوا زور سے چل رہی تھی۔ اور پانی کے دھارے کھڑکیوں پر پڑ رہے تھے معلوم ہوتا تھا کہ یہ عجیب و غریب قصہ انہی از خود رفتہ عناصر کے درمیان سے نکلا ہے۔

شرلک ہومز حسبِ عادت سر جھکائے، آگ کے نزدیک خیالات میں مستغرق، بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُس نے پائپ جلایا اور دھوئیں کے چکر دیکھنے لگا۔ پھر کہا "واٹسن، میں دیکھتا ہوں کہ جتنے بھی عقدے میں نے حل کئے ہیں یہ اُن سب میں مشکل ہے"۔

میں نے جواب دیا "ہاں بہ استثنائے سائن آف فور کے"

"تاہم جان اوپن شا، شاٹس کی بہ نسبت زیادہ خطرے میں ہے"

"کیا ابھی تک تم نے ان خطرات کی نوعیت کے بارے میں کوئی رائے قائم نہیں کی"

"ان کی نوعیت کے متعلق تو کوئی سوال ہو ہی نہیں سکتا"

"تب یہ ک۔ک۔ک۔ کون ہے اور اس بدقسمت خاندان کے پیچھے کیوں پڑا ہے"

ہومز نے آنکھیں بند کرلیں اور کہنیاں کرسی کے بازوؤں پر ٹیک کر بولا" استدلال کرنے والے کو اگر کسی معاملہ کی کوئی ایک بات بھی معلوم ہو جائے تو وہ اس سے کل واقعات مع اُن کے آیندہ نتائج کے دریافت کرسکتا ہے جس طرح کو ویر کسی حیوان کی ایک ہڈی دیکھ کر اُس کا تمام حال بیان کرسکتا تھا بعینہٖ ناظر کسی سلسلۂ واقعات کی محض ایک کڑی کو کامل طور پر سمجھ لے تو وہ کل سلسلہ ابتدا سے انتہا تک معلوم کرسکتا ہے۔ اس ہنر کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ استدلال کرنے والا معلومات سے اچھی طرح فائدہ حاصل کرے۔ میں نے تم سے پہلے بھی کہا تھا۔ اور اب پھر کہتا ہوں، کہ انسان کو چاہئے کہ محض مفید مطلب باتیں دل میں محفوظ رکھے۔ اب ایسے معاملے پر جیسا کہ آج رات کا ہے۔ کامل توجہ سے غور کرنا چاہئے۔ پہلے مہربانی کرکے امریکن انسائیکلو پیڈیا اٹھا دیجئے۔ اچھا اب سوال یہ ہے کہ کرنل اوپن شا نے

فلوریڈا کیوں چھوڑا؟ قیاس کہتا ہے کہ وجوہ بہت اہم ہیں۔ کیونکہ اُس کے ہمعصر انگلستان کی خشک زندگی کو فلوریڈا ایسے دلکش ملک کی سکونت پر کبھی ترجیح نہ دیتے اُس کی اتنی زیادہ خلوت پسندی بتاتی ہے کہ اُسے کسی چیز کا خوف تھا۔ اس لئے ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہی خوف اُس کے امریکہ سے بھاگنے کا باعث ہؤا وہ کس سے ڈرتا تھا؟ یہ ان منحوس خطوط کو دیکھنے سے معلوم ہو سکتا ہے ـــــــ تم نے ان خطوط کی مہروں پر غور کیا؟"

"ہاں، پہلا پانڈیچری سے، دوسرا ڈنڈی سے اور تیسرا لندن سے"

"مشرقی لندن سے ـــــ اس سے کیا نتیجہ نکلتا ہے"

"یہ تمام بندرگاہیں ہیں یعنی راقم کسی جہاز پر ہے"

"بالکل ٹھیک، اس میں شک کی گنجائش نہیں۔ اب ہمیں دوسری طرف رجوع کرنا چاہئے۔ پانڈیچری میں دھمکی اور انجام کار میں سات ہفتے کا تفاوت ہے لیکن ڈنڈی سے کل تین یا چار دن کا ـــــ اس سے کچھ سمجھ میں آتا ہے؟"

"پہلے اُن کو ایک لمبا سفر طے کرنا تھا"

"لفافہ کو بھی تو اتنا ہی سفر طے کرنا تھا"

"تب تو مجھے کوئی بات نظر نہیں آتی"

"کم از کم یہ تو ضرور قیاس میں آتا ہے کہ یہ آدمی کسی جہاز میں ہیں اور نشان بھیجنے کے ساتھ ہی روانہ ہو جاتے ہیں۔ دیکھو جب لفافہ ڈنڈی سے آیا تو بیچارے کا کتنی جلدی کام تمام ہو گیا۔ اگر وہ پانڈیچری سے کسی اسٹیمر میں آتے تو لفافہ کے ساتھ ہی یہاں پہنچتے لیکن سات ہفتے گذر گئے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ سات ہفتے ڈاک کے اور مسافروں کے جہاز کی رفتار کا فرق ہے"

"ممکن ہے"

"صرف ممکن نہیں بلکہ قرین حقیقت ہے۔ اب تم اس جدید وقوعہ کی خوفناک اہمیت معلوم کر سکتے ہو۔ اور سمجھ سکتے ہو کہ میں نے اوپن شا کو سخت احتیاط کی تاکید کیوں کی ہے۔ وقوعہ ہمیشہ اس وقت کے خاتمہ پر ہوتا ہے جو فرستندہ کو اتنا فاصلہ طے کرنے میں لگتا ہے لیکن چونکہ یہ لندن ہی سے آیا ہے اس لئے ہم مہلت کا تو خیال ہی نہیں لا سکتے"

"یا خدا! اس ظلم کا کیا مطلب ہے؟"

"یہ تو صاف ظاہر ہے۔ جو کاغذات کرنل اوپن شا لایا تھا۔ وہ اُن اشخاص کے لئے ایک غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔ یہ تو صریح ہے کہ یہ ایک سے زیادہ آدمیوں کا کام ہے۔ کیونکہ ایک شخص دو قتل اس صفائی سے کہ جیوری بھی دھوکا کھا جائے ہرگز نہیں کر سکتا۔ یہ لوگ نہایت چالاک اور ارادے کے پکے ہیں وہ محض اپنے کاغذات چاہتے ہیں۔ خواہ وہ کسی کے پاس ہوں۔ ک، ک، ک، کسی نام کے شروع کے حروف نہیں اور کسی انجمن کی علامت بھی معلوم ہوتے ہیں۔

"لیکن وہ کونسی انجمن ہے؟"

ہومز آگے کی طرف جھکا اور آواز کو دھیما کرتے ہوئے جواب دیا "کیا تم نے 'کوکلکس کلان' کی بابت کبھی نہیں سنا"

"کبھی نہیں"

ہومز نے انسائیکلو پیڈیا کھولی اور کہا "یہ ہے 'کوکلکس کلان' — بندوق کا گھوڑا چڑھانے سے جو آواز پیدا ہوتی ہے یہ نام اُس سے اخذ کیا گیا ہے۔ یہ ایک خوفناک پوشیدہ انجمن تھی۔ جس کے بانی فوج کے معزول سپاہی تھے۔ اُس نے بہت جلد ترقی کی اور اُس کی شاخیں ملک کے مختلف حصّوں میں پھیل گئیں۔ اس کی طاقت سیاسی معاملات میں صرف کی جاتی تھی۔ مخالفین یا تو قتل کر دیئے جاتے تھے یا جلا وطن۔ اس کی نشانی بلوط کی چند پتیاں یا خربوزے اور نارنگی کے بیج ہوتے تھے جو مجرم کو آگاہ کرنے کے لئے بھیجے جاتے تھے۔ اِن کے پابندہ کے لئے صرف دو صورتیں تھیں۔ یا تو اپنی روش کو چھوڑ کر توبہ کرے یا ملک سے بھاگ جائے۔ اگر وہ ہمت کے کام میں لاتا۔ اور ان میں سے کسی پر بھی عمل نہ کرتا تو اُس کا قتل ہونا یقینی تھا جو اکثر اوقات کسی عجیب و غریب طریقے سے عمل میں لایا جاتا۔ انجمن کا انتظام اس قدر مکمل اور اس کے قواعد کی ترتیب اتنی باضابطہ تھی کہ انہیں شاید ہی کبھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہو۔ حکومت کے انتظام کے باوجود چند سال تک نہایت ترقی پر رہی۔ لیکن ۱۸۶۹ء میں اس کی تحریک یکایک سرد پڑ گئی۔ گو کبھی کبھی کوئی واقعہ سرزد ہو جاتا" ہومز نے کتاب بند کرتے ہوئے کہا "چونکہ اس انجمن کے یکایک ٹوٹنے اور کرنل کے مع کاغذات امریکا سے غائب ہونے میں غیر معمولی مطابقت ہے اِس لئے یہ بھی ایک سبب ہو سکتا ہے۔ اب تم سمجھ سکتے ہو کہ یہ رجسٹر اور ڈائری بہت سے لوگوں کو ماخوذ کرا سکتے تھے۔ اس کے خیال سے اُن کی راتوں کی نیندیں اُڑ اُڑ جاتی ہونگی"

"وہ صفحہ جو ہم نے دیکھا ہے ........"

"وہ ویسا ہی ہے جیسی کہ توقع ہے۔ شاید اُس میں اِس طرح لکھا ہے کہ الف، ب اور ج کو تخم بھیجے گئے یعنی ان کو انجمن کی طرف سے اطلاع دی گئی۔ پھر اس کے بعد ہے کہ الف اور ج مطلع صاف یعنی جلا وطن ہو گئے۔ ب ٹھیک یعنی اُس کا خاتمہ کر دیا گیا۔ اچھا ڈاکٹر امید ہے کہ ہم اس پر خاطر خواہ روشنی ڈال سکیں گے۔ اب رات بہت ہو گئی ہے آرام کرنا چاہئے"

صبح کو مطلع صاف ہو چکا تھا اور آفتاب عالمتاب کہر کے نقاب کو پھاڑ پھاڑ کر شہر پر ضو باری کر رہا تھا۔

جب میں نیچے آیا ہومز ناشتا کر رہا تھا۔ اُس نے کہا "تم میرے انتظار نہ کرنے کو معاف کرنا کیونکہ اوپن شا کے مقدمے میں آج مجھے بہت کچھ کرنا ہے"

"پہلے تم کہاں جاؤ گے؟"

"یہیں شہر سے ابتدا کروں گا" میں نے میز پر سے تازہ اخبار جو ابھی تک بند تھا، اٹھا لیا۔ میری نظر ایک عنوان پر جم کر رہ گئی۔ دل کو ایک جھٹکا سا پہنچا۔ میں نے چلا کر کہا "ہومز تم نے بہت دیر کی" اُس نے چائے کا پیالہ نیچے رکھ کر کہا "آہ میں پہلے ہی ڈرتا تھا۔ یہ کیسے

ہوا؟" گو اُس نے یہ الفاظ نہایت متانت سے ادا کئے۔ مگر میں دیکھتا تھا۔ کہ وہ نہایت متاثر ہوا ہے۔

میں نے کہا "پہلے میں نے " اوپن شا" کا نام دیکھا اور میری نظر " واٹرلو کے پل کے پاس ایک افسوسناک حادثہ" پر جم گئی۔ لکھا ہے کہ گذشتہ رات نو اور دس کے درمیان " ٫ حلقہ کا پولیس کانسٹبل کک واٹرلو کے پل کے پاس اپنی ڈیوٹی پر کھڑا تھا۔ اُس نے مدد کے لئے ایک چیخ اور پانی میں کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز سنی۔ رات غضب کی تاریک تھی، ہاتھ کو ہاتھ نہ سُجھائی دیتا تھا۔ بہرحال خطرہ کی اطلاع دی گئی اور پولس کی امداد سے لاش باہر نکالی گئی۔ جیب سے ایک لفافہ نکلا، اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کا نام جان اوپن شا تھا اور ہورشام کے نزدیک رہتا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ نوجوان واٹرلو کی اخیر ٹرین کے لئے نہایت تیزی سے جا رہا تھا۔ اور چونکہ تاریکی بلا کی تھی۔ اُس کا پاؤں بہک گیا۔ اور وہ دریا میں جا پڑا۔ اس حادثہ کی رو سے میونسپل کی توجہ اس طرف منعطف کرنی چاہئے کہ جلد از جلد پل کے دونوں جانب کچھ روک لگا دی جائے۔"

اُس نے غصہ کو ضبط کرتے ہوئے کہا " واٹسن، اس سے میرے وقار کو سخت صدمہ پہنچا ہے اور اب یہ شخصی معاملہ ہو گیا ہے۔ اگر خدا نے توفیق دی، تو یہ گروہ میرے چنگل میں ہوگا ــــ اُف، وہ میرے پاس مدد کے لئے آئے اور میں اُسے موت کے منہ سے نہ نکال سکوں" اب وہ غصہ کو ضبط نہ کر سکا۔ کرسی سے اُچھلا اور پاگلوں کی طرح مغلوب الغضب ہو کر جلد جلد ٹہلنے لگا۔

آخرکار اُس نے کہا "دغاباز شیطان ہیں، اُسے نیچے کس صفائی سے پھینک دیا۔ بلاشک اُن کے حسبِ مطلب پل پر بہت بھیڑ تھی ــــ اچھا، واٹسن، دیکھیں گے کون جیتتا ہے ــ میں باہر جاتا ہوں،"

"کہاں؟ پولیس چوکی؟"

"نہیں میں خود پولیس ہوں۔ جب میں جال تیار کر چکوں پھر وہ چاہیں تو شکار پکڑ سکتے ہیں۔"

تمام دن میں اپنے کام میں مشغول رہا جب واپس آیا تو بہت دیر ہو چکی تھی لیکن ہومز کا اب تک پتہ نہ تھا۔ آخر دس بجے کے قریب وہ آیا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا اور وہ تھکا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ وہ سیدھا الماری کی طرف گیا اور سوکھی روٹی کو پانی میں بھگو بھگو کر کھانے لگا۔

میں نے پوچھا "شاید تم بہت بھوکے ہو؟"

اُس نے جواب دیا "مر رہا ہوں۔ صبح سے کچھ نہیں کھایا"

"کچھ بھی نہیں"؟

"ایک دانہ نہیں، میرے پاس اس کے سوچنے کے لئے وقت ہی نہ تھا"

"کامیاب ہو گئے؟ سراغ مل گیا؟"

"بخوبی، اب وہ میری مٹھی میں ہیں۔ اوپن شا کا خون بالا بالا نہ جائے گا۔ بہت جلد انتقام ملے گا۔ کیوں، واٹسن، اگر اُن کا نشان انہیں کے پاس بھیجا جائے تو کیسا ہو؟"

"تمہارا مطلب کیا ہے؟"

اُس نے ایک نارنگی اُٹھائی اور اُسے چیر کر پانچ بیج نکالے۔ انہیں ایک لفافہ میں رکھا۔ اُس کے اندر ش، ہ برائے ج، ا، لکھ کر اُسے بند کیا۔ اور یہ پتہ لکھا:۔

کپتان جمیس کالھون    بارک لون اسٹار    سونہہ    جارجیا

پھر مسکراتے ہوئے کہا "یہ بندرگاہ پر اُس کے انتظار میں رہے گا۔ اُسے رات بھر سونے نہ دے گا اور اُس کی قسمت کا قطعی فیصلہ کر دے گا۔ اُسی طرح، جس طرح دس بجے سے پیشتر غریب اوپن شا کا کام تمام کیا گیا ہے"۔

میں نے پوچھا "یہ کپتان کالھون کون ہے"

"گروہ کا سردار۔ میں دوسروں کی بھی خبر لوں گا لیکن سب سے پہلے اس کی"۔

"تم نے پتہ کس طرح لگایا"

اُس نے اپنی جیب سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا جو کہ سارے کا سارا تاریخوں اور ناموں سے پُر تھا۔

"آج میں نے تمام دن جہازوں کے پرانے رجسٹر دیکھنے میں صرف کر دیا۔ میں نے تلاش کیا کہ جنوری اور فروری ۱۸۸۳ء میں پانڈیچری میں کون کون سے جہاز لنگرانداز تھے۔ کل چھتیس نکلے اُن میں سے ایک کا نام لون اسٹار تھا اور یہی نام امریکا کی ایک ریاست کو بھی دیا گیا ہے"

"شاید ٹیکسس کو"

"یہ تو میں یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا لیکن اتنا جانتا ہوں کہ وہ کوئی ہے امریکن ہی جہاز۔ پھر ڈنڈی کے رکارڈ تلاش کرنا شروع کئے تھوڑی ہی دیر میں مجھے ۱۸۸۵ء کے رکارڈ میں لون اسٹار مل گیا۔ اب میں نے لندن کے موجودہ جہازوں کی بابت تحقیقات شروع کی۔ مجھے معلوم ہوا کہ گذشتہ ہفتہ میں لون اسٹار یہاں آیا ہے۔ جب میں بندرگاہ پر گیا تو معلوم ہوا کہ آج صبح یہاں سے سونہہ کی جانب روانہ ہو گیا اور چونکہ ہوا موافق ہے اس لئے جزیرہ وائٹ کے نزدیک پہنچ گیا ہو گا"

"پھر کیا کیا؟"

"اوہ، اب وہ میرے قبضے میں ہیں۔ کپتان اور دو میٹ تو امریکن ہیں۔ اور باقی جرمن اور فن ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ وہ تینوں گذشتہ رات کہیں باہر گئے ہوئے تھے۔ جب تک یہ جہاز سونہہ پہنچے گا، اسٹیمر لفافہ پہنچا چکا ہو گا۔ وہاں کی پولیس کو بذریعہ تار اطلاع دے دی جائے گی کہ یہ تین جنٹلمین قتل کے مرتکب ہوئے ہیں فوراً گرفتار کر لو"

انسانی دماغ کی بہترین تدابیر میں بھی نقص رہتا ہے۔ جان اوپن شا کے قاتلوں نے نارنگی کے تخم کبھی نہ پائے تاہم انہیں معلوم ہو گیا، کہ اُن کے سر پر کوئی ذات اُن سے بھی زیادہ بااختیار اور ہوشیار موجود ہے۔ ہم نے ایک مدت دراز تک لون اسٹار کے متعلق اخبارات میں کچھ نہ دیکھا، آخر سنا کہ بحر اوقیانوس میں ایک جگہ ٹوٹے ہوئے جہاز کا ایک تختہ ملا جس پر ل، الف منقش تھا۔ بس یہ اُس کا حشر تھا جو ہمیں معلوم ہو سکا۔

(کانن ڈائل)

محمد حامد

# Shelley Alone

*Swifter far than summer's flight,*
*Swifter far than youth's delight,*
*Swifter far than happy night.*
*Art thou come and gone:*
*As the wood when leaves are shed*
*As the night when sleep is fled,*
*As the heart when joy is dead,*
*I am left alone. alone.*

'SHELLEY'.

# شاعرِ تنہا

رنگ و بوئے بہارِ فانی سے،
لذّتِ عیشِ نوجوانی سے،
شبِ عشرت کی شادمانی سے،
تیز تھی تیری عمر کی رفتار:
کہ تو آئی بھی اور چلی بھی گئی۔
جس طرح گلستاں بہار کے بعد؛
جیسے شب خوابِ وصلِ یار کے بعد؛
جیسے دل رخصتِ قرار کے بعد،
بالکل ایسی ہے میری حالتِ زار:
ساتھ تیرے مری خوشی بھی گئی۔

محمد ہادی حسین

# مشاہداتِ قدرت

ماہرینِ علمِ ہیئت نے اس بات کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیا ہے کہ اُن تمام سیاروں اور ستاروں کے سوا جن کی موجودگی کا ہمیں علم ہے۔ تقریباً ایک ارب ستارے ایسے بھی ہیں جو ظہور و انکشاف کے مختلف مدارج طے کر رہے ہیں۔ ان میں بعض ایسے ہیں جو کسی زمانے میں خود آفتاب تھے اور ان کے گرد دیگر کواکب اور سیارے گردش کرتے تھے مگر اب وہ تاریک اور سرد ہو چکے ہیں بعض ایسے ہیں کہ اگرچہ اب تک آفتاب کی سی حدت و حرارت اُن میں پیدا نہیں ہوئی لیکن رفتہ رفتہ وہ بھی آفتاب کے درجے تک پہنچ جائیں گے۔ بعض سیارے اب بھی ہمارے آفتاب کی طرح نظامِ شمسی رکھتے ہیں۔ ماہرینِ اسطرانومیہ (علمِ ہیئت) نے جو مزید انکشافات کئے ہیں اُن کی بنا پر یہ امر بہت قرینِ قیاس ہو گیا ہے کہ ان سیاروں میں متعدد ایسے ہیں جن میں ذی حس و صاحبِ ادراک ہستیاں آباد ہیں۔ چنانچہ روز بروز جدید معلومات سے اس حیرت انگیز و تعجب خیز قیاس کی تائید ہوتی جا رہی ہے۔

فضائے آسمانی میں بہت سے دھندلے حلقے ابر کے ٹکڑوں کی طرح نظر آتے ہیں لیکن وہ ان ثوابت و سیارات میں جو ہمارے آفتاب کے تابع ہیں اس طرح سے ملے رہتے ہیں کہ ایک زمانے تک اُن کو تمیز کرنا اور اُن کی حقیقت کا معلوم کرنا بہت دشوار اور مشکل امر تھا۔ یہ حلقے وہ ستارے ہیں جن کی کیفیات کو معلوم کرنے کے لئے مدتوں سے ماہرینِ علمِ ہیئت ساعی و کوشاں تھے کیلیفورنیا میں جہاں ہمیشہ فضا نہایت صاف رہتی ہے ایک عظیم الشان دوربین کے ذریعہ سے اجرامِ فلکی کا مشاہدہ کرنے کے بعد جو مزید انکشافات ہوئے ہیں وہ نہایت حیرت انگیز اور تعجب خیز ہیں۔ ہم ان انکشافات کو سائنس کا ایک کرشمہ سمجھ کر نظر انداز نہیں کر سکتے کیونکہ اُن کی تصدیق دنیا کے سب سے بڑے ماہرینِ فن نے کی ہے جن میں سے ایک امریکا کا مشہور و معروف ہیئت دان ڈاکٹر ہبل (Dr. Hubble) اور دوسرا انگلستان کا بہترین اور مایۂ ناز ماہرِ علمِ ہیئت ڈاکٹر (Dr. Jeans) جینز ہے۔ ان انکشافات کا خیال کر کے انسان کانپ اٹھتا ہے اور رب العالمین کی عظمت و شان اور قدرت و جلال کے تصور سے اُس کے بدن میں لرزہ پیدا ہو جاتا ہے۔

آج تک ہم دوربین سے انہی اجرامِ سماوی کو دیکھ سکے تھے جن کی روشنی زمین تک دس لاکھ سال میں پہنچ سکتی ہے مگر اب نئے نئے آلات اور بڑی بڑی دوربینوں کے ذریعہ سے ایسے ستاروں کی موجودگی کا انکشاف ہوا ہے جن کی روشنی چودہ کروڑ سال کے بعد ہم تک پہنچتی ہے۔ ان ستاروں کا فاصلہ یا بُعد حسبِ ذیل طریقہ سے دریافت کیا جا سکتا ہے۔

روشنی کی رفتار فی سیکنڈ ۱۸۶۰۰۰ میل مانی گئی ہے۔ اس حساب سے اُس کی سالانہ رفتار ۱۸۶۰۰۰ × ۶۰ × ۶۰ × ۲۴ × ۳۶۵¼

ہوئی - اس حاصل ضرب کو اگر ۰۰۰۰۰۰ ۴۰ ۱ سے ضرب دی جائے تو مذکورہ بالا ستاروں کا فاصلہ معلوم ہو جائیگا -

یہ ستارے ہمیں جس حالت میں نظر آتے ہیں آج اسی حالت میں نہ ہونگے - بلکہ چودہ کروڑ سال پہلے اُن کی جو صورت تھی وہ ہمیں اب دکھائی دی ہے - اس حساب کو محض فرضی یا قیاسی نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ یہ مدتوں کی محنت اور تفتیش کا نتیجہ ہے اور بڑے بڑے ہیئت دانوں نے اس کے دریافت کرنے میں عمریں بسر کر دی ہیں -

مذکورہ بالا تمام ستارے قریب قریب ایک ہی جسامت کے ہیں اور اُن کی روشنی بھی مساوی ہے - اس لئے سب سے پہلے اُن میں سے نزدیک ترین ستارے کا فاصلہ معلوم کر لیا جاتا ہے پھر اس سے زیادہ فاصلے کے ستاروں کی روشنی جس مقدار میں کم ہوتی جاتی ہے اُسی اوسط سے اُن کے بُعد کا پتہ لگتا جاتا ہے اور اسی طرح علی الترتیب تمام ستاروں کے فاصلے معلوم ہو جاتے ہیں ہمارے ذہن و خیال کی رسائی آج تک کسی ایسی شئے تک نہیں ہوئی جو ہم سے ان ستاروں سے بھی زیادہ بُعد رکھتی ہو - یا بالفاظ دیگر ہمارے اور ان ستاروں کے درمیان ان تمام اشیا سے زیادہ بُعد ہے جن کی حقیقت و موجودگی کا ہمیں یقین ہو چکا ہے اور جن کے بُعد اور فصل کی کوئی حد قائم ہو چکی ہے +

بڑی سے بڑی دُوربین کی مدد سے بھی ہم ان ستاروں کو خود نہیں دیکھ سکتے - بلکہ دوربین میں ایک قسم کا کیمرا (camera) لگا کر اُن کے عکس اتار لئے جاتے ہیں اور اس کی صورت یہ ہے کہ پہلے قریب ترین ستارے کا عکس لیا جائے اس کے بعد علی الترتیب تمام ستاروں کے عکس لئے جاتے ہیں اس طرح جس قدر ستارہ دور ہوگا اسی قدر اُس کا عکس دھندلا اُترے گا اور جس قدر عکس دھندلا ہوگا اسی قدر ستارے کے فاصلے اور بُعد کے زیادہ ہونے کا ثبوت دے گا - ان ستاروں کی موجودگی کا یقین ہو جانے کے بعد بھی ہمیں یہ نہیں معلوم ہوا کہ وہ قدرت کے کن کن کرشموں کے مظہر ہیں -

اسطرانومیہ کے ماہر ہمیں اس خیال کی صحت کا بھی یقین دلاتے ہیں کہ سیاروں کے ان مختلف اور لاتعداد مجموعوں میں سے ہر ایک بذات خود ایک عالم ہے جس کی وسعت و جسامت کسی طرح اس عالم سے یا ہمارے عالم سے کم نہیں - یہاں عالم سے مراد فقط کرۂ ارض نہیں بلکہ آفتاب کے گرد گردش کرنے والے تمام سیارے اس میں شامل ہیں - دوربینوں کی مدد کے بغیر ہمیں صرف وہ ستارے نظر آتے ہیں جو بلحاظ تعداد تمام اجرام سماوی کا کروڑواں حصہ بھی نہیں - لیکن یہی ہمارے خیالات میں ہیجان اور ہمارے اذہان میں تلاطم پیدا کر دینے کے لئے بہت کافی ہیں - کس قدر رہیبت ناک اور تحیر خیز خیال ہے کہ ان سیاروں میں سے ہر ایک میں اس قدر مادہ موجود ہے کہ جس سے ہمارے عالم کی طرح کا ایک اور عالم بن سکتا ہے -

سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قسم کے کس قدر سیارے موجود ہیں ؟ ماہرین علم ہیئت کہتے ہیں کہ کم از کم بیس لاکھ سیارے یا عالم ایسے ہیں جن کی موجودگی معقول دلائل سے ثابت ہو رہی ہے بلکہ یقیناً اس قسم کے سیارے تعداد میں اس سے بھی زیادہ ہونگے - کیونکہ بہت سے ایسے ہونگے جن کا دیکھنا یا عکس اُتارنا ہماری موجودہ بڑی سے بڑی دوربینوں کے ذریعے سے بھی ممکن نہیں - اور ہزار ہا

سیارے ایسے بھی ہونگے جنہیں معلوم کرنے کے لئے ہم آج تک نہ کوئی دُوربین بنا سکے ہیں نہ آئندہ کبھی بنا سکیں گے۔ خواہ سائنس اپنی موجودہ تیز رفتاری کے ساتھ سالہا سال تک ترقی کے میدان میں گامزن رہے۔ یہی ہیں وہ راز جو پروردگارِ عالم کی عظمت وقدرت کا پتہ دیتے ہیں ؎

ہر سُو نہری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے     حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

ان ستاروں کی موجودگی کو علم ہیئت نے ثابت کر دکھایا ہے فضائے بسیط میں اُن کے مختلف اماکن کی کیفیت کو ہمارے ذہن نشین کرنے کے لئے ڈاکٹر (Dr. Jeans) نے ایک مثال دی ہے وہ لکھتے ہیں کہ پچیس ٹن اخروٹ بے کران میں سے ایک اخروٹ کو زمین پر رکھ دو پھر اُس کے چاروں طرف ایک ایک اخروٹ پچیس پچیس فٹ کے فاصلے پر رکھتے جاؤ اس طرح ایک دائرہ بن جائیگا۔ اس دائرہ کو دوربین کی حدِ قوت یا حدِ نگاہ تصور کر لو۔ یعنی یہ خیال کر لو کہ ان اخروٹوں میں سے ہر ایک اخروٹ ایک سیارہ ہے جو اتنے فاصلہ پر واقع ہے کہ اس سے آگے ہماری نگاہ کام نہیں کر سکتی"۔

ایسے عظیم الشان اور حیرت افزا مجموعۂ کائنات کے تصور کے بعد ہمارا ادراک خود کو ہستی کے اس بحرِ بے پایاں اور موجودات کے اس دریائے بیکراں میں ایک ناچیز و ناقابلِ التفات قطرہ خیال کر کے ایک عجیب ذلّت و شرم محسوس کرتا ہے لیکن جیسے کہ ہر مسئلہ کے دو پہلو اور ہر تصویر کے دو رُخ ہؤا کرتے ہیں اسی طرح اس مسئلہ کا بھی ایک اور پہلو ہے۔ مکان و زمان کی وسعت خواہ کتنی ہی دُور از قیاس اور بعید از فہم کیوں نہ ہو مگر قدرت کے عجائب خانے میں اور بہت سی اشیا بھی درخورِ غور و فکر ہیں۔ انہی میں سے ایک ہمارا فہم و ادراک ہے جس نے ایسے ایسے دور دراز ستاروں کی خبریں لانے کے لئے ہمیں دوربین بنانا سکھایا۔ ان کے بُعد اور فاصلے کی پیمائش کا طریقہ بتایا اور اُن تمام قوانینِ قدرت کا پتہ لگایا جن کے ماتحت یہ سب سیارے موقوفِ گردش و مصروفِ کار ہیں۔ دیدۂ باریک بین ہو تو موجودات کے ہر ذرّے میں ہمیں وسعتِ کون و مکاں نظر آئے گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کوئی ہیئت دان ایسا نہیں پیدا ہؤا جو ذاتِ باری کا منکر ہو اور دہریت کا قائل ہو۔ . . . . . . . .

یہ خیال کہ ان اجرامِ سماوی کو ایسے اصولِ ریاضی کی بنا پر حرکت و گردش دینا جس میں کبھی نقص واقع نہ ہو ایک نہایت بزرگ اور مہتم بالشان ریاضی دان کے بغیر ممکن ہے محض بے معنی اور سراسر مہمل ہے۔ پس ہمارا ادراک جو ان تمام حرکات و ادوار کی کیفیات کو معلوم اور اُن کی ماہیت کو دریافت کر سکتا ہے ناممکن اور بعید از فہم ہے کہ محض چند سال زندہ رہے مشکل ترین مسائل کو حل کرے ذاتِ الٰہی پر وقوف حاصل کرے اور پھر یکایک نیست و نابود ہو جائے۔ موت کو انجامِ حیات اور پیغامِ فنا کہنا غلطی ہے۔ بلکہ موت نام ہے ایک عقدہ کا جو حل نہیں ہو سکتا۔ اجل نام ہے ایک رازِ قدرت کا جہاں تک عقل کی رسائی نہیں۔

(ترجمہ)     فدا علی ملا علی بھائی

# حسنِ خوابیدہ

خوابیدہ عشرت ہے اک پیکرِ رعنائی — دوشیزگی لیتی ہے ہر سانس میں انگڑائی
بکھرے ہوئے بالوں میں طوفانِ ملاحت ہے — کچھ ابر کے ٹکڑے ہیں لیلائی و عذرائی
مخمورِ لطافت ہیں سب حسن کے جلووں سے — خاموش ادائیں ہیں صہبائی و مینائی
ابھری ہوئی آنکھیں ہیں معمورِ سیہ خوابی — واماندۂ رم گویا دو آہوئے صحرائی
آغوش میں پلکوں کی سو آسنے رکھے ہیں — ڈوبی ہوئی حیرت میں ہے چشمِ تماشائی
شاداب ہے نظارہ انوار کی موجوں سے — اللہ ری رنگینی اللہ ری رعنائی
ہونٹوں پہ تبسم ہے، سانسوں میں ترنم ہے — جلووں میں تلاطم ہے عشووں میں پذیرائی

اے درخمِ چشمِ تو عریانی و رسوائی
برخیز و تماشا کن صد محشرِ رعنائی

ذوقی

# یتیم

جب کولاک بیدار ہوا تو اُس نے بچے کو روتے ہوئے پایا۔ اُس نے بغیر آنکھیں کھولے اپنی بیوی کو آواز دی "گولڈا! دیکھنا اس چھوکرے نے کیسا شور مچا رکھا ہے"۔

گولڈا نے کچھ جواب نہ دیا۔ اُس نے اِدھر اُدھر نظر دوڑائی اور دیکھا کہ وہ گھر میں نہ تھی وہ کچھ حیران سا ہوا لیکن پھر اُس نے سوچا کہ وہ شاید نہانے گئی ہے۔ اُس نے کپڑے کا ایک ٹکڑا اُٹھا کر بچے کے منہ میں ٹھونس دیا تاکہ اُس کے رونے کی آواز بند ہو جائے اور خود کپڑے پہننے میں مصروف ہو گیا۔

اُدھر وہ کپڑے پہن رہا تھا اور اِدھر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ چاندی کے جو شمع دان میں نے رات چرائے تھے اُن کی فروخت سے مجھے کیا ملے گا۔ وہ اسی خیال کی اُلجھن میں سامان کا جائزہ لینے کے لئے بالاخانہ پر چڑھ گیا۔ وہاں کچھ نہ تھا! اُس نے کونہ کونہ چھان مارا مگر وہاں کچھ نہ تھا!

جلدی سے وہ چھلانگ لگا کر نیچے اُترا اور اُس طرف گیا جہاں اُس کی بیوی کی چیزیں لٹکی رہتی تھیں۔ ایک جھٹکے سے اُس نے اُس کپڑے کو پھاڑ ڈالا جو اُن کو ڈھانکے رکھتا تھا۔ یہ چیزیں بھی جا چکی تھیں ...... بس اب اُسے معلوم ہونے لگا کہ وہ بھاگ گئی ہے۔

مگر کس کے ساتھ؟

"اچھا ..... اُسے بھاگنے دو ...... اُسے جہنم میں بھیجو! ...... میں تو اُس پر خاک بھی نہیں ڈالتا"، یہ الفاظ نہایت بے پروائی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلے۔

اُس نے بچے پر نظر ڈالی۔

"مگر اس مردود بچے کو اب میں کیا کروں" اُس نے آہستہ سے کہا۔ "اگر میں جانتا کہ وہ کہاں ہے تو میں اِسے اُس کے دروازے پر جا کر ڈال آتا، کہ اسے لے لو، یہ تمہارا ہی ہے"۔

یکایک اُس کے دل میں ایک تاریک خیال پیدا ہوا جس سے اُس کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ اپنے اوپر کے ہونٹ کو دانتوں میں لے کر کاٹنے لگا، اُس کے ہاتھ کانپنے لگے۔ وہ بچے کے قریب پہنچا جو بستر میں بالکل برہنہ لیٹا ہوا تھا۔ کمبل کو اس نے لاتیں مار مار کر ایک طرف پھینک دیا تھا، دونوں ہاتھوں کو منہ میں گھسیڑ رکھا تھا اور کمرے کی تنہا فضا میں ایک عجیب مبہم انداز سے مسکرا رہا تھا۔

وہ بچے کے پاس سے ہٹ گیا، جلدی سے اپنی ٹوپی پہنی اور دروازے کو تالا لگاتا ہُوا باہر نکل گیا۔ وہ بلا ارادہ چلتا گیا لیکن اُس کے دل کو چین نہ تھا۔ بچے کے رونے کی آواز اُس کے کانوں میں گونج رہی تھی جیسے وہ اُسے بلا رہا ہے۔ تصور کی آنکھوں سے وہ اُسے اپنے سامنے دیکھ رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لاتیں چلاتے ہوئے اور واویلا کرتے ہوئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں، نہیں! مجھے واپس جانا چاہیے۔

اُس نے خیال کیا" اگر اب مجھے اُس عورت پر قبضہ حاصل ہو جائے تو میں اُسے گردن سے پکڑوں اور اُس کا گلا گھونٹ دوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُس کا گلا گھونٹ دوں یہاں تک کہ اُس کی زبان باہر نکل آئے اور یُوں اُسے جہنم میں پہنچا دوں۔

وہ ایک نان بائی کی دوکان میں داخل ہُوا روٹی خریدی اور واپس گھر کی طرف چل دیا۔ بچہ اسی طرح پڑا تھا اب بھی اس کے جسم پر سے کپڑا اُترا ہوا تھا مگر وہ مسکرا رہا تھا۔

"اس چھوکرے کو شیطان لے جائے، یہ کم بخت تو بڑے آرام سے لیٹا ہوا ہے!" یہ کہہ کر وہ پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ وہ چلتا تھا مگر اُس کے قدم نہ اُٹھتے تھے۔ بچے کے رونے کی آوازیں رہ رہ کر اُس کے کانوں میں گونجتی تھیں اور اُس کے دل میں سوراخ کئے ڈالتی تھیں۔

غصہ میں اُس نے اپنی مٹھیوں کو ایک مرتبہ بند کیا اور گھر کی طرف روانہ ہُوا۔ اس دفعہ بچہ رو رہا تھا" مامم ما! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مامم ما! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

اُس نے کہا" اپنی ماما کو بلاتے ہو؟ جاؤ تو ذرا اُس انمول ماما کو ڈھونڈھ لاؤ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُسے طاعون ہو جائے!"

اُس نے بچے کو اُٹھا لیا۔ وہ اپنے چھوٹے چھوٹے ہونٹوں سے کسی چیز کو اُس کے ہاتھوں میں پڑا ڈھونڈ رہا تھا۔

اُس نے بچے کو تھپکاتے ہوئے کہا" آگ لگے اُس کی زشت و بداطوار روح کو۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مت رو میرے بچے، اب چُپ ہو جا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چُپ ہو جا، میں تیری منت کرتا ہوں چُپ ہو جا!"

بچہ اپنے ننھے سے منہ کے ساتھ برابر کچھ تلاش کرتا رہا، اپنے ہاتھ پھیلاتا رہا اور سر کو ہلاتا رہا، جیسے وہ ابھی بولنے لگے گا۔ اُس نے اُسے اپنے سینے سے لگا لیا اور ادھر اُدھر دودھ کی تلاش کرنے لگا۔ آخر اُسے چولہے پر تھوڑا سا دودھ مل گیا جس میں اُس نے ذرا سی روٹی کو بھگویا پھر تھوڑی تھوڑی غذا بچے کے منہ میں ڈالنے لگا۔ اور محبت آمیز آواز میں اُس سے باتیں کرنے لگا۔ کھا میرے ننھے، کھا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تیری ماں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُسے شیطان لے جائے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تجھے چھوڑ کر چلی گئی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی کُتیا بھی اپنے بچوں کو یوں نہیں چھوڑتی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ کتوں سے بھی بدتر ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مت رو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ نہیں، میں تجھے نہیں چھوڑوں گا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مجھے اپنی عزت کی قسم میں تجھے نہیں چھوڑوں گا!"

جب بچہ خاموش ہوگیا تو اُس نے اُسے ایک کپڑے میں لپیٹ لیا اور باہر لے گیا۔ گلی میں اُس کی آمد سے ایک ہلچل مچ گئی سب نے شور مچا دیا۔ کراڈک نے دُور ہی سے پکار کر کہا "او کولاک! یہ مینا کہاں سے اٹھا لائے؟"

کراڈک کی بیوی ایک جوش کے ساتھ اُٹھی اور اپنی باہیں پھیلا کر بچّے کی طرف بڑھی۔ اُس نے وفورِ مسرت میں کئی مرتبہ اپنے چہرے کو اپنی چادر سے پونچھا...... ہنستی رہی اور ننھے بچے کے چوتڑوں پر ہلکے ہلکے تھپڑ مارتی رہی۔ پھر کہنے لگی "کولاک کیا یہ تمہارا بچہ ہے؟ مگر میں نے کبھی....... اس کی پیاری پیاری آنکھوں کی طرف دیکھو۔ بالکل ماریناکی آنکھیں معلوم ہوتی ہیں۔ اور ناک بھی بالکل اُسی کی سی۔ کیسا موتی سا بچہ ہے! اسے مجھے دو!....." اُس نے بچے کو لے لیا اور اپنے ہاتھوں میں اُسے اچھالنے لگی "اچھا!...... اچھا! شریر بچے"

بوڑھا کراڈاک، چوروں کا اُستاد، آہستہ سے اُٹھا، بچے کے پاس پہنچا اُسے اچھی طرح دیکھا اور کولاک کی پیٹھ پر تھپکی دے کر کہنے لگا "خوب موٹا تازہ چھوکرا ہے..... مکانوں کی سردلوں پر بڑی آسانی سے چڑھ جایا کرے گا...... مگر اس کی ماں کون ہے؟"

کولاک نے جواب دیا "خدا کرے وہ آگ کی طرح جلے۔ وہ چاندی کے شمع دان لے کر بھاگ گئی"۔

"اور بچے کو چھوڑ گئی؟"

"ہاں"

"یہ بہت بُری بات ہے......... یہ بہت بُری بات ہے"

بوڑھا اپنے سر کو کھجلانے لگا۔ اُس کا بیٹا کولاک کے پاس آیا اور کہنے لگا "اچھا ہوا میں سمجھتا ہوں کہ اب تمہیں اپنا پیشہ چھوڑنا پڑے گا اور بچے کی انّا بن کر اُسے پالنا پڑے گا۔ اُس نے تمہارے ساتھ خوب داؤں کھیلا۔ کیوں ٹھیک ہے نا؟"

کولاک نے کہا "تم میرے غم میں اپنا سر نہ پھوڑو۔ خدا ہر ایک کو روزی دینے والا ہے اور کولاک بھی کولاک ہے!"

اُس نے بچے کو اپنی آغوش میں لے لیا اور شہر سے باہر جنگل کی طرف چل دیا۔ اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے لوگ پیچھے اُس کی طرف انگلیاں اُٹھا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔

جنگل میں پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

آس پاس کوئی متنفس نظر نہ آتا تھا۔ درختوں سے پتے گرتے تھے تو وہ ایک غمناک آواز میں سرسراتے تھے۔ دور ایک پتھروں کو روندتی ہوئی اور ساحل کی چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ندی کے پانی کا ہلکا اور مبہم سا شور سنائی دیتا تھا۔

اُس نے بچے کو اپنے پاس نیچے رکھ دیا اور رقت انگیز نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے لگا۔ بچہ اپنا انگوٹھا منہ میں

ڈاٹے خاموشی سے اُس کی طرف تاک رہا تھا جیسے کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہے۔ کولاک کو کچھ معلوم نہ تھا کہ بچّے کو کیا کرے ایک لمحہ کے لیئے اس کو یہ خیال آیا کہ وہ بھی اُسے چھوڑ دے لیکن معاً اُس بے کس ننھی سی جان کے لیئے، اس اپنے ہی گوشت اور خون کے لیئے اُس کے دل میں رحم کا جذبہ پیدا ہو گیا جس نے پہلے خیال کو بالکل فنا کر دیا۔ اُس نے پھر بچّے کو اپنی گود میں لیا اور اُس کے چہرے کے خوبصورت نقوش پر ایک نگاہ ڈالتے ہوئے اُسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔ اُسے اُس کی شکل میں اپنی ہی صورت کا عکس نظر آیا اور اس خیال سے ایک پُر مسرت گرمی اُس کے تمام اعضا میں دوڑ گئی۔ اُس نے بچّے سے کہا "ننھے کولاک! ...... ہاں تو ایک ننھا سا کولاک ہے۔ اور میں شرط بدنے کے لیئے تیار ہوں کہ تو بڑا ہو کر بہت ہی خوبصورت اور تنا ور جوان بنے گا۔ تو مکانوں کی سردلوں تابدانوں اور کھڑکیوں پر چشم زدن میں چڑھ جایا کرے گا، تالے توڑا کرے گا اور لوگوں کا مال و زر چُرا لایا کرے گا...... اور پھر تیرے بچے ہونگے اور اُن کی ماں اُن کو چھوڑ کر بھاگ جائے گی ...... لیکن — کیا تو اپنے بچوں کو اپنے ساتھ لے کر در بدر بھیک مانگتا پھرے گا؟ ..... تو کون ہے؟ ..... ایک ڈاکو، میری ہی طرح ..... اے تو جو میں ہوں"

اُس نے بچے کو دریا کے کنارے کے پاس زمین پر رکھ دیا اور خود ایک درخت کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ یہ دیکھنے کے لیئے کہ وہ کیا کرتا ہے.......... وہ جلد جلد لاتیں مارتا رہا، اپنے ہاتھوں کو چُوستا رہا اور ماما، ماما کہہ کر کھیلتا رہا۔

وہ ایک اور دُور کے درخت کے پیچھے چُھپ گیا لیکن یہاں بھی اُس کی آواز اُسے آتی رہی۔ اسی طرح وہ ایک درخت سے دوسرے درخت کی اوٹ میں بچے سے دُور اور دُور ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ اُس کی آواز اُس کے کانوں تک پہنچنے سے رہ گئی اور اُس کی صورت اُس کی آنکھوں سے چُھپ گئی ....... پھر وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے بھاگ اُٹھا۔ لیکن اس دوڑ میں بھی بچے کی چیخوں کا شور اُس کے کانوں میں گونجتا رہا۔ یکایک اُس کے دل میں خیال پیدا ہوا، "کہیں وہ لڑھک کر دریا میں نہ گر رہا ہو"؟ ...... اُس کا سر چکرا گیا۔ اُس کا دل ریزہ ریزہ ہو گیا ...... مگر دوڑتا رہا ..........

وہ یک لخت ٹھہر گیا، آس پاس ایک نظر دوڑائی اور تیزی کے ساتھ اُلٹے پاؤں روانہ ہوا۔

بچّہ زار و قطار رو رہا تھا۔ اُس نے اُسے گود میں لے لیا اور جنگل کے نواح کی جھونپڑیوں کی طرف چل دیا۔ ایک دروازے سے ہٹ کر دوسرے دروازے پر وہ پہنچتا تھا اور ایک شکستہ آواز میں کہتا تھا "یتیم کو تھوڑا سا دودھ دو"....

"یتیم کو تھوڑا سا دودھ دو"

"آتش"

منصور احمد

# دِل

کسی کی محبت میں مجبور ہے دل
کسی کی مروّت سے معمُور ہے دل

کسی کی صداقت میں مدہوش ہے جاں
کسی کی شجاعت سے مخمُور ہے دِل

اُسے کیا خبر کیا یہاں ہو رہا ہے
خدا جانے کس جا کہیں دُور ہے دل

مشقت کا دوزخ مسرّت کی جنّت
کبھی نار ہے اور کبھی نُور ہے دل

شکایت کی جس کو اجازت نہیں ہے
وہ مزدورِ مقہور و مجبور ہے دل

بلا سے کرے منتشر اس کو دنیا
کسی کی نظر میں تو منظور ہے دل

حقیقت ہے کیا اس کی دُنیا نہ سمجھی
بہت گرچہ دُنیا میں مشہور ہے دل

فقط اہلِ دل دیکھ سکتے ہیں دل کو
جہاں کی نگاہوں سے مستور ہے دل

بشیرِ وفا کیش غم میں بھی خوش ہے
کہ ہے رُوح شاداں جو رنجور ہے دل

ب ا

# کیا غربت کوئی ناگزیر حقیقت ہے

ایک غریب آدمی کے دل میں رہ رہ کر اس بات کا خیال آنا کہ وہ غریب ہے اُس کے لئے سوہانِ روح سے کم نہیں۔ جب ہمارے دل میں یہ خیال راسخ ہو جائے کہ ہم غریب ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے تو یقیناً ہمارے لئے ترقی کے تمام راستے بند ہو جاتے ہیں۔ غربت کے خیال کو اپنے دل میں جگہ دینا اپنے لئے غربت کا ماحول پیدا کر لینے کے مترادف ہے۔

غربت انسانی زندگی کی ایک غیر معمولی حالت کا نام ہے اور انسانی وجود کے ساتھ اُسے کوئی مناسبت و مطابقت نہیں یہ پیکرِ انسانی کی علویت و روحانیت کے منافی ہے۔ خالقِ حقیقی کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہ تھا کہ انسان ہمیشہ ایک غلامانہ اور مفلسانہ زندگی بسر کیا کرے جسمِ انسانی کے حیرت انگیز ترکیبی عناصر میں کوئی بھی ایسی چیز موجود نہیں جس سے یہ ظاہر ہو سکے کہ انسان مفلسانہ زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۔ خداوند کریم نے فی الحقیقت اُسے خود اپنی فطرت پر پیدا فرمایا فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا۔ اور اسی لئے اُس کی شان محض روٹی پیدا کرنے کی غلامانہ زندگی سے کہیں اعلیٰ و ارفع ہے۔

وہ غریب آدمی جن کی تمام عمر بھوک کے بھیڑئیے کو زندگی کے دروازہ سے دُور رکھنے میں بسر ہوتی ہے کبھی آزادی کی نیند نہیں سو سکتے۔ وہ اپنے آپ کو کبھی کسی اصول کا پابند نہیں بنا سکتے۔ اکثر اوقات وہ اپنی رائے کا بھی اظہار نہیں کر سکتے اور نہ کسی مسئلہ پر اُن کے انفرادی خیالات ہی کی کوئی وقعت ہو سکتی ہے۔

جو لوگ مفلسانہ زندگی بسر کرنے کے مداح ہیں ہوا کریں لیکن یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ غربت کی زندگی عسرت اور حرماں نصیبی کی زندگی ہے۔ وہ زندگی ہی کیا ہے جس میں گلِ امید کی بو نہ ہو جس میں خوشی کی کوئی لہر نہ ہو جس کے پیشِ نظر کوئی شاندار مستقبل نہ ہو۔ غربت اور عسرت کی زندگی انسان کی سفلی ترغیبات کو ابھارنے والی ہے اور دنیا والوں کے درمیان رشتۂ مودت و محبت کو منقطع کرنے والی۔

ایک اوسط درجہ کے مرد اور عورت کے لئے غربت کی زندگی بسر کرتے ہوئے اپنی حیثیت کو قائم رکھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ کیا ایک ایسے انسان کے لئے جو روزانہ زندگی کی کشمکش سے تنگ آ گیا ہو۔ جو قرض کے جال میں پھنس چکا ہو جس کے اخراجات روز بروز اُس کی آمد سے بڑھ رہے ہوں کسی طرح ممکن ہے کہ خودداری اور شرافت کی زندگی بسر کر

سکے! اور متفاخرانہ شان کے ساتھ دنیا والوں کے دوش بدوش چل سکے؟ چند نہایت اعلیٰ وارفع ہستیوں کو مستثنیات میں شمار کر لینے کے بعد کون ہے جو سینہ پر ہاتھ رکھ کر اس دعویٰ کی تردید کر سکے کہ غربت اور عسرت کی زندگی ہی نے ہزارہا انسانوں کو ذلت کے عمیق ترین گڑھے میں گرا دیا ہے" اغربت کی زندگی برکت نہیں ایک لعنت ہے۔ اور جو لوگ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں وہ بھی اپنے اندر اُن کے شدائد اور تکالیف کو برداشت کرنے کی ہمت نہ پائیں گے۔

غربت کی زندگی جب اُس سے بچنے کے لئے کوئی چارہ کار نہ ہو ایک قابلِ رحم زندگی ہے۔ وہ لوگ تو یقیناً ہماری عزت و ہمدردی کے مستحق ہیں جو صرف اس لئے غریب ہیں کہ اُن کے پاس سوءِ اتفاقات' اور خرابیٔ صحت کا کوئی علاج موجود نہیں، جن کی زندگی ایک ناگریز حقیقت ہے لیکن افسوس ہے اُن لوگوں پر جو اپنی زندگی کو سدھا سکتے ہیں، لیکن سدھارنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ غربت کی زندگی جس سے نجات پا جانا انسان کے اپنے قبضۂ اقتدار میں ہے وہ سہل انگاری۔ کاہلی۔ عیاشی۔ بے اصولی۔ غلط کاری اور غلط خیالی کی زندگی جس سے بچ نکلنا انسان کے اپنے بس کی بات ہے یقیناً ایک ایسی زندگی ہے جسے جتنا بھی برا کہا جائے کم ہے۔ ہر شخص کو اس قسم کی زندگی بسر کرنے سے شرم آنی چاہیئے۔ نہ صرف اس لئے کہ وہ اُس کی قابلیت پر ایک بدنما دھبا ہے بلکہ اس لئے بھی کہ اس کے باعث لوگوں کی آنکھوں میں اور خود اُس کی اپنی آنکھوں میں اُس کی کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ سرمایہ داروں کی چیرہ دستیاں اور سیاست دانوں اور بندگانِ حرص و آز کی غیر منصفانہ کارروائیاں اور ظلم کیشیاں غریب لوگوں کا کچومر نکالے ڈالتی ہیں۔ لیکن کتنے لوگ ہیں جو اس حقیقت سے آشنا ہیں کہ اس کے باوجود بھی بے شمار لوگ اپنے مخالف ماحول پر قابو پانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور سخت مقابلہ کے باوجود بھی انہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری! یہ بات خاص طور پر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ غربت فی نفسہٖ اتنی بڑی چیز نہیں جتنا یہ خیال کرنا کہ ہم غریب ہیں۔ جو چیز انسانی ترقی کے لئے مہلک ثابت ہوتی ہے وہ فلاکت زدہ لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ہم غریب ہیں اور ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے۔ یہ اُن لوگوں کی طبیعت کا رجحان ہے جو اس قدر بُرے اثرات پیدا کر رہا ہے۔ اور بس۔ ہمیشہ اپنی غربت کا رونا روتے رہنا اُسے اپنی زندگی کا ایک جزوِ لاینفک قرار دیتے رہنا اُسے اپنی زندگی کے لئے اس طرح متلازم جاننا کہ اس سے کوئی جائے رفتن نہیں ہزاروں انسانی زندگیوں کی ہلاکت کا باعث بن رہا ہے۔

جب انسان اعتمادِ نفس سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ تو وہ کامیابی کی ہر ایک صفت کو کھو دیتا ہے۔ اور زندگی

اُس کے لیئے وبالِ جان بن جاتی ہے وہ ایک بے حس وحرکت زندگی کا ڈھانچ بن کر رہ جاتا ہے، زندگی کی سوچ ناپید ہو جاتی ہے اُس کے کام میں تسلسل قائم نہیں رہتا، وہ جانفشانی نہیں رہتی۔ یہاں تک کہ آخر کار وہ اپنے آپ میں غربت پر فتح پانے کی ہمت نہیں پاتا۔ یاد رکھو اگر تم غربت کی زندگی سے ڈرتے ہو، اگر تمہیں ہمیشہ یہ خوف دامنگیر ہے کہ کہیں بڑھاپے میں وہ تمہارے لیئے وبال جان نہ بن جائے تو یقیناً وہ تمہارے لیئے وبالِ جان بن کر رہے گی۔ کیونکہ اس خیال نے تمہارے حوصلے پست کر دیئے ہیں۔ تمہارے اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے اور تم اُس کا مقابلہ کرنے کی سکت اپنے آپ میں نہیں پاتے۔

سنگِ مقناطیس صرف لوہے کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے مگر وہ چیز جس کی مدد سے انسان اس دنیا کی تمام چیزوں کو اپنی طرف کھینچ سکتا ہے، اُس کا دل ہے۔ اور اُس کا دل اُس کے خیالات کا عکس ہے۔ اور اگر اُس کا دل خوف وغربت کے خیالات کا مرقع ہے۔ تو خواہ وہ کتنی ہی کوشش کیوں نہ کرے۔ غربت اور خوف اُس کا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے۔ وہ شخص جس کا ذہنی رجحان غربت کی طرف ہے وہ ہمیشہ اپنی شومئی قسمت پر افسوس کرتے رہنے کا عادی ہے کبھی اپنے خیالات کی باگ دوسری طرف نہیں موڑ سکتا کبھی اُس منتہائے نظر کی طرف نہیں بڑھ سکتا جس کا نام خوشحالی ہے۔

مجھے اپنے ایک عزیز دوست کی نسبت معلوم ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عملی زندگی میں ایک شاندار ناکامی کا مصداق ثابت ہوا ہے۔ اُسے اس بات کا کامل یقین ہو چکا ہے کہ دنیا میں اُسے کہیں بھی کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی اُس نے یکے بعد دیگرے کئی کام شروع کئے۔ لیکن وہ ہر مرتبہ ناکام ہی رہا۔ وہ کہتا ہے کہ مجھے اب اپنی قابلیت پر اعتماد نہیں رہا۔ میری تعلیم بے سود ثابت ہوئی ہے اور میں کبھی کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتا اِس کی وجہ اُس کا وہ معکوس رجحانِ طبیعت ہے جو پستی کی طرف مائل ہے۔

برخلاف اِس کے اُس کاروباری نوجوان کی مثال جو اپنے کاروبار کے زمانۂ اوائل میں ناکامی کی ایک زندہ تصویر تھا' اور جو محض بعد ازاں تبدیلِ ذہنیت کے باعث نہایت کامیاب کاروباری آدمی ثابت ہوا اپنے اندر ایک درسِ حیات لئے ہوئے ہے۔ اُس کا بیان ہے کہ اس سے پیشتر میں غایت درجہ کفایت شعاری سے کام لینے کے باوجود بھی اپنے اخراجات پورے نہ کر سکتا تھا میں کبھی گاڑی پر سوار ہو کر سیر کرنے کے لئے نہیں گیا۔ میں نے خرچ کے خیال سے کئی کئی میل کا پیدل سفر کیا۔ پھر یکایک میں نے اپنے طرزِ عمل میں تبدیلی پیدا کر لی۔ میں اعلیٰ درجہ کے ہوٹلوں میں جا کر کھانا کھانے لگا میں نے قابل ترین اشخاص سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ جوں جوں میں غربت کے خیالات

کو پس پشت ڈالتا گیا ~~تب تو~~ میری حالت میں تبدیلی واقع ہوتی گئی۔ اور اب اگرچہ میں نہایت ٹھاٹھ کے ساتھ رہتا ہوں لیکن اس کے باوجود بھی میری آمدنی میرے اخراجات سے کہیں زیادہ ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ میری دنیا ہی بدل گئی ہے۔

کسی کام کے محاسن کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُسے شروع کرنا گویا کامیابی کو دعوت دینا ہے یہ فی نفسہ زندگی ہے اور زندگی کی روح۔ برخلاف اس کے کسی کام کی مشکلات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُسے شروع کرنا اُس کی کامیابی کی توقعات کو کالعدم کردینے کے مترادف ہے تمہاری صحت خراب ہو چکی ہو۔ تم جائداد سے ہاتھ دھو چکے ہو لیکن اگر تم میں امید کی ایک جھلک بھی موجود ہے، اعتمادِ نفس قائم ہے تو یقیناً فتح تمہارے ہاتھ ہے۔

ایک گھرانے کے متعلق یہ ایک عجیب واقعہ مشہور ہے۔ اُس کے تمام افراد کے دل میں یہ بات جاگزین ہو چکی تھی کہ اُنہیں دنیا میں کامیابی نصیب نہیں ہو سکتی اُن کی قیام گاہ حسرت و اندوہ اور ناکامی کی تصویر تھی۔ ہر ایک چہرہ پر لفظ یاس نمایاں طور پر منقوش تھا۔ اُن کے حوصلے پست تھے اور دل امیدوں سے خالی کہ اچانک ایک دن گھر کی مالکہ کو ایک کتاب کے مطالعہ کرنے کا اتفاق ہوا جس میں لکھا تھا کہ غربت در اصل ایک ذہنی بیماری ہے جس کا علاج تبدیلِ ذہنیت میں مضمر ہے۔ فوراً اُس کے خیالات نے پلٹا کھایا، اُس کی امیدوں کی دنیا بدل گئی وہ مغموم و متفکر رہنے کی بجائے خوش خوش رہنے لگی، اُس کی روزانہ عادات میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہو گئی۔ چند ہی دنوں میں اُس کے خاوند اور بچوں پر بھی اس تبدیلی کا اثر ہونے لگا۔ خاوند نے یک لخت اپنی عادات کو بدل دیا۔ جہاں وہ پہلے اپنے لباس اور ظاہری شکل و شباہت کی طرف بالکل دھیان نہیں دیتا تھا۔ وہاں اب اس کی تمام توجہ لباس کی درستی اور بدنی صفائی کی طرف مبذول ہو گئی۔ بچوں نے والدین کی تقلید کی اور تھوڑے ہی عرصے میں گھر کی کایا پلٹ گئی۔ اس تمام تبدیلی کا اثر خوش قسمتی کی شکل میں نمودار ہونے لگا۔ باپ بیٹے کاروباری زندگی میں حیرت انگیز ترقی کرنے لگے قسمت یاور تھی۔ خوشحالی نے خیر مقدم کیا۔ دولت و ثروت نے قدم چومے اور فارغ البالی نے آکر مبارکباد دی۔

یہ اکتسابی ترقی کی چند ایک زندہ مثالیں ہیں۔ والدین کو چاہیئے کہ وہ شروع ہی سے اپنی اولاد کو کامیابی اور خوشحالی کے ماحول میں اس طرح تربیت دیں کہ وہ جذبات بچوں کی فطرت سلیمہ میں داخل ہو کر اُن کی عادات کا حصہ بن جائیں۔ تاکہ تبدیلِ ذہنیت کی نوبت ہی نہ آئے اس تربیت کا جو اثر اُن کی آئندہ زندگی پر پڑے گا۔ وہ اربابِ بصیرت سے پوشیدہ نہیں۔

مختار — غلام مصطفیٰ۔

# غزل

گزر بے خوف، اگر کرنے کے قابل کام ہے — ورنہ گرائے دل اسے ہمت کا یہ پیغام ہے
ذکرِ آزادی عبث ممکن جب آزادی نہیں — کیوں اسے تڑپائیے کوئی جو اسیرِ دام ہے
بہرِ آغازِ عمل درکار ہے ہمت کا جوش — اور تو افسردۂ اندیشۂ انجام ہے
کامیابی کے وسائل پر بھی ڈالی ہے نظر؟ — قابلِ الزام خود تو ہے اگر ناکام ہے
ظرف جو رکھتے ہیں، وہ ہوتے نہیں محتاجِ ظرف — کوئی مستِ شوق ہے اور کوئی مستِ جام ہے
رونقِ صبحِ جوانی کی عبث ہے اب تلاش — آمدِ پیری نہیں ہے زندگی کی شام ہے
میری محویت نہیں ہے پردہ دارِ رازِ عشق — دل میں جس کی یاد ہے لب پہ اسی کا نام ہے
دل کا ملنا تو کہاں جب آنکھ تک ملتی نہیں — مجھ سے اس ناآشنا کا ربط اک الزام ہے

فتنے برپا کر رہا ہے دم بدم نیرنگِ حسن
اور وحشتؔ مفت کوئے عشق میں بدنام ہے

وحشت

# غزل

اصطلاحِ عاشقی میں وصل جس کا نام ہے — خود فراموشانِ الفت پر وہ اک الزام ہے
رنگ و بوئے گل کا پردہ کیا چھپا سکتا تجھے — دیدۂ دیدار جو پر مفت کا الزام ہے
ساکنِ میخانہ پر چودہ طبق روشن ہوئے — سامنے آئینۂ عالم نمائے جام ہے
میں تو ہوں مستِ ہوائے جلوۂ دیدارِ دوست — کس کو فکرِ شیشہ ہے کس کو خیالِ جام ہے
اس کو فکرِ دردِ دل میں اپنے دردِ دل سے خوش — چارہ گر بیمار ہے لیکن مجھے آرام ہے
دستِ وحشت پھر بڑھا چاکِ گریباں کی طرف — عقلِ ناداں پھر گرفتارِ خیالِ خام ہے

حسنِ پنہاں کو ہے جب منظور پھر اپنی نمود
اے ظفرؔ میری نظر پھر کس لئے بدنام ہے

ظفر ہاشمی

# محفلِ ادب

## قدیم اُردو

حیدرآباد دکن میں ایک بزرگ گزرے ہیں جو میراں جی خدانما کے نام سے مشہور تھے۔ انہوں نے بہت سے رسالے دکنی زبان میں معرفت وسلوک میں لکھے ہیں اُن کی وفات ۱۰ جمادی الاول ۱۰۸۰ ہجری میں ہوئی۔ افسوس ہے کہ تذکروں میں اُن کی تصانیف کا کچھ ذکر نہیں پایا جاتا۔ حالانکہ ہمارے نقطۂ خیال سے اُن کی بڑی کرامت یہ ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب کے مولف ہیں جو اردو ادب کی تاریخ میں قدر و منزلت کے لائق ہے۔ اس کتاب کا نام "شرحِ تمہیدِ ہمدانی" یا "شرحِ شرحِ تمہید" ہے۔ دو ایک مقام سے چند سطریں یہاں نقل کی جاتی ہیں تاکہ اُس وقت کی زبان کا صحیح اندازہ ہوسکے:-

"اے عزیزاں اے بات نہیں سنیاں، بادشاہاں گھوڑا مستعد کئے باج نہیں سوار ہوتے۔ ہور گھوڑے میں کج کھوٹ اچھے تو بھی قبول کرتے۔ یعنی پیر کے عشق میں پختا ہوئے باج خدا کے عشق میں نہ آسکسی ہور دیکھ نا سکسی۔ اگر عشقِ خالق نداری بارے عشقِ مخلوقے مہیا کن۔ اس کا معنا خدا کی پچھانت کابل نہیں تو اول اپنی پچھانت کر۔ سوائے بات یوں ہے کہ آفتاب کا ذات نواز نہارا ہے ہور اُس کا اجالا جالنہار آہے۔ یعنی دوست نو نوازنہارا ہور خوبیاں دینہارا، ولے اُس کا محبت اُسے دگداتا ہے یعنی معشوق کا محبت عاشق کو گالتا ہے۔ اس کے فراق میں۔ اے مقام ایسا ہے جو عاشق معشوق باج جی نہ سکے۔ باج دیکھے معشوق کا صورت عاشق کیاں انکھیاں کون جالتا ہے ہور اپنا رنگ کرتا ہے۔" ــــ "افسوس سب خلق قرآن کا ظاہر معنا سمجھے ہور تسلی ہوئے۔ اے سب قرآن کا چھڑ کا پہ دیکھے ولے مغز نہیں چاکھے۔ نبی کے قرآن کندوری ہے خدا کی زمین میں نبی علیہ السلام تھی سن اس جماعت کوں کیا منا وتے سو خدا کیا۔ قولہ تعالیٰ یارَبِّ اِنَّ قَوْمِی اتَّخَذُوا هٰذَا الْقُرْآنَ مَهْجُورًا" اس کا معنا، یا بار خدا التحقیق اے جماعت قرآن پھڑنا منگتے ہیں۔"

"اُردو"

---

۱ نقص ۲ جلانے والا ۳ ڈگمگاتا ۴ گلاتا ہے ۵ جلاتا ہے ۶ چھلکا ۷ دسترخوان ۸ پڑھنا۔

# اِنسان اور کائنات

کیا تجھ کو خبر ہے ترا دشمن ہے فلک کیوں　　معلوم بھی ہے تیرے مخالف ہیں ملک کیوں
مجبور ہیں وہ صاحبِ کردار ہے تو ہی
مختار ہے تو ہی

کیوں شام و سحر ہیں ترے نقصان کے درپے　　اے زندۂ جاوید! تری جان کے درپے
غصہ ہے انہیں کیوں تری قسمت میں بقا ہے؟
تو چیز ہی کیا ہے؟

کیوں درپئے آزار زماں بھی ہے مکاں بھی؟　　میں تجھ کو بتا سکتا ہوں یہ رازِ نہاں بھی
تھا غرّہ انہیں وسعت و پہنائی پہ کیا کیا!!
جو تُو نے مٹایا

یہ بُت کدۂ ہست کے ایمان کے دشمن　　ایمان کے دشمن ترے عرفان کے دشمن
ہے اِن کو حسد کیوں تجھے وجدان ملا ہے؟
ایقان ملا ہے؟

امین حزیں　　"نگار"

# ماں کی محبّت

ایک قدیم قصہ اس طرح پر ہے کہ دنیا کی پیدائش کے وقت ایک فرشتہ زمین پر آیا۔ اور واپس ہونے سے پہلے آسمان پر لے جاتے کے لئے کوئی چیز تلاش کرنے لگا۔ تین چیزیں ایسی تھیں جنہوں نے اس سفید بازو والے پیغام بر کی توجہ کو اپنی طرف منعطف کرایا۔

ایک خوبصورت پھولوں کا گلدستہ جو دنیا کے ایک خوبصورت ترین اور شاداب ترین باغ میں سے چنے گئے تھے۔ ایک چھوٹے بچے کی مسکراہٹ جو آفتاب کی ایک شعاع سے کھیل رہا تھا اور ماں کی محبت کیونکہ صرف ماں کی محبت یکساں رہتی ہے اور ایسی پاک اور دائمی پائی گئی ہے جیسے کہ وہ چشمے جو خدائے تعالیٰ کے تخت کے قریب بہتے ہیں آسمان پر تمام فرشتے اکٹھے ہوگئے اور بالاتفاق چلّا اُٹھے "دنیا میں کوئی چیز آسمان کے لئے کافی پاک نہیں ہے سوائے ماں کی محبت کے۔"

یہ ایک ایسی تعریف تھی جس کے اندر ایک زبردست خیال پوشیدہ تھا۔ اور ہر زمانہ میں نوعِ انسانی کا تجربہ رہا ہے

کہ اس نہایت قدیم قصے میں جن فرشتوں کا حوالہ ہے انہوں نے اُس پیغام میں مبالغہ نہیں کیا۔

"تجلّی"

## ایک اُستاد کی تصویر

مجھے اپنے بچّوں کے لئے جس استاد کی ضرورت ہے وہ ضرور دنیا میں کہیں نہ کہیں ہے اور میں نے اپنے خیال میں اُس کی ایک تصویر کھینچ لی ہے تاکہ میں اُسے پہچان لوں جب اُس سے ملاقات ہو۔

اُس کو بچوں کی فطرت پر کمل اور مستقل ایمان ہے۔ اُسے یقین ہے کہ اُن کی فطرت لازمًا اچھی ہے لیکن یہ نہیں کہ بچوں کے قصوروں کی جانب سے اندھا ہو یا اُن کی دلپذیر باتوں سے غیر ضروری طور پر متاثر ہو اُسے مسکرانا آتا ہے اُس کا تبسم آنکھوں سے شروع ہوتا ہے، ذراسی دیر تک اُس کے چہرے کو روشن کرتا ہے اور پھر مسرت کی لہروں میں تبدیل ہو کر کانوں تک پہنچ جاتا ہے۔ ایسا تبسم جو رقصاں آنکھوں اور چمکتے دانتوں کو منور کردے ——— ایک وسیع ہمہ گیری دلی تبسم

اُس کی خاموشیاں عمیق ہوتی ہیں۔ ناراضی کی خاموشی نہیں جو زود رنج لوگوں میں ہوتی ہے بلکہ ایک قوت والے کی پُرغور اور لبریز خاموشی۔ اُس بڑی اٹل چٹان کی خاموشی جو موسموں کے تغیر اور دھوپ اور طوفان سب سے بے نیاز کھڑی رہتی ہے۔ وہ خاموشی جسے بچّے قوت کی دلیل سمجھتے ہیں ——— دوستانہ، پُر فکر اور مطمئن پُرسکون جب وہ بچوں کو پڑھاتا ہے تو اُن سے تعارض نہیں کرتا، نہ اُن سے نہ اُن کے کام سے۔ وہ جانتا ہے کہ ایسا کرنا گویا اپنے ٹٹولتے ہوئے دماغ کو اُن کے دماغ پر حاوی کرنا ہے۔ ایک سایہ کو تاریکی پر حاوی کرنا۔ اس لئے وہ پیچھے ہٹ کر کھڑا ہوتا ہے تاکہ اُس کی روشنی صاف طور پر چمکے۔

حقیقی استاد کا رویہ اپنے کام کی جانب عجز کا ہوتا ہے وہ جانتا ہے کہ اُس کی تعلیم کا موضوع خالق کی ایک صنعت ہے اور اُس میں ایسے بھید ہیں جن پر شک کرنا اُس کا کام نہیں۔ اسے صرف راستہ صاف کرنا ہے تاکہ وہ خود ظاہر ہو سکیں۔ وہ ہمیشہ اس امید میں کام کرتا ہے کہ جلوہ کی رونمائی ہو۔ اُس کا طرز عمل سائنٹیفک ہے۔ وہ اپنے علم کا ادعا نہیں کرتا۔ وہ آج کا قول قبول کرتا ہے اور ایک غیر جانبدار جویا دماغ کے ذریعہ کل کے لئے کام کرتا ہے ایک طالب حق ہے ادعائے حق نہیں کرتا۔ جہاں وہ ہوتا ہے بچّے خوش ہوتے ہیں وہ اُس کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں وہ اُس کی آمد و رفت پر نظر رکھتے ہیں۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اُس سے انہیں دلچسپی ہے۔ جو کچھ وہ کرتا ہے اُن کی

آرزو ہے کہ وہ بھی کریں یہ بالکل سچ ہے کیونکہ وہ اُن سے محبت کرتا ہے۔ جب کوئی اُس کے طرزِ عمل پر شک کرتا ہے تو وہ استقلال سے اپنی جگہ قائم رہتا ہے کیونکہ اُس میں وہ اختیار ہے جو علم اور تجربہ سے پیدا ہوتا ہے وہ کبھی ایسی بات نہیں کرتا جو اُس کے خیال میں بچوں کے مفاد کے خلاف ہو اور اُس کے تمام تعلقات میں یہی اصول اُس کی رہنمائی کرتا ہے۔ میرا یہ اُستاد کھیلنا جانتا ہے اُس کا کوئی نہ کوئی تفریح کا شغل ضرور ہے۔ جب اُس کے آرام کا وقت ہوتا ہے تو وہ اُس کی طرف متوجہ ہوتا ہے اور اُس کے قدم تیز تیز پڑنے لگتے ہیں جب وہ خود کو اس میں گم کر دیتا ہے تو وہ زیادہ اچھی طرح کام کر سکتا ہے کیونکہ اُسے آرام کرنا آتا ہے اُس کا ایک نصب العین ہے جس کی روشنی میں وہ دنیا کو دیکھتا ہے۔ دنیا جو عمدہ ارادوں اور شاندار کارناموں سے منور ہے۔ میرا اُستاد ضرور کہیں نہ کہیں اس دنیا میں موجود ہے۔ تم بھی اپنے لئے ایسا ہی استاد تلاش کرو۔

(انجیلو پطری)

"تعلیم و تربیت"

---

# بچّوں کی معصوم دنیا میں

## نندیا پور

دُور بہت ہی دُور یہاں سے — اور اس سے بھی دُور
ندی اک نکلی ہے جہاں سے — اور اس سے بھی دُور
دلدل ہے گہری سی جہاں پر — دلدل سے بھی دُور
جنگل میں ہے بڑھیا کا گھر — جنگل سے بھی دُور
یاد ہے اُس کو ایک کہانی — ہے اُس میں اک حُور
حور یہ ہے اک ملک کی رانی — ملک ہے نندیا پور
اس جنگل کو دیکھوں گا میں — جنگل سے بھی دُور
حُور کے ملک میں جاؤں گا میں
یعنی نندیا پور

افسر

"نگار"

# تبصرہ

## کتب

**انشائے جدید** مصنفہ جناب محمد علی خاں صاحب اثر منصرم سشن کورٹ ریاست رام پور۔ یہ کتاب اُن اولین کتابوں میں سے ہے جو آج کل جدید فارسی زبان اور جدید طرزِ تحریر کے مطابق لکھی جا رہی ہیں انشائے قدیم کا طغرائے امتیاز تکلف اور مبالغہ، صنعت اور قافیہ تشبیہات اور استعارات تھے لیکن انشائے جدید میں سب سے بڑی خوبی یہ سمجھی جاتی ہے کہ وہ سادہ اور سریع الفہم ہو، تکلف اور طوالت سے پاک ہو اور یہاں تک حقیقی اور مطابقِ فطرت ہو کہ بالکل مکالمہ معلوم ہونے لگے۔ اس کتاب کے مصنف ایک نکتہ سنج ادیب ہیں۔ انہوں نے اس کو ادب جدید کا ایک گران قدر ذخیرہ بنا دیا ہے۔ مسلم یونیورسٹی نے اسے ایف، اے کے نصاب تعلیم میں داخل کر لیا ہے، الہ آباد یونیورسٹی میں بھی اس کی منظوری زیرِ غور ہے، ہماری رائے میں پنجاب یونیورسٹی کو بھی اس کتاب کی قدر کرنی چاہیئے۔ حجم ۱۱۴ صفحات ہے قیمت تحریر نہیں کی گئی ملنے کے پتے یہ ہیں :۔

(۱) محمد علی خاں صاحب اثر خسرو باغ روڈ ریاست رام پور (۲) مینجر مسلم یونیورسٹی بک ڈپو علی گڑھ

**پیکرِ وفا**۔ مرحومہ خاتونِ اکرم صاحبہ کا ایک کامیاب اور مفید افسانہ ہے جس میں عورتوں کے اُس احترام کو واضح کیا گیا ہے جس کی تعلیم مذہب اسلام نے ہمیں دی ہے۔ مرحومہ کے دردمند دل میں اپنی صنف کے لئے ترقی اصلاح اور حفاظتِ حقوق کا ایک بے پایاں جذبہ موجزن تھا۔ اس افسانہ میں جہاں عورتوں کو انہوں نے خودداری اور وفاشعاری کی تعلیم دی ہے وہاں مردوں کو بھی انصاف پسندی اور نیک سلوک کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اندازِ بیان دردانگیز اور عبارت سادہ اور شگفتہ ہے۔ کتاب آرٹ کاغذ کے ۴۸ صفحات پر ختم ہوئی ہے، سرورق سنہری اور رنگین ہے اور قیمت چھ آنے مقرر کی گئی ہے مینجر "عصمت" دہلی سے طلب فرمایئے۔

**ابنِ یمین** شعرائے ایران میں سعدی کے علاوہ ابنِ یمین ہی وہ شاعر ہے جس نے اخلاقی شاعری میں نام پیدا کیا اور یہ پہلی کتاب ہے جس نے اس معلمِ اخلاق کو تاریخی حیثیت سے اور نمایاں طور پر اردو زبان جاننے والوں میں متعارف کرایا ہے۔ اصل کتاب ایک ایرانی مصنف رشید یاسمی نے لکھی ہے اور مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے اُسے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ کتاب کے دو باب ہیں پہلے باب میں سوانحعمری ہے اور دوسرے باب میں اخلاق مذہب اور شاعری سے بحث ہے۔ مولوی عبدالسلام صاحب کی تحریر مسلمہ طور پر دلکش اور دل پسند ہے۔ سوا دو سو صفحے کی کتاب کی قیمت سونی کمپنی لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۱۱۹ لاہور سے منگایئے۔

**مصنوعی بیوی**۔ مشہور و معروف مغربی افسانہ نگار آر۔ ایچ پول کے ایک دلکش ناول کا اردو ترجمہ ہے جس کے مترجم جامعہ عثمانیہ کے تعلیم یافتہ نونہال مولوی عباس حسین صاحب لطفی ہیں خاکہ کی سادگی، فسانہ کی دلچسپی اور ترجمہ کی خوبی قابلِ تعریف ہیں حجم ۱۱۴ صفحات اور قیمت ۱۲ ہے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ۔ حیدرآباد دکن۔

## رسائل

**"مجلۂ مکتبہ"**۔ مولوی محمد عبدالقادر صاحب سروری ایم اے ایل ایل بی کی ادارت میں ریاست حیدرآباد دکن سے شائع ہونا شروع ہوا ہے۔ پہلا پرچہ ہر پہلو سے قابلِ قدر ہے۔ مضامین مفید اور پُر از معلومات ہیں اور لکھائی چھپائی اور کاغذ بہت عمدہ ہے۔ اس نمبر کے ۹۰ صفحات ہیں اور سالانہ قیمت چار روپے مقرر کی گئی ہے پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ اسٹیشن روڈ حیدرآباد دکن

**"ساقی"** اس وقت تک اس رسالے کے دو نمبر ہماری نظر سے گزرے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ترتیب و تدوین ہونہار ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ ترقی کرے گا۔ تصاویر کے انتخاب سے بھی مذاقِ سلیم کا اظہار ہوتا ہے۔ سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ مینیجر "ساقی" ملتان سے طلب فرمائیے۔

**"آواز"** جناب عاجز ملانوی نے یہ رسالہ ملانہ ضلع انبالہ سے نکالا ہے۔ اس میں معاشرتی اصلاحی، تمدنی اور زراعتی مضامین شائع ہوتے ہیں لیکن رسالے کا خاص مقصد صرف زراعتی ترقی و اصلاح ہے "آواز" کے چار پرچے شائع ہو چکے ہیں اور ہم دیکھتے ہیں ہر پرچہ سابق کی بہ نسبت اچھا ہوتا ہے سالانہ چندہ دو روپے ہے۔

**"دیہاتی"** غریب باشندگانِ دیہات کی ترجمانی اور معاونت کی غرض سے جاری کیا گیا ہے محمد معظم صاحب قریشی بی اے۔ ایل ایل بی وکیل جھنگ اس کے اڈیٹر ہیں جو نہایت قابلیت سے اسے مرتب کرتے ہیں۔ زمیندار طبقہ کی فلاح و بہبود کے لئے ایسے پرچوں کی اشد ضرورت ہے۔ باشندگانِ دیہات کو اسے ضرور کامیاب بنانا چاہئے سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ مینیجر رسالہ دیہاتی جھنگ سے منگائیے

**"انجنیرنگ"** اس رسالے کی اشاعت کا مدعا یہ بتایا گیا ہے کہ انجنیر حلقہ میں کام کرنے والوں کے درمیان میل جول کا سلسلہ پیدا کرکے اس پیشہ کی ترقی اور بہتری کے اسباب سوچے جائیں اکثر مضامین فن سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے اُن پر تنقید کا حق ہم اپنے لئے نہیں سمجھتے۔ البتہ یہ امر اس کی خوبی کی کافی ضمانت ہے کہ ڈاکٹر گیان چند شرما پرنسپل وکٹوریہ ٹیکنیکل انسٹیٹیوٹ لاہور اس کے سرپرست ہیں۔ سالانہ قیمت چار روپے۔ پتہ: کمرشل بک کمپنی۔ چوک برانڈرتھ روڈ ریلوے روڈ لاہور۔

**"عصرِ جدید"** مشرقی ہندوستان یا بنگال کا روزانہ قومی اخبار ہے۔ اس میں نہایت قابلانہ سیاسی، اقتصادی اور ادبی مضامین چھپتے ہیں۔ زبان صاف اور شستہ ہوتی ہے۔ ادیب فاضل مولوی چراغ حسن صاحب حسرت اڈیٹر ہیں۔ سالانہ چندہ گیارہ روپے ہے۔ پتہ: مینیجر "عصرِ جدید" چونا گلی فیرس لین نمبر ۵، کلکتہ۔

# فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ بابت ماہِ اگست ۱۹۲۸ء نمبر ۲

تصویر:- فرشتے


| نمبر شمار | مضمون | صاحبِ مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جہاں نما | | ۵۷۸ |
| ۲ | فرشتے | منصور احمد | ۵۸۲ |
| ۳ | روما اور زمانۂ وسطیٰ | بشیر احمد | ۵۸۳ |
| ۴ | تجلیات (نظم) | حضرتِ اثر صہبائی | ۵۹۲ |
| ۵ | ملکِ بابل | جناب مولانا محمد حامد صاحب دہلوی | ۵۹۳ |
| ۶ | قلبیات (نظم) | حضرت امین حزیں | ۶۰۳ |
| ۷ | خالد (افسانہ) | جناب مولوی عبدالشکور صاحب بریلوی | ۶۰۴ |
| ۸ | چاند سے جھڑپ (نظم) | حکیم آزاد انصاری | ۶۲۳ |
| ۹ | جھوٹ (افسانہ) | منصور احمد | ۶۲۴ |
| ۱۰ | شاعر کی التجا (نظم) | جناب ذوقی بی، اے علیگ | ۶۳۳ |
| ۱۱ | جوہری (افسانہ) | جناب حاجی محمد صادق صاحب صادق ایوبی | ۶۳۴ |
| ۱۲ | کنول (نظم) | جناب میر سعادت حسین صاحب نجیب | ۶۳۸ |
| ۱۳ | ابدی خواب (افسانہ) | جناب روشن صدیقی | ۶۳۹ |
| ۱۴ | پیاری دوستی (نظم) | "دگاریز" | ۶۴۱ |
| ۱۵ | عمل اور علم | منصور احمد | ۶۴۲ |
| ۱۶ | محفلِ ادب | | ۶۴۴ |
| ۱۷ | تبصرہ | | ۶۴۸ |

# جہاں نما

## شہریارِ افغانستان کی مراجعتِ وطن

تاجدارِ افغانستان اور اُن کی ملکہ سرحدِ پشاور سے لے کر دارالسلطنتِ کابل تک ایک عظیم الشان جلوس کے ساتھ اُس قابلِ یادگار سیاحت سے کامیاب و کامران اپنی قوم اور اپنی رعایا میں واپس پہنچے جو غالباً اُن تمام شاہی سیاحتوں سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے جو آج تک بادشاہانِ مشرق نے کی ہیں۔

قندھار پہنچنے پر اکتیس توپوں کی سلامی اتاری گئی اور سرکاری طور پر خیر مقدم ہونے سے پہلے شاہ امان اللہ ایک خانقاہ کی زیارت کے لئے تشریف لے گئے۔

ایک مختصر سی تقریر کے دوران میں انہوں نے کہا کہ یورپ اور مشرقِ قریب کی سیاحت سے میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ ان ممالک نے نظم و نسق کے دستور و آئین کو کہاں تک ترقی دی ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک ان مشاہدات کو اپنے ملک میں نافذ نہ کروں گا جب تک کہ اُن پر اپنی قوم کے نمائندوں کے ساتھ مل کر بحث و مشورہ نہ کر لوں۔

انہوں نے کہا کہ جن ممالک کی میں نے سیاحت کی ہے وہاں کی قومی زندگی میں جو حصّہ عورتیں لے رہی ہیں اُس کو دیکھ کر میں بہت متاثر ہوا ہوں۔ وہ ترقی کی ہر تحریک میں نمایاں طور پر شریک تھیں۔

اُس لائحہ عمل کا سب سے ضروری جزو جسے امیر اپنے ملک میں نافذ دیکھنا چاہتے ہیں رسل و رسائل کے ذرائع کی اصلاح ہے۔

قندھار سے براہِ ہرات، فرح، جریش اور شیخ آباد، کابل تک اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت رعایا کے اُس ہجوم کی مسرت و عقیدت کو شرفِ قبولیت بخشتے رہے جو ملک کے کونے کونے سے نکل کر اُن مقامات پر جمع ہو گیا تھا۔

مسرت و شادمانی کے اُن نظاروں کی ایک دھندلی سی تصویر "سول اینڈ ملٹری گزٹ" کے نامہ نگار خصوصی نے اپنے الفاظ میں کھینچی ہے جن کی نمائش اعلیٰ حضرت اور علیا حضرت کے ورود پر کابل میں ہوئی:-

میں کابل کے پُر رونق بازاروں میں کھڑا حیرت و استعجاب کے ساتھ افغانستان کے مختلف الہیئت مگر ہم خیال لوگوں کو دیکھ رہا تھا جو دلی مسرت کے ساتھ اپنے بادشاہ اور ملکہ کو خوش آمدید کہنے کے لئے جمع ہوئے تھے۔

شہر کے قدیم اور جدید دونوں حصّے پھولوں اور جھنڈیوں سے آراستہ کئے گئے تھے اور ہر شخص کے چہرے پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

لوگوں کے ہجوم میں جو صبح ہی سے آکر اُن مقامات پر جم گئے تھے جہاں سے شاہی جلوس کا گزر ہونے والا تھا تمام ایشیائی قوموں کے افراد موجود تھے: کرد۔ بخاری۔ ایرانی اور یہودی۔

کئی دنوں سے لوگ ملک کے ہر کونے سے جوق در جوق کابل میں آ رہے تھے۔ سنگلاخ اور دشوار گزار کوہستانوں اور سرسبز و شاداب وادیوں میں سے نکل کر حریت و قومیت کے نوزائیدہ جذبات پر لبیک کہتے ہوئے آ رہے تھے۔

تمام رات شہر میں جشن برپا رہا۔ ہر دوکان کا رنگ سبز تھا اور ہر دوکان میں کم از کم بارہ رنگین لیمپ روشن تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے آج رات کوئی نہیں سویا۔

خوبصورت محرابوں سے جو بازاروں میں اس تقریب پر جگہ جگہ تعمیر کی گئی تھیں بڑے بڑے فانوس لٹک رہے تھے۔ اور لوگوں کے رہنے کے مکانات کی جھنڈیوں اور روشنیوں کی نمائش عجب شانِ تقابل دکھا رہی تھی۔

شہر کی آرائش و زیبائش کے لئے ایک فنڈ کھول دیا گیا تھا جس میں لوگوں نے نہایت فراخ دلی سے چندہ دیا۔ اسی لئے تقریباً ہر شہری یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس جشن میں اُس کا بھی ایک حصّہ ہے۔

بادشاہ اور ملکہ کے آنے سے بہت پہلے پولیس زرق برق وردیاں پہن کر جلوس کے گزرنے کے راستوں میں اپنی اپنی جگہ پر کھڑی ہو گئی تھی۔

آخر صبح دس بجے طیاروں کی پرواز کا شور سنائی دیا اور پھر آسمان کی صاف اور روشن فضا میں چھ طیارے اڑتے نظر آئے۔ یہ لوگوں کے جذبات کو گرمانے کے لئے ایک اشارہ تھا جس سے نعرہ ہائے مسرت کی ایک لہر اُٹھی اور شہر کے اس سرے سے اُس سرے تک پہنچ گئی۔

بادشاہ اور ملکہ ایک خوبصورت اور مصفا رولس رائس گاڑی میں بیٹھ کر جس کا رنگ ہلکا سفید تھا شہر میں داخل ہوئے سواروں کے محافظ دستے نے گاڑی کو گھیر رکھا تھا اور اُن کے اسلحہ کی آواز اور وردیوں کے گوناگوں رنگ عجب کیفیت پیدا کر رہے تھے، جلوس مشرق و مغرب کے فرق کو نمایاں کر رہا تھا۔

اعلیٰحضرت اور علیاحضرت جن کے دلوں میں مشرق و مغرب کی کئی ایک دارالسلطنتوں کے استقبالوں کی یاد ابھی تازہ تھی ان نظاروں کو دیکھ دیکھ کر اُس دلی مسرت سے مسکرا رہے تھے جو وطن میں پہنچ کر پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں نے اس قدر پھول برسائے کہ موٹر کار اُن میں تقریباً چھپ گئی۔

اعلیٰحضرت کھڑے ہو گئے اور انہوں نے رعایا کے اظہارِ عقیدت کا شکریہ ادا کیا۔ ملکہ کے چہرے پر نیلے رنگ کا ایک ہلکا

سا نقاب تھا اور وہ جھک جھک کر لوگوں کے سلام قبول فرما رہی تھیں۔

پھر جلوس قصرِ دلکشا کی طرف روانہ ہوگیا جہاں ہجوم اور بھی زیادہ تھا۔ یہاں خیر مقدم کے طور پر نائب السلطنت نے ایک سپاس نامہ پڑھا۔ اسی شام قصرِ دلکشا میں ایک شاندار سرکاری ضیافت کا بھی انتظام کیا گیا۔

جشن تین روز تک جاری رہیں گے۔ اسی اثنا میں ملکہ ثریا خانم کا خیر مقدم خواتین کابل کی طرف سے ہوگا۔ آج وہ قصرِ علیا میں ایک ضیافت پر مدعو ہیں۔ اور کل شام کابل کے مدرسۂ نسواں کی طالبات اُن کو ایک جلسہ دیں گی۔

## اخباروں کی جنگ

فلیٹ سٹریٹ آج کل میدانِ کارزار بنی ہوئی ہے اور ایک دلچسپ اور پُر لطف جنگ وہاں جاری ہے۔ "ڈیلی میل" اور "ڈیلی ایکسپریس" انگلستان کی صحافتِ عامہ کے دو سب سے بڑے نمائندے ہیں۔ ان دونوں اخباروں کے درمیان روزانہ اشاعت اشتہارات کی آمدنی اور مستقل خریداروں کے لئے مفت انشورنس کے انتظامات کے رقیبانہ دعاوی پر ایک زبردست جنگ چھڑی ہوئی ہے۔ اول الذکر نے اپنے صفحات میں ایک تصدیق شائع کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کی روزانہ فروخت ۱۹۱۹۵۷۰ ہے اور آخرالذکر کی تعداد اشاعت ۱۳۴۵۳۷۱ تصدیق ہوئی ہے۔

ایک تیسرا اخبار "مارننگ پوسٹ" بھی شریکِ جنگ ہوگیا ہے اور ظاہرا طور پر اس وقت "میل" کے خلاف "ایکسپریس" کا ساتھ دے رہا ہے جیسا کہ اس اخبار کے مندرجۂ ذیل اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے حالات نے نہایت شدید صورت اختیار کرلی ہے:

"ڈیلی میل" اُس جھگڑالو اور اُس اکڑباز روزانہ اخبار نے کل کی اشاعت میں ایک افتتاحیہ لکھا ہے جس میں اُس نے اشتہار دینے والوں اور اشتہارات کے ایجنٹوں کو اپنا کاروبار چلانے کا ایک نیا سبق دیا ہے۔ یہ سبق بڑا آسان ہے۔ اُس نے انہیں مشورہ دیا ہے کہ وہ اپنے تمام ذرائع انتشارات کو یک قلم ترک کرکے "ڈیلی میل" میں اشتہار دینا شروع کردیں۔ اسی مضمون کے دوران میں "مارننگ پوسٹ" پر بھی ایک حملہ کیا گیا تھا جس کا جواب دینے کا ہم یہاں ارادہ رکھتے ہیں۔

"مارننگ پوسٹ"، ایک اعلیٰ درجہ کا اخبار ہے جس کا سرپرست صرف قوم کا تعلیم یافتہ اور عالی دماغ طبقہ ہے "ڈیلی میل" کی طرح اُس کی زندگی کا مدار انشورنس اور کوپن کے ٹکڑوں پر نہیں ہے۔

"مارننگ پوسٹ" اپنی ترقی پر نازاں ہے۔ وہ ہر مہینے اپنے مشتہرین کو اخبار کی اشاعت سے مطلع کرتا رہتا ہے اور وہ اپنے خبروں کے کالموں کو اشتہارات کی مقدار کے ماتحت نہیں رکھتا۔

"ڈیلی میل" اخبار کے ایک اندرونی صفحہ کے لئے نوسو پونڈ وصول کرتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں "ڈیلی ایکسپریس" چھ سو پچھتر پونڈ لیتا ہے۔

۱۹۲۲ء سے اب تک ڈیلی میل کی اشاعت بقدر ۹۴۵۹ پرچوں کے بڑھی مگر "ڈیلی ایکسپریس" کی اشاعت میں اسی عرصہ

کے اندر ۸۱۹۰۸۷ کا اضافہ ہوا۔ اگر اسی شرح سے ترقی جاری رہی تو بہت جلد اُس کی اشاعت "ڈیلی میل" سے اگر بڑھے گی نہیں تو اُس کے برابر ضرور ہو جائے گی۔

## بچّوں کے لئے ورزش گاہیں

جرمنی کے ایک سابق فوجی افسر میجر نیومین نیوروڈ نے برلن میں ایک نئی قسم کی ورزش گاہیں جاری کر رکھی ہیں۔ نیویارک کا ہفتہ وار اخبار "سائنس" لکھتا ہے کہ یہ ورزش گاہیں صرف اُن بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن کی عمریں ایک سال سے متجاوز نہیں ہوئیں۔

بچّوں کو اُن کی انائیں ورزش کا لباس پہنا کر یہاں لے آتی ہیں۔ یہ لباس بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ بچّوں کو مخمل سے منڈھی ہوئی میزوں پر لٹا دیا جاتا ہے اور انہیں ورزش شروع کرائی جاتی ہے۔ ہر بچّے کو میجر موصوف کا ایک ایک تربیت یافتہ مددگار ورزش کراتا ہے۔ ورزش کرانے والا بچے کے بازوؤں یا ٹانگوں کو پکڑ لیتا ہے اور میجر کے احکام پر اُن کو اسی طرح حرکت دیتا ہے جس طرح بڑی ورزش گاہوں کے لڑکے اپنے آپ ورزش کرتے ہیں۔ ان مشقوں کو جو اب عام بچوں کو کرائی جا رہی ہیں سب سے پہلے میجر نیومین نیوروڈ نے خود اپنے بچّوں پر آزمایا تھا۔ اُن کا خیال ہے کہ یہ مشقیں تمام بچّوں کے لئے مفید ہیں اور پانچ مہینے کی عمر سے شروع کی جا سکتی ہیں۔

جرمنی کے مدرسوں میں تقریباً ایک چوتھائی تعداد اُن طلبا کی ہے جن کی نخاع میں کم و بیش کوئی اہم نقص موجود ہے۔ میجر موصوف کی رائے میں اُس کا علاج و انسداد صرف بچپن کی ورزشوں سے ہو سکتا ہے۔ یہ مشقیں اُن بچوں کیلئے مفید سمجھی گئی ہیں جنہیں اعصاب کی بیماری ہو یا پیدائش کے وقت جن کے سر کو صدمہ پہنچا ہو۔ یہ ایک ایسا حادثہ ہے جسے اب اطبا غیر معمولی نہیں سمجھتے۔

## رنگ اور نیند

میونچ کی مجلسِ تحقیقاتِ نور نے حال ہی میں انکشاف کیا ہے کہ رنگ اور نیند میں باہم ایک رشتہ اور تعلق ہے۔ یہ تحقیقات اُن لوگوں کے لئے ضرور دلچسپی کا موجب ہوگی جو بے خوابی کے عارضہ میں مبتلا ہیں۔ اور یہ یوں بھی ایک عجیب بات ہے کہ نیند لانے میں بعض مخصوص رنگ حیرت انگیز طور پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ شیشوں پر نقاشی کرنے والے جب نیلگوں آسمانی رنگ کو استعمال کرنے لگے تو اُن کو وہیں نیند آگئی اور وہ سو گئے۔ دماغ کے مریضوں کے لئے پہلے بھی اطبا نیلی دیواروں اور نیلے پردوں والے کمرے کی اقامت تجویز کیا کرتے تھے، کیونکہ تسکین اور آرام دینے میں نیلا رنگ غیر معمولی طور پر موثر ثابت ہوا ہے۔

# فرشتے

کیا تمہارے لئے اتنا کافی نہیں کہ تمہارا پروردگار آسمان سے تین ہزار فرشتے بھیج کر تمہاری مدد کرے —— قرآنِ مجید

خدا نے فرشتوں کو اپنا قاصد بنایا جن کے دو دو تین تین اور چار چار پر ہیں۔ وہ اپنی مخلوقات کی بناوٹ میں جو چیز چاہتا ہے زیادہ کر دیتا ہے —— قرآنِ مجید

فرشتے وہی کرتے ہیں جس کا اُن کو خدا کی طرف سے حکم دیا جاتا ہے —— قرآنِ مجید

ہم فرشتوں جیسے کبھی نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے جذبات نہ مٹ جائیں —— ڈیکر

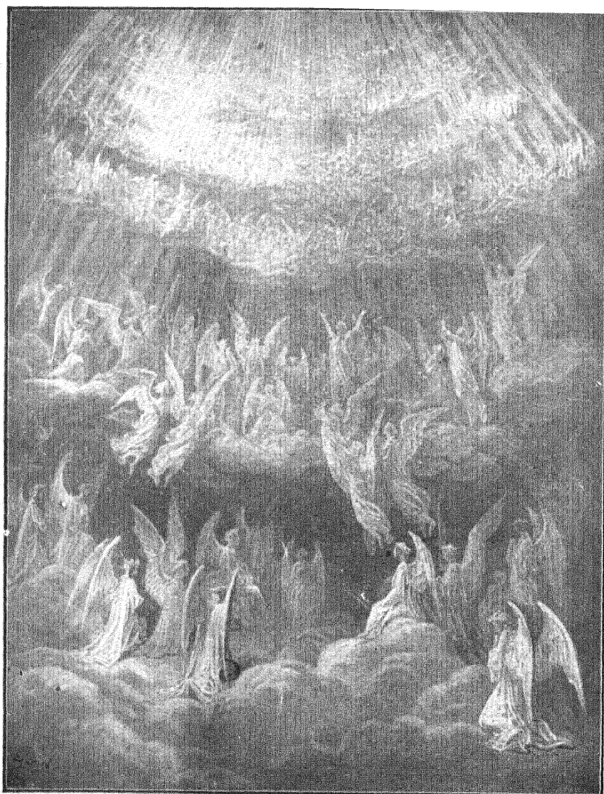
اس تیرہ خاکدان میں جہاں ہر وقت افکار کے بادل چھائے رہتے ہیں ہمیں علم بھی نہیں ہوتا اور فرشتے چپکے چپکے ہمارے ساتھ ہوتے ہیں ہماری آنکھیں اُن کے سفید سفید پروں کو آسمانوں میں اُڑتا ہوا دیکھتی ہیں اور حیران رہ جاتی ہیں —— میسی

وہ خاموشی کے پروں پر کس خوش آئند ادا سے رات کے خالی گنبد میں تیرتے رہے اور جھک جھک کر لیلائے شب کو گدگدی کرتے رہے یہاں تک کہ آخر وہ مسکرا پڑی —— ملٹن

اگر تم بیداری میں فرشتوں کی مصاحبت کی خواہش رکھتے ہو تو وہ ضرور خواب میں تمہارے پاس آئیں گے —— پرنٹس

احمق لوگ وہاں تک بڑھے چلے جاتے ہیں، جہاں فرشتے بھی پاؤں رکھتے ہوئے ڈرتے ہیں —— پوپ

منصور احمد



فرشتے

CALCUTTA
ART PG. WORKS,
LAHORE

# ملکِ بابل

اُس لق و دق میدان کو جس کا نام اہلِ یونان نے میسوپوٹے میا ( Mesopotamia ) رکھا تھا قدرت نے دو حصّوں پر تقسیم کیا ہے۔ اُس کا نصف حصّۂ شمالی سنگ لاخ ہے اور موسمِ برسات میں چراگاہ کا کام دیتا ہے۔ اولادِ اشر ( Assyrians ) کے وہاں آباد ہو جانے سے اسیریا ( Assyria ) مشہور ہو گیا۔ عرب اس خطّہ کو الجزیرہ کہتے ہیں۔ جنوبی حصّہ متعدد انہار کی وجہ سے غیر معمولی طور پر زرعی بن گیا تھا۔ اہلِ یونان اس کو بے بی لونیا ( Babylonia ) اور عرب العراق کہتے ہیں۔ اِس خطّہ میں قوم تورانی اور اولادِ سام کے آباد ہو جانے سے نصف حصّہ کا نام شومیر ( Sumer ) اور نصف کا نام اکدّ ( Akkad ) ہو گیا تھا۔ شمالی مشرقی حصہ کو اکدّ اور جنوبی مشرقی حصہ کو جو خلیج فارس کے گرد اور اُس کے جانب واقع تھا شومیر کہتے تھے۔ یہ دونوں خطّے دریائے دجلہ اور دریائے فرات کی جنوبی وادی میں واقع تھے اور کوئی قدرتی حدِ فاصل اِن دونوں خطّوں کے درمیان نہیں ہے۔ ان کے مغرب اور جنوب میں ریگستانِ عرب اور خلیجِ فارس واقع تھے۔ دریائے دجلہ غالباً اُن کی مشرقی حد تھی اور ایک خط اگر شہر سمارہ واقع دجلہ کے ذرا نیچے سے شہر ہت واقع فرات تک کھینچا جائے تو اسے شمالی حد سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ امر استعجاب سے خالی نہیں کہ باوجود ہزاروں برس کی سلطنت اور لاثانی شان و شوکت کے جن کا اثر آج تک ہر قوم و ملّت کے دل پر باقی ہے ملکِ بابل کی قدیم تہذیب و تمدّن کے آثار کا بڑا حصّہ فنا ہو گیا۔ آج سے کچھ پہلے ممالکِ بابل اور اسیریا کی تہذیب و تاریخ کا علم قطعاً محدود تھا۔ صرف توریت کی معدودے چند آیات، ہراڈوٹس[۱] اور زینوفن[۲]

---

۱؎ ہراڈوٹس مشہور سیاحی اور قدیم یونانی مورخ۔ فنِ تاریخ کا موجد ہے۔ ۴۸۴ء قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۵ء قبل مسیح میں فوت ہوا۔ اسیا میلی کارنیسس ( Helicarnassus ) واقع ایشیا کوچک کا باشندہ تھا جو کیریا ( Caria ) میں ڈوریا والوں ( Dorians ) کی ایک بستی تھی۔ اُس کی پیدائش کے زمانہ میں صوبہ کیریا کی حاکمہ دارا گشتاسپ ( Darius Hystaspes ) شاہِ ایران کی ایک سہیلی یا خواص ارتیمز ( Arthemes ) نام کی تھی۔

۲؎ زینوفن مشہور ایرانی مورخ و جنرل جس کی ذہانت و ذکاوت، فہم و فراست، حزم و احتیاط سے دس ہزار یونانی فوج کی بخیر و عافیت بعد ہزیمت واپسی ہوئی تھی۔ مورخ مذکور دارا ثانی شاہِ ایران (۴۲۴ تا ۴۰۴ ق م) کے خلاف اس کے بھائی سائرس کی طرف سے لڑا تھا۔

کے سرسری بیانات ۔ جوزیفس[۵۱] اور ٹی سیاس[۵۲] کی تصانیف جو بروسس[۵۳] بابلی کی تاریخ بابل کا اقتباس ہیں نیز دیگر یونانی اور لاطینی مورخوں کی مختصر تصانیف ہماری رہبر تھیں لیکن یہ مصالح اس قدر کافی نہ تھے جن کی امداد سے اُن ممالک کی تہذیب کا کامل اندازہ ہو سکتا یا صحیح تاریخ مرتب ہو سکتی ۔

بخلاف مصر بابل اور اسیریا کے دلفریب آثار جو سیاحوں کی کشش کا باعث ہو سکتے تھے نابود ہو چکے تھے لیکن اپنی فوجی قوت ۔ تعجب خیز بلند منار ۔ عالی شان محلات ۔ رشک ارم باغات ۔ انہار کے جال اور کرشمہ ہائے نجوم وسحر سے بنی آدم کے دلوں پر ایسا سکّہ بٹھایا تھا کہ آج تک اُن کے متعلق مبالغہ آمیز روایتیں بیان کی جاتی ہیں ۔ دریائے فرات اور دریائے دجلہ کی سالانہ طغیانی سے گو زمین غیر معمولی طور پر زرخیز بن گئی تھی تاہم انہار کا جال جب تک باقاعدہ نہیں پھیلایا گیا جان اور مال معرضِ خطر میں رہے اور اضلاع کے اضلاع ہفتوں بلکہ مہینوں غرقِ آب رہتے تھے ۔ بعد زوالِ سلطنتِ بابل انہار کی صفائی اور درستی میں غفلت اور تساہل سے وہی انہار جو محافظِ جان و مال تھیں غارت گر بن گئیں ۔ وہ عمارات جو متعدد نسلوں کی محنت ومشقت کی یادگار تھیں بہت جلد فنا ہو گئیں ۔ وہ نادر مصالح یعنی خشت وقیر جن کی خوبی کے باعث اس عہدِ عتیق کے کاریگروں نے بلند شاندار اور مشہور عمارات تعمیر کی تھیں عالمِ ہیولانی بلکہ کاغذی گھروندے کی طرح ناپائیدار اور بے ثبات ثابت ہوئے ۔ کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ ۔

بادشاہ بخت نصر ثانی[۵۴] کا قول ہے کہ مرمت کی طرف سے غفلت کی جائے تو پنتالیس سال میں اعلیٰ سے اعلیٰ

---

۵۱ جوزیفس مشہور یہودی مورخ پہلی صدی عیسوی میں گزرا ہے ۔

۵۲ ٹی سیاس داراب ثانی شاہ ایران ( Artaxerxes Memnon Alias Darius ii ) کا طبیب تھا ۔ بادشاہ مذکور کا عہد ۴۰۴ قبل مسیح سے ۳۵۸ قبل مسیح تک تھا ۔

۵۳ بروسس بابلی ۔ مورخ ہیئت دان اور پوجاری مندر مردوخ ۔ بروسس مذکور نے تاریخ بابل پیدائش عالم سے سکندر اعظم کے عہد تک قلمبند کر کے سکندر اعظم کی حضور میں پیش کی تھی ۔ بقول مورخ جوزیفس اہل بابل کو ناز تھا کہ واقعات متعلقہ ہیئت ۔ احکام نجوم اور تقویم وغیرہ طوفان نوح کے ایک سو پندرہ سال کے بعد سے سکندر اعظم کے عہد تک اُن کے پاس محفوظ ہیں حکیم ارسطو کو علم ہوا تو اُسے اُن کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا ۔ اپنے شاگرد کیلس تینیز ( Calesthenes ) سے فرمائش کی کہ جو سب سے صحیح نسخہ ہو اُس کے مطالعہ کے واسطے بھیجے چنانچہ بعد کوشش بسیار اُس نے ایک نسخہ بروسس بابلی سے حاصل کر کے اپنے اُستاد کو بھیجا اور خود بھی ایک رسالہ مرتب کیا جو ڈی کولو ( Decolo ) کے نام سے مشہور ہے ۔

۵۴ بخت نصر ثانی بادشاہ بابل ۶۰۴ سے ۵۶۱ قبل مسیح میں گذرا ہے ۔

اور مستحکم سے مستحکم عمارات کھنڈر ہو جاتی ہیں۔ اس قول سے تصور ہو سکتا ہے کہ دو ہزار سال تک غیر آباد اور کس مپرسی کی حالت میں رہنے سے اُن عمارات کی کیا صورت بن گئی ہوگی اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر دردِ سری اور مشکلات کا سامنا ہوا ہوگا۔

تمام عمارات منہدم ہو کر بدہیئت کھنڈروں کی صورت میں مبدل ہو گئی تھیں اور تند و تیز ہوا نے صحرا کے ریگ کو اڑا اڑا کر ان کھنڈروں پر لا ڈالا تھا حتی کہ ریگ سے تمام آثار پوشیدہ ہو کر ٹیلوں کی صورت بن گئے تھے دراصل قدرت نے اِن کھنڈروں کو ریگِ صحرا سے پوشیدہ کر کے اپنے فضل و کرم کا اظہار فرمایا کیونکہ مذکورہ کھنڈر اگر کھلے رہتے تو دریاؤں کی طغیانی اور برسات کے پانی کے اثر سے وہ گلی کتبے جو آج تاریخی دنیا میں ہمارے رہبر ہیں نیست و نابود ہو جاتے اور قیامت تک تاریخ بابل پردۂ خفا یا صحیفۂ مختوم کی صورت میں رہتی۔ ریگ کے طبق نے اُن کی ایسی حفاظت کی کہ کھنڈروں کے زیریں حصے سے آج عہدِ عتیق کے ہزاروں بے بہا مختلف الہیئت کتبے بت مہریں قبریں اور دیگر یادگاریں برآمد ہو چکی ہیں جن کے طفیل تاریخِ بابل پر کافی روشنی پڑ گئی ہے۔ اصل واقعات کے تاریکی میں رہنے سے یا لاعلمی کے سبب عموماً روایات مقبولِ خاص و عام ہو جاتی ہیں اور بعض اوقات ان روایات کی تحقیق سے اصل واقعہ کا انکشاف بھی ہو جاتا ہے۔

شہرِ موصل کے متصل متعدد ٹیلے ہیں۔ بعض پر عرب آباد ہو گئے ہیں اور نی زاناوہ آبادی کا یجوق کے نام سے مشہور ہے۔ ان ٹیلوں میں سے ایک پر ایک مسجد اور ایک قبر ہے جس کو وہاں کے باشندے مزارِ حضرت یونس علیہ السلام کہتے ہیں۔ گو یورپی سیاح اِس کو فرضی مزارِ حضرت یونس علیہ السلام سمجھتے ہیں تاہم شہرِ نینوا سے حضرتِ یونس[ؑ] کے جو تعلقات

---

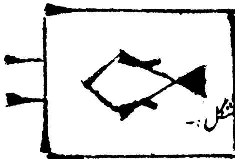
ؑ حضرتِ یونس علیہ السلام تغلط پلیسر شاہ اسیریا کے ہمعصر تھے جو ۷۶۲ء قبل مسیح میں گزرا ہے۔ شہرِ نینوا اس کا دارالامارت تھا احکامِ الٰہی کی تعمیل میں حضرتِ یونس شہرِ نینوا میں بغرضِ ہدایت تشریف لے گئے تھے۔ توریت میں آپ کے نینوا تشریف لے جانے کا واقعہ درج ہے وہ ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے یوناہ بن امتی کو خدا نے حکم دیا کہ نینوا جا کر وہاں کے باشندوں کو ہدایت کرو کیونکہ اُن کے اعمال ہماری ناخوشی کا باعث ہیں۔ یوناہ نے بجائے نینوا کے ترسیش (جنوبی اسپین) کی راہ لی اور جوپا (یافہ) پہنچ کر کشتی پر جو ترسیش جانے والی تھی سوار ہو گیا کچھ دور کشتی مذکور پہنچی تھی کہ خدا نے ایسا طوفان بھیجا کہ کشتی ڈوبنے لگی۔ ملاحوں نے یاس و ہراس سے اپنے اپنے معبود کو یاد کیا اور کشتی کو ہلکا کرنے کی غرض سے اجناس سمندر میں پھینک دیں۔ اس وقت یوناہ کشتی کے زیریں حصہ میں سوتا تھا۔ ناخدا نے جگا کر یادِ الٰہی کی ہدایت کی۔ پھر اہلِ کشتی نے قرعہ ڈال کر دریافت کیا کہ وہ غیر معمولی طوفان یوناہ کی وجہ سے آیا تھا ......... یوناہ کی درخواست پر اس کو سمندر میں پھینک دیا اور طوفان فرو ہوا۔ خدا کے حکم سے ایک مچھلی یوناہ کو نگل گئی اور تین شب و روز یوناہ مچھلی کے پیٹ میں رہا۔ یوناہ نے

(بقیہ حاشیہ صفحہ آئندہ)

رہے ہیں وہ ان ٹیلوں پر شہر نینوا کا شبہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھے۔ چنانچہ کھودنے سے ثابت ہوگیا کہ جس ٹیلے پر مزارِ مذکور ہے وہ قدیم شہر نینوا کا ایک حصہ ہے اور دیگر ٹیلے اِس عظیم الشان شہر کے محلے تھے۔ اسی طرح بغداد سے چالیس میل کے فاصلہ پر چند ٹیلے ہیں۔ اُن میں سے ایک کا نام وہاں کے عرب باشندے بابل بتاتے تھے تحقیق سے اُن کا قول پایۂ ثبوت کو پہنچا۔ بہر حال روایات ہی ذریعۂ سراغ ہوئیں۔

سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی سے اِن روایات نے یورپی سیاحوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا شدہ شدہ یورپ کی ہر بڑی سلطنت نے اپنے نمایندوں کو بھیج کر تحقیقات شروع کی جو آج تک جاری ہے۔ بارہویں صدی عیسوی میں جب کہ ایک یہودی رہبان بنجامن ساکن ٹیوڈیلہ ضلع نوار شہر بغداد میں وارد ہوا تو اُس سے وہاں کے یہودیوں نے بیان کیا کہ مقام حلہ کے آس پاس کھنڈروں میں اب بھی بادشاہ بخت نصر ثانی کے محل کے آثار اس گلخن کے قریب پائے جاتے ہیں جس میں حنانیاؔ۔ مشائیلؔ اور ازاریہؔ ڈالے گئے تھے۔[1]

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۵۹۵) عفوِ گناہ اور رہائی کی دعا مانگی تو بحکمِ خدا مچھلی نے اس کو خشکی میں اگل دیا پھر خدا کے حکم سے شہر نینوا پہنچ کر ہدایت شروع کی۔" (توریت سے زیادہ مشرح و مفصل حالات یونس علیہ السلام تاریخ طبری روضۃ الصفا وغیرہ میں درج ہیں) اکثر یورپین مورخ اس واقعہ سے منکر ہیں۔ اُن کے خیال میں تین روز کے بعد مچھلی کے معدہ سے زندہ برآمد ہونا خلافِ عقل ہے۔ اور مذکورہ واقعے کی تشریح میں خوب خوب طبع آزمائی کی ہے۔ گو بالاستیعاب نظرِ تنقید ڈالنے سے اُن کی تشریح کا کوئی پہلو پایۂ صداقت کو نہیں پہنچتا تاہم نقل کفر کفر نباشد پر کاربند ہو کر ذیل میں درج کرتے ہیں۔



بعض یورپین مورخوں (Mr. Ragozin Chilperic Edwards & Others) کا قول ہے کہ شہر نینوا کا نام زبانِ اہلِ اشور میں ننوا ہے جو مشابہ نونو کے ہے جس کے معنی مچھلی کے ہیں علاوہ اہلِ اشور کی زبان میں ننوا اگر لکھا جائے تو تیر نما حروف کی کشش سے ایک مچھلی تالاب میں بن جاتی ہے مثلاً یہ شکل:۔ لہذا جس مچھلی نے حضرتِ یونس علیہ السلام کو نگلا تھا وہ شہر نینوا تھا اور رہائی کے واسطے اُن کی گریہ وزاری اور دعا کا مانگنا متعددہ خدشوں و تکالیف کے باعث ہوگا۔

[1] ۵۲۔ ۵۳ بعد فتحِ بیت المقدس ۶۰۶ قبل مسیح میں یہ تینوں یہودی شہزادے بخت نصر ثانی کے حضور میں قید ہو کر آئے حسب الحکم عام قیدیوں کے ہمراہ بابل بھیج دیئے گئے بعد تعلیم و تربیت بادشاہ مذکور نے اپنی روبکاری میں متعین کیا حنانیا کا نام تبدیل ہو کر شدراخ۔ ازاریہ کا نام عبید نیگو اور مشائیل کا نام میشاخ ہوگیا بخت نصر ثانی نے جب اپنا ساٹھ کیوبٹ (یونانی کیوبٹ برابر ہے ۱۸۔ انچہ اور ۲۰ جو انگریزی کے) کا طلائی بت رکھ کر اُس کی پرستش کا اذن عام دیا تو ان تینوں شاہزادوں نے انکار کیا۔ بقولِ یہود سجدہ نہ کرنے کی پاداش میں وہ گلخن میں ڈال دیئے گئے لیکن آگ نے اُن پر کچھ اثر نہیں کیا۔ بادشاہِ مذکور نے متعجب ہو کر حکم دیا کہ کوئی شخص اس دن سے یہود کے خدا کو بُرا نہ کہے ورنہ گردن ماری جائے گی (کتاب حضرت دانیال ۱۔ ۳۰۔ ۱۱۔ ۴)

بقول مسٹر راجرز ( Mr. Rogers ) رہبان[1] مذکور کا لاطایل بیان خود شاہد ہے کہ اُس کا بابل کی طرف کبھی گذر ہی نہیں ہوا تھا۔ جس قدر حالات اُس نے قلمبند کئے ہیں سب روایتوں پر مبنی ہیں۔ بہر حال بنجامن مذکور کو مغالطہ ہوا۔ بیرس نمرود کو وہ مینارِ بابل سمجھا۔ کیونکہ اس کا بیان ہے کہ بجلی کے صدمہ سے مینارِ مذکور بنیا ذنک شق ہو گیا ہے۔ دراصل مندر بورسپ پا کی جو البیرس یا بیرس نمرود میں واقع ہے ایسی ہی صورت ہے۔ دبورسپ پا کا حال انشااللہ تعالیٰ آیندہ ہدیۂ ناظرین کیا جائے گا)

سولھویں صدی عیسوی میں ایک انگریز تاجر جان الڈرڈ کا تین دفعہ شہر بغداد میں گذر ہوا جس کا اُس نے جدید بابل کے نام سے ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ حسبِ معمول اُس کا گذر اُس مقام پر ہوا جہاں کسی زمانہ میں عظیم شہر بابل آباد تھا جس کے متعدد کھنڈر دور دور تک اس بیابان میں پھیلے ہوئے تھے۔ اکثر فرصت کے وقت وہ کھنڈروں کی سیر کرنے جایا کرتا تھا۔

۱۵۹۹-۱۶۰۰ء میں انٹی شرلی کا اُدھر سے گذر ہوا اور کچھ زمانہ بعد ۱۶۱۶ء میں اٹلی کے ایک باشندہ پیٹرو ڈیلاوال[2] وہاں پہنچا۔ اُس نے قدرے صحت کے ساتھ مینارِ بابل کی تحقیق کی اور مینارِ بابل کا مقام اُس ٹیلے کو قرار دیا جہاں شہرِ بابل واقع تھا اور جہاں سے وہ بخت نصر ثانی کے عہد کے چند روغنی چوکے جن پر بادشاہِ مذکور کا نام لکھا ہوا تھا روم (اٹلی) لے گیا۔ غالباً آثارِ قدیمہ کا یہ سب سے پہلا مجموعہ گو حقیر تھا جو ملکِ بابل سے یورپ پہنچا تاہم اُس نے مقناطیس کا کام کیا۔ یورپ کی ہر بڑی سلطنت بابل اور اسیریا کی تہذیب و تمدن کی تحقیق کی طرف متوجہ ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یورپ کا تمدن و معاشرت ان عظیم الشان قوموں سے مختلف ہے لیکن قدیم ادبیات اور فنون وغیرہ کی تحقیق کے شوق نے ایک روح پرور ولولہ پیدا کر دیا۔

برٹش ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ۱۸۱۱ء میں مسٹر رچ نے اور ۱۸۵۰ء میں مسٹر لے یارڈ نے ۱۸۵۲-۵۴ء میں سلطنتِ فرانس کی طرف سے جولز اوپرٹ نے اور برٹش گورنمنٹ کی طرف سے ہرمز رسیم نے ۱۸۷۸ء و ۱۸۸۹ء میں شہر بابل کے مختلف کھنڈروں کو کھودا لیکن تحقیقات کچھ نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ ۱۸۸۷ء و ۱۸۸۹ء میں جرمن گورنمنٹ کی طرف سے ڈاکٹر کالڈیوی نے قصرِ بخت نصر کے مشرقی حصہ سے کچھ روغنی چوکے نکال کر جرمنی روانہ کئے جن کو جرمنی کے معتمدِ عجائب خانۂ شاہی ڈاکٹر ریچرڈ شون نے نہایت وقعت کی نظر سے دیکھا اور ۱۸۹۹ء میں ڈاکٹر موصوف کی زیر نگرانی

---

1. The Itencrary of Benjamin of Tudela (Jewish Quarterly Review Vol XVIII) ۵۱
2. Pietro della Valles "Viaggi" (Rome 1650 A.D.) ۵۲

شہرِ بابل کی باقاعدہ کھدوائی شروع کی گئی اور سولہ سال تک مسلسل تحقیقات جاری رہی۔

یونانی حکما نے تمام روئے زمین کو سات حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر ایک حصہ کا نام اقلیم رکھا ہے۔ ہر اقلیم خطِ استوا کی جانب سے شروع ہو کر قطبِ شمالی کی جانب منتہی ہوتی ہے۔ اس یونانی حساب کے بموجب بابل کا طول جزائرِ خالدات سے ۷۹ درجہ ۱۲ دقیقہ اور ۳۰ پل ہے اور عرض اس کا خطِ استوا سے ۳۲ درجہ اور ۴۳ دقیقہ ہے۔

اولادِ سام کی زبان میں شہرِ بابل کا اصل نام باب ایلی تھا جس کے معنی ہیں دیوتاؤں کا دروازہ بعض کتبوں میں باب ایلو یعنی خدا کا دروازہ بھی لکھا ہے۔ اِس سے قدیم تر نام اس کا اہلِ شومیر کی زبان میں کاڈنگررا یا کاڈیمررا تھا اور اس کے معنی بھی وہی ہیں۔ اہلِ اکدّ کی زبان میں تن ترکی تھا جس کے معنی مقامِ حیات کے ہیں۔

توریت کے باب ۱۱۔ آیت ۲ سے واضح ہے کہ حضرتِ نوح علیہ السلام کی اولاد نے طوفان سے ایک مدت بعد جانبِ مشرق سفر کیا اور ملکِ شنعار کے وسیع میدان میں پہنچ کر آباد ہو گئی[۵۱] اور شہرِ بابل تعمیر کیا۔

بقول پادری نیوٹن براؤن (Rev. Newton Brown) نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس (بابل) کو رونق اور وسعت دی۔ ملکِ اسیریا کی مشہور شاہزادی سیمی رامس[۵۲] نے ۱۲۰۰ء قبلِ مسیح میں شہرِ بابل کو از سرِ نو

---

۵۱ توریت باب ۱۱ آیت ۲۔ جب وہ (اولادِ نوح) مشرق سے روانہ ہو کر ملکِ شنعار میں پہنچی تو انھوں نے ایک میدان دیکھا اور اس میں آباد ہو گئی۔ آیت ۳۔ اور آپس میں صلاح کی کہ خشت بنا کر آگ میں پکائیں + آیت ۴۔ پھر مشورہ کیا کہ ایک شہر تعمیر کیا جائے نیز ایک مینار جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے تاکہ یادگار قائم رہے اگر روئے زمین پر منتشر ہو جائیں۔

شارحینِ توریت نے تعینِ سن میں غلطی کی ہے اُن کے قول کے موافق ۲۲۳۴ء ق م میں شہرِ بابل کو اولادِ نوح نے آباد کیا اور ۲۲۱۸ء ق م یا ۲۰۰۰ء ق م میں نوح علیہ السلام کے پرپوتے نمرود نے اس کو رونق اور وسعت دی۔ تعینِ تاریخ و سنہ کا جہاں تک تعلق ہے شارحینِ توریت کے اقوال پایۂ ثبوت سے ساقط ہیں کیونکہ نمرود کے کم و بیش ایک ہزار سال بعد حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ کا زمانہ تھا۔ حمورابی بادشاہِ بابل آنحضرت کا ہمعصر تھا۔ جدید تحقیقات سے بادشاہ مذکور کا عہد ۲۲۶۷-۲۲۱۳ء ق م تھا لہذا نمرود کا زمانہ کم از کم تین ہزار سال قبلِ مسیح ہونا چاہیئے۔

۵۲ سیمی رامس۔ اس نام کی کئی شاہزادیاں گزری ہیں۔ نمرود کے لڑکے کی زوجہ کا نام بھی یہی تھا۔ اسی نام کی ایک شاہزادی ۱۲۲۹ء ق م میں گذری ہے اور ممکن ہے کہ یہ شاہزادی وہی ہو جس کے عہد میں بقول ھیلانیکس مشہور محاصرہ شہر ٹرائے (Troy) کا ہوا تھا زوجہ ابوالیش یا شمس ہداد چہارم (۸۲۳-۸۱۱ء ق م) کا نام بھی یہی تھا۔ اس شاہزادی کی یادگار میں ایک سنگین لاٹھ شہرِ اشر ملکِ اسیریا میں نصب کی گئی تھی جس کو چند سال ہوئے ڈاکٹر اندرائی نے برآمد کیا تھا۔

تعمیر کیا۔ بادشاہ نے بوپولیسر[۵۱] نے سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں اور اُس کے لڑکے بخت نصر ثانی نے سنہ ۶۰۴-۵۶۱ ق م میں اُس کو نہایت مستحکم و خوبصورت بنا کر رشک ارم کر دیا تھا۔

شہرِ بابل کی قدامت کے متعلق یہودیوں کو مغالطہ ہوا۔ یہ امر پایۂ ثبوت کو پہنچ چکا ہے کہ ملکِ شنعار (بابل) میں اولادِ نوح کے پہنچنے سے بہت پہلے بنی آدم وہاں آباد تھے۔ وہ لوگ قومِ تورانی کی ایک شاخ تھے جو مدتِ مدید سے خطۂ شومیر میں آباد ہونے کے باعث اہلِ شومیر کے نام سے مشہور ہو گئے تھے۔ اہلِ شومیر کے اعتقاد کے موافق شہرِ بابل کا وجود پیدائشِ عالم کے ساتھ اور پیدائشِ انسان سے قبل ہوا تھا (کیونکہ بقولِ اہلِ شومیر شہرِ بابل خداؤں کا مسکن تھا) بہرحال بابل کی قدامت میں کچھ شک نہیں۔ گو بادشاہ حاموُرابی[۵۲] ہمعصر حضرتِ ابراہیم خلیل اللہ سے پیشتر کے اکثر تاریخی واقعات ہنوز پنہاں ہیں تاہم قرینِ قیاس ہے کہ شہرِ بابل کی جو شان اور شوکت۔ قدر اور منزلت بادشاہ بخت نصر ثانی کے عہد میں تھی وہی قریب قریب ڈیڑھ ہزار سال قبل بادشاہ حامورابی کے عہد میں ہو گی البتہ اول الذکر نے جدید باغات و محلات کی تعمیر سے شہر کو بہت وسیع اور زیادہ خوشنما بنا دیا تھا۔

افسوس ہے کہ اس قدیم اور عظیم الشان شہر کو سیناحیرب بادشاہِ اسیریا نے بالکل تباہ کر دیا تھا۔ وہ اپنے کتبے میں شہرِ بابل کی تباہی کے متعلق بیان کرتا ہے "جب میں اہلِ بابل کی متواتر یورش اور غدر سے عاجز ہو گیا تو میں نے دیگر شہروں کی رعایا کو عبرت دلانے کی غرض سے بابل کی تمام قدیم عمارات مسمار کر دیں۔ دریا کا بند توڑ دیا اور شہر کو غرقِ آب کر کے اُس کا نام و نشان مٹا دیا"۔ یہ عبرت ناک واقعہ سنہ ۶۸۹ قبلِ مسیح میں ظہور میں آیا۔

قدیم شہرِ بابل کی تباہی کے بعد ایسر حیدن[۵۳] بادشاہ نے سنہ ۶۷۴ ق م میں اس کی دوبارہ تعمیر کی لیکن بادشاہ

---

[۵۱] نے بوپولیسر۔ بادشاہِ بابل سنہ ۶۲۵-۶۰۴ ق م میں گذرا ہے یونانی اس کو بلسز (Belsis) اور ایرانی گودرز کہتے تھے۔

[۵۲] حامورابی بادشاہ بابل جس کو توریت کے باب ۱۴ میں امرافل سے خطاب کیا گیا ہے اس کا عہد سنہ ۲۲۶۷-۲۲۱۳ ق م تھا۔

[۵۳] ایسر حیدن کا بابلی نام اشراخی الدینا تھا۔ اُس کا عہد سنہ ۶۸۰-۶۶۰ ق م تھا۔ یہ سیناحیرب بادشاہ اسیریا کا دوسرا لڑکا تھا۔ اس نے دارالامارت بابل کو تجویز کیا تھا۔ بادشاہِ مذکور کے کتبے شاہد ہیں کہ بابل میں اُس نے منادر کی مرمت اور محلات کی تعمیر کی۔ اسی کے عہد میں مناسہ بادشاہ بیت المقدس گرفتار ہو کر آیا۔ سنہ ۶۶۷ ق م میں شمس دوکن نے بغاوت کر کے بابل پر قبضہ کر لیا۔ اشربانی پال ثانی نے اپنے عہد میں بابل کو دوبارہ فتح کیا۔ بادشاہ مذکور کے لڑکے اشر امت ایلی شاہِ اسیریا نے کے کاؤس بادشاہِ ایران کے حملہ کے وقت نے بوپولیسر کو صوبہ دارِ بابل متعین کیا لیکن صوبہ دار مذکور نے دشمن کے ساتھ مل کر نینوا دارالامارتِ اسیریا کا محاصرہ کیا۔ شہرِ نینوا کی فتح کے بعد کے کاؤس نے نے بوپولیسر کو مستقل بادشاہِ بابل بنا دیا۔

اشر بانی پال[۵۱] کے محاصرہ اور فتح کے بعد یہ پھر برباد ہوگیا۔

قدرت خدا کی دیکھیے کہ آتش زن یا ققنس کی طرح اپنی خاک سے شہر بابل نے ہمیشہ دوسرا جنم لیا اور ہر دفعہ جواں بخت و جواں دولت ثابت ہوا۔ نے بوپولیسر بادشاہ کے عہد میں پھر سر بفلک منادر و عالی شان عمارات تعمیر ہوگئیں جاہ و جلال، سطوت و جبروت، عظمت و شوکت کا نقارہ مثل سابق بجنے لگا اور دبدبہ و ہیبت۔ حکومت و سلطنت کے خورشید کی تجلیاں عالم کو خیرہ کرنے لگیں سچ ہے، مالک نے جو چاہا سو کیا۔ جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ اور جو چاہے گا سو کرے گا۔

غائب قدرت ہے تیری موجود   نابود ہو بود، بود نابود

چھوٹا ہو بڑا بلند ہو پست   ہو ہست نیست نیست ہے ہست

گویا ہیں لب ملائے اعلیٰ   سبحانک شانہٗ تعالیٰ

مشہور سیاح و قدیم یونانی مورخ ہراڈوٹس اور حکیم ٹی سیاس نے بابل کے متعلق جو حالات قلمبند کئے ہیں وہ قابلِ وقعت اس وجہ سے ہیں کہ اول الذکر نے شہرِ بابل کو اپنی آنکھ سے دیکھا تھا اور اُس کی خوب سیر کی تھی اور آخر الذکر شاہِ ایران داراب[۵۲] ثانی کا طبیب تھا۔ اُس کو بابل کی سیر کا اکثر اتفاق ہوا تھا۔

بقول ہراڈوٹس شہرِ بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار ایک سو بیس اسٹیڈیا[۵۳] یعنی قریباً چودہ میل کی تھی اس حساب سے اُس کا دور کم و بیش دو سو میل مربع تھا۔ فصیل مذکور اسی فیٹ چوڑی اور دو سو شاہی کیوبٹ یعنی ۳۳۷ فیٹ ۸ انچ یا ۳۷۳ فیٹ ۴ انچ بلند تھی[۵۴]

---

۵۱ اشر بانی پال بادشاہ اسیریا ۶۲۶-۶۶۸ق م میں گذرا ہے۔ یونانی اس کو سارڈانا پالس کہتے تھے اور توریت میں اس کو اسناپر سے خطاب کیا ہے۔

۵۲ داراب ثانی (۳۶۱-۴۰۵ ق م) ایران کا بادشاہ تھا۔ یونانی اس کو Artaxerxes Memnon alias (Darius II) کہتے تھے۔

۵۳ اسٹیڈیا۔ ایک اسٹیڈیا برابر ہے ۶۰۶ فیٹ اور نو انچ انگریزی کے۔

۵۴ بعض یورپین مورخ عرض و طولِ شہرِ بابل کے متعلق ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے بیانات کو اس وجہ سے مبالغہ آمیز سمجھتے ہیں کہ اس قدیم زمانہ میں تحقیقِ حال کی طرف میلانِ طبع کم اور روایتوں پر بلاکد و کاوش اعتماد زیادہ تھا۔ سکندرِ اعظم کے عہد کے مورخوں کا بیان ہے کہ دارسٹوبیوس جس کے اقوال یوسی بیس نے نقل کئے ہیں) فصیل گیارہ میل ہر طرف اور دور میں کم و بیش ایک سو تیس

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آیندہ)

فصیل کے گرد عمیق اور چوڑی خندق تھی جو دریائے فرات کے پانی سے لبریز رہتی تھی۔ خندق کا فرش اُس کی مٹی سے بنائی ہوئی پختہ اینٹ کے کھرنجہ کا تھا جس میں چونے کی جگہ قیر کو پگھلا کر گرم گرم استعمال کیا تھا خندق کی مٹی سے اینٹیں پکا کر فصیلِ شہر تعمیر کی گئی تھی جس کے کناروں پر جابجا آمنے سامنے بروج اور سپاہیوں کے واسطے حجرے بنے ہوئے تھے۔ حجروں کے درمیان اس قدر جگہ چھوڑی گئی تھی کہ ایک چوکڑی آسانی سے گھوم سکتی تھی۔ اس کی چنائی بھی خشت و قیر سے کی گئی تھی اور ہر تیس ردوں کے بعد ایک تہ نرسل کی دے کر پہلوؤں کو مضبوط کیا گیا تھا۔

اس فصیل میں ایک سو عالی شان دروازے آمد و برآمد کے لئے بنائے گئے تھے۔ کواڑ اور چوکھٹ پیتل کے تھے اُن کواڑوں کا ذکر یسعیاہ پیغمبر یعنی اشعیا علیہ السلام نے اپنی کتاب کے چودھویں باب میں کیا ہے [۱]

شہرِ بابل کی دوہری فصیل تھی۔ ایک شالخو یعنی فصیلِ بیرونی جو نہایت مستحکم اور نی مت [۲] تی بعل کے نام سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۶۰۰) میل مربع تھی۔ حکیم ٹی سیاس کا بیان ہے کہ ہر دیوار پینٹھ اسٹیڈیا تھی اور پچاس فیدم یعنی دو سو معمولی کیوبٹ جس کے تین سو فیٹ ہوئے بلندی میں تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ سب تخمینے نظری تھے۔ باقاعدہ پیمائش کسی نے نہیں کی۔ اگر سکندر کے مورخوں کے اقوال کو ہی صحیح تسلیم کر لیا جائے تو بھی شہر لندن سے پانچ گنا یا چھ گنا وسعت میں ہوا۔

ڈاکٹر کالڈیوی کا خیال ہے کہ شہرپناہ کا اس قدر طویل ہونا کچھ تعجب خیز نہیں اور نہ ناممکن خیال کی جا سکتی ہے جب کہ ہم کو علم ہے کہ ملکِ چین کی مشہور دیوار طول میں پندرہ سو میل ہے۔ (سر ہنری رالن سن ۱۲ سو میل بتاتے ہیں۔)

ڈاکٹر کنگ اس تمثیل کی تردید میں بیان کرتے ہیں کہ چین کی دیوار مملکت چین کی سرحد ہے شہرپناہ نہیں۔ اگر مقابلہ کیا جائے تو شہر ناکن واقع چین سے جس کی فصیل کا دور ۲۴ میل سے کم ہے۔

جولز اوپرٹ ہراڈوٹس کی پیمائش کے موید ہیں۔ انہوں نے اپنے مرتبہ نقشہ میں فصیل کو شہرِ بابل سے بیرس نمرود تک دکھایا ہے اور فصیل کا سلسلہ ہر کھنڈر اور ٹیلے کے کھودنے سے برآمد ہوا۔

قریہ سنجار کے متصل کچھ فصیلوں کے آثار پائے جاتے ہیں جن کو ڈاکٹر ویسباخ ( Weisbach ) نے اپنے نقشہ بابل میں دکھایا ہے مگر اُن کے شامل کرنے سے مغربی حصہ مشرقی حصہ سے چھوٹا ہو گیا ہے۔

چونکہ ہر مورخ کے نقشہ میں اختلاف ہے لہذا کوئی قطعی رائے فصیل کے طول کی نسبت اس وقت تک قائم نہیں کی جا سکتی جب تک کہ کامل تحقیقات نہ کی جائے۔ اہلِ جرمنی اس کی تحقیق میں مصروف تھے لیکن جنگِ عمومی کی وجہ سے تمام انتظامات درہم برہم ہو گئے۔

[۱] Isiah XIV, 1-2 [۲] بقول ابی ڈینس اور یوسی بیس بیرونی فصیل کو بادشاہ بیلس (مرّوخ) یعنی مشتری نے تعمیر کیا تھا۔

موسوم تھی جس کے معنی ہیں دیوتا بعل میری بنیاد ہے۔ دوسری فصیل اندرونی دورو کہلاتی تھی جس کا لقب اگر بعل تھا یعنی دیوتا بعل کا کرم ہے۔ استحکام میں یہ بھی بیرونی فصیل سے کچھ کم نہ تھی [۱]

شہر کے ہر کوچہ میں ایک مستحکم قلعہ بنا ہوا تھا۔ دریائے فرات وسطِ شہر میں موجزن تھا جس کے کناروں پر دورویہ بلند دیواریں کھنچی ہوئی تھیں۔ ان میں چھوٹے چھوٹے دروازے دریائے فرات کی طرف کھلے ہوئے تھے گھاٹ کی سیڑھیاں سطحِ آب کے نیچے تک تعمیر کی گئی تھیں۔ ہر دو عالی شان دروازوں کے وسط میں تین برج فصیل سے دس فیٹ بلند محافظینِ شہر کے لئے اور چاروں کونوں پر بڑے بڑے گنبد نہایت خوبصورت اور خوشنما بنے ہوئے تھے۔ کل بروج دو سو پچاس تھے [۲]

مندرجہ بالا بیان سے اس فصیل کی تعمیر بیس کروڑ مربع فیٹ سے زیادہ ہوئی اور مملکتِ چین کی فصیل [۳] سے بحساب مکسر فٹ دوگنی ہوئی۔ شہرِ بابل کی فصیل کو دنیا کے سات عجائبات میں شمار کیا گیا تھا۔

ہراڈوٹس اور ٹی سیاس کے زمانہ میں فصیل مذکور اپنی اصلی حالت میں تھی۔ زینوفن کے زمانہ میں مرمت نہ ہونے کی وجہ سے بہت شکستہ ہو گئی تھی اور بلندی میں کہیں کہیں سو فیٹ رہ گئی تھی۔ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں کُلہم پچہتّر فیٹ بلند رہ گئی تھی۔ حوادث گاہِ عالم میں ایسے ہی انقلاب ہوئے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔

محمد حامد دہلوی

---

[۱] جدید تحقیقات شاہد ہے کہ عہدِ بخت نصر ثانی سے بہت پہلے بھی بابل کی فصیل دوہری تھی اور دونوں کے نام قدیم سے اگر بعل اور نی مت تی بعل چلے آتے تھے۔ اکثر بادشاہوں نے اُن کی مرمت کی تھی مثلاً بادشاہ شرغانی شرری (سارگن) نے ۷۰۰ ق م میں بادشاہ اشربانی پال نے ۶۴۰ ق م میں اور بادشاہ نےبوپیسر نے ۶۰۴ ق م میں۔

[۲] ڈاکٹر کالڈیوی کا قول ہے کہ شمال مشرقی دیواریں کم از کم نوے بروج تھے صرف پندرہ کی کامل تحقیقات ہو سکی۔

[۳] مملکتِ چین کی دیوار بارہ سو یا پندرہ سو میل میں ہے۔ بلندی مختلف مقامات پر ۱۴ سے ۵۰ فیٹ تک ہے۔ ۱۸۲۳ء کے تخمینہ کی رو سے دیوار مذکور میں سلطنتِ انگلشیہ کی تمام عمارات سے زیادہ تعمیری مصالح صرف ہوا ہے

# قلبیّات

۱

رگِ نیاز میں گر موجِ برقِ ناز نہیں — فتادگی ہے سراپا، امیں! انیاز نہیں
مذاقِ غزنوئی سومناتِ دل ہے وہی — تو ہی ایاز نہیں ہے۔ تو ہی ایاز نہیں

۲

ترے جگر میں اگر شمع کا گداز نہیں — تو بزمِ یار میں جلنے کا تُو مجاز نہیں
دلِ حزیں سے ہے خالی اگر ترا پہلو — ترے نیاز کا خواہاں وہ بے نیاز نہیں

۳

نگاہِ شوق میں گر سُرمۂ نیاز نہیں — حضورِ یار میں اُٹھنے کی وہ مجاز نہیں
زبانِ حسن سے میں نے سنا ہے یہ مصرع — کہ دل وہ دل ہی نہیں ہے جو پاکباز نہیں

۴

اگر تجھے دلِ خود سر پہ اپنے ناز نہیں — قبولِ خاطرِ جاناں ترا نیاز نہیں
تُو اپنے ذوقِ نظر کا اگر نہیں کشتہ — حریمِ ناز میں آنے کا بھی مجاز نہیں

امینِ حزیں

# خالد

## (ایک ماخوذ افسانہ)

ایک چھوٹے سے آراستہ کمرے میں انگیٹھی کے سامنے ہم چند نوجوان بیٹھے حسب معمول باتیں کر رہے تھے۔ موسم سرما کی ایک طویل شب کا ابھی ابھی آغاز ہوا تھا، سماوار میں چائے کا پانی گرم ہو رہا تھا، گفتگو مشکل سے کسی خاص مبحث پر پہنچی تھی بلکہ اب تک ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر منتقل ہو جاتی تھی، آخرکار دوران بحث میں دنیا کی نمایاں ہستیوں کا ذکر آگیا۔ اُن ہستیوں کا جو عوام الناس سے بلند تر ہوتی ہیں۔ ہر شخص نے اپنے اپنے خیالات اپنی ذاتی قابلیت کے اعتبار سے بیان کئے، آوازیں بلند ہو کر شور و شغب کی کیفیت پیدا کرنے لگیں، اسی دوران میں ایک مختصر سا شخص چائے پیتا اور سگار سلگاتا ہوا کھڑا ہو گیا، اور ان الفاظ میں ہم سب کو مخاطب کرنے لگا۔

"حضرات! آپ کی سنجیدہ رائیں اس معاملہ میں اپنی اپنی جگہ پر خوب ہیں، مگر فائدہ سے بالکل خالی ہیں، ہم میں سے ہر شخص نے اپنے مخالف کے خیالات سنے مگر اپنے خیالات کو اب تک قابلِ ترجیح سمجھا۔ ہماری زندگی کا یہ پہلا موقع نہیں ہے کہ ہم اس طرح ایک جگہ آملے ہیں، اور ہم نے بحث و مباحثہ کا باب کھولا ہے، اس لئے ہم ایک دوسرے کے خیالات و عقائد و خصائل سے کماحقہٗ واقف ہیں"۔

اس کے بعد اس مختصر سے آدمی نے سگار کی راکھ آتشدان میں جھاڑ دی، آنکھیں نیچی کر کے مسکرانا شروع کیا۔

ہم بھی اُس کی جانب متوجہ ہوئے، اسی دوران میں اُس سے یہ سوال کیا گیا،

"تو پھر اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، تاش کھیلیں یا سو جائیں، یا پھر اپنے اپنے گھروں کا راستہ لیں؟"

"تاش کھیلنا ایک خوشگوار مشغلہ ہے، نیند بھی مفید ہوتی ہے" اس مختصر سے شخص نے جواب دیا، "مگر ابھی گھر چلے جانا بہت قبل از وقت ہوگا، غالباً آپ میرا مدعا سمجھ نہیں سکے، آؤ، ہم میں سے ہر شخص ایک نمایاں ہستی کا ذکر کرے جس سے کہ وہ اپنی زندگی میں ملا ہو، میرا دعویٰ ہے کہ بیان خواہ کتنا ہی ناقص ہو بہتر سے بہتر دلیل سے زیادہ بامعنی ہوتا ہے"

ہم سب اس تجویز پر غور کرنے لگے،

ہم میں سے ایک نے کہا "علاوہ اپنی ذات کے میں کسی حیرت انگیز ہستی سے واقف نہیں ہوں اور مجھ سے آپ بہت بخوبی واقف ہیں" اس گفتگو کے تمسخرانہ انداز نے حاضرین کے دلوں کو گرمانا شروع کر دیا۔ ایک اور صاحب

فرمانے لگے۔

"بے شک ہم کسی سے واقف نہیں ہیں"۔ مجوز کی جانب متوجہ ہوکر گفتگو یوں جاری رکھی، "آپ ہی آئیے اور اپنا تجربہ بیان کیجئے، مگر یاد رہے کہ اگر ہمیں آپ کے قصہ میں لطف نہ آیا تو ہم بلا تکلف آپ پر پھبتیاں کہنے لگیں گے"۔

پست قامت مجوز آتشدان کے قریب کھڑا ہوگیا، ہم سب اُس کے چاروں طرف بیٹھ گئے اور خاموشی کے ساتھ اُس کو ٹکٹکی لگا کر دیکھنے لگے، مقرر نے ہمیں غور سے دیکھا، ایک نگاہ چھت پر ڈالی، اور اپنی تقریر کو ان الفاظ کا جامہ پہنایا۔

"میرے عزیز دوستو! دس سال ہوئے میں علی گڈھ میں تعلیم پاتا تھا، میرے والد کی آمدنی معقول تھی، مگر اول تو وہ کچھ زیادہ تعلیم یافتہ نہ تھے دوسرے اپنے علاقہ میں ریل سے بہت دور دیہاتی زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے انہوں نے میرے قیام و طعام کا انتظام ایک پروفیسر کے ہاں کردیا، اور اُن کو میرے اخلاقی نشو و نما کا بھی ذمہ دار بنا دیا۔

پروفیسر صاحب موصوف نہایت متین اور سنجیدہ بزرگ تھے۔ اور بالطبع اُن کو تکلفات و ظاہری رسمیات سے عشق تھا۔ ایک مدت تک میں اُن سے بے حد مرعوب و خائف رہا، ایک روز شام کے وقت کھیل سے واپس آیا، اپنے کمرے میں پہنچ کر کپڑے بدلنے لگا۔ قہقہوں کی مسلسل آوازیں میرے کانوں میں آنے لگیں، میں حیرت زدہ ہوگیا، بھلا کجا پروفیسر صاحب کی کوٹھی اور کجا آزادانہ و بے پروایانہ قہقہوں کی اس قدر مسلسل آوازیں! میں ضبط نہ کرسکا، لپک کر ملاقات کے کمرے میں جا دھمکا۔ وہاں کا منظر دیکھ کر میرے ہوش و حواس جاتے رہے، پروفیسر صاحب اپنے دوستوں کو لئے ہوئے ایک گول میز کے قریب بیٹھے شرابِ ناب کے پیالے پیا پے خالی کر رہے تھے، اُن کا چہرہ سُرخ تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں، مجھے دیکھ کر وہ کھڑے ہوگئے، مجھ سے مصافحہ کیا، اور اپنے دوستوں کے روبرو چند تعارفی کلمات کے ساتھ مجھے پیش کیا، میں ایک پاس کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ فلسفۂ تاریخ پر ایک نہایت عالمانہ بحث چھڑی ہوئی تھی، مَیں بھی بحث میں شریک ہوکر اپنی جدتِ طبع کے جوہر دکھانے لگا، مباحثہ کے بعد حاضرین نے میری فہم و فراست کی تعریف کی، نشۂ غرور نے میرا سر بلند کردیا، اور میں اپنے مستقبل کی پاکیزہ مگر خیالی تصاویر دیکھ دیکھ کر جھومنے لگا، اُس کے بعد پروفیسر صاحب مجھ سے آخر دم تک یکساں طور پر ہمیشہ بے تکلف اور آزاد رہے، مجھے اُن کی صحبت میں خاص لطف حاصل ہوتا تھا، میں اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصّہ اُن کی خدمت میں صرف کرتا تھا،

پروفیسر صاحب ممدوح کی بیوی کو بھی میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا، بقیس نوجوان مگر اُن کے کپڑوں میں سے ہمیشہ دھوئیں کی بُو آتی تھی اور آگے کے دانت بھی گر چکے تھے، عورتوں کا ایک بدنصیب گروہ قبل از وقت چہرہ

کی یہ زیبائش کھو بیٹھتا ہے"۔

"جناب! آپ اصل موضوع سے ہٹے جا رہے ہیں" سب نے بہ آواز بلند للکار کر کہا۔

"معاف کیجئے، لیجئے میں قصہ پھر شروع کرتا ہوں، میں کالج میں اچھا خاصا ہردلعزیز ہو چلا تھا، لڑکوں سے میری واقفیت دوستی کے درجہ تک پہنچنے لگی تھی۔ ان دوستوں میں ایک طالب علم بدر تھے۔ بہت معقول اور شریف النفس، وہ اکثر مجھ سے ملنے آتے تھے، میں بھی اُن کو پسند کرتا تھا، تھوڑی ہی مدت میں ہم دونوں بڑے گہرے دوست ہو گئے، علی گڈھ کی پوری آبادی میں میرا کوئی عزیز نہ تھا، میں شہر میں کسی کے ہاں نہ جاتا، اور عورتوں کی صحبت سے بہت خائف رہتا تھا، کالج کے احباب کے والدین واعزا سے میں نے ہمیشہ قصداً پرہیز کیا، اُن کے گھروں پر جانا مجھے ایک دن بھی نہ بھایا۔

میری مالی حالت بہت اچھی تھی، میرے والد مجھے ہر ماہ میں دو تین مرتبہ نوٹوں کا ایک پلندہ بھیج دیتے تھے جن کو نہ کبھی میں نے گنا اور نہ کبھی اُن کا حساب رکھا۔ اسی لئے میرے کمرے میں میرے احباب کے علاوہ اکثر چند خوشامدی بھی جمع ہو جاتے تھے۔

اور نوجوانوں کی حالت سے میری حالت کا آپ خوب اندازہ کر سکتے ہیں، میرے سینہ میں بھی وہ ابال اٹھتا تھا جو تھوڑے ہی عرصہ میں چند بے معنی غزلیات کی صورت میں رونما ہو کر ہوا ہو جاتا ہے، مجھے بھی کسی شے کی آرزو تھی، میں بھی کسی شے کا جویاں رہتا تھا اور میں بھی عالم رویا میں کسی کا نظارہ کیا کرتا تھا، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ میں آج تک یہ نہ سمجھ سکا کہ میں کس کا آرزومند اور کس کا شیدائی تھا، شاید یہ ہو کہ میں اپنی تنہائی سے عاجز آ گیا تھا، اور زندہ دل افراد کی صحبت کے لئے ترستا تھا، "زندگی" کے لفظ سے میرے سینہ میں ہوک اٹھتی تھی، اور میں دردِ دروں کو سینہ میں چھپائے رکھتا تھا، احمد! ذرا ایک سگرٹ دینا"۔

سگرٹ سلگا کر اُس شخص نے سلسلۂ کلام یوں جاری رکھا،

"ایک روز صبح کے وقت بدر ہانپتا کانپتا میرے پاس آیا اور کہنے لگا "لو، تم نے اور بھی کچھ سنا، خالد، خالد آ گئے"۔

"کون خالد؟"

"ارے تم خالد کو نہیں جانتے، افسوس، ابھی چلو، اسی وقت اُٹھ کھڑے ہو، ابھی میں اُن سے تمہاری ملاقات کرائے دیتا ہوں، رات ہی تو وہ تعطیل سے واپس آئے ہیں، ایک حیرت انگیز شخص ہیں"!

"حیرت انگیز"؟

"نہایت"!

"خیر تو تم تنہا ہو آؤ، میں تمہارے حیرت انگیز شخصوں سے مل چکا ہوں"

"نہیں نہیں تمہیں خالد سے ملنا ہوگا، ایسا شخص تم نے کبھی نہ دیکھا ہوگا"

میں کہنے کو تھا کہ خالد کو پہلے میرے یہاں آنا چاہیئے، مگر خدا جانے کیوں میں نے بدر کے ارشاد کی تعمیل کی اور اُس کے ساتھ ہولیا، بدر مجھے علی گڈھ کی سب سے زیادہ گندی اور تنگ و تاریک گلیوں میں لے گیا، جس مکان میں خالد رہتا تھا وہ نہایت بوسیدہ اور تکلیف دہ نکلا، ہم دونوں صحن میں پہنچے، ایک تنومند اصیل الگنی پر دھلے ہوئے کپڑے دھوپ میں پھیلا رہی تھی، بچے چوبی زینہ پر کود رہے تھے، ہم دونوں ایک تاریک راستہ میں سے گذر کر خالد کے کمرے میں پہنچے، اندر داخل ہوئے، آپ کو بخوبی اندازہ ہے کہ ایک غریب مفلوک الحال طالب علم کا کیسا کمرہ ہوتا ہے، دروازے کے سامنے ہی خالد میز کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا سگار پی رہا تھا، اُس نے بدر سے مصافحہ کیا، اور خوش مزاجی سے مجھے خوش آمدید کہا۔ ہماری دونوں کی نگاہیں دوچار ہوئیں، میں خودبخود اُس کی جانب مائل ہونے لگا، حضرات! بدر ٹھیک کہتا تھا، خالد یقیناً دنیا کا ایک حیرت انگیز انسان تھا، حیرت انگیز۔ مجبوراً قبول لو، ذرا میں تفصیل سے بیان کئے دیتا ہوں، لمبا قد، بہت پتلا پتلا چھریرا بدن، چہرہ مہرہ دلآویز، مجموعی طور سے نہایت خوش منظر، اُس کے چہرے کی صحیح تصویر کھینچنا نہایت دشوار ہے، چہرہ کے ہر جزو کو علیحدہ علیحدہ خوب بیان کیا جاسکتا ہے لیکن یہ بتانا کہ اُس چہرے میں کیا تھا یعنی خاص وہ چہرہ کون سے پیغام کا حامل تھا ایک نہایت دشوار امر ہے"

"یعنی چہرہ کی موسیقی" حاضرین میں سے ایک نے کہا۔

"بیشک، چہرے کی موسیقی، اس لئے میں اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ چہرے کا وہ مخصوص انداز ایک نہ مٹنے والے تبسم سے ہمیشہ دست و گریباں رہتا تھا، خالد کے والدین اُس کی یاد سے قبل فوت ہوچکے تھے، اُس نے اپنے ایک دُور کے عزیز کے مکان میں آنکھ کھولی جو اخلاقاً بہت پست خیال تھا، پندرہ برس کی عمر تک وہ دیہات میں زندگی گذارتا رہا، پھر وہ علی گڈھ میں آگیا، انٹرنس کا امتحان پاس کرکے کالج میں داخل ہوا، ٹیوشنی سے اُس کی گذر اوقات ہوتی تھی، خالد نہ تو بہت زیادہ بذلہ سنج تھا، اور نہ ذکی، مگر خدا معلوم کیوں ہر شخص اُس کے دام میں گرفتار ہوجاتا تھا۔ ہم بھی اُس کے رطب اللسان تھے، اُس کے الفاظ، اُس کی نگاہیں، اُس کے انداز شباب کی دلآویزی

سے اِس قدر معمور ہوتے تھے کہ اُس کے سارے احباب اُس پر پروانہ وار فدا ہوتے تھے، پروفیسر اُسے ایک اچھّا خاصا ذہین طالب علم سمجھتے تھے، مگر سست اور کاہل۔ اُن کے نزدیک اُس میں کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔

خالد نے ہماری شام کی مجلسوں میں ایک تازہ روح پھونک دی، اُس کی موجودگی میں ہماری زندہ دلی پر کبھی بدمذاقی کا اثر غالب نہ ہوا، اگر ہم کسی وجہ سے دل گرفتہ ہوتے تو ہم اطمینان کے ساتھ آہستہ آہستہ مناسب موضوع پر بات چیت کرنے لگتے، اُس حالت میں بھی دل نہ گھبراتا۔ غرض یہ کہ خالد ہماری جماعت کا روح رواں تھا، وہ شمع تھا اور ہم سب اس کے پروانہ وار شیدائی ہیں اُسے دل وجان سے چاہتا تھا، میں نے کسی عورت کو بھی اس قدر شدت سے کبھی نہیں چاہا، اب بھی میں اس محبت کو یاد کر کے شرمندہ نہیں ہوتا۔ بیشک وہ گہری محبت تھی، جس میں مجھے فراق جدائی رشک اور رقابت کی ساری مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں، مثلاً خالد ہم سب کو ایک سا چاہتا تھا مگر احمد کے ساتھ اُس کا برتاؤ اور لگاؤ خصوصیت کا تھا، ہم نے احمد سے اُسے کبھی جدا نہ دیکھا، اکثر وہ اُس سے خفیہ بات چیت کرنے لگتا، اور کبھی کبھی دو دو تین تین دن کے لئے اُس کے ساتھ علی گڈھ سے غائب ہو جاتا، مگر یہ کس کی مجال تھی کہ کوئی خالد سے سوال کرے، نتیجہ یہ ہوتا کہ میں مضطرب رہتا، خالد کا غائب ہو جانا کسی طرح سمجھ میں نہ آتا، میرے اضطراب کی ایک وجہ یہ بھی تھی، میں خود خالد کا مستقل ساتھی بننا چاہتا تھا، اور اسی لئے میں احمد کو اپنا رقیب سمجھ کر اُس سے نفرت کرتا تھا۔

بے اندازہ غور وفکر کے بعد بھی میں خالد کے غائب ہو جانے کی توضیح نہ کر سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ اُس کے چہرہ میں استعجاب پیدا کرنے والی ایسی کوئی کیفیت نہ تھی جس پر نوجوان اکثر فخر کیا کرتے ہیں۔ اور نہ اُس کا وہ بے پروایانہ انداز تھا جس سے یہ خیال ہو کہ متعدد قوتیں اس میں خفتہ ہیں۔ مگر ہر موقع پر بروئے کار لائی جاسکتی ہیں، نہیں، اس کا چہرہ سراسر بے لوث اور کھلا کھلا رہتا تھا، مگر جب اُس پر جوش کا غلبہ ہوتا تو یہ معلوم ہوتا کہ اُس کی ہر متعلقہ شے ایک شدید قوت کی حامل ہے، اُس نے اپنی قوت کو کبھی فضول صرف نہ کیا۔ اور نہ کسی حالت میں اُس پر تصنع کا رنگ جما، اِن باتوں کے باوجود میں ہی وہ پہلا شخص تھا جس نے خالد کی فطری حسیات کا پتہ لگایا، شاید اس لئے کہ محبت میں آدمی دل کی گہرائیوں تک سے واقف ہو جاتا ہے، میں نے تمام خطرات کے باوجود خالد کا اعتماد حاصل کرنے کا پختہ ارادہ کرلیا، مجھے خالد کو خوش کرنے میں زیادہ زحمت گوارا نہ کرنی پڑی، میں ایک بے لوث بچے کی طرح اُس کی پرستش کرتا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہ تھی کہ خالد مجھے کبھی مشکوک نگاہوں سے دیکھتا، مگر مجھے یہ معلوم کر کے شدید روحانی تکلیف ہوئی کہ خالد میری بے تکلفانہ قربت کو ناپسند کرتا ہے، اُسے میری گرویدگی سے تکلیف پہنچتی تھی، ایک دن اُس نے مجھ سے کچھ روپے قرض مانگے اور دوسرے ہی دن طنزیہ شکریہ کے ساتھ واپس کر دیئے، موسم سرما پورا گذر گیا،

مگر ہمارے تعلقات میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا۔ میں احمد سے اکثر اپنا مقابلہ کرتا، مگر میری سمجھ میں نہ آتا کہ وہ مجھ سے کس طرح قابلِ ترجیح ہے، یکایک واقعات نے ایک پلٹا کھایا، اپریل کے وسط میں احمد یکایک سخت بیمار پڑا، اور دوہی دن میں خالد کے زانو پر سر رکھے ہوئے اس دنیا سے چل بسا۔ کامل ایک ہفتہ تک خالد اُسی کمرے میں بیٹھا روتا رہا، نہ باہر نکلا اور نہ کسی سے ہم کلام ہؤا، ہم سب کو احمد کی جدائی کا سخت صدمہ تھا۔ احمد کے چہرہ کی ابدی زردی اغلباً اُس کی آنے والی موت کا صحیح پیش خیمہ تھی، میں بھی ان واقعات سے کئی دن تک دل گرفتہ رہا، مگر میرے دل میں ایک نامعلوم توقع کسی مخفی طریقہ سے پرورش پارہی تھی۔

ایک روز شام کے وقت میں صوفے پر تنہا لیٹا ہوا تھا اور میری نگاہیں چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی شخص جلدی سے میرے کمرے میں داخل ہؤا اور آ کر میرے سامنے کھڑا ہو گیا، میں نے اپنا سر اُٹھایا، وہ خالد تھا، وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور صوفے پر میرے پاس بیٹھ گیا، اور بھرائی ہوئی متفکر آواز میں کہنے لگا:

"میں تمہارے ہی پاس آیا ہوں، کیونکہ تم سے زیادہ اور کسی کو میرا خیال نہیں ہے ——— (آنسوؤں کو پی کر) تمہیں معلوم ہے کہ میرا عزیز ترین دوست مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے (کچھ رُک کر) اب مجھے تنہائی شاق ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم میں سے کوئی شخص بھی احمد سے پوری طرح واقف نہ تھا، ایک بھی نہیں،" یہ کہہ کر وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور کمرے میں ٹہلنے لگا۔ پھر میرے قریب آ کر کہنے لگا۔

"تم اُس کی جگہ لینا چاہتے ہو؟" یہ کہہ کر اُس نے اپنا ہاتھ عہد و پیمان کو مضبوط کرنے کے لئے میرے ہاتھ میں دے دیا، میں کود کر اُس کے سینہ سے چمٹ گیا، میری حقیقی مسرت مجھے دیوانہ بنا رہی تھی، میرے الفاظ کا خزانہ خالی تھا، گلے میں میرا سانس گُھٹ رہا تھا، خالد نے مجھ پر ایک غائر نظر ڈالی اور مسکرانے لگا، اس کے بعد ہم دونوں نے چائے پی، وہ برابر احمد کی وفاشعاری کے افسانے سناتا رہا، اُس زرد رُو کمزور لڑکے نے ایک مرتبہ سینہ سپر ہو کر خالد کی جان بچائی تھی۔ میں یہ قصہ سنتا تھا اور اپنی قسمت پر نازاں تھا، رات کے آٹھ بج گئے، خالد اُٹھ کھڑا ہؤا کھڑکی کے پاس جا کر شیشوں کو کھٹ کھٹانے لگا۔ اور پھر کرسی پر بیٹھ گیا، میں نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا، "خالد میں تمہارے بھروسے اور اعتماد کا یقیناً مستحق ہوں"۔ خالد نے مجھے غور سے دیکھا اور کہا، "اگر یہ ہے تو ٹوپی اوڑھ لو اور میرے ساتھ چلو"۔

---

ہم دونوں چل کھڑے ہوئے، ایک تانگہ کرایہ پر لیا اور شہر کے باہر چل دیئے، شہر کے باہر پہنچ کر تانگہ کو رخصت

کردیا گیا۔ ہم دونوں ایک پگڈنڈی پر چلے جا رہے تھے کہ کوئی پون میل جانے کے بعد خالدؔ رکا، رات کا تاریک سایہ اب ہر جگہ پڑ رہا تھا، دائیں جانب ہلکے دھوئیں سے لبریز فضا میں کچھ ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آرہے تھے، بائیں جانب ایک مختصر سے کھیت میں دو سفید گھوڑے چر رہے تھے، ہمارے سامنے دُور تک کھیتوں کا ایک وسیع سلسلہ تھا میں خاموشی کے ساتھ خالدؔ کا تعاقب کر رہا تھا، وہ یکایک رُکا، سامنے ہاتھ پھیلا کر کہنے لگا کہ بس ہمیں یہیں آنا تھا، سامنے ایک چھوٹا سا تاریک مکان تھا، جس کی چھوٹی چھوٹی کھڑکیوں میں سے دھندلی روشنی نکل رہی تھی۔ خالدؔ نے کہا " اس مکان میں ایک پنشن یافتہ فوجی رہتا ہے، اپنی بہن، اپنی لڑکی اور ایک ماما کے ساتھ اِس فوجی کی زندگی کا زیادہ تر افریقہ اور یورپ میں گذرا ہے، عجب اکھڑ مزاج کا آدمی ہے، میں تمہیں اپنا عزیز بتاؤں گا " تم اُس کے ساتھ بیٹھ کر تاش کھیلنا شروع کر دینا، تاش کے کھیل سے اُسے عشق ہے "

میں نے سرِ تسلیم خم کیا، خصوصاً یہ جتانے کے لئے کہ میں بھی احمدؔ کی طرح اطاعت شعار بن سکتا ہوں، لیکن میں تلاشِ حقیقت کے لئے شدت سے بے چین تھا، ہم دونوں مکان میں داخل ہو رہے تھے کہ کھڑکی میں سے میں نے ایک نازک اندام لڑکی کو دیکھا۔ وہ غالباً ہماری ہی منتظر تھی، اور ہمیں دیکھتے ہی غائب ہو گئی، ہم دونوں آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتے ہوئے اندر کے کمرے میں پہنچے ایک پنجاہ سالہ شخص نے ہمارا خیر مقدم کیا، میں نے اُسے غور سے دیکھا، چہرہ ملول و غمگین، سر کے بال کھڑے کھڑے، تنگ پیشانی، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی بڑی مونچھیں، موٹے موٹے ہونٹ،

" خالد! بہت مدت کے بعد آئے، کہاں رہے؟ بہت انتظار دکھایا، احمدؔ کو نہیں لائے؟ "

" احمد تو بیچارے مر گئے! "

" نہیں، مر گئے؟ یہ کون ہیں؟ "

" میرے ایک عزیز ہیں، آپ سے ملنے آئے ہیں "

" بہت خوب، بہت خوب، تاش کھیلتے ہیں؟ "

" بہت مزے سے "

" نہایت خوب، لو، ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں، ذرا خیرنؔ سے کہو کہ گول میز اور تاش کی گڈی لے آئے "

یہ کہہ کر میں اور وہ پنشن یافتہ فوجی دوسرے کمرے میں آ گئے، جو پہلے سے زیادہ مختصر تھا " وہ صوفے پر بیٹھ کر تاش پھانٹنے لگا۔ برابر ہی کرسی پر ایک نہایت دبلی پتلی عورت عینک لگائے بیٹھی تھی، اُس عورت سے تعارف کراتے ہوئے

فوجی نے کہا۔ "وہ پہلا شخص انتقال کر گیا، خالد اُن کی بجائے انہیں لائے ہیں، دیکھیں یہ کیسا کھیلتے ہیں"۔
میں نے اِدھر اُدھر دیکھا خالد غائب ہو چکا تھا تاش کا کھیل شروع ہُوا، فوجی میری ذرا سی غلطی پر آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ مگر اس سے زیادہ افسوس کے قابل بات یہ تھی کہ اپنی بہن کی غلطی پر بھی اُس کے غصہ میں ذرا کمی واقع نہ ہوتی تھی، اخلاق کے اس مظاہرے کو دیکھ کر جی تو یہی چاہا کہ اس قعرِ مذلت سے بھاگ نکلوں، مگر خالد کی محبت کی طلائی زنجیر بے دست و پا کئے ہوئے تھی، ایک موقع پر اُس کی بہن فوجی کے توہین آمیز الفاظ کو ضبط نہ کر سکی اور اپنے سنگ دل بھائی سے کہنے لگی" "تمہیں اپنی بیوی کی موت کا باعث ہوئے، کیا اب مجھے بھی کھڑے کھڑے قبر میں اتارنا چاہتے ہو، تم ہرگز ایسا نہیں کر سکتے، ہرگز نہیں"۔
آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس مکالمہ کے دوران میں میری حالت کسی طرح قابلِ رشک نہ تھی، مگر یہ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ آخر خالد نے مجھے اِس مصیبت میں کس غرض سے پھنسایا ہے۔ میں تاش کھیلنے میں ماہر نہیں تھا، مگر اُس روز معمول سے زیادہ خراب کھیل رہا تھا، یہ کشمکش کوئی دو گھنٹہ تک جاری رہی، مگر اس دوران میں میری روح سمٹ کر ایک نقطہ میں منجمد ہو چکی تھی۔ آخری ربر کے ختم ہونے پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، خالد موجود تھا، اُس کے قریب ایک نوجوان لڑکی کھڑی تھی، اور میری طرف دیکھ رہی تھی اور مسکرا رہی تھی، "سکینہ! ذرا میرا حقّہ لاؤ" فوجی نے کہا، لڑکی ہوا ہوگئی، وہ کچھ بہت زیادہ خوبصورت نہ تھی، بہت پتلی دبلی، چہرہ زردی مائل، مگر میں نے آج تک نہ ایسی رسیلی آنکھیں دیکھیں اور نہ ایسے پیارے دلفریب بال دیکھے۔ ربر ختم ہُوا، خدا خدا کر کے روپے دے کر میں نے اپنی جان چھڑائی، فوجی حقّہ گڑگڑانے لگا۔ خالد نے سکینہ سے میرا تعارف کرایا، ہم دونوں چند منٹ تک بدحواس سے رہے، لیکن چند ہی منٹ میں خالد نے حسبِ معمول سب کو بشاش اور بے تکلف بنا دیا، اُس کی روح کی دلآویزی بہت تھوڑے عرصہ میں پورے ماحول میں سرایت کر جاتی تھی، کبڑی ماما نے آکر میز پر دسترخوان بچھایا، ہم سب کھانا کھانے میں مصروف ہوگئے،
خالد کے عضو عضو سے مسرت و انبساط کی شعاعیں نکل رہی تھیں، خوب بے تکلفی سے، وہ چٹ پٹی کہانیاں سنانے لگا، فوجی کے قہقہوں سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، میں سکینہ کو دیکھنے لگا، اُس کی نظریں خالد پر جمی ہوئی تھیں، میں فوراً تاڑ گیا کہ وہ اُس کی محبوبہ ہے، اور اُسے دل سے چاہتی بھی ہے، اُس کے لب خفیف سے جُدا تھے، اُس کا سر آگے کو جھکا ہُوا تھا، اور اُس کے چہرہ پر مسرت کا ایک دلکش رنگ رقص کر رہا تھا، کبھی کبھی وہ آہیں بھرنے لگتی اور پھر خود بخود ہنسنے لگتی تھی، میں خالد کی خوش نصیبی پر مسرور تھا، مگر ساتھ ساتھ خدا پناہ میں رکھے اُس پر

رشک آمیز نگاہیں بھی ڈال رہا تھا،

کھانے کے بعد ہم دونوں رخصت ہوئے، سکینہ ہمیں رخصت کرنے دروازہ تک آئی، اور خالد سے کہنے لگی، ــــــ

"اب کب آؤ گے؟"

"دو تین دن میں"

"ضرور آنا"

"یقیناً"

(میری طرف اشارہ کرکے) "انہیں بھی اپنے ساتھ لانا"

"ضرور لاؤں گا"

"اچھا خدا حافظ"

راستہ میں مجھے یہ انوکھا قصّہ معلوم ہوا ــــــ

خالد سے اس فوجی کا اچانک چھ ماہ ہوئے تعارف ہوا تھا، بارش میں رات کے وقت خالد شہر کی جانب شکار سے واپس آرہا تھا، کہ شاہراہ کے قریب ہی اُسے گالیاں بکنے اور چلانے کی آوازیں سنائی دیں، اُس کے ہاتھ میں بندوق تھی، وہ اُس آواز پر چل کھڑا ہوا، تھوڑی ہی دُور ایک گڑھے میں ایک شخص اپنی مضروب ایڑی لئے ہوئے چلّا رہا تھا، یہ وہی فوجی تھا جس سے ہم بخوبی واقف ہو چکے ہیں، بڑی دقت سے اُس نے اُسے اُٹھایا، اُس کے مکان تک لے گیا، اُسے اُس کی خوف زدہ بہن اور بیٹی کے سپرد کیا، اور خود ڈاکٹر کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بڑی جستجو کے بعد ڈاکٹر ملا اُسے اپنے ساتھ لے کر فوجی کے مکان پر آیا، پھر شہر سے دوا لایا، اسی اثنا میں پَو پھٹنے لگی، خالد بہت زیادہ تھک چکا تھا، اتنی ہمت نہ تھی کہ پھر شہر کی جانب واپس ہو، سکینہ سے اجازت لے کر صوفے پر لیٹ گیا، نیند کا غلبہ ہوا، صبح آٹھ بجے آنکھ کھلی۔ گھر والوں سے اجازت مانگی، مگر اُنھوں نے چائے کے لئے اُسے ٹھیرا لیا۔ رات میں اُس نے دو مرتبہ سکینہ کو دیکھا تھا، مگر صبح کو دیکھنے سے سکینہ کی ہیئت نے اُس کے دل پر ایک عجب خوشگوار اثر پیدا کیا، سکینہ کی پھوپی نے خالد کی جانفشانی اور مہربانی کا شکریہ ادا کیا، مگر خود سکینہ خاموش رہی۔ چائے دانی میں سے خالد کی پیالی میں چائے ڈالتی رہی، پھر اُس نے بالائی کی پلیٹ اور شکردان اُس کی جانب بڑھا دیا، اسی اثنا میں فوجی بیدار ہوا اور چلانے لگا،

"کوئی ہے؟ سب مر گئے، حقّہ لاؤ"

اُس کی بہن لپک کر اُس کی خواب گاہ میں گئی، وہ پھر چلّایا "ہاں پھر اُس ظالم کا کیا ہوا، اُس کم بخت کا نام تو بتاؤ، کیا وہ چلا گیا؟ ــــــ"

**خالد۔** "نہیں۔ جناب ابھی موجود ہوں، کہئے آپ کا مزاج اب کیسا ہے؟"

"ہاں اب ذرا اچھا ہوں، ذرا یہاں کرم کیجئے"

خالد کمرے میں داخل ہوا۔ فوجی نے اُس کو دیکھا، اور کہا،

"آپ کا شکریہ، آپ پھر کبھی ضرور آئیے اور مجھ سے ملئے، آپ کا کیا نام ہے؟"

"خالد"

"بہت خوب، آپ ضرور تشریف لائیے، اب آپ کو یہاں ٹھیرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ آپ کے گھر پر آپ کی تلاش ہو رہی ہوگی"

خالد نے سلام کیا، اجازت چاہی، اور چل کھڑا ہوا، اس کے بعد آنا جانا شروع ہوگیا، پھر جلد جلد اور بے تکلفی کی ملاقاتیں ہونے لگیں، موسمِ گرما آگیا ــــــ خالد نکر پہن کر ہاتھ میں بندوق لے لیتا، اور چل کھڑا ہوتا، لوگ یہ خیال کرتے کہ وہ شکار کو گیا ہے، حالانکہ وہ سیدھا فوجی کے مکان پر پہنچتا، اور شام تک گپیں ہانکتا رہتا۔

---

سکینہ کے والد نے فوج میں چھبیس سال ملازمت کی تھی، اُن کی ملازمت کا زیادہ حصّہ جنوبی افریقہ، مصر، سوڈان دردانیال اور فلینڈرس میں صرف ہوا تھا، سالہا سال آبادی سے دُور فوجی کیمپ میں مقیم رہے۔ اور انگریزی افسروں کی نیم سرکاری اور نیم سوشل صحبت میں وقت گذارتے رہے، رفتہ رفتہ اُن کی عادتیں بھی مغربی ہوگئیں، پنشن لینے کے بعد جب وطن میں آئے تو ہزارہا دقتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر دُھن کے پکے تھے، شہر سے ایک میل کے فاصلہ پر اپنا مکان مشرقی عزیزوں اور دوستوں سے علیحدہ بنا لیا، اُس کے قریب ہی ایک چھوٹا سا چمن تیار کرایا، اُسی میں رہتے تھے۔ وطن کے احباب اور اعزا سے بہت نالاں تھے، نہ وہ کبھی کسی کے پاس جاتے نہ اُن کے پاس کوئی آتا تھا، لکھنا پڑھنا کچھ یوں ہی جانتے تھے، مگر ظاہری بھدّے پن اور بے تکی باتوں کے باوجود کافی ہوش مند اور چالاک تھے، اور ضرورت کے وقت ریشہ دوانی تک کر گذرتے تھے، اُن میں فطرت نے خود غرضی کوٹ کوٹ کر بھری تھی، بالطبع بہت ضدی اور خود پسند واقع ہوئے تھے، معمولاً کج خلق اور نامہربان معلوم ہوتے تھے، بچوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ضد کرنا اُن کا شیوہ تھا، اُن کے خیالات نے ایک عجیب تمسخر آمیز صورت اختیار کر لی تھی، ایک مرتبہ ہم سب بیٹھے ہوئے اُن سے شادی پر گفتگو کرنے

لگے ، فرمایا "شادی ؟ اُسے لعنت بھیجو ، دیکھو میں کسی کو اپنی لڑکی سے شادی نہ کرنے دوں گا - وہ کیا کرے گا - وہی نا جو میں نے اپنی بیوی کے ساتھ کیا ، یعنی اُسے اِدھر اُدھر لیئے پھرے گا - علاوہ ازیں پھر میں کس کے ساتھ رہوں گا - لاحول ولاقوۃ"

امید ہے کہ میں نے کافی وضاحت کے ساتھ حاضرین سے سکینہ کے والد کو روشناس کر دیا ہے ، خالد کا وہاں جانا اور اس قدر پابندی سے جانا ظاہر ہے کہ محض سکینہ کی وجہ سے تھا ، مجھ سے خود خالد نے پہلے ہی روز یہ کہہ دیا تھا -

"میں سکینہ سے محبّت کرتا ہوں ، کیسی پیاری لڑکی ہے ، اُس نے تمہیں بھی پسند کیا ہے"

میں شاید یہ عرض کرنا بھول گیا ہوں کہ اس وقت تک میں عورتوں کی صحبت سے بہت خائف تھا اور اسی لیئے ان سے اجتناب کیا کرتا تھا - سکینہ پہلی لڑکی تھی جس سے مجھے ضرورتاً ہمکلام ہونا پڑا - ویسے تو سکینہ کوئی غیر معمولی لڑکی نہ تھی ، مگر مقدس ہندوستان کی پوری آبادی ایسی شریف النفس لڑکیاں بہت کم پیدا کرتی ہے ، آپ ضرور دریافت کرنا چاہتے ہونگے کہ یہ کیسے ؟ میں اس کا مختصر سا جواب دیئے دیتا ہوں کہ میں نے اُس کی کسی حرکت میں بناوٹ ، تصنع اور ریاکاری کا شائبہ تک نہ دیکھا - مجھے اُس کا تبسم زیرلبی مدت تک یاد رہے گا - اُس کی دل میں اُتر جانے والی باریک آواز ، اُس کے لطیف و نازک قہقہے ، اُس کی متوجہ نگاہیں میں کبھی نہ بھولوں گا - اُس کے چہرہ سے بمشکل کسی توقع کا اندازہ ہو سکتا تھا ، مگر یہ ناممکن تھا کہ آپ اُسے دیکھ کر اُس کی تعریف نہ کریں - اِس طرح جیسے ایک گھنے جنگل میں کسی پوشیدہ شاخ پر کوئی پرند چہچہاتا ہے ، اور اُس کے لحن پر سننے والا عش عش کرتا ہے -

حضرات ! مجھے یقین ہے کہ آپ چونکہ مہذب اور تعلیم یافتہ ہیں ، اس لئے دورانِ حیات میں . . . . . . نہیں . . . . بلکہ عالمِ شباب میں آپ بھی کسی پر فریفتہ ہوئے ہونگے - اور آپ کو بخوبی علم ہوگا کہ محبت کس طرح پیدا ہوتی ہے اور بڑھتی ہے ، بدیں وجہ میں اس مبحث کو نظر انداز کرتا ہوں اور اُس تفصیل سے آپ کی سمع خراشی نہیں کرنا چاہتا کہ میرے دل میں محبت کیسے پیدا ہوئی اور منزل بمنزل کیسے بڑھی مختصر یہ کہ میں سکینہ کے عشق میں مبتلا ہو چکا تھا ، اور دردِ فراق کی لذتوں اور ملاقات کی دلفریبیوں سے لطف اندوز ہوتا رہتا تھا - سکینہ کے گھر ہم دونوں اکثر جایا کرتے ، میں اُس کے باپ کے ساتھ تاش کھیلنے لگتا ، اور اُس کہن سال فوجی کی بدمزاجیوں کا نشانہ بنتا - لیکن محبوب کی قربت بجائے خود ایک مسرت تھی ، میں نے اُس امنڈتے ہوئے جذبہ کو روکنے کی کبھی کوشش نہ کی ، بلکہ یہ کہنا زیادہ بہتر ہوگا کہ قبل اس کے کہ میں اس جذبہ کی صحیح نوعیت سے واقف ہوں ، یہ طوفان میرے قبضۂ قدرت سے تجاوز کر گیا ، میں نے خفیہ طور پر جذبات کی پرورش کی اور اغیار کی نگاہوں سے اُسے ہمیشہ بہت پوشیدہ رکھا - اس جذبۂ خاموش کے وقتی اُبھار اور ابال کو میں نے

ہمیشہ تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھا۔ نہ میری بھوک زائل ہوئی، اور نہ نیند، پھر بھی شبانہ روز میں سکینہ کے جذبات کے اُس تموج کا احساس کرتا رہتا تھا جو محبت کی ایک صحیح علامت ہے۔

حیات کی وہ کشاکش جس سے مجھے اکثر دوچار ہونا پڑا، ایک اعلیٰ پایہ کا شاعر ہی لکھ سکتا ہے۔ میرے قلم میں وہ طاقت نہیں کہ میں اُن کا مرقع پیش کر سکوں، مثلاً ایک مرتبہ خالد اور سکینہ باغ سے برآمد ہوئے، سکینہ کا چہرہ محبت اور مسرت کی تابش سے جگمگا رہا تھا۔ اور اُس کے اعضا پر شگفتگی کے وہ تمام اثرات موجود تھے جو غیر معمولی انبساط اور خوش نصیبی کی حالت میں پائے جاتے ہیں۔ سکینہ مکمل طور پر خالد کی حیات میں پیوست ہو گئی تھی، حتیٰ کہ بے خبری کے عالم میں اُس کے حرکات و سکنات کا تتبع کرنے لگی تھی، اُس کی نگاہیں خالد کی نگاہیں تھیں اُس کا قہقہہ اور تبسم خالد کا قہقہہ و تبسم تھے، اب تک میری یاد میں وہ لمحات محفوظ ہیں جو اُس نے خالد کے پہلو میں گذارے تھے، اور سرشارِ محبت ہو کر اُٹھی تھی،

مگر خالد اب تک آزاد تھا، سکینہ کی عدم موجودگی میں خالد کو کبھی اُس کا خیال تک نہ آتا تھا، اب تک وہ ویسا ہی آزاد منش، بے خبر، ہنس مکھ نوجوان تھا، اُس کی زندگی کے کسی پہلو میں تبدیلی پیدا نہ ہوئی ـــــ

وقت گذرتا گیا، وہ دونوں نہایت شادان و فرحاں تھے، اس کی چنداں ضرورت نہیں کہ میں اُن کی خوشیوں کے واقعات مفصل بیان کروں، آخر کار مجھے محسوس ہونے لگا کہ سکینہ کی طفلانہ سبک اندازی نے ایک اضطراب آمیز وقار کی صورت اختیار کر لی۔ مگر رفتہ رفتہ اُس بات کا خطرہ نظر آنے لگا جس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا یعنی خالد کے جذبات ختم ہونے لگے، اُس کے دل کی گہرائیوں میں سرد مہری آچلی، اس احساس نے مجھے مسرور بھی کیا اور مغموم بھی، مگر مجھے خالد پر ذرا بھی غصہ نہ آیا۔ اب اُن کی ملاقاتیں کم اور مختصر ہوتیں، سکینہ کی آنکھوں میں اکثر آنسو نظر آتے، شکوے شکایت کے دفتر کھلتے، ملامت آمیز لہجہ سنائی دیتا، اور اکثر رونا دھونا بھی ہوتا، میں خالد سے اکثر کہتا "آج سکینہ کے گھر چلو گے؟" وہ سرد مہری سے مجھے دیکھ کر کہہ دیتا "نہیں آج تو ارادہ نہیں"۔ میں ایک طویل عرصہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں احمد کا صحیح جانشین نہ ہو سکا، وہ مجھ سے کہیں زیادہ اطاعت شعار اور احمق تھا۔

ایک بات اور یاد آ گئی، افسوس ہے کہ میں نے اب تک کیوں نہ کہی، اب تک میں نے آپ سے اپنے دوست ظفر کا تعارف نہ کرایا اُس کی عمر پچیس سال کی ہو گی، گذشتہ دس سال سے وہ علی گڈھ میں تعلیم پا رہا تھا، ظفر میں جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے کوئی ظاہری حسن نہ تھا، چہرہ لانبا، زرد زرد چھوٹی چھوٹی بادامی آنکھیں، ناک لمبی مگر آگے سے جھکی ہوئی، ہونٹ پتلے مگر ہموار، آواز بھی اکثر کانوں کو بھلی معلوم نہ ہوتی تھی۔ مگر اُس کے ساتھ ہی ذکی الطبع، تیز فہم، ہوشمند

اور شیریں گفتار تھا، اکثر ایسی برجستہ چھوٹی سی مثل کہہ کر ہمیں خاموش کر دیتا، کہ ہم اس پر استعجاب کی نظریں ڈالنے لگتے ظفر ایسے طالب علموں کے لئے موت کا فرشتہ تھا جو ٹھوس مضامین کے مطالعہ سے بھاگتے ہیں، اور چند بے معنی اور لغو غزلیں کہہ کر سامعین سے داد لینا چاہتے ہیں، مگر یہ تعجب ہے کہ خود ظفر کو ہم نے کبھی پڑھتے نہ دیکھا تھا، ظفر اُس محبت کا مذاق اُڑاتا تھا جو مجھے خالد سے تھی، پہلی مرتبہ میں نے اُس کے طنزیہ فقرات سنے، اور کہہ دیا کہ جاؤ میرا سر نہ کھاؤ، دوسری مرتبہ میرا غصہ کم ہوُا، میں نے متانت سے اُسے سمجھانا چاہا کہ یہ محبت اور دوستی تمہارے دائرۂ ادراک سے باہر ہے' اس کے بعد وہ کچھ سمجھ گیا اور تھوڑے ہی عرصہ میں ہم دونوں گہرے دوست ہو گئے' ۔۔۔۔۔

پندرہ دن سے میں نے سکینہ کو نہ دیکھا تھا۔ دل مضطرب و بے چین تھا، غرور، نخوت، محبت، آنے والے واقعات کا ایک دھندلا سا پرتو، متعدد اور مختلف جذبات دل اور دماغ میں طوفان برپا کئے ہوئے تھے، ایک ڈوبتے ہوئے دل کو اپنے پہلو میں لے کر میں چل دیا، مجھے یہ معلوم نہیں کہ میں اُس کے مکان تک کیسے پہنچا، ہاں اس قدر ضرور یاد ہے کہ راستہ میں دو تین جگہ بیٹھ بیٹھ گیا، تھکن کی وجہ سے نہیں بلکہ جذبات کی فراوانی کی وجہ سے، مجھے دُور سے دیکھتے ہی سکینہ میرا خیر مقدم کرنے کے لئے لپکی، اور بے اختیار ہو کر پوچھنے لگی۔

"خالد کہاں ہیں"

"وہ تو نہیں آئے"

"نہیں آئے! کیوں؟"

"وہ ایک کام کی وجہ سے رُک گئے"

مجھے اس کا مطلق علم نہ ہوُا کہ میں نے کیا کہا، مجھے آنکھیں اُٹھانے کی ہمت نہ ہوئی، سکینہ میرے سامنے خاموش اور ساکت کھڑی تھی، میں نے ہمت کر کے اُسے دیکھا، اُس نے منہ پھیر لیا، دو بڑے بڑے آنسو اُس کے رخساروں پر حرکت کر رہے تھے، اُس کے چہرہ سے ایک فوری اور گہری روحانی کوفت کا پتہ چلتا تھا، شرم، رنج، اور بھروسے کی نمایاں کش مکش اس قدر شدت سے اُس کے ہاتھوں کی حرکات سے ظاہر ہوتی تھی کہ میرے دل میں درد پیدا ہو گیا، میں ذرا آگے کو جھکا، وہ چونکی اور نظروں سے غائب ہو گئی۔

ملاقات کے کمرے میں سکینہ کے والد نے میرا استقبال ان الفاظ سے کیا،

"دوست! آج اکیلے کیسے آئے؟"

"بے شک، میں تنہا آیا ہوں"

میرے جواب کا انتظار کئے بغیر فوجی بہادر ہنستا ہوُا دوسرے کمرے میں جا چکا تھا،
ایسی حالت میں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کہ میری پوزیشن کیسی تکلیف دہ تھی، مگر کیا ہو سکتا تھا اس خندۂ بیہم کی علت، غایت؟ سکینہ کی پھوپی اسی دوران میں ایک پھٹی پرانی کتاب ہاتھ میں لئے آموجود ہوئی، میں اُس سے باتیں کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد سکینہ بھی آگئی، بہت نڈھال اور غمگین، پنشن یافتہ فوجی نے خالد پر فقرے چست کرنے شروع کئے، سکینہ جلدی سے اُٹھ کر چل دی، چائے آگئی، میں نے اُن کے ساتھ چائے پی اور رخصت مانگی، فوجی افسر نے مصافحہ کیا اور کہا:-

"مہربانِ من پھر آپ سے کب ملنا ہوگا؟"
میں ہوں ہاں کر کے واپس ہوُا، میں درحقیقت اُس سے بے حد خائف تھا،
سیڑھیوں پر ایک سرد ہاتھ نے میرے شانے کو مس کیا، میں نے مڑ کر دیکھا، وہ سکینہ تھی، کہنے لگی۔
"مجھے تم سے کچھ باتیں کہنی ہیں، کل ذرا اول وقت آجانا، سیدھے باغ میں، ابا جان کھانے کے بعد سو جاتے ہیں"
میں نے اُس کا ہاتھ دبایا اور چل کھڑا ہوُا۔

دوسرے دن سہ پہر کو تین بجے میں فوجی افسر کے باغ میں چہل قدمی کر رہا تھا، صبح کے وقت میں کوشش کرنے پر بھی خالد سے نہ مل سکا، موسم خوشگوار تھا، نازک نازک زرد گھاس موسمِ خزاں کا پتہ دے رہی تھی، چست و چالاک گلہری شاخوں کے گچھوں میں کبھی روپوش ہو جاتی اور کبھی پھر رقص کرنے لگتی تھی، ایک خرگوش باغ کے ایک پوشیدہ سے گوشہ میں جست لگا رہا تھا۔ فوجی افسر کے گھوڑے کا بچھیرا سایہ میں کھڑا اِدھر اُدھر پُر معنی نگاہیں ڈال رہا تھا، میں نے نارنگی کے ایک درخت کے نیچے سکینہ کو ایک بنچ پر بیٹھے ہوئے پایا، اُس کا لباس سیاہ اور کچھ غیر مرتب سا تھا، اُس کی آنکھیں اور اُس کے بالوں کا انداز اُس کی سوزشِ پنہاں کا پتہ دے رہے تھے۔ میں بھی اُس کے پاس بیٹھ گیا، ہم دونوں خاموش تھے، بہت دیر تک وہ نارنگی کی ایک چھوٹی سی ٹہنی کو توڑتی رہی، پھر اُس نے اپنا سر جھکا دیا، اُس کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔

## "خالد"

میں نے اُس کی جنبشِ لب سے فوراً تاڑ لیا کہ وہ عنقریب رویا چاہتی ہے میں نے اُس کی تشفی کی، اور خالد کی محبت کا یقین دلایا، وہ میری تقریر سنتی رہی اور غمگین انداز سے اپنا سر ہلاتی رہی آہستہ لہجہ میں کچھ کہا اور پھر خاموش ہوگئی وہ ابتدائی لمحے جن کا مجھے سب سے زیادہ خوف تھا یوں آسانی سے ختم ہو گئے۔ پھر اُس نے جستہ جستہ خالد کے متعلق باتیں کیں۔

"مجھے معلوم ہے کہ اب اُسے مجھ سے محبت نہیں ...... خیر اُس کا خدا حافظ و ناصر ہو۔
"سمجھ میں نہیں آتا کہ بغیر اُس کے میری زندگی کیسے گذرے گی، ساری ساری رات روتی رہتی ہوں۔
"...... یا اللہ اب کیا کروں ....... تو ہی مددگار ہے"
اُس کی آنکھیں نم ناک ہوگئیں،
"میں اُسے ایسا اچھا سمجھتی تھی، مگر ...... وہ ........"
سکینہ نے رومال سے اپنی آنکھیں پونچھیں، اور اطمینان سے پہلو بدل کر بیٹھ گئی، پھر کچھ وقفے کے بعد کہنے لگی،
"معلوم ہوتا ہے کہ خالد ابھی ابھی یہاں سے گئے ہیں"

میں اُس کے بیانات کو خاموشی کے ساتھ سنتا رہا۔ میری روح اک جاں گسل سعادتِ بشری سے مملو ہو رہی تھی، میں اپنی نگاہیں اُن نمناک آنکھوں، اُن لانبی ابروؤں اور اُن لرزتے ہوئے لبوں سے نہ ہٹا سکا، کیا اس موقع پر مجھے اجازت دو گے کہ میں تھوڑی دیر کے لئے اپنے جذبات کے اجزا آپ کے ملاحظہ کے واسطے پیش کروں، میں سخت ملول تھا کہ سکینہ میرے علاوہ کسی اور پر جان دیتی ہے، اور کوئی اَور اُس کے دردِ دل کا موجب ہے، مگر میں خوش تھا کہ وہ اپنے دلی جذبات مجھ سے بے تکلفی سے کہہ رہی تھی، میں مسرور تھا کہ میں نے اُس سے ہمدردی کر کے اُسے شکر گذار ہونے کا موقع دیا، میں دل میں عہد کر رہا تھا کہ میں خالد اور سکینہ کو پھر ایک مرتبہ ہمکنار کرا دوں گا۔ میری یہ فیاضی کس قدر لائقِ تحسین تھی، کبھی یہ بھی خیال گذرتا تھا کہ شاید میرا ایثار اُسکے دل میں میرے لئے کچھ گنجائش پیدا کردے۔

گھنٹہ گھڑی سے پانچ بجنے کی آواز آئی، شام کی تاریکی درو دیوار پر تیزی سے چھا رہی تھی، سکینہ جلد اُٹھ کھڑی ہوئی اور میرے ہاتھ میں ایک خط دے کر چل دی۔ میں نے خالد کے لانے کا وعدہ کیا، اور ایک عاشق کی طرح کھڑکی میں سے ہوتا ہوا باغ کے باہر آگیا۔ لفافہ پر یہ الفاظ تحریر تھے، "مسٹر محمد خالد کی خدمت میں"

دوسرے روز علی الصباح میں خالد کے مکان پر پہنچا، میں صاف عرض کئے دیتا ہوں کہ گو میرا ارادہ نہ صرف بے لوث تھا بلکہ ایک حد تک ایثار سے بھی خالی نہ تھا لیکن خالد کا سامنا کرنے میں مجھے ایک قسم کا تکلف محسوس ہونے لگا، میں کچھ بجھا بجھا تھا، دل دھڑکنے لگا! اور رگوں میں خون کی گردش نے غیر معمولی سرعت اختیار کرلی، میں ان ہی خیالات میں غلطاں و پیچاں تھا کہ آخر کار خالد کا دروازہ نظر پڑا، میں اُس کے کمرے میں داخل ہوا، یونیورسٹی کا ایک طالب علم جس کی عمر کوئی بیس برس کی تھی اور جس سے میں زیادہ واقف نہ تھا اُس کے پاس بیٹھا ہوا اپنی ایک نظم سنا رہا تھا، نظم میں اُس نے اُس عورت کے جذبات قلمبند کرنے کی کوشش کی تھی جو مرد کی بے وفائی کا شکار ہو جاتی ہے، اُس مرد

کا فنکار جس نے مدتوں اُس کے سامنے محبت اور عقیدت کے راگ گائے ہوں۔ نظم بلند پایہ نہ تھی، اٹھارہ اور پچیس سال کی درمیانی عمر میں کالج کے ہزار ہا طلبا محبت کے افسانے، الفت کے خطوط، اور عشقیہ نظمیں لکھتے ہیں اور دوستوں کو سناتے پھرتے ہیں، دنیا میں اس سے زیادہ جلد فنا ہونے والا اور کوئی لٹریچر نہیں، آخر کار نظم ختم ہوئی، طالب علم کو استحقاق سے زیادہ داد ملی، اور تھوڑی دیر بعد پھر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے وہ چل دیا۔ اب ہم دونوں تنہا تھے، میں نے دل مضبوط کیا اور بغیر رسمی الفاظ کے وہ خط خالد کو دے دیا۔ خالد نے اول تو میرے اوپر تعجب کی نگاہیں ڈالیں، پھر لفافہ چاک کر کے خط کا مضمون پڑھا، کچھ مسکرایا اور کہنے لگا،

"تم آج سکینہ سے مل آئے؟"

"ہاں میں وہاں کل شام تنہا گیا تھا"

"خوب"

"تمہیں اُس کا مطلق کچھ خیال نہیں، کاش تم اُس کی اشک آلود آنکھیں دیکھتے!"

میں نے اپنی پوری فصاحت صرف کرنے کی کوشش کی اور سکینہ کی حالتِ زار کا صحیح مرقع خالد کے سامنے پیش کیا، مگر وہ خاموش بیٹھا ہوا سگار پیتا رہا۔ پھر کہنے لگا۔

"تم نارنگی کے درخت کے نیچے اُس کے پاس بیٹھے ........ خوب ........ گذشتہ مئی میں اُسی جگہ میں بھی اُس کے ساتھ اُسی بنچ پر بیٹھا کرتا تھا، ....... باغ پر جوششِ بہار تھا۔ درخت کی سبز سبز چمکدار پتیاں ہم پر گرتی رہتی تھیں اور میں اپنے ہاتھ میں سکینہ کا ہاتھ لئے ہوتا تھا۔ عجب مسرت کا زمانہ تھا، ....... اب پتیاں زرد پڑ گئی ہیں اور نارنگیاں بھی ترش ہو گئی ہیں"۔

یہ تقریر سن کر مجھے غصہ آگیا، خالد کی سرد مہری اور ظلم آرائی پر میں اُسے ملامت کرنے لگا، "آخر اُس لڑکی سے یوں یکایک دست بردار ہو جانے کا تمہیں کیا حق حاصل ہے، بالخصوص ایسی حالت میں جب تم نے اُس کے دل میں شمعِ محبت روشن کی، اور اُسے اپنا شیدائی بنا لیا" میں نے خالد کی منت سماجت کی اور اُسے ترغیب دی کہ وہ کم از کم آخری مرتبہ پھر سکینہ سے مل آئے، خالد خاموشی سے میری تقریر سنتا رہا،

**خالد**۔ "یہ صحیح ہے کہ دوست کی حیثیت سے تمہیں میرے افعال پر نکتہ چینی کرنے کا حق حاصل ہے، لیکن بہتر ہو کہ اس سے پیشتر میرا جواب سن لو"، یہ کہہ کر وہ کچھ رکا اور مسکرانے لگا۔

"سکینہ ایک بہترین لڑکی ہے" اُس نے کہا " اُس نے میرے ساتھ کوئی بھی برائی نہیں کی، اِس کے برخلاف میں

اُس کا بے حد مرہونِ منت ہوں، اُس کی نوازشوں کو میں کبھی نہ بھولوں گا، مگر اب میں نے اُس کے پاس جانا، اور اُس کی پروا کرنا ترک کر دیا ہے، اُس کی ایک معمولی سی وجہ ہے، بہت معمولی سی"

"وہ کیا وجہ ہے" میں نے سوال کیا۔

"خدا جانے کیا...... جب تک میں نے اُس سے محبت کی میں ہمہ تن اُس کا تھا میں نے مستقبل پر کبھی غور نہ کیا۔ میری ہر چیز کی حتیٰ کہ میری حیات تک کی وہ حقدار اور مالک تھی،...... مگر اب میرا یہ جذبہ ختم ہو گیا ہے، شاید تم مجھے لغو خیال کرو گے کہ میں محبت کے جذبات سے بچوں کی طرح کھیلتا رہا۔ مگر کیوں؟ اُس پر ترس کھا کر! اگر وہ ایک معقول لڑکی ہے تو اب اُسے تمہارے ترس کھانے کی پروا نہ ہوگی، اور اگر تمہاری ہمدردی سے وہ مطمئن ہو جاتی ہے تو مجھے اُس کی پروا کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے......"

خالد کے ان ظالم اور بے رحم الفاظ نے مجھے سخت تکلیف پہنچائی، بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ اُس ہستی کے متعلق تھے جس کا میں شیدائی تھا، رگوں میں میرا خون کھولنے لگا، خالد سے اگر میں مرعوب نہ ہوتا تو یقیناً میں اُس سے دست و گریباں ہو جاتا، گو میرے دلی جذبات میرے چہرے سے ظاہر ہو رہے تھے، مگر خالد نے اُن کی مطلق پروا نہ کی، ٹوپی سر پر رکھ کر وہ چلنے لگا، میں نے دریافت کیا،

"کہاں جاتے ہو"

"سیر کرنے، اُس طالب علم کی نظم نے اور تمہاری بکواس نے دردِ سر پیدا کر دیا ہے"

"تم خفا ہو گئے؟"

"بالکل نہیں" مسکراتے اور مصافحہ کرتے ہوئے اُس نے کہا۔

"اچھا، سکینہ سے کیا کہہ دوں؟"

"رخصتی سلام کہہ دینا" یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا، میں نے زینہ پر اُسے پھر پکڑ لیا۔

"کیا وہ بہت پریشان ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"بہت، نہایت"

"بیچاری کی تسلی کرتے رہنا، اب تو تم اُس کے چاہنے والے ہو"

"ہاں، مجھے اُس سے اُنس ضرور ہے"

"بھی، اُنس کس جانور کا نام ہے، عشق" اُس نے مجھے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، ہم دونوں جدا ہو گئے، میں مکان

پر واپس آیا، مگر مجھے بخار چڑھا ہوا تھا،

"میں نے اپنا فرض انجام دیا" میں نے اپنے دل میں کہا۔ "خود غرضی کو پس پشت ڈالا، خالد کو ترغیب دی کہ وہ سکینہ کے پاس پھر واپس جائے، اب میں حق پر ہوں"۔

خالد کے بے پروایانہ انداز نے مجھے مجروح کر دیا، اُس نے مجھ پر رشک آمیز نگاہیں ہی نہ ڈالیں، بلکہ مجھے ہدایت کی کہ میں اُس کی تسلی کرتا رہوں ...... کیا سکینہ کوئی معمولی لڑکی ہے، کیا وہ ہمدردی کی بھی مستحق نہیں، مگر اس سے کیا حاصل؟ وہ مجھ سے محبت نہیں کرتی، ...... خالد سے نا امید ہو کر بھی اُس کا دل نہ پسیجا، ...... مگر ممکن ہے کچھ عرصہ کے بعد ...... میری وفا شعاری اس کے دل پر اثر کر جائے، اِس وقت مجھے اپنے حقوق پیش نہیں کرنے چاہئیں، میں سراسر اُسی کا بندۂ بے دام بن جاؤں گا، کیا پھر بھی سکینہ مجھ سے محبت نہ کرے گی؟

یہ خیالات تھے جن میں میں اپنے پروفیسر کے مکان پر ۱۹۰۳ء کے زمانہ میں غلطان و پیچاں رہتا تھا کبھی رونے لگتا، کبھی غشی کی حالت طاری ہو جاتی، موسم شدت سے تکلیف دہ تھا علی گڈھ کی جہنم نشان گرمی سے کون واقف نہیں ہفتہ میں چھ دن شام کے وقت فرحناک ہوا کے بجائے آندھی، دن بھر لُو کی روح فرسا شدت، خدا کی پناہ! صبح ساڑھے سات بجے سے آٹھ نو بجے رات تک گرمی اور لُو سے کہیں بھی عافیت نہ ملتی تھی،

سامعین میں سے ایک نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ آپ خود اپنی داستانِ محبت سنانا چاہتے ہیں، جی نہیں، آپ تو صرف حیرت انگیز خالد کا ذکر کیجئے"۔

"معافی چاہتا ہوں، بڑی غلطی ہوئی، دل سے مجبور تھا ...... بڑی غلطی ......"

ایک ہفتہ کے بعد میں پھر سکینہ کے مکان پر پہنچا۔ ملاقات کے کمرے میں گھر کے سارے ارکان موجود تھے۔ مجھے دیکھ کر سکینہ سپید پڑ گئی۔ غالباً میرے چہرے سے حزن و ملال کے آثار ظاہر ہو رہے تھے، تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد میں سکینہ سے تنہائی میں بات چیت کر سکا، سکینہ نے کہا۔

"آپ تنہا ہیں"

"بالکل تنہا ...... اور شاید ایک مدت کے لئے"

"آپ نے میرا خط دے دیا تھا؟"

"اُسی دن"

"خوب" وہ سانس لینے کے لئے رُکی۔ میں اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا، میرے دل میں "اسدانہ

مسرت کا غلبہ تھا، میں نے کہا۔" خالد سے اب توقع رکھنا عبث ہے!"

سکینہ نے اپنا بایاں ہاتھ اپنے دل پر رکھا، سیدھا ہاتھ آگے بڑھایا، کچھ لڑکھڑائی اور کمرے سے غائب ہوگئی، میں اور دو گھنٹے وہاں موجود رہا، پھر واپس آگیا، مگر نہایت منفعل اور بدحواس تھا، سکینہ سے محجوب تھا، اور خود اپنی ذات سے شرمندہ، کہتے ہیں کہ ناقص عضو کو جلد سے جلد کاٹ ڈالنا چاہیئے، لیکن اس غریب لڑکی کے دل پر مجھے کیا اختیار تھا۔ بہت دیر تک بستر پر لیٹا ہؤا کروٹیں بدلتا رہا، آخر کار نیند آ ہی گئی،

اِس کے بعد میں برابر خالد سے ملتا رہا، اُس کی زبان پر پھر کبھی سکینہ کا نام نہ آیا، سکینہ سے بھی مجھے اکثر ملنے کا موقع ملا، رفتہ رفتہ اُس کو مجھ سے بہت گرویدگی ہوگئی، مگر اُس قسم کی گرویدگی جس میں محبت کا شائبہ تک نہیں ہوتا، اُس نے میری ہمدردی کی دل سے قدر کی، مجھ سے گھنٹوں رازِ دل کہتی تھی، اور خالد کا ذکر کرتی تھی، اب تک ان تمام مراحل کے بعد بھی خالد اُس کی رگ رگ میں پیوست تھا، میں نے بارہا اُس کے نسوانی غرور کو بیدار کرنا چاہا، لیکن وہ یا تو خاموش ہو جاتی یا پھر خالد کے افسانے سنانے لگتی مجھے اُس زمانہ میں اس کا خیال بھی نہ تھا کہ وہ رنج والم جس میں گویائی کا مادہ بڑھ جاتا ہے خاموش کر دینے والے غم سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ وہ زمانہ میرے لئے نہایت کرب اور بے چینی کا زمانہ تھا، رفتہ رفتہ مجھے محسوس ہونے لگا کہ میں خالد کا جانشین نہیں ہوسکتا، اور نہ سکینہ کا زریں ماضی از سرِ نو پیدا کر سکتا ہوں، اُس دوران میں وہ بہت دبلی ہوگئی تھی، میری ناکام کوششیں چار سال تک جاری رہیں، پورے چار سال تک، اب تک سکینہ اُسی طرح ملول و غمگین رہتی ہے، اور اُس کی زبان پر اب تک خالد کی محبت کے افسانے جاری ہیں +

عبدالشکور بریلوی

---

# پتیاں

سچے حسن سے سچی محبت پیدا ہوتی ہے۔

---

دنیا وہ نہیں جسے ہم دیکھیں۔ دنیا وہ ہے جسے ہم تصوّر کریں۔

---

دیکھو کہ تمہیں نظر آئے۔ ڈھونڈو کہ تم پالو۔ دوڑو کہ تم پہنچ جاؤ۔

باغبان

# چاند سے جھڑپ

ٹھنڈے ٹھنڈے جائے چاند — جلنوں کو نہ جلائے چاند
پہلو میں وہ چاند نہیں — کس سے دیکھا جائے چاند
میری طبیعت بھی خوش ہو — مجھ کو کیا خوش آئے چاند
مجھ کو بھائے جب جانوں — دنیا بھر کو بھائے چاند
مجھ کو رجھائے جب مانوں — عالم بھر کو رجھائے چاند
سب کو بھائے، مجھ کو کیا — مجھ کو بھی تو بھائے چاند
میرے سامنے آ آ کر — میرا منہ نہ چڑائے چاند
مجھ کو تنہا پا پا کر — میرا جی نہ دکھائے چاند
اس کا نتیجہ کیا ہوگا — غور بھی تو فرمائے چاند

---

ٹیڑھی چالیں ٹھیک نہیں — ان سے باز آ جائے چاند
سیدھی طرح اک کام کرے — اُلٹے پاؤں جائے چاند
جس سے مرا گھر روشن تھا — اُس کو ڈھونڈ کے لائے چاند
جس سے یہ آنکھیں بینا تھیں — اُس کا جلوہ دکھائے چاند
جس سے مل کر چین ملے — اُس کو لا کے ملائے چاند
جیسے کہ خود نور افشاں ہے — اپنے رخ کو لگائے چاند
یوں ہی میرے گھر کو بھی — بقعۂ نور بنائے چاند
واہ وہ روشن ساعت جب — گھر کا گھر بن جائے چاند

---

اور جو اُس کو لا نہ سکے — مجھ کو منہ نہ دکھائے چاند

میرا گھر محتاج نہیں — میرے گھر سے جائے چاند
مجھ سے ضدوں کی لے لیکر — باہم ضد نہ بڑھائے چاند
مجھ کو چوکے دے دے کر — پیہم دل نہ دکھائے چاند
حد سے زیادہ دق کرکے — غصہ تو نہ دلائے چاند
میں بھی آپے میں نہ رہوں — اتنا تو نہ ستائے چاند
میں بھی تحمل کھو بیٹھوں — ایسا قہر نہ ڈھائے چاند
اب بھی فسادوں پر نہ تلے — اب بھی شر نہ اٹھائے چاند
اب بھی عقل کے ناخن لے — اب بھی ہوش میں آئے چاند
ورنہ میرے منہ آ کر — شاید منہ کی کھائے چاند

---

لیکن اب میں کیوں چوکوں — دکھ پائے تو پائے چاند
کیوں نہ اک ایسی چٹکی لوں — جس سے تڑپ ہی جائے چاند
مجھ پہ تو چوٹیں کرلیں اب — اپنی چوٹ بچائے چاند
سورج سے منو لے کر — اپنا نور بڑھائے چاند
نظروں کو جُل دے دے کر — اپنا عیب چھپائے چاند
مانگے تانگے جوبن پر — غرّہ کرے، اترائے چاند
ظلم ہے اک تاریک کرہ — اپنے کو کہلائے چاند
قہر ہے، صرف اک تودۂ خاک — اپنے کو منوائے چاند

آزاد اب تو سامنے آئے — اب تو آنکھ ملائے چاند

حکیم آزاد انصاری

# جھوٹ

"تم جھوٹ بولتی ہو! میں جانتا ہوں تم جھوٹ بولتی ہو"!

"تم نے شور کیوں مچا رکھا ہے؟ لوگ سنیں گے تو کیا کہیں گے؟"

یہ اُس نے ایک اور جھوٹ بولا، کیونکہ میں شور نہیں مچا رہا تھا۔ میں نہایت آہستگی کے لہجے میں گفتگو کر رہا تھا۔ میں اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی نرمی اور آہستگی سے باتیں کر رہا تھا جب یہ زہر آلود لفظ "جھوٹ" سانپ کی طرح پھنکارتا ہوا نمودار ہوا۔

اُس نے کہا "مجھے تم سے محبت ہے اور تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیئے۔ کیا تمہیں اب بھی یقین نہیں آتا"؟ اور اُس نے اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے ملا دیئے لیکن جونہی میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے گلے سے لگانا چاہا وہ مجھے چھوڑ کر جا چکی تھی تاریک برآمدے کو طے کر کے وہ کمرے میں داخل ہوئی جہاں ایک مسرور محفل برخاست ہو رہی تھی۔ میں بھی اُس کے پیچھے پیچھے گیا۔ میں یہاں کیونکر آیا تھا؟ اُس نے مجھ سے اس جگہ آنے کو کہہ رکھا تھا اور اسی لئے میں یہاں موجود تھا۔ میں تمام رات لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری طرف کوئی نہ آیا نہ مجھے کسی نے مخاطب کیا۔ میں سب کے لئے اجنبی تھا اور ایک کونے میں سازندوں کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ پیتل کے ایک بہت بڑے باجے کا منہ سیدھا میری طرف تھا۔ اور کوئی اس باجے میں چھپ کر مجھ پر ٹھٹھا اُڑا رہا تھا اور بار بار ایک کرخت اور ہچکیہ آمیز قہقہے کے ساتھ ہنستا تھا۔ "ہو! ہو! ہو!"

وقتاً فوقتاً ایک سفید اور خوشبو سے مہکا ہوا بادل میرے قریب آ کر چلا جاتا تھا۔ وہ تھی۔ میں نہیں جانتا کہ وہ کس طرح دوسروں کی نظریں بچا کر مجھ سے ہم آغوش ہوتی تھی لیکن ایک اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے اُس کا کندھا میرے کندھے سے آ کر چھو جاتا اور اسی اُڑتے ہوئے مختصر لمحے کے لئے میں اپنی آنکھیں نیچی کر کے اُس کی سفید نورانی گردن کو دیکھ لیتا تھا۔ جب میں نظریں اوپر اُٹھاتا تو مجھے ایک ایسی سفید سنجیدہ اور پُر صداقت یک رخی تصویر نظر آتی کہ اُس پر ایک مغموم و دلگیر فرشتے کا دھوکا ہوتا۔ میں اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھتا جو بڑی بڑی روشنی کے لئے حریص، خوبصورت اور پُرسکون تھیں۔ اُن کی نیلاہٹ میں پتلیوں کی سیاہی چمکتی اور جب کبھی میں اُن میں جھانکتا وہ سیاہ ہو جاتیں اور اُن کی گہرائی انتھاہ معلوم ہونے لگتی شاید وہ لمحہ جس میں میں اُن کی طرف دیکھتا اس قدر مختصر ہوتا کہ میرے قلب کی حرکت کے وقفے بھی اُس سے طویل ہونگے لیکن خوف اور درد و کرب سے مجھے ایسا محسوس ہوتا جیسے میری ساری زندگی کھنچ کر اُس کی آنکھوں میں سما گئی ہے یہاں تک کہ میں اپنے آپ سے اجنبی ہو جاتا۔ خاموش، تنہا، مُردے کی طرح۔ پھر وہ رقص کی ایک گردش کے ساتھ مجھے چھوڑ جاتی۔ میری زندگی

مجھ سے چھین کر اپنے ساتھ لے جاتی اور اپنے بلند قامت مغرور لیکن حسین و جمیل شریک کے ساتھ رقص کرنے لگتی میں اس شخص کی ہر چیز کا بغور مطالعہ کرتا رہا۔ اُس کی جوتیوں کی طرز و وضع کا، اُس کے تناسب اعضا کا، اُس کے پُر پیچ و سرکش بالوں کی لہروں کا، مگر اُس کا بے پروایانہ انداز اُس کی کم نگہی مجھے زمین میں پیوست کرتی ہوئی معلوم ہوتی تھی اور مجھے خاک کی طرح باطل اور بے معنی بناتی ہوئی نظر آتی تھی۔

جب انہوں نے شمعیں بجھانی شروع کیں تو میں اُس کے پاس گیا اور اُس سے کہا "اب جانے کا وقت ہے۔ میں تمہیں گھر چھوڑ آؤں گا"۔

اُس نے حیرت زدہ ہو کر جواب دیا "مگر میں تو اُس کے ساتھ جا رہی ہوں اور اُس نے اُسی شخص کی طرف اشارہ کیا۔ جو میری طرف دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئی اور اُس نے مجھے چوم لیا۔

"یہ سب جھوٹ ہے" میں نے آہستہ سے کہا

اُس نے جواب دیا "ہم کل ملیں گے۔ تم ضرور میرے ہاں آنا"

جب میں گھر کی طرف جا رہا تھا تو کہر سے بھری ہوئی زمردیں صبح کی شعاعیں اونچے اونچے مکانوں کی چھتوں پر پڑ رہی تھیں۔ سڑک پر صرف ہم دو شخص تھے۔ گاڑی والا اور میں۔ وہ تیز و تند ہوا سے اپنے چہرے کو بچانے کے لئے آگے کو جھک گیا اور اُس کے پیچھے میں نے اپنے چہرے کو آنکھوں تک ڈھانپ لیا۔ گاڑی والے کے دل میں اپنے خیالات تھے اور میرے دل میں اپنے، اُدھر مکانوں کی پختہ دیواروں کے پیچھے ہزاروں لوگ سوئے پڑے تھے اور اُن کے اپنے اپنے خواب اور اپنے اپنے خیالات تھے۔ میرے دل میں اُس کا خیال تھا اور اُس کے جھوٹ کا خیال تھا میں نے موت کا خیال کیا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ دیواریں جو صبح کا نور جذب کر رہی ہیں مجھے ابھی سے مردہ تصوّر کر کے میری طرف دیکھ رہی ہیں شاید یہی وجہ تھی کہ وہ اتنی بے رخی اور سرد مہری سے کھڑی تھیں میں نہیں جانتا کہ گاڑی والے کے خیالات کیا تھے نہ مجھے اُن لوگوں کے خوابوں کا علم ہے جن کو دیواروں نے چھپا رکھا تھا۔ مگر وہ بھی تو میرے خیالات اور خواب نہ جانتے تھے۔

پس ہم بازار کی لمبی سیدھی سڑک پر سے گزرتے گئے صبح مکانوں کی رفیع و بلند چھتوں پر طلوع ہو رہی تھی اور ہمارے چاروں طرف سکون برس رہا تھا۔ ایک خوشبو سے لدا ہوا بادل میرے قریب آیا اور کسی غیر مرئی ہستی نے سیدھا میرے کانوں میں قہقہہ لگایا "ہو! ہو! ہو!"

**۲**

اُس نے جھوٹ کہا تھا۔ وہ نہ آئی اور میں بے فائدہ اُس کا انتظار کرتا رہا تیرہ فام آسمان سے ایک دھندلا منجمد اندھیرا سا

اُتر کر زمین پر مستولی ہو گیا اور میں نے نہ جانا کہ کب شفق شام میں تبدیل ہوئی اور کب شام سے رات ہو گئی۔ مجھے یہ تمام کا تمام عرصہ ایک طویل رات معلوم ہو رہا تھا۔ میں انتہائے افسردگی میں برابر ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر اپنے ہموار اور یکساں قدم اُٹھاتا رہا۔ میں اس رفیع الشان مکان سے دور ہی دور رہا جس میں میری محبوبہ رہتی تھی۔ میں ڈیوڑھی کے اُس دروازے کے قریب بھی نہ گیا جس کی دہلیز پر سنہری چھت کا عکس پڑ رہا تھا، بلکہ میں بازار کی مقابل والی طرف اختیار کرکے اسی ایک چال سے پھرتا رہا ــــ آگے اور پیچھے، آگے اور پیچھے۔ جب میں آگے بڑھتا تو میری آنکھیں اُس آب اردہ وانے پر جم جاتیں اور جب میں واپس ہونے لگتا تو میں اکثر ٹھہر جاتا اور پیچھے مڑ کر دیکھتا، تب برف کی تیز تیز سوئیاں میرے چہرے پر گر گر کر اُسے چھلنی کر ڈالتیں اور وہ سوئیاں اتنی لمبی، اتنی تیز، اتنی ظالم ہوتیں کہ میرے سینے میں اتر جاتیں اور میرے دل کو میرے اس یاس آمیز انتظار پر پژمردگی اور غصّے کے تیروں سے پاش پاش کر دیتیں۔ برفانی ہوا چیختی چلاتی ہوئی روشن شمال سے تاریک جنوب کو چل رہی تھی۔ وہ مکانوں کی برفانی چھتوں کے ساتھ کھیلتی ہوئی نیچے اترتی تھی اور میرے چہرے پر برف کے چھوٹے چھوٹے تیز گالوں کے تھپیڑے لگاتی ہوئی سنسان کوچے کی ان شمعوں کے شیشوں سے جا کر ٹکراتی تھی جن میں تنہا زرد رو شعلہ سردی سے کانپ کانپ کر تند و تیز ہوا کے آگے جھک جھک جاتا تھا۔ اس بے کس و بے نوا شعلہ کو دیکھ کر میں بہت رنجیدہ ہوا۔ اُس کی زندگی بس رات کی رات تھی اور میں نے خیال کیا کہ اگر میں چلا جاؤں گا تو اس کوچہ میں حیات کی ایک رمق بھی باقی نہ رہ جائے گی اور صرف برف کے گالے خالی فضا میں اُڑے اُڑے پھریں گے اور زرد رُو شعلہ اس تنہائی اور سردی میں کانپتا اور ٹھٹھرتا رہے گا۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا، مگر وہ نہ آئی۔ اُس وقت مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ تنہا شعلہ اور میں ایک ہی جیسے ہیں، سوائے اس کے کہ میرا فانوس اُس کی طرح خالی نہ تھا، کیونکہ کبھی کبھی کوئی انسان اُس مقام پر آ نکلتا تھا جسے میں اپنے قدموں سے ناپ رہا تھا، وہ چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے بڑھتے چلے آتے، میرے پاس سے گزر جاتے اور یکایک کسی خیالی تصویر کی طرح اُس سفید عظیم الشان عمارت کے کسی کونے کے پیچھے غائب ہو جاتے۔ پھر دوبارہ وہ اس کونے کی اوٹ سے نمودار ہوتے، میرے قریب پہنچتے اور پھر آہستہ آہستہ کہر سے لدی ہوئی وسیع فضا میں جسے خاموشی سے گرنے والی برف نے پیدا کر رکھا تھا جذب ہو جاتے۔ لپٹے لپٹائے بے وضع و قطع اور خاموش، وہ ایک دوسرے سے اور مجھ سے ایسی مماثلت رکھتے تھے کہ ایسا ظاہر ہوتا جیسے بیسیوں آدمی میری ہی طرح، ادھر سے اُدھر پھر رہے ہیں۔ انتظار کر رہے ہیں، کانپ رہے ہیں، خاموش ہیں اور اپنے پیچ در پیچ اور الم انگیز خیالات میں منہمک ہیں۔

میں اُس کا انتظار کرتا رہا اور وہ نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس درد و کرب میں چیخ چیخ کر کیوں نہ رو دیا۔ میں نہیں جانتا کہ میں اُس وقت کیوں ہنستا تھا اور خوش تھا، اور اپنی انگلیوں کو اس طرح بند کرتا تھا جیسے وہ کسی خونخوار جانور کے پنجے ہیں، اور

مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُن کے فشار میں مَیں اُس زہریلے سانپ کو بھیں رہا ہوں جس کا نام "جھوٹ" ہے۔ وہ میری بانہوں سے لپٹا ہوا تھا اور میرے قلب کو ڈس رہا تھا یہاں تک کہ میرا سر اُس کے زہر سے چکر لینے لگا۔ دنیا کی ہر بات ایک "جھوٹ" تھی۔ اُس وقت جب میں ابھی پیدا نہ ہوا تھا اور اُس وقت کے درمیان جب مجھے یہ زندگی ملی ایک حدِ فاصل تھی جو اٹھ گئی اور میں نے خیال کیا کہ میں ہمیشہ سے زندہ ہوں اور اگر یہ نہیں تو پہلے کبھی نہ تھا۔ اور ہمیشہ میری زندگی سے پہلے اور میری زندگی کے دور میں اُس نے مجھ پر حکومت کی ہے۔ اور یہ ایک عجیب بات معلوم ہوتی تھی کہ اُس کا کوئی نام اور کوئی جسم بھی ہے اور اُس کے وجود کی کوئی ابتدا اور کوئی انتہا بھی ہے۔ اُس کا کوئی نام نہ تھا۔ وہ ہمیشہ رہ تھی جس نے جھوٹ بولا اور جس ہمیشہ ایک ابدی انتظار میں رکھا اور کبھی نہ آئی۔ میں نہیں جانتا کہ کیوں، مگر میں ہنسا۔ برف کی تیز سوئیاں میرے دل کو زخمی کر رہی تھیں اور کوئی غیر مرئی ہنسی میرے کان میں قہقہے لگا رہی تھی: "ہو! ہو! ہو!"

اپنی آنکھیں کھول کر میں نے ایک نگاہ اُس عالی شان مکان کی روشن کھڑکیوں پر ڈالی اور انہوں نے چپکے چپکے اپنی زرد اور سرخ زبانوں کے ساتھ مجھ سے کہا:-

"وہ تم کو دھوکا دے رہی ہے۔ تم یہاں آوارہ منتظر اور مضطرب پھر رہے ہو اور وہ حسن، مسرت اور فریب میں ڈوبی ہوئی اپنے گھر کے اندر اُس بالا قد اور خوبصورت شخص کی سرگوشیاں سن رہی ہے جو تمہیں حقارت سے دیکھتا ہے۔ اگر تم اندر گھس جاؤ اور اُس کو قتل کر ڈالو تو تم ایک نیک کام کرو گے۔ کیونکہ درحقیقت تم جھوٹ کو قتل کرو گے۔"

میں نے اپنے اُس ہاتھ کو زور سے بند کر لیا جس میں چاقو تھا، اور ہنستے ہوئے جواب دیا: "ہاں میں اُسے ضرور مار ڈالوں گا۔"

کھڑکیوں نے مجھے حسرت اور اندوہ سے دیکھا اور کہا "تم اُسے کبھی قتل نہ کر سکو گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ تمہارے یہ ہاتھ کا ہتھیار بھی اُس کی محبت کی طرح جھوٹا ہے۔"

خاموش سائے مدت ہوئی غائب ہو چکے تھے اور اُس زمہریر میں مَیں اکیلا رہ گیا تھا ـــــ میں اور شعلہ کی بے کس و تنہا زبان سردی اور مایوسی میں کانپ رہے تھے۔ پاس کے گرجا میں سے گھنٹے کی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ اُداس اور فلزی آواز تھرتھراتی اور سسکیاں لیتی ہوئی فضا میں پرواز کرتی اور پھر ہوا میں دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے برف کے گالوں میں گم ہو جاتی تھی۔ میں نے ضربوں کو گننا شروع کیا اور مجھے بے اختیار ہنسی آگئی: کلاک نے پندرہ بجائے! یہ ایک پرانا گھنٹہ گھر تھا اور اسی طرح کلاک بھی پرانا تھا، اور گو اس کا وقت درست ہوتا تھا لیکن گھنٹہ اس کا بے تحاشا ہی بجا کرتا تھا، اس طرح کہ اکثر بوڑھے گھنٹہ بجانے والے کو کلاک کے مینار پر چڑھ کر اُس کی زبان کو اپنے ہاتھوں کی مدد سے بند کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنے دل میں کہا، گھنٹے کی اس اداس اور تھرتھراتی ہوئی آواز نے جو کہر کی ظلمت سے الجھی ہوئی اور لپٹی ہوئی ہے آخر یہ "جھوٹ" کس لئے بولا ہے؟ آہ، یہ

بے فائدہ جھوٹ کس قدر ذلیل اور بے سروپا ہے۔

گھنٹے کی آخری آواز کے ساتھ وہ چمکتا ہوُا دروازہ کھلا اور وہ بلندو بالاقد کا شخص سیڑھیوں سے نیچے اُترا۔ صرف اُس کی پشت پر میری نظر پڑی لیکن میں نے اُسے شناخت کرلیا۔ کیونکہ غرور اور تبختر کے اُس پتلے کو ابھی میں نے کل شام ہی دیکھا تھا میں نے اُس کا قدم پہچان لیا جو گزشتہ شام کی بہ نسبت زیادہ ہلکا اور زیادہ مطمئن پڑ رہا تھا۔ میں بھی اکثر اوقات اس گھر سے یوں ہی نکلا تھا۔ اُس کی یہ چال مردوں کی وہی چال تھی جو اُس وقت پیدا ہوتی جب اُن کے لب کسی عورت کے جھوٹے لبوں سے ملتے ہیں۔

## ۳

میں نے اُس کی منتیں کیں، اُسے دھمکایا، اُس پر دانت پیسنا رہا۔

"بتاؤ، مجھے سچ سچ بتاؤ!"

مگر برف جیسے سرد مہر چہرے کے ساتھ، اُٹھے ہوئے متحیر ابروؤں کے ساتھ، سیاہ عمیق چمکتی ہوئی پُراسرار و پُرسکون آنکھوں کے ساتھ اُس نے مجھے یقین دلایا کہ "میں جھوٹ نہیں کہہ رہی ہوں"۔

وہ جانتی تھی کہ میں ثابت نہ کرسکوں گا کہ وہ جھوٹ کہہ رہی ہے اور یہ بھی اُسے معلوم تھا کہ اُس کے ایک لفظ سے اُس کے ایک جھوٹے لفظ سے میرے ان جاں خراش و جاں ستاں خیالات کا تمام بوجھ یکسر ہلکا ہوکر رہ جائے گا۔ اسی لفظ کا مجھے انتظار تھا اور وہ اُس کے شیریں لبوں سے ٹپکا۔ صداقت کی تمام رنگینیوں کو لئے ہوئے موتی کی طرح چمکتا ہوُا ٹپکا مگر اُس کی گہرائیوں میں اب بھی وہی تاریکی موجود تھی۔

"مجھے تم سے محبت ہے۔ کیا میں کلیتہً تمہاری ہی نہیں ہوں؟"

ہم شہر سے دور تھے اور برف پوش کھیت تاریک کھڑکیوں میں سے نظر آرہے تھے۔ اُن کے اوپر تاریکی تھی اور اُن کے چاروں طرف تاریکی تھی، بے حرکت، خاموش تاریکی، لیکن کھیت اپنی ذاتی روشنی سے اس طرح چمک رہے تھے جیسے اندھیرے میں کسی لاش کا چہرہ نظر آرہا ہو۔ کمرہ خوب گرم تھا اور صرف ایک مومی بتّی اُسے روشن کررہی تھی اور اُس بتی کے سرخ شعلے پر بھی مردہ کھیتوں کی زردی کا اثر پڑتا ہوُا معلوم ہوتا تھا۔

میں نے کہا "میں حقیقت کو معلوم کرنا چاہتا ہوں خواہ وہ میرے لئے کتنی ہی پُرالم کیوں نہ ہو۔ شاید میں اُسے سن کر مرجاؤں لیکن موت میرے لئے بہتر ہے اُس زندگی سے جس میں جھوٹ کو دخل ہو۔ تمہارے لبوں میں ایک جھوٹ ہے۔ تمہاری آنکھوں میں ایک بطلان ہے۔ مجھ سے سچ کہہ دو اور میں ہمیشہ کے لئے تم کو چھوڑ دوں گا۔" مگر وہ خاموش رہی اور اُس کی متجسس نگاہیں

میرے دل میں اتر گئیں۔ میری روح کو انہوں نے کھینچ کر باہر نکال لیا اور ایک عجیب پرجستجو طریقہ سے انہوں نے اس کا مطالعہ شروع کر دیا۔ میں چلا کر بولا "میری بات کا جواب دو، ورنہ میں تمہیں مار ڈالوں گا"!

اُس نے نہایت مطمئن لہجہ میں جواب دیا "مجھے مار ڈالو۔ بعض اوقات زندگی ایسی ہی اجیرن ہو جاتی ہے۔ مگر دھمکیوں سے تمہیں حق نہ مل سکے گا۔"

میں اُس کے سامنے جھک کر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھوں کو میں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور رو رو کر اس سے رحم اور حق کے لئے التجا کرنے لگا۔

"آہ اے غریب"! اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

میں نے منت سے کہا "مجھ پر رحم کرو۔ میری روح حق کے لئے بیتاب ہے۔"

میں نے اُس کی شفاف پیشانی کی طرف دیکھا تو مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے حق اُس کی اُس باریک مانگ کے پیچھے چھپ کر بیٹھا ہوا ہے۔ میرے دل میں اُس کے سر کو توڑ کر حق کو اُس میں سے نکال لینے کی ناقابلِ ضبط آرزو پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کا دل اُس کے سینے میں دھڑک رہا تھا اور میں دیوانہ وار اُس سینے کو اپنے ناخنوں سے پھاڑ ڈالنا چاہتا تھا، انسان کے دل کو عریانی میں دیکھنے کے لئے، خواہ وہ ایک ہی دفعہ کے لئے کیوں نہ ہو میں سب کچھ کر گزرنے کو تیار تھا۔ مومی بتی کا نوکدار زرد شعلہ جواب خاموش ہوا ہی چاہتا تھا بے حرکت ہو رہا تھا۔ مکان کی دیواریں بڑھتی ہوئی تاریکی کے اندر وسعتِ فضا میں گرتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ غم بے کسی اور ہیبت ہر طرف چھا رہی تھی۔

"آہ اے غریب!" اُس نے کہا "آہ اے غریب!"

بتی کے زرد شعلے پر تشنج سا طاری ہو گیا۔ ذرا سی دیر کے لئے وہ تڑپا اور پھر بجھ گیا۔ تاریکی کی چادر نے ہم کو اپنے اندر لپیٹ لیا۔ اب نہ میں اُس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور نہ اُس کی آنکھوں کو، اور جھوٹ بھی اب مجھے نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ نہ میں سوچتا تھا اور نہ اپنے جسم میں زندگی محسوس کرتا تھا، بلکہ صرف اُس کے ہاتھوں کے مس کو اپنے اندر جذب کر رہا تھا اور یہ مجھے سچ معلوم ہوتا تھا۔ پھر اس اندھیرے میں اُس کی دھیمی سی سہمی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آئی۔

"اپنی آغوش میں مجھے چھپا لو۔ میں ڈر گئی ہوں"!

"تم حق معلوم کرنا چاہتے ہو — مگر کیا میں اُس سے واقف ہوں؟ آہ، کاش کہ میں اُس سے واقف ہوتی۔ مجھے بچا لو۔ آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

میں نے اپنی آنکھیں کھول ڈالیں۔ زرد رو تاریکی بلند کھڑکیوں میں سے نکل کر دیوار کے قریب جمع ہو گئی اور اِدھر اُدھر کونوں

میں اپنا سر چھپانے لگی۔ پھر نہایت آہستہ سے کسی بہت بڑی اور نہایت سفید چیز نے کھڑکیوں میں سے اندر کی طرف جھانکا ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کسی کی مردہ آنکھیں ہمیں تلاش کر رہی ہیں اور اپنی نگاہ کے برفانی تاروں سے جکڑ رہی ہیں۔ کانپتے ہوئے ہم ایک دوسرے کے ساتھ اور زور سے چمٹ گئے۔ اُس نے پھر آہستہ سے کہا "آہ، میں ڈر گئی ہوں"!

۴

میں نے اُسے مار ڈالا۔

میں نے اُسے مار ڈالا اور جب وہ کھڑکی کے قریب ایک بے جان تختے کی طرح چت پڑی ہوئی تھی تو میں اُس کی لاش پر اپنا پاؤں رکھ کر خوب ہنسا۔ یہ ہنسی کسی مجنون کی ہنسی نہ تھی، نہیں! میں اس لئے ہنسا کہ میرا سینہ اب ہلکا ہو گیا تھا، اُس میں اب سکون اور مسرت کی حکومت تھی اور میرے دل سے وہ کرم جھڑ کر گر پڑا تھا جو اُسے دم بدم کھائے جا رہا تھا۔ جھک کر میں نے اُس کی مردہ آنکھوں میں نگاہ ڈالی۔ وہ بڑی بڑی روشنی کے لئے حریص آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں اور چینی کی گڑیا کی آنکھوں کی مانند گول اور بے نور نظر آ رہی تھیں۔ میں اُن کو اپنی انگلیوں سے چھو سکتا تھا انہیں کھول سکتا اور بند کر سکتا تھا اور مجھے اُن سے کسی قسم کا خوف نہ آتا تھا کیونکہ اب اُن سیاہ اور عمیق تپلیوں میں جھوٹ اور شک کا دیو موجود نہ تھا جس نے اتنی طویل مدت تک حریصانہ میرا خون چوسا تھا۔

جب انہوں نے مجھے گرفتار کیا تو میں ہنس پڑا اور میری یہ حرکت گرفتار کرنے والوں کو نہایت وحشیانہ معلوم ہوئی۔ انہوں نے نفرت کے ساتھ میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پیچھے ہٹ گئے۔ کچھ اور لوگ لعنت اور نفرین بھیجتے ہوئے میری طرف بڑھے لیکن جب انہوں نے میری مسرت سے چمکتی ہوئی آنکھیں دیکھیں تو اُن کے چہرے زرد پڑ گئے اور اُن کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔

وہ مجھے دیوانہ کہتے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ مجھے دیوانہ کہہ کر انہیں تسکین ہو جاتی ہے کیونکہ یہی وہ لفظ تھا جو انہیں قتل کے معمے کو حل کرنے میں مدد دیتا تھا ـــ کیونکر ممکن تھا کہ میں ایک عاشق ہو کر اپنی محبوبہ کو قتل کر دوں اور پھر ہنسوں۔ صرف ایک موٹا تازہ اور خوش بخوش آدمی مجھے ایک دوسرے نام سے پکارتا تھا جس سے ایک دھچکا سا آ کر مجھے لگتا تھا اور میری آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا جاتا تھا۔

"آہ اے غریب آدمی!" اُس نے رحیمانہ لہجہ میں کہا۔ اُس کو بالکل غصہ نہ آیا کیونکہ وہ ترو تازہ اور خوش تھا "آہ اے غریب آدمی!"

میں نے چلا کر کہا "خبردار! مجھے اس طرح مخاطب نہ کرو"۔

میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُس پر جھپٹا۔ میں یقیناً اُسے مارنا نہ چاہتا تھا لیکن مجھ سے ڈرے ہوئے یہ تمام لوگ جو مجھے دیوانہ اور مجرم سمجھے تھے اور زیادہ خائف ہو گئے اور اس طرح چیخیں مارنے لگے کہ مجھے پھر ہنسی آ گئی۔

جب وہ مجھے اُس کمرے میں لے گئے جہاں لاش پڑی ہوئی تھی تو اُس لحیم وشحیم اور مسرور آدمی کی طرف دیکھ کر میں نے پے بہ پے بلند اور ہٹیلی آواز میں کہنا شروع کر دیا "میں خوش ہوں۔ میں خوش ہوں"۔

اور یہ سچ تھا۔

## ۵

بچپن میں ایک مرتبہ چڑیا گھر میں مَیں نے ایک چیتے کو دیکھا تھا۔ جس کا تصور میرے دل میں مدتوں رہا اور مدتوں میرے خیالات اُس کے ساتھ وابستہ رہے۔ وہ دوسرے درندوں کی طرح احمقانہ نشے میں سرشار پڑا نہ رہتا تھا اور نہ ہی بیہودہ طور سے تماشائیوں کی طرف مبہوت ہو کر دیکھتا تھا۔ وہ ایک خطِ مستقیم پر سیدھا ایک کونے سے دوسرے کونے تک جاتا تھا اور ہر بار ایک ہی مقام سے پلٹتا تھا اور ہر دفعہ اُس کی صاف اور چمکیلی کھال اُس کے پنجرے کی ایک ہی سلاخ سے ٹکراتی تھی اُس کا خونخوار سر جھکا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بالکل سامنے کی طرف متوجہ تھیں۔ کبھی ایک دفعہ بھی اُس نے اِدھر اُدھر نظر نہیں ڈالی۔ دن بھر لوگ آ آ کر اُس کے پنجرے کے سامنے شور مچاتے تھے مگر وہ برابر ایک نہج پر آگے اور پیچھے چلتا رہتا تھا اور کبھی آنکھ اٹھا کر بھی اُن کی طرف نہ دیکھتا تھا۔ ہجوم میں سے چند مسکراتے تھے مگر اکثر سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے بلکہ افسردگی اور پژمردگی کی اس زندہ تصویر کو دیکھ کر مغموم ہو جاتے تھے ایک آہ بھر کر آگے بڑھ جاتے تھے۔ اور جب وہ کچھ دور نکل جاتے تو ایک مرتبہ پھر ایک مستفسرانہ اور متحیرانہ نگاہ اُس پر ڈالتے جس سے ظاہر ہوتا کہ وہ محسوس کر رہے ہیں کہ اُن کی اپنی انسانی حالت میں اور اس مقید درندے کی حالت میں کوئی بات مشترک ہے جو فہم و ادراک سے بالاتر ہے۔ اور جب میں بڑا ہوا اور لوگوں کی زبانوں کو اور کتابوں کو ازل و ابد کا تذکرہ کرتے دیکھا تو مجھے وہ چیتا پھر یاد آ گیا اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ہمیشگی اور اُس کے رنج و تعب کی ایک تصویر کو میں نے کبھی دیکھا ہے۔

اُس چیتے کی طرح میں اپنے پتھر کے پنجرے میں بند تھا۔ ٹہلتا تھا اور سوچتا تھا۔ ایک کونے سے دوسرے کونے تک ایک سیدھی لکیر پر میں چلتا تھا اور میرے خیالات بھی ایک ایسے ہی خطِ مختصر پر سفر کرتے تھے لیکن یہ خیالات اتنے بوجھل تھے کہ مجھے یہ نہ معلوم ہوتا تھا کہ میں نے صرف ایک سر کو اُٹھا رکھا ہے بلکہ مجھے اپنے کندھوں پر ایک دنیا کا بار پڑا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ یہ تمام خیالات صرف ایک لفظ پر مشتمل تھے لیکن کیا ہی وسیع، کتنا پُرعذاب اور کیسا تباہ کن تھا وہ لفظ !

وہ لفظ: "جھوٹ"

تمام کونوں سے وہ پھنکارتا ہوا نکلتا تھا اور میری روح کے گرد لپٹ جاتا تھا۔ لیکن اب وہ چھوٹا سا سانپ نہ رہا تھا، اب وہ بہت بڑا، خونخوار، شعلہ ریز اژدہا بن گیا تھا وہ مجھ کو ڈستا تھا اور اپنی آہنین لپیٹوں میں جکڑ کر مجھے نیم جان کر دیتا تھا۔ میرے سینے میں چھوٹے چھوٹے سانپوں کا ایک طوفان امڈا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ میں درد و کرب سے چیخ اُٹھتا تھا۔ اُس وقت میرے منہ سے

وہی ایک پھنکارتا ہُوا خوفناک لفظ نکلتا تھا "جھوٹ"!

اور جب میں اپنے خیالات میں ڈوبا ہُوا نفیدخانہ میں ٹہلتا تھا تو اُس کا بھورا بھورا فرش میری آنکھوں کے سامنے ایک بھورے رنگ کے شفاف غار میں تبدیل ہو جاتا تھا۔ میرے پاؤں فرش کو چھوتے معلوم نہ ہوتے تھے اور میں خیال کرتا تھا کہ میں کسی ناقابلِ فہم بلندی پر گہری تاریکیوں میں بہا چلا جا رہا ہوں۔ اور جب میرے سینے سے وہ سنسناتا ہُوا نعرہ نکل جاتا تو نیچے سے گہرے اس ناقابلِ نفوذ پردے کے پیچھے سے آہستہ آہستہ ایک ہیبت ناک گونج اٹھتی اور اتنی آہستہ اور دھیمی ہوتی گویا وہ ہزارہا سال کے زمانے میں سے گزر کر آرہی ہے اور دھند کے ایک ایک بخرے میں اُس کی طاقت کا ایک ایک ذرہ گم ہو گیا ہے۔ میں نے سمجھ لیا کہ وہاں، نیچے یہ اُس آندھی کی طرح چل رہی ہے جس سے درخت بھی اکھڑ اکھڑ کر گر پڑتے ہیں، لیکن جب یہ میرے کانوں تک پہنچتی تو اس کی بساط اُس مختصر سے لفظ سے زیادہ نہ رہتی جو سرگوشی کی آواز میں کہا جائے "جھوٹ"!

یہ ذلیل اور کمینہ سرگوشی مجھے طیش میں لے آتی اور میں زور سے زمین پر پاؤں مارتا اور چلا کر کہتا "جھوٹ کہیں بھی موجود نہیں۔ میں نے جھوٹ کو مار ڈالا ہے"!

میں جان بوجھ کر پرے ہٹ جاتا کیونکہ میں جانتا تھا کہ اس کا جواب مجھے کیا ملے گا ——— اور اتھاہ غار میں سے آہستہ آہستہ جواب اوپر کو آتا "جھوٹ"!

جانتے ہو، میں نے ایک خطرناک غلطی کی۔ عورت کو قتل کر کے میں نے جھوٹ کو ابدی زندگی دے دی۔ عورت کو کبھی قتل نہ کرو۔ یہاں تک کہ دعا بنج اور عذاب سہہ سہہ کر تم اُس کی رُوح سے سچ کو پالو۔

## ۶

تاریک اور خوفناک ہے وہ جگہ جہاں وہ سچ کو اپنے ساتھ لے گئی، اور جھوٹ کو ——— اور وہیں میں بھی جا رہا ہوں۔ شیطان کے تخت کے نیچے میں اُسے پکڑ لوں گا اور اُس کے سامنے جھک کر اور رو رو کر اُس سے کہوں گا "مجھے سچ بتاؤ! مجھے سچ بتاؤ"!

لیکن خدا! اے خدا! یہ بھی تو جھوٹ ہے۔ یہاں تو خلا ہی خلا ہے، صدیوں کا خلاء، بے پایاں خلا، مگر وہ کہاں ہے ——— وہ کہیں بھی نہیں ہے لیکن جھوٹ کو وہ باقی چھوڑ گئی ہے۔ یہ غیر فانی ہو گیا ہے۔ میں ہوا کے ہر ذرّے میں اُسے پاتا ہوں اور جب میں سانس لیتا ہوں تو یہ میرے سینے میں داخل ہو کر پھنکارتا ہے اور کاٹ کاٹ کر میرے دل کے پرچخے اڑا دیتا ہے۔

اوہ! کسی شخص کے لیے حق کی تلاش کتنا بڑا جنون ہے، کتنا بڑا دکھ ہے۔

بچاؤ! مجھے اس دکھ سے بچاؤ!

ماخذ رشید  منصور احمد

# شاعر کی التجا

## (محبت کی دیوی سے)

سر جھکائے ہوئے، خاموش پجاری کی طرح — تیرے دربار میں آیا ہوں بھکاری کی طرح
روح افسردگیٔ ذوق سے بے حد ہے ملول — خلشِ شوق کے ناپید ہیں اسبابِ حصول
سازِ دل نغمۂ بیتاب سے یکسر خالی — کشتِ جاں موجۂ شاداب سے یکسر خالی
زندگی خنکیٔ جذبات سے برباد و خراب — بے حسی وہ کہ جوانی بھی مری ننگِ شباب
ذہن ناکام و مقید ہے، نگاہیں محدود — طائرِ شوق کے پرواز کی راہیں مسدود
روح ٹھٹھری ہوئی بیگانۂ تابش ہے الگ — عقل افسردہ و محرومِ نوازش ہے الگ
دل سے جولانیٔ ارماں کی حرارت مفقود — کشمکشہائے تمنا کی جسارت مفقود
قلب پر ابرِ کثافت کی گرانباری ہے — سینۂ سرد پہ خاموشیٔ غم طاری ہے

---

پھونک دے وہ نفسِ گرم مرے سینے میں — بال پڑ جائے مرے قلب کے آئینے میں
فطرتِ عشق کو اسبابِ ضیا باری دے — دل کے سوئے ہوئے جذبات کو بیداری دے
طائرِ روح کو مل جائے وہ پروازِ خیال — لے اُڑے بامِ فلک کو بھی تگ و تازِ خیال
چشمِ پُرشوق کو مخمورِ تماشا کر دے — دل میں "وجدانِ محبت" کا اجالا کر دے
میرے الفاظ میں وہ سوز و اثر پیدا ہو — ہر طرف شعلہ نوائی کا مری چرچا ہو

سارے عالم پہ ہو محویتِ وجداں طاری
جھوم جائے مرے اشعار سے دنیا ساری!

ذوقی

Impossible

# جوہری

کاروبار کے جھمیلے میں نو بج گئے اور کثرتِ کار کے سبب میرا دماغ چکرانے لگا۔ تازہ دم ہونے کے لئے آخر "چانسری لین" سے نکل کر میں "ام بینک منٹ" کی طرف چل دیا۔

راستے میں دریا کی درخشانی فردوسِ نظر تھی۔ میں بہاؤ کا تماشا دیکھنے کے لئے رکا ہی تھا کہ معًا میرے کانوں میں یہ آواز آئی: رات گرم ہے"

میں نے سر اُٹھا کر دیکھا تو ایک شخص پل پر دیوار سے سہارا لئے کھڑا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ یہ شخص راندۂ روزگار اور آوارۂ قسمت ہے۔ اگر اس کو جواب دیا گیا تو بہت ممکن ہے کہ وہ کھانے پینے کا سوال کر بیٹھے۔ میری نظریں اُس کے چہرہ پر مرکوز ہوگئیں۔ اُس کا چہرہ اُس کی پریشانیٔ خاطر کا بھانڈا پھوڑ رہا تھا۔ اُس کی پیشانی پر ذہانت و فطانت کے آثار ہویدا تھے اور اُسکے ہونٹ متحرک اور مرتعش تھے۔

میں نے جواب دیا" رات واقعی گرم ہے لیکن اس جگہ دریا کے قرب کی وجہ سے کچھ خنکی سی پیدا ہوگئی ہے"

اُس نے دریا کے اُس پار نظر ڈال کر کہا: "اُس شخص کے لئے جو سارا دن فکرِ دنیا میں سر کھپائے لندن بھر میں یہی ایک پُرکیف جگہ ہے جہاں دماغ کو تازگی اور نظروں کو آسودگی ملتی ہے ...... پھر اُس نے رک رک کر کہا: زندگی کاہشوں سے لبریز ہے ---- میرا خیال ہے کہ آپ بھی میری طرح تھکے ماندے اور غمِ روزگار کے شاکی ہیں ---- دل چاہتا ہے کہ نام و نمود کی ہنگامہ طرازیوں سے ہمیشہ کے لئے بیزار ہو جاؤں اور زر و مال کو تج دوں" یہ کہکر وہ خاموش ہوگیا اور مجھے اضمحلالِ شکستہ کے ساتھ مڑکر "متحیر" نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں نے عمر بھر اس جیسا حیرانی و حسرت کا مارا انسان نہیں دیکھا تھا اُس کا ملبوس میلا چکٹ اور دریدہ تھا۔ مجھے اس سے ایک بوئے کنگی آنے لگی۔ اُس کے طرزِ تخاطب سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص کوئی دیوانہ ہے۔

میں نے کہا:" واقعی زندگی کاہشوں سے لبریز ہے۔ زندگی میں فائز المرام ہونے کے لئے سر کھپانا پڑتا ہے ---- کہو کسبِ معاش کا کیا ذریعہ ہے؟"

اُس نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا: "کیا کہوں آپ کو یقین نہیں آئے گا ---- میرا کاروبار نہایت ہی اعلیٰ پایہ کا ہے لیکن اب کچھ تکالیف کا سامنا ہو رہا ہے۔ میں ...... ہیرے ...... بنا سکتا ہوں"

"شاید اب کام سرد پڑ گیا ہے؟"

"نہیں ـــــــ مصیبت یہ ہے کہ لوگ مجھ پر اعتبار نہیں کرتے۔"

پھر اُس نے اپنے صد تار کوٹ کے بٹن کھول کر جیب سے کپڑے کا ایک بٹوا نکالا اور اُس سے ایک آبدار ہیرا نکال کر میرے ہاتھ میں دیا اور کہا: "ایک سال کا عرصہ گزرتا ہے کہ میں علم الطبعیات کی آخری سند لے چکا ہوں۔ یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے۔"

حقیقتاً یہ ہیرا بہت موٹا اور بڑا تھا۔ میں نے اطمینان کی غرض سے پہلے تو گھڑی کے شیشے کو کاٹا اور پھر چاقو کو خراش دی۔ میرے دل میں خلش تجسس پیدا ہوگئی اور پوچھا: "یہ ہیرا ہے ـــــــ کہو یہ کیسے ہاتھ آیا ہے؟"

اُس نے ہیرا میرے ہاتھ سے لے کر کہا: "میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے۔ آپ سے ایک سو پاونڈ کی حقیر رقم لوں گا جو اس کی قیمت کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں ہے۔"

یہ سن کر میرے دل میں کئی قسم کے شبہات پیدا ہوئے: "اگر یہ ہیرا ہے تو اس آشفتہ سر کے ہاتھ کیونکر آیا ہوگا اور یہ اسے بیچنا کیوں چاہتا ہے؟"

پھر ہماری نگاہیں دوچار ہوئیں اور مجھے اُس کی دیانت داری اور ایمانداری کا یقین سا ہوگیا۔ ادھر یہ خیال میرے دل میں جاگزین ہوگیا کہ ہیرا یقیناً بے حد قیمتی اور گراں مایہ ہے۔ جواہراتِ عالم پر جب کوئی کتاب لکھی جائے گی تو اس ہیرے کا تذکرہ کیا جائے گا۔ میں یہ ہیرا خرید لیتا لیکن مصیبت یہ تھی کہ یک صد پونڈ میرے پاس پس انداز نہیں تھے۔ یہ رقم راس المال سے دینی پڑتی تھی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کاروبار میں دشواریاں پیدا ہوجاتیں۔

میں نے اطمینان کی غرض سے ایک بار پھر پوچھا: "آپ نے یہ ہیرا کہاں سے لیا ہے؟"

"یہ میرا خود ساختہ ہیرا ہے" پھر اُس نے آہ کھینچ کر کہا: "دل چاہتا ہے کہ آپ کو اپنی سرگذشت سنادوں شاید آپ کے شکوک رفع ہوجائیں ـــــــ لیکن . . . . . . . . ."

پھر اُس نے بھرائی ہوئی آواز میں ہیرے کے کیمیاوی اجزا پر ایک بصیرت افروز علمی لیکچر دیا اور کہا کہ میں نے سترہ سال کی عمر میں یہ کام شروع کیا تھا۔ اب میری عمر بتیس سال ہے۔ گویا پندرہ سال اس شغل کی نذر ہوچکے ہیں۔ میرا کل اندوختہ اِسی جنوں کی تکمیل میں صرف ہوا اور نتیجہ کچھ بھی نہ نکلا۔ لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور برابر تجربات کرتا رہا۔ میرے لئے سب سے بڑی مشکل اس راز کا چھپانا تھا۔ میں نے کنگسٹن ٹاؤن میں تن تنہا اپنے مختصر سے معمل میں ایک عجیب النوع تجربہ کیا۔ کاربن اور بعض سیال چیزوں کے امتزاج کو بندوق کی نلی میں ڈال کر اُسے گلخن کے سپرد کر دیا۔"

میں نے کہا: "یہ تجربہ تو خطرناک ثابت ہوا ہوگا"

اُس نے جواب دیا "نلی پھٹ گئی اور دروازہ کھڑکی اور جو کچھ اثاث البیت باقی تھا سب جل بجھ کر رہ گیا۔ پھر میں نے پیرس کے ایک محل میں جاکر یہ خطرناک کھیل کھیلا اور وہاں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخر مایوس ہوکر وہاں سے چلا آیا۔ اور ایک دن فولادی سلنڈر میں بعض کیمیاوی اجزا بھر کر اُسے لَو دیتے ہوئے گلخن میں ڈال کر سیر کو نکل گیا۔"

یہ سُن کر میں بے اختیار ہنس دیا اور کہا: "کیا اس کمرہ میں آدمی نہیں تھے یا تمہیں پچھلا تلخ تجربہ بھول گیا تھا"

اُس نے جی کڑا کر کے کہا: اِس قسم کے خمیازے تجربات کے شوق میں کھینچنے ہی پڑتے ہیں ——— بالائی منزل میں مالنیں رہتی تھیں اور نیچے ایک بڑا کنبہ اقامت گزیں تھا۔ میں سیر سے واپس آیا تو سلنڈر صحیح و سالم پڑا تھا۔ میں نے اس ڈر سے کہ شاید ایک آنچ کی کسر کا معاملہ کہیں پیش نہ آئے اُس کو گلخن سے نکالنا مناسب نہ سمجھا۔ گو دل ایک کشمکش اور اضطراب میں تھا۔ ان دنوں میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی۔ اِدھر مکان کے کرایہ کا تقاضا ہو رہا تھا۔ اِس جنون میں جو کچھ کیا اُس کا اعادہ تحصیلِ حاصل ہے۔ مختصر یہ ہے کہ دربانی کی، اخبار بیچے، سائیس بننا منظور کیا اور ایک ہفتہ تو کاسۂ گدائی ہاتھوں میں لے کر دریوزہ گری کرتا رہا۔

ایک بار دو دن کا فاقہ تھا، اِدھر گلخن کی آگ ٹھنڈی ہو رہی تھی اور کوئلے ختم ہو کر رہ گئے تھے۔ حسنِ اتفاق سے ایک چھوٹی بچی کو اُٹھا کر اُس کے گھر پہنچا آیا اور وہاں سے چھ پیسے ملے جن کے آتے ہی کوئلے خرید لئے۔

تین ہفتوں کے بعد وہ سلنڈر نکال کر دیکھا تو کیمیاوی اجزا کبریتِ احمر کی طرح کھول رہے تھے۔ جب سلنڈر سرد پڑ گیا تو اُسے کھولا۔ اُس میں سے تین بڑے بڑے اور پانچ چھوٹے چھوٹے ہیرے برآمد ہوئے۔ میں اُنہیں دیکھ رہا تھا کہ ایک نشے میں مخمور شرابی میرے کمرے میں در آیا۔ میں نے جھنجھلا کر اُس کا منہ نوچ لیا اور پھر دھکے دے کر اُسے مکان سے نکال دیا۔ گو وہ ہنکارتا رہا لیکن میں نے کانوں میں روئی ٹھونس لی اور اپنی دُھن میں لگا رہا۔ کمبخت نے یہاں سے نکل کر پولیس میں میرے خلاف چغلی کھائی اور مجھے تھانہ میں اپنے سربستہ راز کو خود ہی افشا کرنا پڑا۔ اگر حقیقت کا اعلان نہ کرتا تو بہت ممکن تھا کہ کسی سازش کے الزام میں دھر لیا جاتا۔ صبح کو اخبارات نے جو ہمیشہ بے پر کی اڑانے میں میرے کلبۂ احزان کو "وڈنگسٹن ٹاؤن بم فیکٹری" لکھا۔

آپ ہی دنیا بھر میں پہلے شخص ہیں جن سے یہ راز کی بات کہہ رہا ہوں کیونکہ مجھے آپ پر اعتماد ہے۔"

میں نے ازراہ تمسخر کہا: "خدا کا شکر ادا کیجئے کہ سستے چھُٹے ورنہ کیا معلوم کہ کونسی افتاد پڑتی۔"

اس سرگذشت کے بعد میرے لئے ہیرے کا خریدنا حماقت کا کام تھا۔ اِس لئے میں نے جواب دیا کہ "مجھے

پوری طرح سے تو نہیں، کچھ نہ کچھ یقین ضرور ہوگیا ہے۔ بہتر ہے کہ کل آپ میری دوکان پر تشریف لے آئیں تاکہ کھل کر باتیں ہو سکیں۔"

اُس نے جھلّا کر کہا: "آپ ملاقات کا دن معیّن کر کے مجھے گرفتار کرانا چاہتے ہیں ——— لیکن میں کچّی گولیاں نہیں کھیلا۔"

میں نے آواز کے مطمئن لہجہ میں جواب دیا: "یہ آپ کا سوءِ ظن ہے۔ مجھے آپ پر اعتماد ہے ——— اچھا کل نہ سہی کسی دن تشریف لایئے۔ یہ ہے میرا کارڈ۔"

اُس نے کارڈ لے کر جاتے ہوئے کہا: "اگر آپ نے یہ راز افشا نہ کیا تو معقول ہدیہ دوں گا۔"

یہ کہہ کر وہ تاریکی میں غائب ہوگیا اور میں بھی چلا آیا۔ کچھ دنوں کے بعد اُس کے دو خطوط ملے جن میں لکھا تھا کہ فلاں پتے پر بینک نوٹ بھیج دو۔ لیکن میں نے دونوں تحریروں کا کوئی جواب نہ دیا۔ ایک بار میں کہیں باہر تھا کہ وہ میری دوکان پر آیا۔

واپسی پر میرے ملازم نے مجھ سے کہا کہ "ایک شخص آپ سے ملنے کے لئے آیا تھا۔ جس کا ملبوس کہنہ اور دریدہ تھا۔ اُسے کالی کھانسی کا روگ بھی تھا۔"

یہ سُن کر مجھے خیال آیا کہ غالباً وہی دیوانہ جوہری آیا ہوگا۔ میں اکثر راتوں کو سوچتا رہتا ہوں کہ کیا واقعی وہ ہیرے بنا سکتا ہوگا ——— یا کوئی دیوانہ ہوگا۔ اب وہ مر چکا ہوگا اور اب اُس کے ہیرے پھینک دیئے گئے ہونگے۔ پھر رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ وہ ابھی زندہ ہوگا اور ہیروں کو بیچتا پھرتا ہوگا۔

صادق ایوبی　　　　(مختار)

---

اگر میرے پاس آسمانوں کی اقلیم کے قالین ہوتے ——— نور کی سیمیں و زریں کرنوں سے مزیّن قالین، رات دن اور شام کے نیلے دھندلے اور سیاہ قالین،

تو میں اُن کو تمہارے قدموں میں بچھا دیتا،

مگر میں نادار ہوں اور میرے پاس صرف میرے خواب ہیں،

میں نے اپنے خوابوں کو تمہاری راہ میں بچھا دیا ہے،

آہستہ چلو، کیونکہ تمہارے قدموں کے نیچے میرے خواب ہیں۔

ییٹ

# کنول

کیسا جھلک رہا ہے رنگ آب میں کنول کا — کیا خوشنما ہے منظر تالاب میں کنول کا
کیا صبح ہو رہی ہے کیا نور کا سماں ہے — پانی پہ اللہ اللہ کیا فرشِ ارغواں ہے
ہوتے ہی صبح انجم گردوں سے سب سدھارے — پر جلوہ گر ہیں کیسے پانی کے یہ ستارے
ہے داغ دار لالہ وہ کس حساب میں ہے — نسبت کنول سے کیا دوں کانٹا گلاب میں ہے
ہے سطحِ آب ساکن یا روئے آب فق ہے — ہے طرفہ تر تماشا پانی پہ بھی شفق ہے
تاباں نہیں کنول میں شبنم کا قطرہ قطرہ — موتی سے ہے لبالب یاقوت کا پیالہ

---

روشن نہ ہوں کنول سے کیوں رمزِ حسنِ فطرت — اس کا ورق ورق ہے اک دفترِ حقیقت
ڈنٹھل ہیں نرم و نازک پتّے ہرے ہرے ہیں — کیسے بڑے بڑے ہیں کیسے بچھے ہوئے ہیں
ہے دلفریب کیسا نظارۂ زرِ گل — رکھا ہوا ہے گویا اک تاج برسرِ گل
کیا آرہی ہیں کرنیں خورشید سے نکل کر — کیا کھل رہی ہیں کلیاں رنگت بدل بدل کر
کیا اُڑ رہے ہیں بھونرے کیا آ کے گر رہے ہیں — کیا جاں چھڑک رہے ہیں کیا گرد پھر رہے ہیں
کیا لوٹتی ہیں موجیں پھولوں کی اس ہنسی سے — بے تاب خود ہے جل بھی ان کی شگفتگی سے
لہروں کے پیچ و خم کا کیا دل کشا ہے نقشا — پھولوں میں ہے ہوا سے یہ اہتزار کیسا
پانی میں بھی ہے قائم، یہ نشہ رنگ کا ہے — رہ رہ کے ہائے کیسا ہر پھول جھومتا ہے
دکھلا رہا ہے کیا کیا اپنی بہار ساگر — کثرت سے ہے کنول کی اک لالہ زار ساگر

---

نسریں، گلاب، سوسن ہیں خندہ زن چمن میں — چمپا چنار، جوہی، ٹیسو، کھلے ہیں بن میں
لالہ بنا ہے زینت افزائے کوہساراں — ہے پردۂ حجر میں نورِ شرار پنہاں
یعنی نہیں کوئی جا حسنِ ازل سے خالی
پانی کی سطح رہتی کیونکر کنول سے خالی

میر سعادت حسین نجیب

# پیاری دوستی

خوش نما رنگیں ادا ننھی سی پیاری دوستی
دوستی سی دوستی ہے یہ ہماری دوستی

زندگی معمور ہو جاتی ہے حق کے نور سے
جب فضائے روح میں ہوتی ہے طاری دوستی

مصلحت نا آشنا راحت سے یکسر بے نیاز
دل کی مجبوری ہے اور بے اختیاری دوستی

جان و دل صاف و سبک ہوتے ہیں دیدِ دوست سے
دردِ فرقت میں مگر دل پر ہے بھاری دوستی

دوست کا ملنا نہ ہو صد حیف اپنے دوست سے
بے قراری دوستی ہے آہ و زاری دوستی

کب وہ دن آئے کہ میرے دل کا بھی غنچہ کھلے
ہے کسی سے مجھ کو بھی بادِ بہاری دوستی

"گلریز"

# عمل اور علم

انسان کو سمجھ لینا چاہیئے کہ اُس کی زندگی تمام کی تمام قلب سے ظہور کرتی ہے اور قلب اُس کی عادات کا ایک مجموعہ ہے جسے وہ پیہم کوشش سے ایک غیر معین حد تک تبدیل کر سکتا ہے؛ اور جس پر وہ کامل غلبہ اور اقتدار حاصل کر سکتا ہے۔ اسی طریقہ سے وہ کلید اُس کے قبضہ میں آجاتی ہے جس سے نجات کا دروازہ کھل جاتا ہے۔

لیکن زندگی کی مصائب و آفات سے (جو در اصل انسان کے اپنے ہی قلب کی مصائب و آفات ہیں) نجات ایک ایسا معاملہ ہے جو بتدریج نفس سے نشو و نما پاتا ہے اور یکایک کہیں باہر سے اس کا حصول ناممکن ہے۔ ہر گھڑی اور ہر روز نفس کی تربیت ایسی ہونی چاہیئے کہ اُس میں بے لوث خیالات پیدا ہوں اور وہ اُن حالات میں بھی جو انسان کو غلط کاری اور ظلم کی طرف لے جاتے ہیں، راست بازی اور انصاف پسندی کی طرف مائل ہو۔ اُس صابر و شاکر بت تراش کی طرح جو مجسمہ کے ایک ایک عضو پر پہروں صرف کر دیتا ہے راستی کی زندگی کے طالب کو اپنے نفس کے سنگین مجسمہ پر نہایت صبر و استقلال سے بتدریج کام کرنا چاہیئے، یہاں تک کہ وہ اپنے اُس مطمح نظر کو پالے جس کے پاکیزہ اور شیریں خواب وہ دیکھا کرتا تھا۔

اس قسم کے بلند پایہ نتائج حاصل کرنے کے لئے یہ ضروری ہے سب سے نچلی اور آسان ترین سیڑھی پر قدم رکھا جائے اور بلند اور مشکل مقامات کی طرف باقاعدہ اور بتدریج ترقی کی جائے۔ نشو و ارتقا اور ترقی و فلاح کا یہ قانون کہ آہستہ آہستہ اور درجہ بہ درجہ بامِ رفعت تک پہنچا جائے۔ زندگی کے ہر شعبہ میں کامیاب ہونے کے لئے اپنے اندر ایک قطعیت رکھتا ہے اور جہاں اس قانون، اس دستور العمل کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے قطعی ناکامی اس کا نتیجہ ہوتی ہے۔ علم پڑھنے میں، فن سیکھنے میں یا کوئی تجارت اختیار کرنے میں اس دستور العمل کو پوری طرح تسلیم کیا جاتا ہے اور اس پر نہایت دقتِ نظر سے عمل کیا جاتا ہے، لیکن نیکی سیکھنے میں، صداقت کا سبق پڑھنے میں اور زندگی کا حقیقی تجربہ اور علم حاصل کرنے میں اسے عموماً بھلا دیا جاتا ہے اور اس پر عمل نہیں کیا جاتا۔ اسی لئے نیکی، صداقت اور کامل زندگی ہماری نظروں سے پوشیدہ رہتی ہے۔

یہ فرض کر لینا ایک عام غلطی ہے کہ اعلیٰ زندگی محض دینیاتی اور مابعد الطبیعاتی قیاسات کو پڑھ لینے اور اُن پر یقین کر لینے کا معاملہ ہے اور یہ کہ اس طریقہ سے روحانی حقائق سمجھے جا سکتے ہیں۔ اعلیٰ زندگی نام ہے خیالاً، لفظاً اور عملاً اعلیٰ زندگی بسر کرنے کا۔ اور اُن روحانی حقائق کا علم جو انسان میں اور کائنات میں مرکوز ہیں صرف اخلاقِ فاضلہ کی پیروی

اور عمل کی باقاعدگی سے حاصل ہوتا ہے۔

قبل اس کے کہ زیادہ کو جانا اور سمجھا جائے کم کو کامل طور پر جان اور سمجھ لینا چاہئے، اور یہ ایک کلیہ ہے کہ عمل ہمیشہ حقیقی علم پر مقدم ہوتا ہے۔ مدرسہ کا استاد کبھی اپنے شاگردوں کو ابتدا میں ریاضی کے مختصر اور دقیق اصول نہیں بتاتا۔ وہ جانتا ہے کہ اس طریقہ سے پڑھانا بیکار اور پڑھنا ناممکن ہو جائے گا۔ وہ پہلے پہل اُن کے سامنے ایک سادہ اور آسان سوال رکھ دیتا ہے اُس کے حل کا طریق انہیں سمجھاتا ہے اور پھر انہیں حل کرنے کو کہتا ہے۔ جب بار بار کی ناکامیوں اور پے بہ پے کوششوں کے بعد وہ اس کا صحیح جواب نکالنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو وہ انہیں ایک اور اس سے مشکل سوال دیتا ہے اور پھر ایک اور، اور ایک اور۔ یہاں تک کہ جب طالب علم سالہا سال کی مسلسل مشق سے ریاضی کے تمام اسباق پر حاوی ہو جاتے ہیں تو اُس وقت استاد اُنہیں علم ریاضی کے وہ حقائق بتاتا ہے جو پہلے اُن سے پوشیدہ تھے۔

اول اول کسی فن کے حاصل کرنے میں مبتدی کو اُس فن کے حقائق و اصول نہیں بتائے جاتے بلکہ ایک معمولی سا اوزار اُس کے ہاتھ میں دے دیا جاتا ہے اور اُسے اُسکے استعمال کرنے کا صحیح صحیح طریقہ بتا کر کوشش اور مشق کرنے کے لئے آزاد چھوڑ دیا جاتا ہے جب وہ اپنے اوزاروں کو درست طور پر استعمال کرنے لگتا ہے تو پہلے سے زیادہ مشکل کام اُس کو تفویض کئے جاتے ہیں یہاں تک چند سالوں کی کامیاب مشق کے بعد وہ اس فن کے حقائق کو سمجھنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔

ایک مہذب خاندان میں پہلے بچے کو فرمانبرداری اور اطاعت گزاری کی تعلیم دی جاتی ہے۔ اُسے یہ بتایا بھی نہیں جاتا کہ وہ ایسا کیوں کرے اور ایسا کیوں نہ کرے بلکہ اُسے حکم دیا جاتا ہے اور بہت بعد میں جا کر اُسے علم ہوتا ہے کہ اُسے نیکی اور صداقت کی تعلیم کیوں دی گئی تھی۔ کوئی باپ اپنے بچے کو اُس وقت تک اخلاقیات کی غایت نہیں بتائے گا جب تک کہ وہ اُس میں ماں باپ کے لئے اطاعت اور دوسروں کے لئے نیکی کا مادہ پیدا نہ کرلے۔

یوں ہی معمولی سے معمولی دنیاوی امور میں بھی عمل ہمیشہ علم پر سبقت رکھتا ہے، اور روحانی امور میں اور اعلیٰ زندگی بسر کرنے میں تو یہ قانون اور بھی شدید قطعیت رکھتا ہے نیکی صرف عمل سے مل سکتی ہے اور صداقت کا علم صرف نیکی کے ساتھ اپنے نفس کی تکمیل میں حاصل ہو سکتا ہے اور وہ شخص جو نیکی کے حصول اور عمل میں کامل ہو گیا اُس نے حقیقت و صداقت کو پالیا۔

صداقت صرف اس طریق سے حاصل ہو سکتی ہے کہ ہر روز اور ہر گھڑی نیکی کے اسباق کا مطالعہ کیا جائے اور آسان ترین اسباق سے شروع کر کے بتدریج مشکل اسباق پر عبور حاصل کیا جائے جس طرح ایک بچہ مدرسہ کے اندر نہایت صبر اور اطاعت شعاری سے سبق پڑھتا ہے مسلسل اور متواتر مشق سے تمام مشکلوں اور ناکامیوں پر غالب آ جاتا ہے بالکل اسی طرح صداقت کا علم سیکھنے والا ابتدی بھی ناکامیوں سے بے پرواہ ہو اور مشکلات سے اپنی طاقت کو بڑھا کر اپنے آپ کو خیال اور عمل کی نیکی میں مصروف کر دیتا ہے اور جب نیکی کے حصول میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُس کا دل حقیقت اور صداقت کے علم سے معمور ہو جاتا ہے اور یہ وہ علم ہے جس کی موجودگی میں امن و آرام کی زندگی بسر کر سکتا ہے۔

"ایلین" منصور احمد

# محفلِ ادب

## جنگلی پھول

اُف یہ رنگینی و دلآویزی — اُف یہ رعنائی و جنوں خیزی
اُف یہ نقش و نگارِ زیبائی — اُف یہ جوشِ بہارِ زیبائی
شوق نے حشر کر دیا دل میں — سوز ہی سوز بھر دیا دل میں
اُف مرے اضطراب کا عالم — دل ہے اور ایک لرزشِ پیہم
چاہتا ہوں کہ رازِ حسن کہوں — ہائے مَیں اپنے آپ میں کب ہوں
کیا کہوں تو جہاں میں کیا شے ہے — عقل جاتی رہی مری ہے ہے
ایک تصویر تیرا نقشہ ہے — دفترِ حُسن کا خلاصہ ہے
اور بھی پھول ہیں جہاں میں بہت — قدر ہے جن کی گلستاں میں بہت
اُن میں یہ خوبیٔ جمال کہاں — اُن میں یہ شانِ ذوالجلال کہاں
ماند ہے تجھ سے رونقِ گلزار — گرد ہے تیرے آگے رنگِ بہار
پھونک ڈالے دل و جگر میرے — بھر دیئے سینے میں شرر میرے
آہ صبر و قرار کھو بیٹھا — راحتِ زندگی کو رو بیٹھا
ہے عجب کیف لیکن اس غم میں — اڑ رہا ہوں میں اور عالم میں
اب یہی جان کی تمنا ہے — اب یہی روح کا تقاضا ہے
تیرے سائے میں خاک پر بیٹھوں — دین و دنیا سے بے خبر بیٹھوں
اور سجدے میں ہو جبیں میری — تر ہو اشکوں سے آستیں میری

"زمانہ"

## تعلیم اور ظرافت

بیچارے معلموں کو اپنے پیشہ کی بدولت جو بیماریاں ہو جایا کرتی ہیں اُن میں دماغ کی خشکی بھی ہے۔ آپ خیال تو کیجئے کہ جو شخص

خود روز دس بجے سے چار بجے تک ناک بھوں چڑھائے آنکھیں نکالے نہی عن المنکر کی صورت بنائے بیٹھا رہے۔ اور آدمیوں کے بچوں کو مولویوں کی طرح "صمّ و بکمّ" بنا کر بٹھائے رکھے، جو نہ خود ہنسے نہ دوسروں کو ہنسنے دے اُس کے دماغ کا کیا حال ہوگا معلم خشک کی حالت اصل میں زاہدِ خشک سے زیادہ قابلِ رحم ہے۔ کیونکہ زاہد تو دنیا کی دلچسپیوں کو سائمن کمیشن یا بدیسی کپڑا سمجھ کر سرے سے بائیکاٹ کر چکا ہے لیکن معلم ان دلچسپیوں میں رہنے کے باوجود اُن کا لطف اُٹھانے سے محروم ہے۔

معلم میں ظرافت کی کمی اور متانت کی زیادتی سے خود اُس کو جو نقصان پہنچتا ہے اس سے کہیں زیادہ مضر اثر طالب علموں پر پڑتا ہے۔ بچے اور نوجوان جو گھر کا سکھ چین چھوڑ کر زندگی کے کٹھن سفر کی تیاری کے لئے مدرسے میں آتے ہیں۔ انہیں پہلے ہی قدم پر ایک مجسم مارشل لا سے سابقہ پڑے تو اُن کے دل میں ہمیشہ کے لئے ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ جہاں ڈر بیٹھا تو سمجھئے کہ روح کی بالیدگی اور آزاد نشو و نما رخصت ہوئی۔ یہ عمر کھیل اور کام " سادگی و پرکاری بے خودی و ہوشیاری" کی درمیانی منزل ہے اور ان اضداد کی ترکیب جیسی صحیح ظرافت میں ہوتی ہے اور کسی چیز میں ناممکن ہے۔ اگر اس کا استعمال صحیح اور احتیاط کے ساتھ کیا جائے تو نوجوان زندگی کا بوجھ ہنستے کھیلتے اٹھا لیتے ہیں تعلیم کا یہ اہم ترین مسئلہ باتوں باتوں میں حل ہو جاتا ہے۔

جہاں معلم کے لئے یہ جائز نہیں کہ نوجوانوں کو دنیا کی تصویر ضرورت سے زیادہ مہیب کھائے وہاں یہ بھی دیانت داری اور احتیاط کے خلاف ہے کہ وہ اُن کے سامنے زندگی کو " خالہ جی کے گھر" کی صورت میں پیش کرے۔ یا کسی نیم سرکاری یونیورسٹی کی شکل میں پیش کرے جہاں انسان اصولِ تقویم کے خلاف دن کو عید رات کو شب برات مناتا ہے اور دین و دنیا کی ذمہ داریوں سے آزاد ہوتا ہے۔ ہنسی دل لگی کی زیادتی انسان میں دماغی کاہلی پیدا کرتی ہے۔ وہ زندگی کے اہم مسائل پر غور کرنا چھوڑ دیتا ہے۔ اور ہر بات کو مذاق میں ٹالنا چاہتا ہے۔

ظرافت سے پورا تعلیمی فائدہ اُٹھانے کے لئے نیک نیتی بھی ضروری ہے معلم کو اس بات کا پورا احساس ہونا چاہئے کہ اس کے ہاتھ میں ایک بڑی قوت ہے جسے وہ ایمانداری کے ساتھ طلبہ کی بہبود کے لئے استعمال کرنے پر مجبور ہے محض ذاتی جانبداری یا مخالفت کرنے کے لئے یا محض زورِ طبع آزمانے کے واسطے بچوں کو نشانۂ ظرافت بنانا بڑے کمینہ پن کی بات ہے ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر معلم ظرافت سے کام لے تو یقین ہے کہ وہ بچوں کے لئے بہترین رہنما اور رفیق ثابت ہوگا۔ خود سوداوی امراض کمیشن کی شہادت اور کونسل کی ممبری سے محفوظ رہے گا اور اپنے دوستوں کے لئے تفننِ طبع کا باعث ہوگا،

"تعلیم و تربیت"

## ماں اور بچّہ

ماں نے کہا "ننھے بچے تو میری مسرتوں کا خزانہ ہے۔ تو میرے ارمانوں کا گنجینہ ہے"

بچّہ ہنسنے لگا۔ اس طرح جیسے گلستاں کی کلیاں ایک ساتھ چٹک گئی ہوں +

"ہاں ماں! پھر کہہ۔ میں کیا ہوں"

"خوبصورت پھول! تو میری روحانی مسرتوں کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔ تو قدرت کی بے نظیر دستکاری کا اعلیٰ نمونہ ہے"

بچّہ مسکرایا۔ ایسی مسکراہٹ، جیسے یاقوت کی موتیوں سے لبریز، ڈبیا کھل گئی +

"ماں پھر کہہ میں کیا ہوں"

"تو میری دنیاوی محبّت کا ثمر ہے۔ خدا کا بیش بہا عطیہ ہے" بچّہ خفا ہو گیا "میں یہ نہیں جانتا۔ اور کہہ"

"آہ تو معصوم ہے۔ گلِ نو شگفتہ ہے۔ میرے لئے دنیا میں جنت کا نمونہ ہے۔ میری خوشیاں تجھ سے وابستہ ہیں۔ تو میری راحت اور سکون کا سامان ہے"

بچہ رونے لگا۔ اُس کے پھول جیسے رخساروں پر گوہرِ اشک ڈھلکنے لگا "میں نہ سنوں گا، مجھے نہیں معلوم"

"میرے لال۔ تو میرا بچہ ہے۔ اللہ نے تیری صورت میری تسکین کے لئے بنائی ہے مجھے کھیلنے کو ایک چلتا پھرتا اور بولتا ہوا کھلونا دیا ہے"

بچّہ زور سے ہنس پڑا "ہاں ماں میں بھی ایسا ہی کھلونا لوں گا"

"بیشک اے معصومیت و نیکی کی تصویر! چند روز بعد تو بھی بہت سے کھلونوں کا مالک ہوگا۔ لیکن میں اُس وقت کیا ہوں گی؟ ایک کمر خمیدہ بڑھیا۔ دھوپ جیسے سفید بالوں والی۔ ننھے میں درخت ہوں اور تو ابھی پودا ہے۔ چند روز بعد تو ثمردار شجر ہوگا اور موت میری جڑ اکھاڑ دے گی"

بچہ زور سے اچھل پڑا "ماں موت کیا ہے؟ میں اُسے نہ آنے دوں گا!"

"میرے ننھے سیدھے راستہ پر چل۔ خوش رہ۔ نیکی کر۔ لطف و محبت سے ہر انسان کے ساتھ پیش آ۔ میں پھر نہ مروں گی"

"عصمت"

---

## موسمِ بہار کے پردہ میں کون ہے؟

موسمِ بہار آیا، راحت و انبساط کا پیغام لے کر آیا، لوگ موسمِ بہار کی رنگینیوں کو دیکھ رہے ہیں، میں موسمِ بہار میں رنگ بھرنے والے کی تلاش میں ہوں، تتیریوں کو یہ خوبصورتی کس نے دی، پھولوں میں یہ رنگ کس نے بھرا غنچوں کو یہ دل کشی کس نے عطا کی، لوگوں کے دلوں میں یہ مسرت کی لہر کس نے دوڑائی، ×

خوبصورت عورتیں سمندر کے ساحل پر تتیریوں کی طرح رنگ برنگ کا لباس پہنے ہوئے، اپنے دوستوں کے ساتھ موسمِ بہار کا لطف

اٹھارہی ہیں، لیکن میں موسمِ بہار سے لطف اٹھانے والوں کی امنگوں کا مطالعہ کررہا ہوں کہ یہ امنگیں کس نے پیدا کیں، اور یہ روح پرور نظارے کس نے عطا کئے،

یہ ایک مخفی طاقت ہے، یہ ایک پوشیدہ قوت ہے، اگر اس قوت کا مشاہدہ کرنے میں ہم کامیاب ہوجائیں تو دنیا کی ساری مسرتیں اور ساری بہاریں ہمیں خزاں نظر آنے لگیں، اور حقیقی اور سچی راحت ہمیں میسّر آجائے۔

## اِنسانی زندگی کی رُوح

دولت مند دولت کو راحت سمجھتے ہیں، عیش پرست عیش کو زندگی کی روح بتاتے ہیں، لیکن زندگی کی روح ضمیر کی وہ آواز ہے جو انسان کی ہمیشہ راستی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، جب انسان تاریکیوں میں بھٹکتا ہے جب انسان گناہ میں پھنس جاتا ہے، جب انسان اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتا ہے، جب انسان دیانت کو چھوڑتا ہے تو یہ خاموش آواز اُسے ہدایت کرتی ہے کہ اے تاریکی کی طرف جانے والے سنبھل جا، اے گناہ کی وادی میں تباہ ہونے والے ہوش میں آ، اے اخلاقی جرائم کے مرتکب اپنے فرائض کو پہچان، اے بددیانتی کے تمنائی دیانت کی خوبصورت دیوی تجھ پر لعنت کررہی ہے بیدار ہو، لیکن جب انسان آواز کی طرف رخ نہیں کرتا تو اُس کی زندگی کی روح مرجاتی ہے،

تمہاری زندگی کی روح تمہارا ضمیر ہے، اگر تم نے اُس کی آواز پر توجہ نہ کی تو تمہارا ہونا نہ ہونا بیکار ہے۔

"طور"

## رام کا رتھ

راون کو کل سامانِ جنگ کے ساتھ رتھ پر سوار ایک طرف اور اُس کے مقابلہ کے لئے پیادہ پا رام کو دوسری طرف دیکھ کر بھبکین جیسے راسخ الاعتقاد اور وفادار بھگت کا دل بھی دہل گیا۔ وہ مہاراج رامچندر سے سوال کرتا ہے کہ مہاراج! فتح کیسے ہوگی؟ ہائے کیا روحانیت اور اخلاقی تہذیب پیروں سے کچلی جانے ہی کے لئے بنی ہے؟ اس موقع پر مہاراج رام فرماتے ہیں کہ فتح کے لئے جو رتھ ہے اُس کے اجزا کی تفصیل اے بھبکین سنو:-

بہادری اور استقلال جس رتھ کے پہیے ہیں، مضبوط سچائی اور محبت جس کے جھنڈے اور پھریرے ہیں۔
طاقت، تمیز، نفس کشی اور پر اوپکار، یہ چار گھوڑے عفو، رحم و مساوات کے باگ ڈور سے اس رتھ میں جتے ہوئے ہیں۔
ایشور کا بھجن اُس رتھ کا چلانے والا ہے اُس کی ڈھال بیراگ اور تلوار قناعت ہے۔
فیاضی اُس کا پھرسا اور عقلِ سلیم شکتی بان ہے اور افضل ترین علم اُس کی مضبوط کمان ہے۔
پاک اور مستقل طبیعت جس کا ترکش ہے اور سنجم (اصولِ اخلاقِ ذاتی) اور نیم (اصولِ اخلاقِ تمدنی) سپر ہیں۔
زرہ بکتر جیسے برہمن کی خلوصِ دل سے پرستش ہے، اُس کے مقابلہ میں کوئی دوسرا ذریعہ فتح کا نہیں ہے۔

"نگار"

# تبصرہ

**اسلامی کہانیاں**۔ مرتبہ شیخ عبدالسلام صاحب فضلی بی۔اے۔ بی ٹی۔ اس کتاب میں تاریخ اسلام کا خلاصہ نہایت آسان اور دلچسپ پیرایہ میں درج کیا گیا ہے۔ چھوٹے بچوں کو اپنی قومی روایات سے واقف کرانے کے لئے یہ بہترین کتاب ہے۔ حجم ۹۰ صفحات اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

**پھولوں کی ڈالی**۔ مرتبہ شیخ محمد اسمٰعیل صاحب ایڈیٹر رسالہ کائنات نصیحت آمیز، آسان اور سلیس نظموں کا خوبصورت مجموعہ ہے۔ جو ہر مذہب و ملت کے بچوں کے لئے یکساں مفید ہیں۔ حجم ۳۲ صفحے اور قیمت چار آنے ہے۔

**جنت کے پھول**۔ چھوٹی تقطیع پر سولہ صفحے کا مختصر سا رسالہ ہے جس میں تبلیغی نظمیں درج کی گئی ہیں جوش عمل پیدا کرنے کے لئے مفید چیز ہے۔ قیمت دو پیسے رکھی گئی ہے۔ تینوں کتابیں مینیجر حالی بک ڈپو پانی پت سے طلب فرمائیے۔

**یورپین شعرائے اردو**۔ اس کتاب میں انگریزی، فرانسیسی اور پرتگیزی شعرائے اردو کے صحیح و مختصر حالات اور اُن کے منتخب اردو کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں۔ اپنی قسم کا پہلا تذکرہ ہے حجم ۲۸ صفحے اور قیمت آٹھ آنے ہے۔

**تذکرہ شعرائے اورنگ آباد**۔ جب اورنگ زیب دکن کا صوبہ دار مقرر ہوا تو اُس نے اورنگ آباد کو اپنا مرکز حکومت قرار دیا۔ اس سے اورنگ آباد علوم و فنون کا مرکز بن گیا اور وہاں بڑے بڑے نامور شعرا پیدا ہوئے۔ اس مختصر تذکرے میں اُن کے حالات اور منتخب کلام درج ہے۔ حجم ۴۰ صفحے اور قیمت چھ آنے ہے۔ دونوں کتابیں کتب خانہ مسجد چوک حیدرآباد دکن سے منگائیے۔

**بلقیس** ۵۴ صفحے کا ایک درد انگیز و نتیجہ خیز افسانہ ہے جس کے مصنف سید محمد رشید الملک صاحب ہیں۔ انداز تحریر مؤثر اور دل کش ہے۔ قیمت چار آنے ہے۔ مینیجر ملیح آباد گزٹ۔ مقام فتح پور (ہسوہ)

**آئینہ حساب** حصۂ اول و دوم۔ ان دو کتابوں میں گنتی، پہاڑوں اور پیمانوں کو شکلوں اور نقشوں کے ذریعہ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ بچوں کے لئے یہ کتابیں نہایت مفید ہیں۔ ابتدائی حساب کی تعلیم ان میں ایسے طریقہ سے دی ہے کہ نہایت آسانی سے ہر بات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔ ملنے کا پتہ:۔ زین الدین بنگڑی والا۔ دادر مارکٹ نمبر ۱۴ بمبئی۔

**کامل صابون ساز**۔ صابون سازی ایک کارآمد فن ہے۔ اس کتاب میں دیسی انگریزی اور دواوالے صابون بنانے کے سہل اور آسان نسخے لکھے ہیں۔ حجم ۲۴ صفحے ہے۔ مجلد کتاب کی قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ کامل بک ڈپو لاہور سے مل سکتی ہے۔

# فہرستِ مضامین

جلد ۱۴ — بابت ماہِ ستمبر ۱۹۲۸ء

تصویر:- نواب خانِ خاناں



| نمبر شمار | مضمون | صاحبِ مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جہاں نما | | ٦٥٠ |
| ۲ | نواہائے راز (نظم) | حامد علی خاں | ٦٥٢ |
| ۳ | ایک مکالمہ | " | ٦٥٣ |
| ۴ | رباعیات | جناب جلال الدین صاحب اکبر بی، اے آنرز | ٦٥٤ |
| ۵ | نواب خانِ خاناں * | جناب میرزا فہیم بیگ صاحب فہیم گوالیاری | ٦٥٥ |
| ٦ | خیالاتِ پریشاں (نظم) | جناب پنڈت شام موہن لال صاحب جگر بریلوی | ٦٧٠ |
| ۷ | روما اور زمانۂ وسطیٰ | بشیر احمد | ٦٧٢ |
| ۸ | وجدانیات (نظم) | جناب سید عابد علی صاحب عابد بی، اے ایل ایل بی | ٦٧٨ |
| ۹ | خیالات | باغبان | ٦٧٩ |
| ۱۰ | نفع نقصان برابر (افسانہ) | جناب میجر میاں عطاالرحمٰن صاحب | ٦٨٠ |
| ۱۱ | محبت سے (نظم) | بہار | ٦٨٨ |
| ۱۲ | اسیرِ قفس (افسانہ) | جناب محترمہ ز۔ ب صاحبہ | ٦٨٩ |
| ۱۳ | بیوہ کی زبان سے (نظم) | جناب محترمہ ع۔ ب صاحبہ | ٦٩٤ |
| ۱۴ | دیوانہ (افسانہ) | جناب مسٹر فضل محمد صاحب افضل | ٦٩٥ |
| ۱۵ | نوادرِ جنوں (نظم) | جناب حاجی محمد صادق صاحب صادق یوپی | ٧٠٥ |
| ۱٦ | اردلی (افسانہ) | منصور احمد | ٧٠٦ |
| ۱۷ | آہنگِ تپش (نظم) | جناب شیخ عبد اللطیف صاحب تپش بی، اے | ٧١٤ |
| ۱۸ | غزل | جناب غاصف ملاّوی | " |
| ۱۹ | دشمن | حامد علی خاں | ٧١٨ |
| ۲۰ | محفلِ ادب | | ٧١٧ |
| ۲۱ | تبصرہ | | ٧٢٠ |

# جہاں نما

## جاپان کا شاہی مشاعرہ

ماہ مارچ کے جاپان میگزین میں لکھا ہے:۔

"محلاتِ شاہی کا سالانہ مشاعرہ جو پچھلے سال قومی ماتم کی وجہ سے بند کر دیا گیا تھا اس سال ۲۸ جنوری کی صبح کو فینکس ہال میں منعقد ہؤا۔

چونکہ مرحوم شہنشاہ ٹیشو کی علالت طول پکڑ گئی تھی اس لئے وہ اپنے دورِ حکومت کے آخری ایام میں مشاعرہ میں شریک ہونے سے قاصر رہے۔ اب کہ نئے شہنشاہ کا عہدِ حکومت شروع ہوا ہے لوگوں نے اپنے جواں سال شہریار کی موجودگی میں بڑے جوش اور شان سے مشاعرہ منعقد کیا۔ اعلیٰ حضرت معمولی فوجی لباس میں علیا حضرت کے ساتھ مشاعرہ میں تشریف لائے دربار کے ایک شاعر نے اُٹھ کر اعلان کیا کہ اعلیٰ حضرت کے فرمان کے بموجب سالِ نو کی نظم کا مضمون "نظارۂ کہسار کی سرسبزی و شادابی" قرار پایا ہے۔ اس کے بعد منتخب نظمیں پڑھی جانے لگیں۔ پہلے عوام نے اپنا کلام سنایا اور پھر خاندانِ شاہی کی باری آئی۔ پھر ملکہ اور دوسری بیگموں کے اشعار تین تین دفعہ پڑھوائے گئے۔ سب سے آخر میں شہنشاہ کی پہلی نظم ملک الشعرا کونٹ اوہارا نے بلند آواز سے پڑھ کر سنائی اور دوسری نظم دربار کے دوسرے شعرا سے پڑھوائی گئی۔ ہر نظم پانچ پانچ مرتبہ دہرائی گئی۔

شاہی محلات میں نوروز کا یہ مشاعرہ پانچ سو سال سے منعقد ہوتا چلا آیا ہے اور اس موقع پر معمولی سے معمولی شخص بھی اپنی نظم دربار میں پڑھ سکتا ہے۔ جو نظمیں انتخاب کی جاتی ہیں وہ بادشاہ ملکہ اور شہزادوں اور شہزادیوں کو پیش کی جاتی ہیں یہ اجتماع شاہی خاندان اور قوم کے درمیان ربط و ضبط قائم کرنے کا ایک عظیم الشان ذریعہ ہے۔

شہنشاہ اور ملکہ شہزادوں اور شہزادیوں اور دوسرے شعرا کا منتخب کلام جاپان میگزین میں درج ہے۔ شہنشاہ کی نظم یوں شروع ہوتی ہے:۔

"سال کا آغاز ہے اور پہاڑ سرسبز و شاداب ہو رہے ہیں،
"مگر اس قوم کا کیا حال ہے جس پر میری حکومت کا آغاز ہؤا ہے؟"

## جرمنی اور ہندوستان

گزشتہ پچیس سال کے عرصہ میں سنسکرت ادبیات اور ہندوفلسفہ پر جرمنی میں اتنی کتابیں شائع ہوئی ہیں کہ ہندوستان میں بھی نہ ہوئی ہونگی۔ ہندوستان کے حکما، شعرا اور علما کی جتنی تواضع اور مدارات وہاں ہوتی ہے اور کہیں نہیں ہوتی۔

جرمن صنّاع ہندوستان کی اہمیت کو دوسری تمام قوموں سے زیادہ محسوس کرتے ہیں۔ جنگِ عظیم سے پہلے جرمنی کی تجارت ہندوستان میں بڑے عروج پر تھی جسے دیکھ کر برطانیہ عظمیٰ کو بھی رشک ہونے لگا تھا۔

موجودہ زمانے میں جرمنی کی کوئی سیاسی خواہش ایشیا سے وابستہ نہیں ہے۔ اُسے معلوم ہے کہ وہ بعض خاص حالات پیدا کئے بغیر ایشیا میں کبھی اپنے قدم نہیں جما سکے گا جو ممکن ہے اُس کے حقیقی مفاد کے لئے خطرناک ثابت ہوں۔ جرمنی کو یہ معلوم ہے کہ تجارتی نقطۂ نظر سے ہندوستان اُس کے لئے بمنزلہ ایک جائداد کے ہے اور بین الاقوامی نقطۂ نظر سے ہندوستان کی آزادی سیاسی دنیا میں جرمنی کی طاقت اور اُس کے اثر کو بڑھائے گی اور دوسری مغربی حکومتوں کی طاقت کو گھٹائے گی۔

جرمنی کی درس گاہیں غیر ملکی طالب علموں کا خیر مقدم کرنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہیں۔ جاپان نے اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیا ہے اور اب ایک "جرمن جاپانی انجمن" برلن میں قائم ہوئی ہے۔

# اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن

آنریبل سید امیر علی اور مولانا وحید الدین سلیم کے انتقال سے پچھلے مہینے دنیائے علم و ادب کو دو بہت بڑے صدمے پہنچے ہیں۔ سید امیر علی مرحوم مسلمانوں میں خلوص اور نیک نیتی کا پیکر تھے۔ اُن کے دل میں اسلام کے لئے محبت اور مسلمانوں کے لئے درد تھا۔ اُن کی قومی اور اسلامی خدمات اور علمی اور قانونی کارنامے بڑی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ مرحوم ہی وہ پہلے ہندوستانی ہیں جو ہائی کورٹ کے جج بنے اور پریوی کونسل کے ممبر ہوئے یوں تو قانون اور اسلام پر انہوں نے متعدد کتابیں لکھیں لیکن اُن کی دو معرکۃ الآرا تصانیف مختصر "تاریخ عرب" اور "روح اسلام" خاص طور پر مقبول ہوئیں اور ان دو کتابوں نے اسلام کے متعلق مغربی دنیا کا اور مغرب پرست مسلمانوں کا نقطۂ نظر ہی بدل دیا۔

مولانا وحید الدین سلیم مرحوم ایک بلند پایہ ادیب اور ایک خوش فکر شاعر تھے۔ ابتدا میں وہ ہندوستان کے کئی ایک معزز و موقر اخبارات کے مدیر رہے لیکن فطرت کو اُن سے اخبار نویسی سے زیادہ اہم کام لینا تھا چنانچہ وہ جامعۂ عثمانیہ میں ادبِ اردو کے پروفیسر مقرر ہوئے اور دار الترجمہ کے ایک ممتاز رکن تسلیم کئے گئے۔ وہاں انہوں نے نہایت محنت اور استقلال سے زبانِ اردو کی خدمات انجام دیں خصوصاً وضع اصطلاحات کے متعلق مرحوم نے اپنے خیالات سے ادبِ اردو میں ایک قابلِ قدر اضافہ کر دیا۔ وہ "ہمایوں" کے خاص معاونین میں سے تھے اور ہمایوں ہمیشہ اُن کی عنایات کا ممنون رہے گا۔

خدا سے ہماری دعا ہے کہ وہ دونوں بزرگوں کو اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

# نواہائے راز

دیکھی جو عمر بھر وہ تری راہ ہی تو ہے
حاصل اس انتظار سے کیا؟ آہ ہی تو ہے

اب مدعی کو دیکھ ہے کس اضطراب میں
آمد ہماری بزم میں ناگاہ ہی تو ہے

اظہارِ اشتیاقِ ملاقات کیا کریں
تو بھی ہمارے حال سے آگاہ ہی تو ہے

مونس ہمارے غم میں بجز آہِ نیم شب
لے دے کے اک دعائے سحرگاہ ہی تو ہے

کیوں ناز سے چھپاتے ہو چہرہ نقاب میں
آخر ہے اسمیں بات ہی کیا؟ ماہ ہی تو ہے

اے ہوشمند! حسن فریبِ نگاہ ہے
اور عشق سر بسر غمِ جانکاہ ہی تو ہے

ہے پردۂ ریا میں، پرے واعظانِ شہر!
دعوائے فقر بھی ہوسِ جاہ ہی تو ہے

منزل میں آکے رک نہیں سکتے مرے قدم
منزل، ہزار منزلوں کی راہ ہی تو ہے

بے جا ہے ہم کو رشک ہو گر بادشاہ پر
ہم بے نوا گدا ہیں وہ جمجاہ ہی تو ہے

حامد علی خاں

# ایک مکالمہ

## روسی معجز نگار آئیون ٹرجینیف کے تتبع میں

(ترجمہ)

کوہ ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی ........

اونچے نیچے، پتھریلے ٹیلوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ......

عین وسط ایشیا۔

کوہستان پر جھکا ہوا پستئی رنگ کا صاف ستھرا، چپ چاپ آسمان۔ تند، بے رحم پالا، سخت، بلورین برف؛ اور برف میں سے سر نکالے کھڑی ہوئیں، تیز جھکڑوں کے ستم جھیلے ہوئے، برف پوش پہاڑوں کی جگمگاتی جھلملاتی ہوئی چوٹیاں۔

دو عظیم الہیئت اجسام، افق کے پہلوؤں کے دو دیو، گوری شنکر اور کنچن جنگا۔

اور گوری شنکر اپنے ہمسائے سے مخاطب ہوتا ہے، "پڑوسی! کہ کوئی نئی بات بتا سکتا ہے؟ نیچے وہ دُور کیا ہے؟"

چند ہزار برس گزر جاتے ہیں: ایک لمحہ، اور کنچن جنگا جواب میں گرجتا ہے۔

"زمین پر گہرے، غلیظ بادل چھا رہے ہیں ..... ذرا ٹھہر" اور ہزار ہا برس گزر جاتے ہیں: ایک لمحہ۔

**گوری شنکر** "اچھا اور اب؟"

"اب نیلا نیلا پانی، گھنے گھنے سیاہ جنگل اور اوپر تلے پڑے ہوئے پتھروں کے بھورے بھورے ڈھیر نظر آتے ہیں، اور پھر اُن کے درمیان کچھ کیڑے جنھوں نے اب تک تجھے اور مجھے ناپاک نہیں کیا، اِدھر اُدھر سر سرانے پھرتے ہیں۔

"انسان؟"

"ہاں انسان!"

ہزار ہا برس گزر جاتے ہیں: ایک لمحہ۔

**گوری شنکر**۔ "اور اب بتا؟"

کنچن جنگا جواب میں کڑکتا ہے "اب نیچے کا منظر زیادہ صاف اور کھلا ہؤا ہے۔ کیڑے کم دکھائی دیتے ہیں، پانی سکڑ سمٹ گیا ہے اور جنگل بھی ویسے گھنے نہیں"

پھر ہزار ہا برس گزر جاتے ہیں: ایک لمحہ۔

**گوری شنکر**۔ "اچھا اب کیا نظر آتا ہے"

"ہمارے قرب وجوار کا منظر اب زیادہ پاکیزہ ہے لیکن دُور وادیوں میں ابھی تک کچھ دھبے سے باقی ہیں اور کوئی چیز حرکت کرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔"

**گوری شنکر**۔ (اور ہزار ہا برس کے بعد) "اور اب؟"

"اب لطف ہے، جہاں تک نظر کام کرتی ہے ہر جگہ صاف، سفید برّاق، ہر جگہ تہ بر تہ جمی ہوئی ہماری برف کی سپاٹ اور ناشکستہ سطح، ہر چیز منجمد ہے۔ واہ وا کیسا سکوت ہے؟"

**گوری شنکر** "ہاں خوب ہے، لیکن بھائی ہم باتیں بہت کر چکے۔ اب سونے کا وقت ہے"

**کنچن جنگا**۔ "ہاں اب ہے تو سونے کا وقت"

عظیم الشان پہاڑ سوتے ہیں، صاف ستھرا، سبز آسمان، ابدی سکوت کی سرزمین پر سر جھکائے سوتا ہے۔

**حامد علی خاں**

---

# رباعیات

بے خود ہوں میں سرمست ہوں ہشیار نہیں
ہوں بے خبر راز خبردار نہیں
ناواقفِ اسرار نہیں ہوں اکبر
ہر چند کہ میں واقفِ اسرار نہیں

---

ناکامِ حیات وقفِ حسرت ہوں میں
محرومِ کرشمہائے قسمت ہوں میں
اے دوست اے کامگارِ ہستی پرہیز!
پرہیز کہ سر بسر مصیبت ہوں میں

**جلال الدین اکبر**

# نوابِ خانِ خاناںؒ

## ابتدائی دور

نوابِ خانِ خاناں جن کی تصویر آج ناظرین "ہمایوں" کی بصارت نوازی کر رہی ہے۔ خان بابا (بیرم خاں خانِ خاناں) کے نونہال ہیں۔ وہ ۱۴۔ صفر ۹۶۴ھ میں (بیرم خاں کی بیگم) جمال خاں میواتی کی دخترِ نیک اختر کے بطن سے تولد ہوئے۔ اور اُن کا نام نامی میرزا عبدالرحیم خاں رکھا گیا۔

میرزائے موصوف کا عالمِ شیرخوارگی، وہ زمانہ کہ انسان پر ایک فطرتی غفلت طاری ہوتی ہے، بیرم خاں کے انتہائی عروج کا وقت تھا۔ اس دور میں خاندانِ مذکور کے سامنے کسی کا چراغ نہ جلا۔ اکبر کے سرپرست بنے ہوئے تھے، عنانِ حکومت ہاتھ میں تھی۔

سدا کسی کی نہیں رہی۔ میرزا عبدالرحیم خاں کو اس باغ کی ہوا کھاتے خیر سے ابھی تین سال بھی نہ گذرے تھے کہ اس گلِ نودمیدہ کی طرف انقلابات کی بادِ سموم کے جھونکے آنے لگے۔ بیرم خاں کے مخالف امرانے ہاتھ پیر نکالنے شروع کئے۔ دشمنوں کی دیرینہ ریشہ دوانیاں رنگ لانے لگیں۔ آہ! بیرم خانی آفتابِ اقبال لبِ بام آگیا۔

زمانہ کروٹیں بدل رہا تھا۔ اور معصوم عبدالرحیم خاں غفلت کے گہوارے میں پڑا سو رہا تھا۔ اُسے احساس نہ تھا کہ ضعیف باپ پر کیا گذرتی ہے اور اُس کے حق میں کیسا مستقبل تیار ہو رہا ہے۔

ڈھلتی چھاؤں میں تین پشت کے وفا شعار بیرم خاں پر فلاکت کا آسمان ٹوٹا۔ ایسی بگڑی کہ بنائے نہ بنی پیچ پر پیچ پڑتا گیا۔ گتھی پر گتھی الجھتی گئی۔ بیرم خاں نے لاکھ کوشش کی کہ بات نہ بڑھے۔ لیکن مخالف طول دیتے گئے۔ کچھ ایسا چکر ڈالا کہ آخر بیچارے کی چٹی داڑھی کو بغاوت کا سیاہ داغ لگوا کر رہے۔ نوبت بہ ایں جا رسید کہ بیرم خاں کو فوجِ شاہی کے مقابلہ پر مجبور ہونا پڑا اور اگر وہ کہن سال سپہ سالار اڑا رہتا تو نہ جانے کیا سے کیا ہو جاتا۔ وہ تو خیر گذری۔ کچھ یُوں ہی سی ایک آدھ جھڑپ ہونے پائی تھی کہ شاہی لشکر کے ایک امیرزادے سلطان حسین جلائر کا سر اُس کے سامنے پیش ہُوا۔ انسان کا دل آخر انسان کا دل ہے۔ واللہ اعلم کیا بن گئی۔ بڈھے کا جی بھر آیا منہ پر رو مال ڈال کر بچوں کی طرح زار زار رونے لگا کہ ہائے ایسے ایسے دیدار و جوان جو دربار کی زینت اور سپاہ کی شوکت ہیں میری شامتِ اعمال سے

یوں رائیگاں جائیں۔

اس کے بعد ہر چند کہ پہاڑی راجہ متواتر کمک کو چلے آرہے تھے۔ بابا زنبور اور شاہ قلی محرم دامن سے لپٹ لپٹ کر روتے تھے کہ آقا ہمیں کس پر چھوڑ چلا، سائیں کے سو کھیل ہیں کچھ نیکی بدی ہوگئی تو ہم کہاں جائیں گے۔ اُس نے ایک نہ سنی اور مجرموں کی سی ہیئت بناکر بارگاہِ شاہی کا رخ کیا۔

بارگاہ کے قریب پہنچا تو ولی نعمت کو چشم براہ پایا۔ نمک خوارِ قدیم رو کر قدموں پر گر پڑا۔ خطا پوش نوعمر بادشاہ نے خان بابا، خان بابا کہہ کر زمین سے اُٹھایا۔ چھاتی سے لگایا۔ رونے والے بڑے بوڑھے کے بندھے ہوئے ہاتھ کھولے قدیم دستور کے مطابق دائیں پر بٹھایا اور سینے صاف ہو گئے۔

خان بابا دربارِ شاہی سے رخصت ہو کر مع اہل وعیال کے حج بیت اللہ کو جارہے تھے، پٹن، گجرات میں پڑاؤ تھا۔ ۱۴ جمادی الثانی ۹۶۸ھ کی شام کا ذکر ہے۔ مقام کولاب سہر لنگ پر کشتی میں بیٹھے سیرِ دریا کر رہے تھے جب آفتاب غروب ہوگیا تو نمازِ مغرب کے لئے اترے۔ اُس وقت راستے میں مبارک خاں لوہانی (جس کے ہمراہ تیس چالیس آدمی تھے) ملا اور اشتیاقِ ملاقات ظاہر کیا۔ آپ نے محبت سے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ اُس نے اچانک اُن کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا۔ آناً فاناً اُس کے ایک ساتھی نے اُن کے سر پر تلوار کا وار کیا۔ دونوں وقت ملے قالبِ عنصری سے روح جدا ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

چہار سالہ عبدالرحیم خاں نے اپنے گرد و پیش ماتم ہوتے دیکھا تو سہم گیا۔ کچھ ہوش کچھ بے ہوشی میں اُسے محسوس ہوا کہ افتاں وخیزاں اُسے کہیں لے جایا جارہا ہے۔

یتیم عبدالرحیم کا بے سر قافلہ خدا خدا کر کے احمد آباد پہنچا۔ ادھر پرچہ لگتے ہی اعتماد خاں حاکم گجرات کے نام فرمانِ شاہی نافذ ہوا کہ خان بابا کے پس ماندگان بحفاظتِ تمام دربار میں بھیج دیئے جائیں۔

۹۶۹ھ میں عبدالرحیم خاں کا محلاتِ شاہی میں داخلہ ہوا۔ سبحان اللہ ماں باپ سے زیادہ شفیق ولی نعمت شہنشاہ اکبر نے انتہائی دل سوزی سے اس معصوم یتیم کو گود میں لے لیا۔ سر پر دستِ شفقت پھیرا اور بابا زنبور سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ دیکھو یہ ہمارا بچہ ہے، خبردار اس کا رونگٹا میلا نہ ہونے پائے، دل وجان سے اس کی پرورش کرو۔ خدا بخشے بابا زنبور بیرم خاں کے خاص جاں نثاروں میں سے تھے۔ اُن کی تو گویا امید بر آئی۔ منہ مانگی مراد پائی۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر کیا اور پرورش میں مشغول ہوئے۔

مرے کی نشانی، بیرم خاں مقتول کا فرزندِ ارجمند بابا زنبور کے ہاتھوں اکبر کے زیرِ سایہ پروان چڑھنے لگا۔ جب باہر

نکلنے کے قابل ہُوا تو جس رستے سواری جاتی، چرچے ہوتے۔ ذرا دیکھنا! یہ کس خان زادے کی سواری ہے۔ آہا چندے آفتاب چندے ماہتاب، سورج کی سی کرن، چاند کا سا ٹکڑا۔ ماشا اللہ کیا بھولا بھالا مکھڑا ہے کہ دیکھا ہی کرو۔ بلکہ مصور تصویریں کھینچ لیتے تھے۔ جو بڑے بڑے امرا کے دیوان خانوں میں سجائی جاتی تھیں۔

اکبر اُسے پیار سے میرزا خاں کہا کرتا تھا۔ اُسے میرزا خاں سے ایسی محبت تھی کہ آنکھ سے اوجھل نہ ہونے دیتا تھا کیا حضر کیا سفر ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔

جب وہ دارالسلطنت آگرہ سے دہلی ہوتا ہُوا لاہور گیا تو میرزا خاں کو بھی ہمرکاب لیتا گیا تھا۔ اب ننھے سے خان زادے کی اقبال مندی ملاحظہ فرمائیے کہ جہاں جہاں شاہی قیام ہُوا سوداگر، مصور، صناع، دستکار، مالی وغیرہ میرزا خاں کے ڈیرے پر طرح طرح کے تحفہ تحائف لے لے کر آئے اور پیشکش کئے۔ اِن باتوں سے وہ نمک خوارانِ قدیم جو اُس کی ذات پر آس لگائے بیٹھے تھے، نہالوں نہال ہوئے جاتے تھے " دشمنوں کے کان بہرے، خدا رکھے ہمارا آقا معلوم تو اقبال مند ہوتا ہے۔ اللہ نے چاہا جوان ہو کر بڑا آدمی نکلے گا۔

میرزا خاں کون تھا؟ بیرم خاں کا لختِ جگر۔ وہ بیرم خاں جن کی مہمان نوازی و فراخ دلی کے افسانے زبان زدِ خلائق ہیں۔ باپ کی طرح ہونہار بیٹا بھی ویسا ہی عالی حوصلہ نکلا۔ گو لڑکپن میں اُس کی اتنی بساط نہ تھی کہ دل کے حوصلے نکالتا تاہم اُن ننھے ننھے ہاتھوں کے دینے میں وہ خوبی ہوتی تھی جس سے امیدواروں کے ہاتھوں کلیجے بڑھ جاتے تھے۔ یہی دعائیں نکلتی تھیں۔ الٰہی! اسے پروان چڑھائیو یہ راج دلارا، غریبوں کا آسرا، ضعیفوں کا سہارا ہے۔

چاہئے تو یہ تھا کہ بیرم خاں کے قتل پر معاملہ رفع دفع ہو جاتا۔ مگر افسوس ایسا نہ ہُوا۔ ارم آشیانی ـــــــ سے جلنے والے امرا کی آگ نہ دبی۔ میرزا خاں پر مراعاتِ خسروانہ و الطافِ شاہانہ دیکھ دیکھ کر آتشِ حسد میں جلے مرتے تھے، ہر وقت لگائی بجھائی سے کام تھا۔

اکبر نے دیکھا سیدھی انگلیوں گھی نکلتا نظر نہیں آتا، یہ لوگ یوں نہ مانیں گے تو یہ تدبیر کی کہ خانِ اعظم میرزا عزیز کوکلتاش کی صاحبزادی ماہ بانو بیگم سے میرزا خاں کی شادی کر دی۔ اس طرح سے اُس کے حمایتوں کی جماعت زبردست ہو گئی اور مخالفوں کی کور دبنے لگی۔

## عہدِ اکبری کے کارنامے

۹۷۳ھ میں جب جہاں پناہ (اکبر) خانِ زماں کی مہم میں مصروف تھے اور معاملہ طول پکڑ گیا تھا تو میرزا خاں ہی

کی سفارش سے خانِ مذکور کی خطا معاف ہوئی تھی۔ اسی سنہ میں خبر آئی کہ محمد حکیم میرزا نے بغاوت کی۔ کابل سے اُٹھ کر لاہور آ پہنچا۔ اُس کی مدافعت کے لئے جاتے وقت آں بدولت میرزا خاں کو خلعتِ فاخرہ سے سرفراز فرما کر اور چند امراکو اس کے ماتحت کر کے دارالسلطنت کے انتظام پر چھوڑ گئے۔

سنہ ۹۸۰ھ میں میرزا عزیز کوکلتاش کو مظفر خاں نے احمد آباد میں محصور کر لیا۔ آں بدولت نے خانِ اعظم کی حمایت کے لئے احمد آباد کی طرف فتح نشان کھولا۔ میرزا خاں کو ہمرکاب لے کر دو ماہ کی راہ سات روز میں لپیٹی اور دفعتہً میدان میں فوج اتار دی۔ لشکر جماتے وقت بجائے کسی تجربہ کار سپہ سالار کے میرزا خاں کو قلب میں قائم کیا اور بہت جلد ثابت ہو گیا کہ یہ تجویز نہایت مناسب تھی، کیونکہ مظفر خاں نے ہزیمت اُٹھائی۔

سنہ ۹۸۳ھ میں اکبر نے خانِ اعظم کو احمد آباد کا حاکم مقرر کرنا چاہا تو وہ ہیچ مچر کرنے لگے۔ میرزا خاں پر جو نظر ڈالی، وہ آداب بجا لائے اور آمادگی ظاہر کی۔ آں بدولت نے اس انیس سال کے شیر بچہ کی اولوالعزمی پر آفرین کی اور چونکہ آغازِ شباب الڑپن کا زمانہ ہے، نوعمر سپہ سالار کو ملک گیری کے اتار چڑھاؤ سمجھائے اور ہدایت کی کہ وزیر خاں کی صلاح کے بغیر کسی کام پر ہاتھ نہ ڈالنا۔ اور علاوہ وزیر خاں کے علاء الدولہ قزوینی، پیاگ داس، سید مظفر بارہہ وغیرہ کو بھی اُس کی ڈھارس بندھانے کے لئے ساتھ کر دیا۔

سنہ ۹۸۶ھ میں شہباز خاں (ایک اکبری امیر) نے رانا کے علاقہ مقام کملمیر پر چڑھائی کی اور میرزا خاں کو مدد کے لئے بلایا۔ انہوں نے جو جھپٹا مارا رانا کا قلعہ کوکندہ چھین فوراً اودے پور پر قبضہ کر لیا۔ رانا بڑبڑا کر پہاڑوں میں جا چھپا شہباز خاں نے اس کا بہتیرا پیچھا کیا لیکن وہ ہاتھ نہ آیا۔

میرزا خاں کی حیرت انگیز کارگزاریاں دن دونی رات چوگنی اکبر کے دل میں گھر کرتی گئیں اُن کی ہمہ گیر خوبیوں کا ہر جگہ چرچا ہونے لگا تو سنہ ۹۸۸ھ میں اکبر نے انہیں دربار کے عہدۂ عرض بیگی پر مامور کیا تاکہ حاجتمندوں کی باریابی میں آسانی ہو اور ہر مظلوم کی فریاد سنی جا سکے۔

زیادہ دن نہ گزرے تھے (اسی سنہ میں) کہ راجہ مان سنگھ کے عزیز و اقارب کچھواہہ راجپوتوں نے صوبۂ اجمیر میں علم بغاوت بلند کیا۔ اور ایسا فساد اُٹھایا کہ ایک مخلوق تباہ ہو گئی۔ وہاں کا صوبہ دار رستم خاں بھی اس بلوے میں کام آیا۔ اب بڑی دقت یہ پیش آئی کہ کھلے خزانے کچھواہوں کی سرکوبی کرنا بھی اکبری پالیسی کے خلاف تھا۔ مصلحت تھی کہ سانپ مرے نہ لاٹھی ٹوٹے۔ جس وقت اعیانِ سلطنت پر نگاہ ڈالی تو منشاء کے مطابق عمل در آمد کرنے کی صلاحیت میرزا خاں میں نظر آئی جملہ وجوہ کو ملحوظ رکھ کر شہنشاہ نے اسی کو رنتھبور جاگیر کر کے صوبۂ اجمیر کی

اصلاح پر مامور کیا۔ ×

تقریباً دو سال تک میرزا خاں اجمیر کا خس و خاشاک صاف کرتے رہے۔ اس کے بعد ۹۹۰ھ میں جب شیخو بابا (شہزادہ سلیم) تیرہ سال کے ہوئے اور انہوں (میرزا خاں) نے زندگی کی چھبیسویں منزل میں قدم رکھا تو اکبر نے اُن کو شیخو بابا کا اتالیق مقرر کر دیا۔ چونکہ یہ وہی عہدہ تھا جس پر اکبر کی شہزادگی کے وقت میرزا خاں کے والد ارم آشیانی رہ چکے تھے اس واسطے انہیں بڑی خوشی ہوئی۔ حضور پناہ میں گذارش کی کہ براہِ ذرہ نوازی خانہ زاد کی نانِ جویں کی دعوت قبول فرمائی جائے۔ ولی نعمت نے اُن کی دعوت قبول فرمائی۔

کیا لطف آیا ہے۔ جہاں پناہ کی سواری اُٹھی۔ میرزا خاں قلعہ سے لے کر اپنے گھر تک سونے روپے کے پھول برساتے گئے۔ جب اُن کا گھر نزدیک آگیا تو موتی نچھاور کرنے لگے۔ دھوم دھام سے سواری اتاری اور بادشاہ کو سوا لاکھ کی ڈھیری (سوا لاکھ روپے کا چبوترہ) پر بٹھا کر نذر دی۔ وہاں سے دوسری بارگاہ کو لے چلے۔ سواری اُٹھتے ہی ڈھیری لٹا دی۔ بارگاہ میں لے جا کر کوہ پیکر ہاتھی اور اصیل گھوڑے پیشکش کئے۔ امرائے ہمرکاب کو عجائب تحائف سے خوشنود کیا۔

خبر آئی مظفر خاں نے گجرات میں اندھیر جوت رکھا ہے۔ روک تھام کی گئی۔ خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا۔ ۹۹۱ھ میں اکبر نے سادات بارہہ، ایرانی دلاور، راجپوت سپہگر، چندر رانا اور ٹھاکر ساتھ کر کے میرزا خاں کو شہاب الدین خاں حاکم گجرات کی جگہ بھیجا اور ایک فرمان قلیچ خان کو نافذ کیا کہ جلد مالوہ کی فوج لے کر میرزا خاں کی کمک کو پہنچو۔ علیٰ ہذا القیاس امرائے دکن کو بھی فرامینِ امداد نافذ کئے گئے۔

میرزا خاں نے رکاب میں پیر ڈالا اور گجرات کی طرف باگ اٹھا دی۔ کوچ در کوچ منزل بہ منزل جالور ہوتے ہوئے پٹن گجرات یعنی اُس مقام تک جا پہنچے جہاں ۱۴ جمادی الثانی ۹۶۸ھ کی شام کو اُن کے والد ارم آشیانی نے جامِ شہادت نوش فرمایا تھا۔ اس پڑاؤ پر امرا بھی اپنی اپنی فوجیں لے کر استقبال کو آ گئے۔

یہاں آتے ہوئے امرا کو جمع کر کے میرزا خاں نے مشورہ کیا۔ بعض امرا نے رائے دی۔ قلیچ خاں کا انتظار کرنا چاہیے ذرا وہ بھی آ جائیں تو مکمل تیاری کر کے دشمن کی سرکوبی کی جائے۔ میرزا کے خیر خواہ مصاحبوں نے کہا سرکار ایسا ہرگز نہ کیجیے گا۔ اگر وہ آ گئے تو پھر ہم کیسی ہی جاں بازی و سرفروشی کیوں نہ کریں وہ پرانے سپہ سالار ہیں فتح انہیں کے نام لکھی جائے گی۔ بہتر یہ ہے کہ ہم اُن کی آمد سے پہلے ہی خدا کا نام لے کر دو ٹوک فیصلہ کر رکھیں۔

سچے ہی خواہوں کی رائے میرزا خاں کے ذہن نشین ہو گئی۔ پہلے تو انہوں نے ایک ہوائی اڑائی کہ شاہی فرمان آتا ہے۔ پھر ایک شاندار استقبال کر کے مجمع عام میں ایک مصنوعی فرمان سنایا کہ اِن جانب فلاں تاریخ کو عزمِ گجرات

سوار ہو نکلے اور عنقریب یلغار مارنے والے ہیں۔

میدان بندھا۔ مظفر خاں کی چالیس ہزار فوج کے مقابلہ پر میرزا خاں کی دس ہزار سپاہ ڈٹ گئی، نیزے تُل گئے، تلواریں بے نیام ہوئیں، خون برسنے لگا۔ موت کی گرم بازاری میں ہاتھیوں کی آڑ لیئے میرزا خدا کی قدرت کا تماشا دیکھ رہا تھا۔ مظفر خاں کا غلبہ ہُوا۔ شاہی فوج دبنے لگی۔

عین اُس وقت کہ مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ ایک جاں نثار دوڑا دوڑا آیا۔ اور میرزا خاں کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر اُس کو خطرے سے نکال لے جانا چاہا۔ باگ پر ہاتھ پڑتے ہی میرزا خاں محویت سے چونکا۔ ایڑ جو دی گھوڑا ہنہنا کر الف ہو گیا۔ ادھر نوجوان سپہ سالار کے اشارے پر فیلبانوں نے قرنا پھونک دی۔ شاہی جانبازوں میں نئی روح دوڑ گئی۔ ایک نعرہ لگا کر پل پڑے۔ گھٹنوں تیغ کر دی۔ مظفر خانی دل بادل میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یکایک کسی تازہ دم دستے نے پیچھا مارا۔ مخالفوں کو یقین ہو گیا کہ ہائے اکبر آ گیا۔ پھر کون کسی کی سنتا ہے۔ نفسی نفسی پڑ گئی بھگوڑوں کے ساتھ مظفر خاں بھی یہ جا وہ جا چھو ہو گیا۔

اور دراصل بات کچھ بھی نہ تھی۔ میرزا خاں نے جنگ سے پہلے اپنے ایک امیر خواجہ نظام الدین نامی کو تھوڑی سی فوج دے کر بھیج دیا تھا کہ جس وقت لڑائی ترازو کی تول ہو، کا وا دے کر دشمن پر ٹوٹ پڑنا۔ یہ حکمت ایسی کارگر ہوئی کہ دشمن کی فتح شکست کی صورت میں بدل گئی۔

اس فتح کی خوشی میں میرزا خاں نے اپنا سارا مال واسباب فوج میں تقسیم کر دیا اور اس دریا دلی سے کہ آخر میں صرف قلمدان رہ گیا تھا وہ بھی ایک سپاہی کے حوالے کر کے ہاتھ جھاڑ کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔

بات میں بات نکلتی ہے۔ جب فتح گجرات میں تاخیر ہوئی تو بیرم خاں کی مخالف جماعت والوں نے دربار میں شوشے چھوڑنے شروع کیئے۔ نہ جانے جہاں پناہ کی بھی کیا مرضی ہے۔ جہاں ایک چھوڑ دو دو بڈھے سپہ سالار بھی کچھ نہ بنا سکے وہاں ایسے نوخیز خوش رُو نوجوان کو بھیج دیا جو دربار کی زینت اور مجلسوں کی رونق ہے۔

ان رموز پر بیرم خانی امرا خون کا سا گھونٹ پی کر رہ جاتے۔ جہاں پناہ خاموش ہو رہتے۔ مخالفوں کی زبان بند نہ ہوتی آخر جہاں پناہ تنگ آ گئے۔ قلعۂ الہ آباد کا سنگ بنیاد رکھ کر جلد جلد پلٹے تاکہ دارالسلطنت ہوتے ہوئے گجرات پر یلغار کریں۔ ابھی کوڑا گھاٹم پور تک ہی پہنچے تھے کہ پرچہ لگا "فتح گجرات"

اس خبر مسرت اثر سے آں بدولت بہت محظوظ ہوئے۔ میرزا خاں کو اُس کے موروثی خطاب "خانِ خاناں" سے سرفراز کیا اور فرمانِ خوشنودی نافذ فرمایا۔

احمد آباد سے کھیت چھوڑ کر مظفر خاں نے پہاڑوں میں پناہ لی۔ اور بعجلت تمام سامانِ جنگ کرنے لگا۔ اِدھر اُدھر کے چھٹے بٹے بٹور نے شروع کئے۔ لیکن خانِ خاناں کہاں دم لینے دیتے تھے۔ قضا کی طرح اُس کے سر پر جا پہنچے۔ لوہے سے لوہا بھڑ گیا۔ بلا کا رن پڑا۔ خوب خوب حوصلے نکلے۔ مظفر خاں زمین پکڑ گیا۔ ہلائے نہ ہلے۔ مضبوطی سے جما ہوا تھا۔ جس وقت خانِ خاناں نے فیلی توپ خانہ کو اشارہ کیا، پہاڑ پر کالی آندھی چڑھی، تو میاں مظفر ہوا ہوئے۔ کوہ و دشت میں اکبری فتح کے نعرے گونجنے لگے۔

کم وبیش ایک سال کے عرصہ میں خانِ خاناں نے ملک کا بندوبست کر لیا۔ آس پاس کے چھوٹے بڑے مطیع ہو گئے۔ حتیٰ کہ امین خاں غوری والیٔ جوناگڑھ بھی دوست بن گیا۔

۹۹۲ھ میں سن گن پہنچی کہ مظفر خاں نے پھر کچھ بدنظمی پھیلانی شروع کی اور لوٹ مار میں مصروف ہے۔ انہوں نے اُس پر چند امرا تعینات کر دیئے وہ اُسے جابجا بھگائے بھگائے پھرتے تھے ایک دن نواگراؤں کے راجہ جام نے خبر دی کہ اس وقت مظفر خاں فلاں مقام پر چھپا ہوا ہے۔ اگر ذرا سی بھی مستعدی سے کام لیا جائے تو یقیناً گرفتار کیا جا سکے۔ خانِ خاناں نے بلا پس وپیش راجہ کے بتائے ہوئے مقام پر گھوڑا ڈال دیا۔ وہاں مظفر خاں کوئی نہ ملا۔ بلکہ قصہ یہ ہوا کہ خانِ خاناں تو اُدھر گئے۔ اِدھر میدان خالی پا کر مظفر خاں نے احمد آباد پر دھاوا بول دیا۔ یہاں خانِ خاناں کے ہوشیار سپہ گر موجود تھے۔ انہوں نے وہ ٹکر لی منہ پھیر دیا۔

واپسی پر خانِ خاناں کو معلوم ہوا کہ بڑی چال چلی گئی۔ مکار جام دونوں طرف ملا ہوا ہے اُس نے ہمیں دھوکا دیا۔ آگ ہی تو لگ گئی۔ غضبناک ہو کر حملہ کر دیا اور راجہ کی راج دھانی نواگراؤں سے چار کوس اوپر پڑاؤ ڈال دیا۔ راجا کو جو اِس حال کی خبر لگی۔ حواس باختہ ہو گیا۔ فوراً اپنے کنور کے ہاتھ "شرزہ" نامی ہاتھی اور بہت سے تحفے تحائف بھیج کر معافی حاصل کی۔

امرائے خاندیس اور حکامِ دکن میں خانہ جنگی شروع ہوئی۔ ۹۹۳ھ میں راجی علی خاں حاکم برہانپور نے دربارِ شاہی میں عریضہ ارسال کیا کہ ایسے میں بڑا اچھا موقع ہے، میدان مار لیا جائے۔ اکبر نے خانِ اعظم کو مہمِ دکن پر مامور کیا اور ایک فرمان خانِ خاناں کو بھی پہنچا یا کہ اس مہم میں خانِ اعظم کی امداد کرو۔ وہ احمد آباد سے اُٹھ کر فتح پور تک گئے تھے۔ کہ مظفر خاں نے احمد آباد پر چھاپا مارا۔ متعینہ امرا بھی گتھ گئے۔ ابھی جھڑپیں ہو رہی تھیں کہ خان خانان دکن جاتے جاتے ایک دم پلٹ کر مظفر کے سر پر آدھمکے اور بھگوڑا مظفر وہ جاتا ہے۔ صاف اُڑ گیا۔ اس کھینچ تان کا نتیجہ یہ ہوا کہ خانِ خانان نے اور بہت سا علاقہ ہتیا لیا۔

متذکرہ بالا وجوہ کے سبب سے خانِ خانان خانِ اعظم کی مدد کو نہ جاسکے اور وہ ناکام پھرے۔ اثنائے راہ یعنی مقام بڑونچ پر اُن کا میل ہوا۔ خانِ خانان نے پرجوش خیر مقدم کیا۔ انتہائی تواضع سے پیش آئے۔ اور ہردو صاحبان میں صلاح ٹھہری کہ فی الحال جنگ ملتوی رہے۔ برسات کے بعد دیکھا جائے گا۔

سنہ ۹۹۷ھ میں خانِ اعظم حاکمِ گجرات کئے گئے اور خانِ خانان کی دربار میں طلبی ہوئی یہاں راجہ ٹوڈرمل کے انتقال کی وجہ سے وکیلِ مطلق کا منصب خالی تھا۔ باپ کے وقت کا گیا ہوا منصب خانِ خانان کو ملا اور جونپور کی جاگیر بھی عطا ہوئی۔ اسی سنہ میں خانِ خانان نے تزکِ بابری کا ترکی سے فارسی ترجمہ کیا اور بارگاہِ شاہی سے خراجِ تحسین و آفرین پایا۔

سنہ ۹۹۹ھ میں ملتان اور بھکر خانِ خانان کی جاگیر ہوئے میرزا جانی حاکمِ ٹھٹھ سے بگاڑ ہوگیا۔ انہیں معلوم ہوا کہ قلعہ سیوان میں جو میرزا جانی کے زیرِ حکومت ہے آگ لگ گئی۔ انہوں نے بڑھ کر قلعۂ مذکور پر محاصرہ ڈال دیا۔ یہ قلعہ آٹھ کوس لمبا اور چھ کوس چوڑا تھا۔ اس کے گرد چالیس گز کی خندق اور سات گز چوڑی فصیل تھی۔ یہاں میرزا جانی سے بڑے بڑے معرکے ہوئے۔ میرزا کے پاس دوسو کشتیاں تھیں اور خانِ خانان کے پاس صرف پچیس لیکن وہ منہزم ہوا۔ اور قلعہ سیوان سے چالیس کوس کے فاصلہ پر جاکر اُس نے دریائے سندھ کے کنارے مقام نالہ کنڈی پر ایک دوسرا مستحکم قلعہ بنالیا۔ خانِ خانان نے وہاں بھی جا گھیرا۔ ادھر ملک میں ایک ہلاکت آفرین بلا نازل ہوئی جس نے سندھیوں کا کھیت کردیا۔ شاہی سپاہ میں کسی کو چھینک تک نہ آئی۔

آدمی کا مقابلہ دوسری بات ہے خدائی غضب سے کون لڑے۔ میرزا جانی مجبور ہوگیا۔ اور عاجزانہ صلح کا پیغام بھیجا۔ وہ صلح نامہ ان شرائط پر منظور ہوا۔ کہ میرزا صاحب قلعہ سیوان اور علاقہ سیوان کے علاوہ بیس جنگی کشتیاں سامانِ جنگ سمیت نذر کریں اور خان خانان کے بڑے صاحبزادے میرزا ایرج سے اپنی دختر کی شادی رچائیں میرزا جانی نے سب کچھ قبول کیا۔ مورچوں کی جگہ برات کے شامیانے نظر آنے لگے۔ دھوں دھاں۔ مار دھاڑ چیخ پکار کے بجائے نغمۂ سرود بلند ہوا۔

سنہ ۱۰۰۲ھ میں برہان الملک فرمانروائے دکن نے انتقال کیا اور اس کا چہاردہ سالہ فرزند جانشین ہوا چونکہ اکبر کے دل میں سنہ ۹۹۳ھ والی ناکامی کھٹک رہی تھی، نیز اسی قسم کے اور بھی کتنے ہی اسباب جمع ہوگئے تھے، لہذا اس مرتبہ خان خاناں کو مہمِ دکن پر مامور کرنا مصلحت جانا۔ انہیں روانہ دکن کیا اور شہزادۂ مراد (جو اس وقت دکن ہی میں تھے) کو فرمان بھیجا کہ خانِ خاناں کا انتظار کرو۔ جب وہ پہنچ جائیں تو ان سے مل کر احمد نگر پر چڑھائی کردینا غرض موصول ہونے

پر شہزادہ صاحب کے مصاحبوں (خاص کر صادق محمد) نے سوچا کہ کانے کے آگے چراغ نہیں جلتا۔ کہیں خان خاناں آ گیا تو اپنے شہزادہ کا رنگ پھیکا پڑ جائے گا۔ ہماری ورنہ رہے گی۔ بس وہیں سے اکھاڑ پچھاڑ شروع کر دی اور اُن کے پہنچنے پر وہ پیچ مارے کہ مجبور کر دیا۔ یہ بیچارے شاہی لحاظ کے سبب سے دم نہ مار سکے حاصل یہ ہُوا کہ بھاری نقصانات اُٹھانے کے بعد چاند بی بی سے صلح کرنی پڑی۔

اور سنئے یہاں تو لحاظ لحاظی ہی میں رہے۔ وہاں چاند بی بی نے کیا تدبیر کی۔ اپنے دیور عادل شاہ کو لکھا۔ اے کیا غضب کرتے ہو۔ کچھ خبر بھی ہے۔ دیکھنا اکبری لشکر کو راہ مل گیا تو اب سے دُور خیر نہیں۔ یاد رکھو آفت ہی تو آجائے گی۔ ایسے جوڑ توڑ لگائے کہ فرمانروایانِ دکن کا ساٹھ ہزار ٹڈی دَل فراہم کر لیا۔ اب تو مجبوری ہوگئی ہر بات کی کوئی حد ہوتی ہے۔ کہاں تک لحاظ کیا جائے۔ خان خاناں کو آبرو کی پڑی۔ شہزادہ صاحب کو شاہ پور میں چھوڑ شاہ رخ میرزا اور راجی علی خاں کو ہمراہ لے بیس ہزار کی جمعیت سے آگے بڑھے۔

۱۷ جمادی الثانی ۱۰۰۵ھ کی صبح کو عادل شاہ کے نائب سہیل خاں حبشی نے نادیرہ کے میدان میں نظام شاہی اور قطب شاہی افواج کے دائیں بائیں بازو پھیلا دیئے اور خود قلبِ لشکر میں نمودار ہو کر لام باندھا۔ ادھر خانِ خاناں کے جانباز بھی مرنے مارنے پر تل گئے۔ ایک پہر دن چڑھے دہانِ توپ سے دکنی پیغامِ جنگ آیا۔

فوجوں کو حرکت ہوئی ہراول سے ہراول ٹکرایا۔ سہیل خاں نے میمنہ میسرہ بڑھا کر فوجِ شاہی کو نرغے میں لے لیا اندھا دھند لڑائی ہونے لگی۔ شورِ قیامت برپا ہُوا۔ اس ہنگامہ میں کسی کو تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ سہیل خانی توپ خانے کا ایک افسر علی بیگ رومی اپنے آدمیوں کی نظر بچا کر آیا اور گھبرا کر کہنے لگا۔ ہٹیئے! جلد ہٹیئے! غنیم نے توپ خانے کا رخ ادھر کر دیا ہے۔ اور عنقریب مہتاب دکھایا چاہتا ہے۔ فوراً دائیں کو ہو رہیئے۔ خان خاناں اُس کے بشرے پر ایک نظرِ عمیق ڈال کر تاڑ گئے کہ یہ جھوٹا نہیں اظہارِ امرِ واقعی کر رہا ہے۔ جھٹ پٹ دائیں کا رخ کیا۔ اور دو سوار راجی علی خاں کی طرف دوڑائے کہ سخت خطرہ ہے۔ جلد جگہ تبدیل کرو۔

خانِ خاناں کا ہٹنا تھا کہ دکنی توپ خانہ کی گرج سے زلزلہ آیا۔ ہر طرف اندھیرا چھا گیا۔ بدبودار تاریکی میں تخفیف ہونے سے پہلے خانِ خاناں اپنے سامنے والی فوج سے دست و گریباں ہوگئے اور چونکہ سہیل خان کو چغتائی سپہ سالار کی تباہی کا یقین آچکا تھا، وہ اُن (خانِ خاناں) کے خیموں کی طرف جھک پڑا اور بے طرح لوٹ مچا دی۔ یہاں تک کہ شام ہو کر سچ مچ کا اندھیرا ہو گیا۔ لوٹ گھسوٹ سے فراغت پا کر اُس نے سوچا اب کون بکھری ہوئی فوج سمیٹے چلو صبح دیکھا جائے گا۔ دن بھر کے مارے دھاڑے ہیں ذرا کمر سیدھی کریں۔ یہ خیال کر کے وہ میدان سے ایک گولی کے

ہٹتے پر نالے کے کنارے جا ٹھیرا۔

خانِ خاناں بھی رہے سہے جاں نثاروں کو لے کر اسی نالے کے کنارے) ذرا دور جا کر توپوں کے تخت اور مگزین کی آڑ میں پناہ گزین ہوئے۔ رات پہاڑ ہو گئی۔ کاٹے نہ کٹتی تھی۔ پچھلا پہرہ ہونے کو آیا پلک سے پلک نہ لگی۔ پھیکی رات میں خان خاناں اور اُن کے ساتھیوں کو کچھ روشنی نظر آئی۔ سب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے۔ خدایا کیا اسرار ہے۔ خبر جو منگاتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہاں تو سہیل خاں توپوں کی آڑ میں پڑا ہوا ہے اور اس طرف توپوں کے دہانے ہیں۔ آفرین ہے اس دلیری کو۔ خانِ خاناں نے جھٹ پٹ دکنی توپوں کے دہانے پھیر کر مہتاب دلوا دی۔

ارے! یہ کیا؟ سہیل خانی دستے میں گڑبڑ مچ گئی۔ الٰہی یہ پچھلی رات غیبی گولا کہاں سے گرا۔ اب کس سے جما جاتا تھا۔ اکھڑے اور بری طرح اکھڑے۔ ادھر خان خاناں نے فتح کے شادیانے بجوا دیئے۔ وہ شاہی سپاہی جو جان کے ڈر سے جھاڑ جھنکاڑ، غاروں، کڑاڑوں میں دبکے بیٹھے تھے جی گئے۔ ایک دم فتح کے نعرے لگاتے ہوئے دوڑے۔ دستے پہ دستہ جمع ہونے لگا۔ متواتر گیارہ مرتبہ قرنا پھنکی اور خان خاناں کے جھنڈے تلے کافی جمعیت ہو گئی۔ سہیل خاں نے بھی ہاتھ پیر مار کر بارہ ہزار نوجوان اکٹھا کر لیا اور پچھلی رات کے دھندلکے میں تیغ و سناں کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ خانِ خاناں کے بل پر آٹھ پہر کے بھوکے سپاہیوں نے خالی پیٹ وہ ساکھا کیا میدان الٹ دیا۔ دشمنوں میں بھاگڑ پڑی، سہیل خاں زخمی ہو کر گرا، ادھر سردار کو ہاتھوں ہاتھ اٹھا کر دکنی فرار ہوئے اور خان خاناں کی فتح ہو گئی سنا جا رہا تھا۔ راجی علی خاں بھاگ گیا۔ تلاش پر معلوم ہوا افواہ غلط تھی۔ نہیں نہیں وہ جانباز تو جس جگہ سے خانِ خاناں ہٹے تھے۔ وہیں ۳۵ سردارانِ نامدار اور پانچ سو غلامانِ وفاشعار کے جمگھٹ میں پڑا ہمیشہ کی نیند سو رہا تھا وہیں راجہ رام چندر کی بھی لاش تھی۔

جب شہزادہ مراد کثرتِ شراب نوشی سے نامراد جوانا مرگ ہوا تو شہنشاہ نے شہزادۂ دانیال کی شادی جاناں بیگم (خانِ خاناں کی صاحبزادی) سے کر دی۔ اور لشکرِ عظیم و سامانِ وافر دے کر اُسے خانِ خاناں کی سرپرستی میں دکن کو روانہ کیا۔ انہوں نے پہنچتے ہی احمد نگر کو محصور کر لیا۔ ہرچند کہ قلعہ مضبوط تھا لیکن دکنیوں میں افراتفری پھیل چکی تھی۔ معاملات پر نظر ڈال کر چاند بی بی نے اپنے وزیر سے کہا، خدا خیر کرے آثار اچھے نہیں۔

یہ خبر کہیں چیتا خاں تک پہنچ گئی۔ غضب ہو گیا۔ اُس نے دوسرے دکنی سرداروں کو چاند بی بی کے خلاف اکسایا۔ خبردار رہنا! یہ بیگم اکبری سپاہ سے ساز باز کر رہی ہے۔ اس کے کہنے پر چلے تو ٹھکانا نہ لگے گا۔ سردار چیتا خاں کی بولی میں آ گئے۔ چاند بی بی ناحق شہید کر دی گئی۔ اور اس پھوٹ کے طفیل حاصل یہ ہوا کہ ہزاروں دکنی تلوار کے گھاٹ اُترے

چیتا خاں کام آیا اور جس لڑکے کو نظام الملک بہادر شاہ بنایا گیا تھا گرفتار ہو کر خانِ خاناں کے ذریعہ سے برہان پور میں شہنشاہ کے حضور پیش کیا گیا۔

اس طرح خانِ خاناں نے بتدریج دکن کا بہت سا حصّہ مسخر کر لیا۔ جب بندوبست سے فارغ ہوئے تو سنہ ۱۰۱۲ھ میں انہیں دربار میں طلب کیا گیا۔ صوبہ جاتِ برہان پور، احمد نگر، برار شہزادۂ دانیال کی حکومت میں آئے اور خانِ خاناں اُس کے اتالیق مقرر ہوئے۔

# دورِ جہانگیری

شہزادۂ سلیم شہنشاہِ جہانگیر بن کر تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ خانِ خاناں برہان پور تھے۔ انہوں نے اشتیاقِ آستاں بوسی کا ایک عریضہ ارسالِ دربار کیا اور منظور ہوا۔ چونکہ ایک زمانے میں وہ شہنشاہ کے اتالیق رہ چکے تھے لہٰذا جانبین میں ایک خاص ارتباط ہونا لازمی تھا۔ جہانگیر اپنی تزک میں لکھتا ہے جس وقت خانِ خاناں باریاب ہوئے ہیں اُن پر وارفتگیٔ شوق میں کچھ عجیب رقت کا عالم طاری تھا۔ آتے ہی زمین پر بکھر گئے۔ جہانگیر نے انہیں اٹھا کر سینے سے لگایا۔ سر پر ہاتھ پھیرا۔ چہرہ کو بوسہ دیا۔ انہوں نے دو تسبیحیں پیشکش کیں اور چند قطعہ لعل و زمرد نذر گذرانے تین لاکھ کے تھے۔ این جانب نے انہیں چند روز مہمان رکھ کر اُن ہی کی درخواست کے مطابق مہمِ دکن پر مقرر کیا اور منصبِ دیوانی سے وزیر الممالک کا خطاب دیا۔ بیس ہزار سوار اور لکھو کھا روپیہ نقد بخش کر رخصت کیا۔

سنہ ۱۰۱۷ء میں جہانگیر نے شہزادۂ پرویز کو دو لاکھ کا خزانہ۔ تین سو گھوڑا خاصہ۔ دس ہاتھی اور بہت سے بیش بہا جواہرات عطا فرمائے۔ پھر سیف خاں بارہہ کو اُس کا اتالیق مقرر کر کے خانِ خاناں کی کمک کے لیئے دکن بھیجا۔ لیکن چونکہ ابھی اُن کا آغازِ شباب تھا، وہ دنیا کے نشیب و فراز لڑائی کے رنگ ڈھنگ سے ناآشنا تھے۔ جاتے ہی موسمِ برسات میں دشمن سے لت پت ہو گئے۔ اُن کی ناتجربہ کارانہ جلد بازی کے سبب سے خانِ خاناں کو جنہوں نے کبھی شکست کا منہ نہ دیکھا تھا خفت اُٹھانی پڑی۔ طرہ یہ کہ شہزادہ صاحب نے اپنی بلا ٹالنے کے لیئے الٹی خانِ خاناں کی شکایت ارسالِ دربار کی کہ سرِ عالم (بادشاہ) اِن کے سبب سے سارا کام بگڑ گیا۔ اب یا تو انہیں بلائیے یا مجھے واپسی کی اجازت دیجئے۔

خانِ خاناں نے بھی مزید امداد کے لیئے عریضہ ارسال کیا۔ اس وقت بات ٹال کر انہیں سنہ ۱۰۱۸ھ میں طلب کیا گیا۔ دو سال بعد خانِ خاناں اور اُن کی اولاد کو قنوج اور کالپی کے علاقے جاگیر ہوئے سنہ ۱۰۲۰ھ میں خبر آئی کہ شہزادہ پرویز کا لشکر اور اُس کے امرا دکن میں ٹکریں مارتے پھرتے ہیں مگر بنائے نہیں بنتی۔ جہانگیر کو پھر وہی پرانا سپہ سالار یاد آیا۔ دوبارہ طلب

گیا۔ شش ہزاری منصب ذات وسوار خلعت و اسپ عطا فرمایا۔ داراب اور خواجہ ابوالحسن کو ہمراہ کرکے شہزادہ پرویز کے پاس بھیجا۔

اب خدا کے فضل سے خانِ خاناں کے لڑکے بھی اس قابل ہو گئے تھے کہ بڈھا باپ بیٹھا بیٹھا جاگیر کا بندوبست کرتا اور صاحبزادے ملک گیری کرتے پھرتے۔ چنانچہ ۱۰۲۴ھ میں بڑے صاحبزادے میرزا ایرج الملقب بہ شہنواز نے بالاپور میں وہ ساکھا کیا کہ دکنیوں کا سنہراؤ کردیا۔ ایسی ایسی جانبازیاں کیں کہ جہانگیر کے دل پر نقش ہو گئیں۔ یوں کہئے کہ خانِ خاناں مع بال بچوں کے آں بدولت کے منظورِ نظر ہو گئے۔ یہاں تک خاطر ملحوظ ہوئی کہ ۱۰۲۶ھ میں شہزادہ خورم (جنہیں شاہجہان خطاب عطا ہوا) کو جب برار اور احمد نگر جاگیر کیا تو دربار میں طلب کرکے شہنواز کی بیٹی (خانِ خاناں کی پوتی) سے اُس کا عقد بھی پڑھوادیا۔

۱۰۳۱ھ میں شہزادہ خورم (شاہجہاں) اور نورجہاں بیگم کے درمیان کچھ کھٹک گئی اور جنگ وجدل تک نوبت پہنچی۔ اس موقعہ پر خانِ خاناں نے شہزادے کا ساتھ دیا جس کا حاصل یہ ہوا کہ کچھ دن کے لئے خانِ خاناں کو اپنا رہا سہا خطاب باغی بھی مل گیا۔

بہرحال بڑے کشت وخون اور عبرت ناک نتائج کے بعد صلح صفائی ہوگئی اور ۱۰۳۶ھ میں جب خان خاناں دربار میں بلائے گئے تو وہ بیچارے ناکردہ گناہ غلط فہمی کے ہدف سر جھکائے گردن ڈالے حاضر آستانہ ہوئے اور قدوم شاہی میں سر ڈال کر زار زار رونے لگے۔ جہانگیر نے انہیں اٹھا کر تشفی دی۔ فرمایا گذشتہ را صلواۃ۔ جو ہونا تھا ہوا۔ تم سے زیادہ اس معاملہ میں ایں جانب اپنی ذات کو شرمندہ پاتے ہیں۔ اب ان باتوں کو بھول جاؤ۔ تمہارا خطاب واپس کیا جاتا ہے۔ (جو ضبط کرکے عارضی طور پر مہابت خاں کو دے دیا گیا تھا) آج سے تم وہی خانِ خاناں ہوئے۔ نیز صوبۂ قنوج بھی واپس کیا جاتا ہے۔ تم سے ہم راضی ہمارا خدا راضی۔

واضح ہو کہ شہزادۂ خورم اور نورجہاں بیگم کے معاملہ میں مہابت خاں نے اپنی خودغرضی کے سبب سے الجھنیں بڑھائی تھیں۔ زیادہ دن نہ گذرے تھے کہ نورجہاں بیگم نے برہم ہو کر اُس پر فرمان نافذ کیا کہ حاضر دربار ہو کر اپنی جاگیرات فوج وغیرہ کا حساب دو۔ مہابت خاں چھ ہزار راجپوت تیغ زنوں کی جمعیت سے لاہور پہنچا۔ یہاں خانِ خاناں بھی تھے۔ انہوں نے نہ خود اُس کی ملاقات کی نہ اپنا وکیل وغیرہ اُس کے پاس بھیجا۔ اب تو وہ ڈرا کہ بابا بری گھڑی ہے خدا بچائے۔ خان خاناں ہے۔ نہ جانے کب بندھوالے۔ لاہور سے دبے پاؤں کھسک کر جہلم کی طرف روانہ ہوا جہانگیر گلگشت کشمیر کو جارہا تھا۔ اُس نے جہلم پر راستہ روکا اور قصہ مختصر شہنشاہ اور نورجہاں بیگم کو الگ الگ نظر بند کردیا۔

زیرک اور مدبرہ نورجہاں بیگم نے اپنی حکمت عملی سے کچھ ایسی صورتیں پیدا کیں کہ اُس پر ہیبت چھاگئی اور وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر فرار ہوگیا۔

اب خانِ خاناں نے درخواست کی کہ بندۂ درگاہ کو مہابت خاں پر مامور فرمایا جائے۔بیگم نے اس کی (مہابت خاں کی) جاگیر خانِ خاناں کے نام کی۔ہفت ہزاری، ہفت ہزار سوار، دو اسپہ سہ اسپہ خلعت شمشیر مرصع اور گھوڑا مع زین مرصع سے سرفراز فرمایا۔علاوہ ازیں فیل خاصہ، بارہ لاکھ روپیہ نقد اور بہت سی باربرداری دی اور صوبۂ اجمیر اُن کی جاگیر کرکے رخصت کیا۔

اب خانِ خاناں گھاٹ کنارے آلگے تھے۔سارا جسم گھن چکا تھا۔لاہور میں اُن کی طبیعت ناساز ہوئی۔دہلی پہنچتے پہنچتے سکت نہ رہی وہاں جاکر ۱۰۳۶ھ میں انتقال فرمایا۔انا للہ وانا الیہ راجعون مقبرۂ ہمایوں میں دفن ہوئے۔

## اوصافِ حمیدہ

نواب خانِ خاناں میرزا عبدالرحیم خاں کے مفصل حالات لکھنے کے لئے ایک دفتر درکار ہے اور ان اوراق میں اتنی گنجائش نہیں مجبوراً جستہ جستہ واقعات لکھ دیئے ہیں۔اُن کے فاتحانہ کارناموں کا تو تھوڑا بہت بیان ہوچکا اب ذرا ذاتی اوصاف ملاحظہ فرمائیے۔

نواب خانِ خاناں باوجود ایک اولوالعزم فاتح ہونے کے فنونِ جنگ کی طرح دیگر علوم وفنون میں بھی اچھی دستگاہ رکھتے تھے۔انہیں ترکی، فارسی، عربی۔بھاشا اور سنسکرت پر عبور حاصل تھا۔جہاں انہوں نے سرکشوں کی گردنیں توڑیں، ظالموں کا قلع قمع کیا، اہلِ علم، فقرا، صلحا، اور گوشہ نشینوں کی بھی اعلیٰ پیمانے پر خدمات کیں۔وہ مفلسوں کے داتا اور مظلوموں کے مائی باپ تھے۔بار بار حاجت مندوں کو سونے روپے میں تلوا تلوا دیا۔ذرا ذرا سی بات پر مخلوق کو نہال کردیا۔اُن کے وسیع دسترخوان پر کھانے کی قابوں میں روپیہ اور اشرفیاں چھپا دی جایا کرتی تھیں جس کی بنا پر مثل چلی آتی ہے کہ "خانِ خاناں جس کے کھانے میں بتانا"

جیسا کہ بیان کیا جاچکا ہے ۹۷۳ھ میں شہنشاہِ اکبر نے آپ کو منعم خاں کا خطاب دیا تھا۔ایک مرتبہ آپ آگرہ سے لاہور تشریف لے جارہے تھے۔پہلی منزل پر پڑاؤ ہوا۔سراپردہ کے سامنے والے فرش فروش سے آراستہ شامیانے میں کرسی پر بیٹھے مصاحبوں سے باتیں کررہے تھے۔یکایک کسی فقیر کی صدا آئی:۔

منعم بکوہ ودشت وبیاباں غریب نیست     ہر جا کہ رفت خیمہ زد وبارگاہ ساخت

پھڑک گئے۔خزانچی کو حکم دیا۔ دے دو اس فقیر کو ایک لاکھ اشرفی۔ اسی طرح سات روز تک یہی سلسلہ جاری رہا۔ آٹھویں منزل پر فقیر نے خیال کیا۔ زیادہ لالچ بھی ٹھیک نہیں۔کہیں کسی وقت طبیعت حاضر نہ ہوئی اور لیا دیا سب اگلوا لیا تو کیسا ہوگا۔بس سات لاکھ ہی بہت ہیں۔

خانِ خاناں صدا پر کان لگائے بیٹھے رہے لیکن صدا نہ آئی۔مجلس برخاست ہوتے وقت فرمانے لگے آج ہمارا روزوالا فقیر نہ آیا۔نہ جانے اُس نے کیا سمجھا۔ہم نے تو پہلے ہی دن اُس کے نام کی ستائیس لاکھ اشرفیاں الگ رکھوا دی تھیں (آگرہ سے برہان پور ستائیس منزل ہے)

ایک دن خانِ خاناں کی سواری جا رہی تو کوئی بڑھیا آئی۔اور روٹی پکانے کا توا اُن کے بدن پر رگڑنے لگی نوکر چاکر ہائیں! ہائیں!! کرتے دوڑے۔آپ نے انہیں حکم دیا، ان بڑی بی کے برابر سونا تول دو۔انہوں نے کسی سے سنا ہوگا کہ بادشاہوں کے امیر پارس ہوتے ہیں اگر ان سے لوہا چھو جائے تو کندن ہو جاتا ہے۔اس لئے آزماتی ہیں کہ کیا آج کل بھی کوئی ایسا امیر ہے؟

دربار جارہے تھے کہ ایک عجیب الخلقت بانکے سامنے آگئے اور آداب بجا لائے۔واہ کیا شان تھی۔علاوہ دوسرے کیل کانٹوں کے پگڑی میں خیموں کی دو میخیں بھی اُڑسے ہوئے تھے۔دریافت کیا کیا چاہتے ہو؟ جواب دیا، نوکری۔پھر پوچھا یہ میخیں کس مصلحت سے اُڑسی ہیں۔بولے۔ایک میخ اُس آقا کے لئے ہے جو نوکر کو تنخواہ نہ دے۔دوسری اُس نوکر کے واسطے جو تنخواہ لے کر کام چوری کرے۔

خانِ خاناں مسکرائے۔انہیں اپنے ساتھ دربار میں لائے۔پھر پوچھا، کیوں میاں بانکے، انسان کی عمرِ طبیعی کتنی ہے۔انہوں نے جواب دیا جی ۱۲۰ سال۔خان خاناں نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ اِن کی ساری عمر کی تنخواہ بے باق کر دو۔اور فرمایا۔لیجئے میاں بانکے ایک میخ کا بوجھ تو ہلکا کیجئے۔

اس داد و دہش کے سبب دنیا جہان کے علما، فضلا، اور شعرا کا اُن کے دروازے پر ہجوم رہتا تھا۔اُن کی توصیف میں اتنے قصیدے لکھے گئے ہیں کہ شاید اکبر کی ہی مدح میں لکھے گئے ہوں تو لکھے گئے ہوں۔ملّا عبدالباقی صاحب نے مآثرِ رحیمی نامی ایک ضخیم کتاب میں اُن قصائد کو نہایت خوبی سے جمع کیا ہے جس میں مصنفین کے حالات اور وہ تقریبات بھی درج ہیں جن میں یہ قصیدے پیش کئے گئے۔

خان خاناں خود بھی فارسی اور ہندی کے شاعر تھے۔اُن کی ایک رباعی ہے۔

سرمایۂ عمرِ جاودانی غمِ تو ۔۔۔ بہتر ز ہزار شادمانی غمِ تو
گفتی کہ چنیں والہ و شیدا کہ کرد ۔۔۔ دانی غمِ تو گر نہ دانی غمِ تو

علی ہذا القیاس بھاشا میں بھی آپ کا بہت سا کلام موجود ہے جسے دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایک ترک الاصل امیر نے اُس زمانہ میں کہ اسلامی بادشاہت تھی، بھاشا پر کیونکر اتنا عبور حاصل کیا۔

فرماتے ہیں:۔

رحمن چپکے ہوئے رہو دیکھ دِنن کو پھیر — جب دن نیکے آئے ہیں بنت نہ لاگی بیر

رحیم گردشِ ایام پر نظر ڈال کر خاموش ہو رہ — جب اچھے دن آئیں گے تو فضل ہوتے دیر نہ لگے گی

کاگج تھوڑو بہت گھنو کیسے لکھوں بنائے — ساگر میں جل بہت ہے گاگر میں نہ سمائے

غم بہت ہے کاغذ تھوڑا۔ آہ کیوں کر لکھوں — دریا میں پانی بہت ہے کوزہ میں نہیں سما سکتا

کھیرے کو مکھ کاٹ کیں دیتے لون لگائے — رحمن کڑوے مکھ کوں چہئیے یہی سزائے

کھیرے کا منہ کاٹ کر نمک لگاتے ہیں — رحیم منہ پھٹ بدزبانوں کو ایسی ہی سزا دینی چاہئیے

خلاصہ یہ کہ میرزا عبدالرحیم خاں کمالاتِ انسانی کا مکمل نمونہ تھے۔ اُن کی کون کون سی خوبی بیان کی جائے۔ جس وقت اُن کے جملہ اوصاف کو ملحوظ رکھ کر تاریخی دُوربین سے نظر دوڑاتا ہوں تو آبائے محترم میں نوابِ خانِ خاناں کا سا ہمہ صفت موصوف امیر کسی کے پاس نہیں پاتا ہُوں۔

میرزا فہیم

# رُباعیات

در عالمِ خار و گل بسے خوار شدیم — در ہر چہ شدیم سخت بیزار شدیم

فرعون شدیم غرقہ گشتیم بہ نیل — منصور شدیم بر سرِ دار شدیم

---

گل را کہ بقائے او دریں عالمِ رنگ — ہر چند کہ نیست خار با او در جنگ

بلبل کہ نہ کرد در جہاں جز نالہ — بیچارہ شدہ ز دستِ صیاداں تنگ

توحید ہوشیارپوری

# خیالاتِ پریشاں

نہیں باقی ہے طاقت اب جگر میں شور و شیون کی — الٰہی پھر یہ کیوں رہ رہ کے یاد آتی ہے بچپن کی
وہ امرت جس کو ماں کا دودھ کہتے ہیں کہاں پاؤں — پیا اک گھونٹ تلخی مٹ گئی سب شور و شیون کی
وہ ماں کی گود میں کندھے پہ سر کو رکھ کے سو جانا — نہیں جنّت میں بھی ہیں راحتیں مادر کے دامن کی
ہمک کر آہ وہ آغوشِ مادر سے نکل جانا — کہاں ہے اے دلِ مردہ کشش وہ شمعِ روشن کی
بڑھا کر ہات وہ خوش خوش بلانا پھر مچل جانا — اُترتیں کیوں نہیں اب دل میں کرنیں ماہِ روشن کی
زمیں پر کھیلتے ہی کھیلتے اِک بار سو جانا — وہ راحت اب اگر پہنچائے گی تو نیند مدفن کی
چمن میں تتلیوں کے شوق میں وہ دوڑتے پھرنا — اُلجھ کر خار سے جب دھجیاں اُڑتی تھیں دامن کی
وہ پہروں محو ہو کر کھیلنا کاغذ کی ناووں سے — بہا دیتی تھیں نالے جب گھٹائیں آ کے ساون کی
شبِ تاریک میں جب کوئی جگنو دیکھ لیتا ہوں — جگر میں ہوک بن جاتی ہے حالت دل کی اُلجھن کی
نہ جانا تھا کہ باغِ دہر میں کانٹے بھی ہوتے ہیں — نہ ہونے پائی تھی تمیز ہی کچھ دوست دشمن کی
فریبِ ذوقِ آگاہی نہ کھایا تھا طبیعت نے — نہ کچھ غم آشیاں کا تھا نہ تھی کچھ فکر دامن کی
اُجالا ہی اجالا تھا مرے کاشانۂ دل میں — سحر کی روشنی میں کچھ عجب رونق تھی گلشن کی
وہ معصومی وہ بے فکری وہ ہنستے کھیلتے رہنا — تڑپ اُٹھتا ہوں جس دم یاد آ جاتی ہے بچپن کی

اگر پھر ایک دن مل جائے مجھ کو اُس زمانے کا
رہے شکوہ نہ دل میں کوئی باقی غم اُٹھانے کا

# خیالات

خدا کی طاقت اظہار میں ہے آدمی کی اقرار میں

میں نے گناہ کیا اور میری ساری طاقت سلب ہوگئی

ننھے بچے کا شیریں تبسم نوعِ انسان کی خوشیوں کا منتہائے کمال ہے

کبھی دو گھڑی دنیا کے جھگڑوں سے دل کو پاک بھی رکھ

میں نے خوب غور کیا ہے کہ ہر شخص اپنے اپنے طریق میں خودغرض و خودبین ہے۔ ہاں کوئی زیادہ کوئی کم

کچھ میں ایسا برا نہیں بلکہ دوسروں کی برائی مجھے نیک راہ سے بھٹکاتی رہتی ہے۔

جب میں کسی سے سچے دل کے ساتھ نیکی کرنے لگتا ہوں تو میں شرما جاتا ہوں

دوستی غرض پر مبنی ہے محبت احساس پر

جو چیز حد سے بڑھی نظروں سے گر گئی۔ عیش و عشرت خوشی سکون سب کا یہی حال ہے۔ صرف نیکی کی کوئی حد نہیں

بحث مطالب کو واضح نہیں کرتی بلکہ عموماً اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتی ہے

باغبان

# نفع نقصان برابر

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ کسی شے سے ڈرنا بزدلی کی علامت ہے۔ لیکن میرے خیال میں فرقۂ اناث سے خوف کھانا بزدلی نہیں۔ ہر ایک ذی روح فطرتاً اُس چیز سے ڈرتا ہے جس کی ماہیت وہ سمجھ نہیں سکتا۔ شیر بزدل نہیں لیکن آگ سے ڈرتا ہے۔ موجودہ زمانے میں سائنس نے خاک و آتش ہوا اور پانی یعنی عناصرِ قدیم کا شیرازہ بکھیر دیا۔ لیکن زنانہ مزاج وہ مرکب ہے جس کے عناصر کی دریافت نہ ہو سکے گی۔ اس لئے ......

میرا دوست ناظم بھی اسی خوف کے سامنے لاچار ہے گو اور تمام معاملاتِ دنیوی میں خصوصاً جہاں کہیں سچائی یا دیانت داری کا سوال پیش ہو نہایت دلیر اور بے خوف واقع ہوا ہے اور بلا کا ذکی الحس ہے۔ اس ضمن میں مجھے اُس کے زمانۂ طالب علمی کا ایک واقعہ یاد ہے کہ اُس نے ولایت سے بوٹ منگائے جن میں دوکاندار کی غلطی سے ایک پیر آٹھ نمبر کا اور دوسرا نو کا آگیا۔ ماشاءاللہ پیر کا ناپ اُس وقت بھی نو سے بڑھتا ہوا ہی تھا چونکہ دام کافی خرچ ہو چکے تھے استعمال لازمی تھا کبھی کبھی پہن لیا کرتا۔ دوست احباب مذاق بھی کرتے۔ ایک روز اتفاق سے ناظم وہی بوٹ پہنے تھا۔ باغ میں بہت سے دوست جمع تھے فوٹوگرافر سے سب کا یکجائی گروپ بنوانے کی تجویز ہوئی۔ ناظم نے شمولیت سے انکار کر دیا اور جب اصرار ہوا تو لال پیلا ہو کر کہنے لگا کیا تم چاہتے ہو کہ میرے بُوٹ کی یادگار ہمیشہ کے لئے قائم ہو جائے! اس پر فرمائشی قہقہہ پڑا۔ دوسرے ہی دن بیس روپے کے بوٹ اُس نے پانچ روپے میں نیلام کرا دیئے۔

غرض یہ کہ ایک تو کسی قسم کی بدنامی اور دوسرے فرقۂ اناث سے عموماً اور اُس کے اجنبی افراد سے خصوصاً وہ بہت گھبراتا تھا۔ اس لئے جب کوئی محترمہ حسب اتفاق اپنی سہیلی یا ہمجولی منہ بولی دختر یا ہمشیرہ وغیرہ وغیرہ یعنی بیگم ناظم کو ملنے کے لئے آنے کا ارادہ ظاہر کرتیں ناظم کسی بہانے سے اِدھر اُدھر سٹک جایا کرتا۔ اور کاروبار کا عذر پیش کر کے کسی دوست کے یہاں وہ دن گذار دیتا۔

قسمت بھی بعض اوقات سیدھے سے سیدھا چلنے والوں کے راستے میں ایسا روڑا اٹکاتی ہے کہ اس سے بچاؤ کی کوئی صورت نہیں بن پڑتی۔ کرسمس کے دن تھے اور بمبئی میں بے انتہا رونق کہ بیگم ناظم کی ایک قریبی عزیزہ کے ــــــ عورتوں کے رشتے اُن کے مزاج کی طرح اس قدر پیچیدہ ہوتے ہیں کہ اُن کو سمجھنے کی کوشش کرنا بے کار ہے ــــــ چند روز کے لئے تشریف لانے کی خبر ملی۔ ناظم نے اپنا بستر اور سوٹ کیس گاڑی میں رکھوایا اور بیوی سے یہ کہہ کر کہ "تار آیا

ہے کپڑے کی تجارت میں بہت کچھ اُتار چڑھاؤ ہوگا۔ میرا جانا ضروری ہے۔ غالباً چار پانچ روز میں واپس آجاؤں گا"
گھر سے روانہ ہوا اور بمبئی میں میرے یہاں آکر مقیم ہوگیا۔ ہمیں بھلا ناظم اور وہ بھی اس طرح کھلے بندوں مل جائے ہماری
عید ہوگئی۔ دن کو اِدھر اُدھر سیر و تفریح رات کو سینما، تھیئیٹر یا دل بھر کے فونوگرافی۔ اُس کی عزیزہ کو دعائیں دینے لگے۔

ایک انگریزی دوکان پر کرسمس بازار لگ رہا تھا۔ فروختنی اشیا کے ساتھ قسمت کے کھیل یعنی انواع واقسام کی فیشن ایبل قمار بازی کا سامان بھی تھا۔ اور اسی سلسلے میں ایک لاٹری تھی جس کے ٹکٹ کی قیمت دو روپے اور اول انعام ایک ہزار روپیہ تھا۔ چونکہ لاٹری کا نتیجہ اُسی روز نکلنے والا تھا ہمیں بھی شوق چرایا۔ ناظم منظور اور ہم تینوں نے ایک ایک ٹکٹ خرید لیا اور آپس میں حصہ داری کی ٹھہرالی کہ اگر ہم میں سے کسی کو انعام ملا تو تینوں تقسیم کرلیں گے شام کے وقت جب چٹھیاں نکالی جانے والی تھیں وہاں جاکر بیٹھ گئے۔ اتفاق کی بات پہلا انعام ناظم کے نام نکلا ہم بہت اچھلے کودے۔ تین سو تینتیس روپے پانچ آنے اور چار پائی ہر ایک کے حصے میں آئے۔ اس موقع پر خوشی منانے کے لئے گرینڈ ہوٹل میں جاکر بڑی شان سے کھانا کھایا۔ الفریڈ کمپنی کا تماشہ درجہ خاص الخاص میں بیٹھ کر دیکھا اور مکان پر آکر سو گئے۔

عاملانِ قضا و قدر کو بھی خدا جانے نیند نہیں آتی یا اُن کے آرام فرمانے کا کوئی اور وقت مقرر ہے۔ ہم ابھی تمام دروازے بند کئے دن کو رات بنائے عیش کے ساتھ خراٹے ہی لے رہے تھے کہ صبح کے اخبار نئے کاغذی پیرہن کی سندار خوشبو لئے ہوئے نکلے اور اپنی چکنی چپڑی سیاہ زبان سے شہر بھر میں منادی کردی کہ "ہندوستان کلاتھ ایجنسی کے مالک مسٹر محمد ناظم کے نام ایک ہزار روپے کی لاٹری نکلی"۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ "وہ مع اپنے احباب کے لاٹری نکلنے کے وقت حاضرین میں موجود تھے"۔

اب بیگم ناظم کی عزیزہ محترمہ صرف حد درجہ پابندِ صوم و صلوٰۃ ہی نہیں تھیں بلکہ اس قسم کے کھیلوں سے جن میں شرط یا جوئے کا نشان تک بھی ہو سخت عداوت رکھتی تھیں۔ اور لاٹری تو کجا بنک میں روپیہ رکھنے یا دکانداری میں لین دین تک کو اپنی اصطلاح میں "حرام کھانے" سے تعبیر کیا کرتیں۔ وہ دن تو بخیر و خوبی گذر گیا اور لاعلمی نے ہمارے رنگ میں بھنگ کی آمیزش نہ ہونے دی لیکن تابکے۔ دوسری صبح کو ناظم کے نام دو خط موصول ہوئے جو اُس کی دوکان کے پتہ پر لکھے گئے تھے۔ جب کبھی وہ شہر سے باہر جایا کرتا تو اپنی نقل و حرکت کی اطلاع دوکان پر دے دیا کرتا تاکہ ڈاک جہاں بھی وہ ہو وہاں بھیج دی جایا کرے اس دفعہ دوکان والوں کو خاص ہدایات تھیں کہ کسی کو یہ نہ بتایا جائے کہ ناظم بمبئی ہی میں موجود ہے صرف خط وغیرہ میرے یہاں بھیج دیئے جائیں۔

اُس نے ہنستے ہنستے پہلے وہ لفافہ کھولا جس پر اُس کی بیگم صاحبہ کے ہاتھ کا پتہ لکھا ہوا تھا لیکن پڑھنا شروع کیا ہی تھا کہ ہنسی مبدل بہ دمِ سرد ہو کر رہ گئی - دریافتِ حال پر معلوم ہوا کہ تحریر تو بیگم صاحبہ کی ہے لیکن مضمون سے کسی اور کی شوخیٔ تحریر کا پتہ چلتا ہے "کیا یہ سچ ہے کہ آپ بمبئی ہی میں ہیں؟ گھر میں کیا حسبِ منشا کھانا نہیں ملتا تھا؟ اور علانیہ قمار بازی بھی شروع کر دی ہے - یہاں تک کہ آپ کا نام اس سلسلے میں بڑی عزت کے ساتھ اخبارات میں آنے لگا ہے ـــــــ اور وہ احباب کون ہیں جو اِس قسم کے جلسوں میں آپ کے ساتھ شریک ہوتے ہیں؟ ایک نو وہ ہونگے نا جنھوں نے اپنا کالا علم پڑھا کر بجائے بھلے آدمیوں کی طرح نشست گاہ میں بیٹھنے کے اندھیرے میں روپے کو پانی کے ساتھ بہاتے رہنے کی ترغیب دی ہے - اور ایک وہ ـــــــ "

غرضکہ ایسے ایک دو نہیں بلکہ چار صفحے پُر تھے - جُوں جُوں ناظم پڑھتا جاتا اُس کے چہرے کی رنگت میں سفیدی بڑھتی جاتی اور برف میں رکھ دینے سے تھرمامیٹر کے پارے کی طرح ہمارے دل بھی بیٹھے جاتے تھے، کیونکہ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ناظم ہماری سوسائٹی کا روحِ رواں ہے، اور جب اُس کے دل پر کسی فکر کا بار ہو تو وہ نہ ہونے کے برابر ہو جاتا ہے -

خط کے اختتام پر ہم تینوں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے اور ہماری حالت ایسی ہو گئی جیسی بچوں کی ہوتی ہے جب وہ کوئی معصومانہ شرارت کر رہے ہوں اور اُستاد کی غصہ بھری دھمکی کی آواز دُور سے سنائی دے - دو تین منٹ کے وقفہ کے بعد ناظم نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور دوسرے لفافہ کو اٹھا کر کھولا - رسم الخط کے بڑے بڑے نتناسب حروف راقم کے "کشادہ" مزاج کا پتہ دیتے تھے لیکن کاغذ کے بے جا استعمال سے جس پر فی صفحہ بمشکل تین چار سطور تھیں لاپروائی کا اظہار ہوتا تھا - جس نے ایک مرتبہ بھی اُن کے طرزِ تحریر کو دیکھا ہے وہ بے دریغ کہہ سکتا تھا کہ خط لطیف صاحب کا ہے -

لطیف صاحب رشتے میں ناظم کے ماموں زاد بھائی ہیں اور عمر میں چار پانچ سال کم - عام طور پر نہایت شستہ مزاج، گو قدرے ضرورت سے زیادہ بے تکلف معلوم ہوتے ہیں - اور اپ ٹو ڈیٹ فیشن کے دلدادہ - لیکن گاہے گاہے کسی مرض کے دورے کی طرح اُن کی طبیعت میں ایک تبدیلی سی واقع ہو جایا کرتی ہے اور اس حالت میں اُن کے عزیز اور احباب جانتے ہیں کہ اُن سے کچھ بھی سرزد ہو جانا بعید از قیاس نہیں - خصوصاً اُن دنوں میں گھر سے کئی کئی دن غائب رہنا معمولی بات تھی اور واپس آنے سے کچھ عرصہ بعد ایامِ بے مہاری کے واقعات اپنے بے تکلف احباب میں نہایت فخریہ انداز سے مزے لے لے کر بیان کیا کرتے - سب سے عجیب بات یہ ہے کہ شکل و صورت تراش خراش قد و

لباس میں ناظم سے اس قدر مشابہ ہیں کہ بعض اوقات نزدیک ترین عزیزوں کو نیم اندھیرے یا پشت کی طرف سے دیکھنے پر لطیف کے ناظم اور ناظم کے لطیف ہونے کا شبہ ہو جاتا ہے۔

خط میں جو پونا سے حوالۂ ڈاک کیا گیا تھا حسبِ معمول گردشِ ایام کی شکایت تھی جو لطیف صاحب کو وقتاً فوقتاً پیدا ہو جایا کرتی حالانکہ انہیں گھر سے اخراجات کے لئے کافی روپیہ ملتا تھا۔ ان مواقع پر وہ ہمیشہ ناظم ہی کی طرف رجوع کیا کرتے کیونکہ تعلقاتِ دیرینہ کی بنا پر اُس کو اپنی عارضی مشکلات کا "مشکل آسان" بنا لیتے۔ مشکل نہ تھا۔ خط کے اختتام پر منظور بول اُٹھا اور اس طرح جیسے یک لخت کوئی نادر چیز ہاتھ آگئی ہو ــــــــ

"ارے یار! بات تو سنو! مجھے ایک تجویز سوجھی ہے۔ لیکن واللہ بہت قیمتی تجویز ہے۔ ہاتھ لاؤ!"

ناظم نے پھیکی سی مسکراہٹ سے اُس کی طرف ہاتھ بڑھایا اور میں نے کہا "ہاں کہو تو!"

"لطیف کو یہاں بلا لو اور تم پونا چلے جاؤ۔ وہاں سے بیوی کو لکھ بھیجو کہ تم نہیں تھے لطیف تھا۔ اخبار کے نامہ نگار کو غلط فہمی ہوئی۔ ہم دونوں گواہی دے دیں گے۔"

ناظم نے پوچھا "اور وہ مانیں گی کیسے؟"

"مانیں گی کیوں نہیں؟ وہ جانتی ہیں ہمیشہ لوگوں کو دھوکا ہو جاتا ہے۔ لاٹری کے ٹکٹ پر تو نام تھا نہیں صورت پہچان کر اخبار والوں نے لکھ دیا ــــــــ"

ناظم نے اطمینان بھرے انداز سے میری طرف دیکھ کر کہا "بات تو ٹھیک ہے۔"

غرض کہ اس تجویز پر فوراً عمل درآمد کر دیا گیا۔ لطیف کو بلانے کے لئے تار دے دیا اور منظور نے اور میں نے طے کر لیا کہ اُس کے آتے ہی سمجھا بجھا کر اُسے ناظم کے گھر بھیج دیں گے تاکہ وہاں جا کر خود ہی لاٹری میں سے روپیہ جیتنے کی کہانی سنائے۔ ناظم پونا سے جا کر اپنی بیوی کو نیم ناراضگی کا خط لکھے کہ میں تو پونا میں بیٹھا ہوں، تمہیں معنت میں شبہات ہو رہے ہیں۔ جیتے ہوئے روپے میں سے کچھ حصہ لطیف سے یہ تو کیا اس سے بہت زیادہ اہم جھوٹ بلوا سکتا تھا۔ ہم سب کو اطمینان ہو گیا۔ ناظم اُسی شام کو پونا روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں لطیف کے آنے کا انتظار کرنے لگے۔

اس تمام کارروائی کی ضرورت اس لئے محسوس ہوئی کہ جیسے میں پہلے کہہ چکا ہوں۔ ناظم بے حد ذکی الحس واقع ہوا ہے اور کسی آئندہ موقع پر کنبے کی عورتوں کا عزیزہ مذکور کی سرکردگی میں اُس پر علانیہ جوئے بازی کا الزام لگانا اُس کے لئے سخت تکلیف دہ خیال تھا۔ اب تو چونکہ ان واقعات کو ایک عرصہ گذر چکا ہے جب کبھی ذکر آتا ہے ہم سب ناظم اور لطیف کی معیت میں دل کھول کر ہنستے ہیں لیکن اُس وقت ناظم نہایت پریشان تھا اور لطیف پر جو اب ایک نہایت

ثقہ دنیا دار ہے شروع جوانی کی دیوانگی سوار تھی۔

ناظم پونا کے اسٹیشن پر ریل سے اُتر کر باہر نکلا ہی تھا کہ ایک کرائے کی گاڑی والا نہایت بے تکلفانہ انداز میں مسکراتا ہوا آیا اور اُس کا بیگ اور بستر قلی سے لے کر ساتھ ہولیا۔ ناظم کو حیرت ہوئی اور کچھ پوچھنا چاہتا تھا کہ گاڑی والا خود بخود باتیں کرنے لگا "ہم تو سمجھے تھے کہ اب آپ سے ملاقات نہ ہوگی۔ آپ ایسے خوش طبع مہربان کم ملتے ہیں سیٹھ فرامجی پوچھ رہے تھے اور میم صاحبہ نے بھی بنگلے پر بلا کر دریافت کیا لیکن کچھ پتہ ہوتا تو بتاتے۔ یہی کہہ دیا کہ ہمیں معلوم نہیں ........"

ناظم وہیں ٹھہر گیا۔ اُس کی عادات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کوئی ضروری بات یاد آجائے یا کسی سے بحث چھڑ جائے تو سڑک ہو خواہ بازار راستہ چلتے چلتے مخاطب یا متکلم کے کوٹ کی آستین یا بٹن پکڑ کر وہیں جم جاتا ہے۔ اور جب تک بات ختم نہ کرلے نہیں ہلتا۔ چنانچہ اس دفعہ بھی اُس نے یہی کیا اور سخت حیرت میں گاڑی والے سے پوچھنے لگا "کیا خرافات بک رہے ہو؟ کون فرامجی اور کیسی میم صاحبہ؟ تم ہوش میں ہو؟"

اُس نے نہایت اطمینان سے مسکراتے ہوئے آنکھ مار کر جواب دیا "واہ صاحب واہ! ابھی سے بھول گئے یا ہم سے مذاق کرتے ہو؟ وہی سیٹھ فرامجی ناجن کی دکان پر رنگین شربت کے گلاس اُڑا کرتے تھے۔ اس بات کو ہم کبھی نہیں بھولیں گے۔ بھلا آپ کی صورت پر مغالطہ ہوسکتا ہے؟ لاحول ولا ہم تو آپ کو دس ہزار آدمی میں پہچان لیں"

ناظم اور بھی پریشان ہوا "لیکن بھلے آدمی میں تو چھ ماہ کے بعد پونا آیا ہوں اور ابھی ریل سے اترا ہوں۔ تم کب کا ذکر کرتے ہو؟" اُس کے چہرے پر مسکراہٹ کا نام نہ تھا۔ گاڑی والا بھی اب قدرے برہم ہونے لگا۔

"اجی صاحب کل دوپہر تک تو آپ یہیں تھے۔ ہفتہ بھر تک برابر میری گاڑی آپ کی سواری میں رہی ہے آپ نے کہا تھا کہ اکٹھا کرایہ دے دیں گے۔ کل مجھے اسٹیشن کے عقب میں گلی کے کونے پر چھوڑ کر چلے گئے۔ میں نے وہاں دو گھنٹے انتظار کیا اور پھر ہوٹل میں کل بھی اور آج بھی دریافت کیا لیکن آپ نہیں ملے تو میں سواری کی تلاش میں اسٹیشن پر آگیا۔ اگر اس طریقے سے آپ اتنے دنوں کا کرایہ بچانا چاہتے ہیں تو یہ نہیں ہوسکے گا۔ آپ تسلی رکھیں۔ آپ کی ایک کتاب بھی میری گاڑی میں رکھی ہے۔ جو کل لے جانا بھول گئے تھے۔ چلئے میں دکھائے دیتا ہوں"۔

چاروناچار ناظم اُس کے ساتھ ہولیا۔ گاڑی بان نے اسباب رکھ کر گاڑی کی سیٹ کے نیچے سے ایک نئی مجلد کتاب نکال کر اُس کے ہاتھ میں دے دی۔ اس میں خالی ورق تھے لیکن پہلا ورق پلٹنے پر اُسی پر بڑے بڑے حروف والے خوبصورت رسم خط میں شیخ احمد لطیف بمبئی تحریر تھا اور دو روز قبل کی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔

گو ناظم اس طرح بر سرِ راہ ایک معمولی گاڑی والے سے تکرار ہو جانے پر بہت کچھ نادم اور پریشان ہو رہا تھا تاہم اس نام کو دیکھ کر بے اختیار مسکرا دیا۔ گاڑی والا سمجھا کہ دھوکا دینا چاہتا تھا لیکن نہیں چلا تو اب سوائے مسکرانے کے چارہ نہیں رہا۔ اُس نے پھر اُسی بے تکلفی کے انداز میں کہا۔

"اب تشریف رکھئے نا ہوٹل کو لے چلیں۔ ہمیں تو دن بھر میں بیسیوں لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے اگر اپنے خاص مہربانوں کو بھول جایا کریں تو گذارا کیسے ہو"

ناظم نے جھنجھلا کر کہا "اچھا اچھا اب زیادہ باتیں نہ کرو۔ ہوٹل کو چلو۔ میں وہ تو نہیں ہوں جسے تم سمجھے ہو تاہم میں تمہارا کرایہ ادا کر دوں گا" یہ کہہ کر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا اور گاڑی روانہ ہوئی تو اپنی حالت پر پھر ایک بار مسکراہٹ کو ضبط نہ کرسکا۔

ہوٹل پہنچ کر ناظم نے گاڑی والے کو گذشتہ آٹھ دن اور آج کا کرایہ ملا کر چالیس روپے پر بدقت تمام راضی کیا اور اسباب اتروا کر ہوٹل کے دفتر میں اقامت کا انتظام کرنے کی غرض سے داخل ہوا۔ وہاں پولیس کا ایک سب انسپکٹر اور دو سپاہی مینجر سے باتیں کر رہے تھے۔ ناظم کو دیکھ کر مینجر گھبرا سا گیا۔ کھڑا ہو گیا اور بولا۔ لیجئے وہ خود ہی آ گئے" پھر ناظم کو ایک کرسی پر بٹھا کر نیم شرمندگی کے انداز میں کہنے لگا "معاف فرمائیے گا۔ آپ کا چونکہ کل سے پتہ نہ تھا، نہ آپ ہوٹل کے کسی ملازم سے کہہ کر گئے تھے۔ مجبوراً مجھے پولیس کو اطلاع کرنا پڑی۔ گو ہفتہ بھر کا بل ہی تھا تاہم بعض اوقات ہمیں ایسے لوگوں سے سابقہ پڑ جاتا ہے کہ احتیاط کرنا ہوتی ہے۔ آپ کا بکس جو آپ کمرہ میں چھوڑ گئے تھے سب انسپکٹر صاحب نے ابھی ابھی منگوا کر کھولا تو اس میں بھی سوائے چند معمولی کپڑوں کے کچھ نہ تھا۔ اس لئے ... سچ کہنا چاہئے ...... ہمیں تو فکر سی ہو گئی تھی .........."

یہاں بھی وہی ناظم کی لطیف سے مشابہت جس سے ہم فائدہ اُٹھانے کی کوشش کر رہے تھے الٹی نقصان دہ شکل اختیار کر رہی تھی۔ اور اگر ناظم بل کے بہتر روپے کچھ آنے فوراً ادا کر کے مینجر کے دل کو ٹھنڈا نہ کر لیتا تو غالباً اُن دونوں کو اس بات کا یقین دلانا اور بھی مشکل ہوتا کہ وہ لطیف نہیں ناظم ہے۔ آخر کار گو مینجر کی حیرت اور سب انسپکٹر کی بدگمانی کے نشانات اُن کے چہروں پر ابھی قدرے باقی تھے اور ناظم کا چہرہ غصہ اور شرم سے سرخ ہو رہا تھا، معاملہ انجام پا گیا اور لطیف کی طرف سے یہ عذر پیش کر کے کہ اُسے ایک ضروری تار کے ذریعہ سے بمبئی طلب کیا گیا تھا اس لئے غالباً جلدی میں اپنا حساب بیباق کئے بغیر چلا گیا۔ ناظم پیشانی سے ندامت کا پسینہ پونچھتا ہوا دفتر سے باہر نکلا اور اپنے کمرے میں جا کر آرام کرسی پر لیٹ گیا اُس روز پھر باہر نکلنے کی اُسے ہمت نہ ہو سکی۔

دوسرے روز طبیعت قدرے سنبھل چکی تھی۔ شام کے وقت اُسے خیال ہؤا کہ کلب میں جاکر کچھ عرصہ دل بہلائے۔ کمرے میں سے نکل کر آنکھیں نیچی کئے دفتر کے سامنے سے ہوتا ہؤا ہوٹل کے باہر چل دیا۔ کلب پہنچ کر کسی جان پہچان کی تلاش میں اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا کہ ایک خوبصورت بہت لمبی موٹر دروازے پر آکر ٹھہری اور اس میں سے ایک سودیشی یورپین عورت اُتر کر سیدھی ناظم کی طرف آئی۔ ناظم کے چہرے پر شناخت کی کوئی علامت نہ تھی عورت نے حیران ہوکر یہ فقرہ کہا۔

"مسٹر لطیف کیا آپ مجھے نہیں جانتے؟"

ناظم بیچارہ گھبراسا گیا "مجھے افسوس ہے شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی، میرا نام محمد ناظم ہے"۔

میم صاحبہ کچھ رکیں، کچھ سوچا اور پھر قدرے بگڑ کر کہنے لگیں "صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ اب ہم سے گفتگو کرنا ناگوار ہے۔ جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے"۔

ناظم پسینے پسینے ہوگیا۔ اول تو جنسِ لطیف جس سے وہ پہلے ہی بھاگتا پھر رہا تھا اور دوسرے کلب کا موقع جو بازار سے بھی زیادہ "برسرِ راہ" ہونے کی حیثیت رکھتا تھا کیونکہ یہاں صرف معززین ہی آتے تھے اور خدا جانے کن کن کی نگاہیں اُن دونوں پر لگی ہوئی تھیں۔ قریب تھا کہ وہ شاید غش کھا کر جاتا کہ ایک پرانے ملنے والے نے دُور سے آواز لگائی "ہلو ناظم! اِدھر آؤ، جی ہمیں چوتھے آدمی کی ضرورت ہے" لیکن ناظم کے قدم نہ اُٹھتے تھے مبہوت سا کھڑا تھا۔

دوست قریب آیا اور دونوں کو چُپ چاپ دیکھ کر مہذب سوسائٹی کا فرضِ اولیں بجالایا "مسز فوسٹر ناظم صاحب سے ملاقات نہیں ہے کیا؟ آپ کے دوست لطیف صاحب اِن کے ماموں زاد بھائی ہیں۔ مسٹر محمد ناظم۔ مسز فوسٹر"

اب مسز فوسٹر کے چہرے پر بھی شرم (؟) کی سرخی نمودار ہوئی اور اپنی غلط فہمی کی معافی طلب کرتے ہوئے اُس نے ناظم سے ہاتھ ملایا لیکن اُس کی آنکھیں زمین پر ہی گڑی رہیں یہاں تک کہ چند ضابطے کی باتیں کرکے مسز فوسٹر ایک طرف کو چل دی اور ناظم کے دوست نے اُسے تاش کی میز پر لاکر بٹھادیا۔

عام طور پر ناظم نہایت اچھا برج کھیلنے والا ہے اور اُس کا شریک اگر بالکل نابلد نہ ہو تو بہت کم ہارتا ہے لیکن اُس روز خیالات کے ہجوم سے کچھ ایسا بوکھلایا ہؤا تھا کہ دو ہی کھیلوں میں اٹھارہ روپے مدِّمقابل کی نذر ہوگئے۔ اس کے بعد کھیل چھوڑ کر رخصت چاہی تو اُس کے دوست نے کلب کے دروازے تک پہنچا کر دریافت کیا:۔

"آج کیا بات ہے ناظم۔ تم کچھ اُجڑے ہوئے سے کیوں ہو؟"

ناظم نے پہلے اِدھر اُدھر دیکھا اور جب تسلی ہوگئی کہ کوئی شخص قریب نہیں ہے تو حسبِ عادت اپنے دوست

کی آستین پکڑی اور ٹھہر گیا۔" مجھے یہ بتاؤ جمیل کہ یہ بلا کون تھی ؟"

جمیل نے قہقہہ لگایا۔" تو پہلے میرا شکریہ ادا کرو کہ تمہیں اس سے نجات دلائی۔ اور پھر سنو کہ ان کی عمر کسی کو معلوم نہیں۔ ساخت ہندوستانی ہے۔ یوریشین کہلاتی ہیں۔ بیوہ ہیں۔ مالدار ہیں۔ عقد ثانی کی آرزو رکھتی ہیں اور لطیف صاحب سے خصوصیت۔ لطیف صاحب پرسوں سے غائب ہیں اور اب خیال ہوتا ہے کہ شاید یہ بھی ہمارے دوست کے دریائے مزاج کی ایک طوفانی لہر تھی جو آئی اور چلی گئی۔ ورنہ ہم تو سمجھے تھے کہ اُن کی کشتیٔ حیات اس نقرئی بندرگاہ میں ہمیشہ کے لئے لنگرانداز ہو گئی اور اس خوشی میں کلب کی طرف سے ایٹ ہوم کا پروگرام تیار کرنے کی فکر میں تھے ۔"

" یا میرے اللہ !" ناظم کے منہ سے نکلا اور وہ سر پکڑ کر ہال کے بنچ پر بیٹھ گیا۔ " اور یہ مجھے لطیف سمجھے ہوئے تھی ؟" ——

جمیل کا بیان ہے کہ اس سے تھوڑا عرصہ بعد ناظم کے تانگے کا گھوڑا ہوٹل کی طرف سرپٹ جا رہا تھا ——

دوسرے روز خبر ملنے پر منظور اور میں ناظم کے گھر گئے۔ دیکھا تو مردانے میں وہ اور لطیف گنڈیریاں چوس رہے ہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ بیگم ناظم کی عزیزہ رخصت ہو چکی ہونگی کیونکہ کھانے، پینے کا شوق اُسے اُسی وقت ہوا کرتا ہے جب بے فکری ہو۔ اور خاص طور پر گنڈیری تو وہ ایک وقت میں اتنی کھا جاتا ہے کہ دوست اُسے کولھو کے نام سے پکارتے ہیں۔ لطیف حسب معمول زور زور سے ہنس ہنس کر کہہ رہا تھا۔

" ——— میری جیب میں دام ہوتے، تو میں تمہیں کیوں لکھتا۔ اور تمہارے روپے کون سے کمائی کے تھے۔ تمہارا کام ہو گیا میرے بل ادا ہو گئے۔ عوض معاوضہ گلہ ندارد۔"

عطاء الرحمٰن

---

تو اے شیخِ حرم شاید نہ دانی جہانِ عشق را ہم محشرے ہست

گناہ و نامہ و میزاں نہ دارد نہ او را مسلمے نے کافرے ہست

اقبال

# محبّت سے

محبت سے میں اپنی زیست کو زرّیں بناتا ہوں
محبت کے اثر سے زیست کا رُتبہ بڑھاتا ہوں

محبت سے مَیں اپنے دل کو نورانی بناتا ہوں
محبت کی مدد سے اک نئی دنیا بساتا ہوں

محبت کی کہانی دل سے سُنتا ہوں سناتا ہوں
محبت کا سبق خلوت میں پڑھتا ہوں پڑھاتا ہوں

سبھی کے سامنے مَیں پیش کرتا ہوں جو پاتا ہوں
خدا کا نُور دل میں دیکھتا ہوں اور دکھاتا ہوں

مجھے بے تاب رکھتی ہے تمنّا اُن سے ملنے کی
مگر ملنے پہ بھی میں آنکھ کب اُن سے ملاتا ہوں

سرایت کر گئی ہے میری فطرت میں حیا اُن کی
جو خواہش ناروا ہو اُس پہ مَیں خنجر چلاتا ہوں

حقیقت کی طلب ہے مجھ کو دشتِ زندگانی میں
وہ گم گشتہ ہوں میں محبوب کو اپنے بُلاتا ہوں

جُدا کب تک رہیں اے دوست یوں ہم تجھ سے تُو مجھ سے
محبت کی طرف تُو مجھ کو مَیں تجھ کو بُلاتا ہوں

غم و رنج و محن میں حوصلہ اپنا بڑھانے کو
تصوّر میں ترے اشعار اپنے گنگناتا ہوں

نچھاور مجھ پہ کرتا ہے فلک موتی ستاروں کے
جدائی میں تری راتوں کو جب آنسو بہاتا ہوں

مری آواز میں مستور ہے رقّت محبت کی
تڑپ اُٹھتے ہیں اہلِ درد جب میں گیت گاتا ہوں

سکوں کی سرد مہری سے ہے دل ناآشنا میرا
کبھی ہنستا ہنساتا ہوں کبھی روتا رُلاتا ہوں

عجب کیا ہے کہ شب کو خواب میں محبوب مل جائے
یہ کہہ کہہ کر دلِ بیدار کو اپنے سُلاتا ہوں

وہ کچھ کہتا ہوں اُس سے جو کسی سے کہہ نہیں سکتا
مَیں جب اپنے خدا کو اپنی خلوت میں بُلاتا ہوں

محبت کی کہانی ہے بہارؔ اب زندگی میری
محبت کی کہانی اُن سے سنتا ہوں سناتا ہوں

بہارؔ

# اسیرِ قفس

ننھی چڑیا اپنے رنگیں پروں کو پھیلا پھیلا کر ہوا میں پرواز کرنے لگی۔ بہت دن نہیں ہوئے جب وہ بالکل ننھی سی تھی اور اپنے گھونسلے کے تنکوں کو چونچ سے اِدھر اُدھر ہٹا کر اپنی ماں کی راہ دیکھا کرتی تھی۔ اُس کی ماں اُسے دانہ بھراتے وقت دنیا کی عجیب و غریب باتیں سناتی۔ ننھی چڑیا سنتی اور خوش ہو ہو کر چہچہانے لگتی۔ لیکن بعض باتیں ایسی بھی ہوتیں جنھیں سنتے ہوئے وہ خوف و ہراس کے مارے اپنا سر اپنی ماں کے پروں میں چھپا لیتی۔

باغ میں سب چیزوں سے بڑھ کر اُسے اُس بڑے بڑے گلابی پھولوں کے پودے سے محبت تھی جس کے پھولوں کی نسبت اُسے گمان تھا کہ وہ دور سے جھک جھک کر اُس کے گھونسلے کو دیکھا کرتے ہیں۔ اُس کی پہلی مشق پرواز اُسی پودے تک ہوئی ــــ جب ننھا دل حرص و ہوا کے نام سے بھی ناواقف تھا۔ اُس نے گلابی پھولوں کے پودے ہی میں اپنے لئے ایک دنیا کو موجود پایا۔ اور جب اُس کی ماں نے اپنے سخت اور مضبوط پروں کو پھڑپھڑا کر کہا "نادان بچی! اس خوشبودار پودے میں تیرے لئے کیا رکھا ہے۔ میں تجھے ایسے ایسے کھیتوں میں لے جاؤں گی جو دانے سے بھرے پڑے ہیں اور جہاں تیرا یہ دبلا پن بالکل جاتا رہے گا۔ تو یہ سُن کر اُس کے دل پر ایک چوٹ سی لگی ــــ "آہ کیوں دنیا میں ایسی چیزیں بھی موجود ہیں جو اُس کے پودے پر فوقیت رکھتی ہیں!"

ایک سہانی صبح ننھی چڑیا گلابی پھولوں کے پودے پر بیٹھی ہوئی وہ میٹھا راگ گا رہی تھی جو اُس کی سہیلی بلبل نے اُسے سکھایا تھا۔ اُس کی ماں اُڑتی ہوئی اُس کے قریب آئی اور محبت کے انداز میں اپنی چونچ اُس کی چونچ سے ملا کر کہنے لگی "میری بچی! کب تک تو یہ راگ الاپتی رہے گی۔ آ میرے ساتھ چل میں تجھے دنیا کی سیر کراؤں گی۔ اب تیرے پروں میں اتنی طاقت آگئی ہے کہ تو میرے ساتھ اُڑ سکے"۔

شہر کی بلند عمارتوں اور اونچے اونچے میناروں پر سے اُڑتی ہوئی مسجد مندر گرجے وغیرہ سب کو پیچھے چھوڑ کر وہ بہت آگے نکل آئی تھیں۔ اور اب شہر سے باہر دور وہ ایک مقتل پر سے گذر رہی تھیں۔

ننھی چڑیا نے ہر چیز کو حیرت اور تعجب کی نظر سے دیکھا۔ قتل و خون اُس کے لئے ایک دل دہلا دینے والا نظارہ تھا۔ اُس نے کہا "اماں! کیا اسی خوفناک مخلوق کا نام انسان ہے"۔

چڑیا نے جواب دیا "ہاں یہی تو انسان ہیں" ننھی چڑیا نے آہستہ آہستہ دھرایا "انسان، انسان!" پھر کہا "یہ انسان۔

کس کا خون بہا رہے ہیں؟" چڑیا نے جواب دیا "انسان انسان کا خون بہا رہا ہے"۔

"اماں! کیا انسان اپنے دوستوں کے ساتھ یہی سلوک کرتا ہے؟"

"نادان بچی انسان سوائے اپنی ذات کے کسی دوسرے کا دوست نہیں ہوتا"۔

"اچھی اماں اگر ہم میں سے کوئی اُن کے پاس چلا جائے تو؟"

"میری بچی! کیا تو پنجرے کا نام بھول گئی"۔

"کیا یہ اپنے ہم جنسوں کو بھی پنجرے میں بند کر دیتے ہیں"؟

"کیوں نہیں وہ بڑی عمارت جسے یہ انسان قید خانہ کہتے ہیں ابھی تو اپنی آنکھوں دیکھ چکی ہے"۔ ننھی چڑیا نے نفرت و حقارت کے انداز سے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ آج اُس نے وہ خونین نظارے اپنی آنکھوں دیکھ لئے تھے جن کا ذکر وہ اپنی ماں کی زبان سے سُن کر کانپ جایا کرتی تھی۔

اب وہ ایک وسیع کھیت کے کنارے پہنچ چکی تھیں۔ چڑیا نے کہا "آہا اس کھیت میں کیسے اچھے اچھے دانے ہیں۔ بچی! خدا حافظ، جا اور اب اپنا پیٹ آپ بھرنا کہ تو اپنا بار خود اُٹھانے کی عادت سیکھے۔ میں اور آگے جاؤں گی اور کل کے لئے اس سے اچھی جگہ کی تلاش کروں گی۔ شام کو ہم اکٹھے گھونسلے کی طرف جائیں گے اور میں دن بھر کے تجربے کی باتیں تجھ سے پوچھوں گی"۔

وہ آگے چلی گئی اور ننھی چڑیا چکر باندھ کر آہستہ آہستہ کھیت میں اُترنے لگی۔ اُس نے کہا "آہا کیسے اچھے دانے ہیں میں نے آج تک ایسی اچھی چیزیں اس افراط سے نہیں دیکھیں"۔ باغ، پھول، سبزہ اور بچپن کی سہیلیاں سب اس ایک لمحہ میں فراموش ہوگئیں۔

دفعتہً اُس نے اپنے پر پھڑپھڑائے "دانے واقعی اچھے ہیں لیکن میرے پاؤں کس چیز میں بار بار اُلجھ رہے ہیں"! ایک ڈراونے خیال نے اُسے چونکا دیا اور بے اختیار وہ اُڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ لیکن بے سود، صیاد سر پر کھڑا تھا۔ آخر وہ جال سے نکل کر ایک پنجرے میں بند ہوگئی۔

"اُف یہ بازار کی بھیڑ بھاڑ! میرا اچھا پودا، اماں، اور میری سہیلیاں۔ ہائے میں کیا کروں۔ یہ دیو مجھے کہاں لے جا رہا ہے۔ اچھی بلبل رخصت، آہ میرے پھول!"

---

مڑ کے نے کہا "بس مجھے یہ زرد چڑیا کا بچہ بہت پسند ہے۔ کہو میاں شکاری کیا قیمت لوگے"؟

"ننھے میاں! یہ آپ کی نذر ہے۔ میرا انعام تو یہی ہے کہ سرکار میرے لعین بھائی کو کیفرِ کردار تک پہنچا دیں"
لڑکے نے کہا "تمہارے بھائی کو ابا گرفتار کر چکے ہیں" پھر خوشی خوشی بھاگ کر زینے پر چڑھ گیا۔ گھر بھر میں کوئی درجن بھر بچے موجود تھے چاندی کا پنجرہ قسم قسم کی کٹوریوں سے بھر دیا گیا۔ آہ صحبتِ ناجنس! ان انواع و اقسام کے کھانوں کی بجائے اگر کوئی اُس کا گلا گھونٹ دیتا تو وہ اُسے زیادہ پسند کرتی۔

بچے پنجرے کی سلاخوں میں سے تنکے بڑھا بڑھا کر چڑیا کی آنکھیں کھولنا چاہتے تھے۔ انہیں چڑیا سے محبت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ چڑیا ان چیزوں کو دیکھے اور ہماری طرح خوش ہو اور یہ سب کے سب دانے ہمارے سامنے کھائے۔ چڑیا اس محبت کو نہ سمجھ سکتی تھی۔ اُس کی ماں بھی اس سے محبت کر چکی تھی اور خود اُسے بھی کئی چیزوں سے محبت تھی۔ لیکن اُس کے دل میں انہیں پنجرے میں بند کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔

دن بھر وہ دیونما انسانوں کے خوف سے سہمی ہوئی بیٹھی رہتی اور ڈر کے مارے اُسے کچھ سوچنے کا حوصلہ بھی نہ ہوتا لیکن رات کو جب بچے سو رہتے جب سارے گھر پر خاموشی چھا جاتی تب چڑیا اپنی باتیں سوچتی۔

ہائے میرا اچھا پودا میرا باغ، سبزے کا فرش، ہنستے ہوئے چہروں والے پھول، ہر کسی سے چھیڑ کرنے والی ہوا، میرے اچھے دانے دنکے، میری سہیلیاں، اماں اب تم مجھے کبھی نہ پاؤگی۔ آزادی، ہائے آزادی"

بلبل گانا چھوڑ چکی ہوگی، اور سارا باغ میرے گم ہو جانے سے حیران ہوگا۔ میرے گلابی پھول اب کبھی نہ کھلے ہونگے، مجھے نہ پا کر سب مرجھا کر مٹی میں مل گئے ہونگے۔ میرا پودا زرد لباس پہن چکا ہوگا اور اُس کی کونپلیں ڈھلک ڈھلک کر خاک پر آ رہی ہونگی۔ ہوا اب افسردگی کے ساتھ آہستہ آہستہ میرے باغ میں سے گذر جاتی ہوگی۔ پہاڑ پر سے میری سہیلیوں نے باغ میں آنا چھوڑ دیا ہوگا۔ وہ ابابیلیں جو کالے کالے بادلوں کے نیچے پرا باندھ کر فضا میں رقص کیا کرتی تھیں ضرور میرے نہ ہونے کا خیال کرتی ہونگی اور میرے خیال سے اُن کی رفتار سست پڑ جاتی ہوگی۔ شبنم موتی پرونے کو اب باغ میں کیوں آنے لگی، مجھے شبنم سے بڑی محبت تھی معلوم نہیں ابر اب بھی باغ پر چھایا ہوگا یا نہیں۔ آہ میری اماں دن بھر میری تلاش میں اڑتی ہوگی۔ اُس کے پر میلے پڑ گئے ہوں گے اور اُس نے دانا چگنا چھوڑ دیا ہوگا"

---

بلبل باغ میں اب بھی اُسی طرح گاتی تھی۔ اور گلابی پھول ہر روز نئی بہار کے ساتھ کھلتے تھے۔ اور اب نئی نئی کونپلیں سر نکال رہی تھیں۔ باغ میں ویسی ہی بہار تھی۔ ہوا اُسی شوخ رفتار سے چلتی تھی۔ ابابیلیں

رقص کرتی تھیں اور اس بہار میں پہاڑ پر سے کثرت کے ساتھ چڑیاں باغ میں آرہی تھیں۔ شبنم بدستور موتی بکھیرتی تھی اور ہر روز ابر امنڈ امنڈ کر باغ پر چھا جاتا تھا۔ اُس کی ماں اُس کا رنج بھول کر اب نئی نئی دلچسپیوں میں محو ہو چکی تھی۔

---

ہوا خوش گوار اور ٹھنڈی تھی آسمان پر گھنگھور گھٹا چھا رہی تھی اور آج چڑیا کا پنجرہ بھی صحن میں تھا۔ بہت سے پرند ہوا میں خوش ہو کر ادھر اُدھر اُڑ رہے تھے کئی چڑیاں پھُر سے اُڑتی ہوئی عین پنجرے کے سامنے سے گذر گئیں۔ اُس نے غور سے کچھ دیکھا اور ایک مضطربانہ انداز میں اُس کے منہ سے نکلا "میری اچھی اماں"! "لیکن آہ تم ایسی خوش کہاں ہو سکتی ہو۔ میری نظر بار بار کیوں مجھے فریب دیتی ہے"

آہ واقعی وہ اُس کی ماں ہی تھی۔ لیکن ننھی چڑیا اُسے کیونکر پہچانتی جب خود اُس کے دل میں اب مسرت کی ایک رمق بھی موجود نہ تھی۔

ایک بار صرف ایک بار وہ کھلی فضا میں سے اُڑتی ہوئی اپنے باغ تک جانا چاہتی تھی۔ صرف ایک بار وہ اپنے نہ ہونے کا ماتم اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتی تھی۔ صرف ایک بار وہ اپنی آمد سے پژمردہ چیزوں کو از سر نو شگفتہ ہوتے ہوئے دیکھنا چاہتی تھی لیکن اُس کا ننھا دل ایک دلخراش حقیقت سے کس قدر ناواقف اور چمن والے اِن معصوم جذبات سے کس قدر ناآشنا تھے

---

آج رات اُس نے خواب میں اپنے آپ کو پھر اُسی پودے پر بیٹھا ہوا پایا۔ باغ میں ہوا چل رہی تھی اور بلبل اپنا ترانہ گا رہی تھی۔ کلیاں پھول بن رہی تھیں اور پھول ہنس رہے تھے۔ اُس کی ماں اُسے چونچ سے دانہ بھرا رہی تھی اور اس کی سہیلیاں اُسے ساتھ اُڑنے کے لئے بلا رہی تھیں۔ پنجرے کی قید بالکل اُس کی یاد سے محو ہو چکی تھی۔ وہ ایک معصوم بچی تھی ـــــ دنیا کی تلخ کامیوں سے ناآشنا! اُسے خیال بھی نہ تھا کہ وہ سب سے جدا ہو چکی ہے۔

ایک کرخت آواز نے اُسے چونکا دیا "بدبخت بچے! تو اس چڑیا کا خیال نہ چھوڑے گا۔ صبح سے لے شام تک تجھے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں۔ دن نکلا اور تو اس پنجرے کے گرد ہوا۔ دیکھ تو سہی آج میں چھری لے کر اس مردار چڑیا کا فیصلہ ہی کئے ڈالتی ہوں۔

---

پھر وہی نیند آ دبیں کہاں ہوں۔ وہ سب کدھر گئے باغ کہاں غائب ہو گیا" بے اختیار ایک جنون انگیز کیفیت میں اُس نے اپنے سر کو پنجرے کی سلاخوں سے پٹکنا شروع کیا۔ اُف پا کر کھو دینا کتنا دردانگیز ہوتا ہے۔ وہ اپنا سر یونہی

پٹکتی رہی۔ اُس کے سارے پر خون سے رنگین ہو گئے لیکن پھر بھی بدستور وہ اپنا سر پٹکتی رہی۔

بچوں میں ایک کھلبلی پڑ گئی۔ وہ پنجرے کو کھول کر مری ہوئی چڑیا کو حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی اُس کے سر پر سے جما ہوا خون ہاتھوں سے صاف کر رہا تھا۔ اور کوئی اس کے خون سے رنگے ہوئے پروں پر ہاتھ پھیر پھیر کر دیکھ رہا تھا۔ ہر شخص اپنا اپنا خیال ظاہر کر رہا تھا۔ ایک عمر رسیدہ بیگم یہ کہہ کر فاموش ہو گئیں۔ "بھلا ہوا یہ منحوس چڑیا مر گئی۔ جب سے گھر میں آئی تھی ایک نہ ایک نقصان ہو رہا تھا" ایک نو عمر لڑکی بولی "خیر یہ سب تو ڈھکوسلے ہی ہوتے ہیں، لیکن میں بھی کہوں گی کہ اچھا ہوا جو یہ چڑیا مر گئی دن بھر یہ شریر کھلنڈرے میرے کمرے کے پاس شور و غل سے حشر برپا رکھتے تھے"! بچے آپس میں جھگڑنے لگے۔ ہر ایک یہی چاہتا تھا کہ مری ہوئی چڑیا کو میں ہی کھڑکی کی راہ سے سڑک پر پھینکوں۔

ز۔ ب

## مصیبت

مصیبت خدا کے پروں کا سایہ ہے۔

رات تاروں کو فروغ دیتی ہے جیسے غم صداقت کو

ہماری بصیرت اُس وقت تیز تر ہو جاتی ہے جب ہم مصیبت کی گہرائیوں میں جا پہنچیں۔

غلہ ہوا چلے صاف ہوتا ہے اور روح مصیبت پڑے۔

ازلی ستارے چمک اُٹھتے ہیں جب فضا تاریک تر ہو جائے

گلچیں

# بیوہ کی زبان سے

اب نہیں دنیا میں کوئی بھی خوشی میرے لئے
ہو گئی ہے اِک مصیبت زندگی میرے لئے
دل کے زخموں پر نمک پاشی کیا کرتا ہے وہ
تھا جو ساماں وجہِ آسائش کبھی میرے لئے
آہ اب تو ہو گئی ہے غم سے بھی اُلفت مجھے
باعثِ تسکیں ہے یہ افسردگی میرے لئے

---

آہ تاراج اپنی امیدوں کا گلشن ہو گیا
آسمانِ کینہ پرور اپنا دشمن ہو گیا
آرزوؤں کے اسی دل میں کھلا کرتے تھے پھول
اب یہی اپنی تمناؤں کا مدفن ہو گیا
جس سے ہوتا تھا کبھی روشن سیہ خانہ مرا
وہ اُجالا اب فروغِ خاکِ مدفن ہو گیا

---

بھول کر آتا نہیں ہے اب تمہیں جس کا خیال
جس کی دُوری تھی تمہارے واسطے وجہِ ملال
جس کو غمگیں دیکھ کر بے تاب ہو جاتے تھے تم
اک ذرا سا رنج جس کا تم کو کرتا تھا نڈھال
جس کو آنکھوں سے نہ اوجھل ہونے دیتے تھے کبھی
دیکھ لو اب اک نظر ہی کاش آکر اُس کا حال

---

آہ وہ اُلفت تمہاری یاد آتی ہے مجھے
یادِ ایامِ گذشتہ خوں رُلاتی ہے مجھے
غم سے تھا نا آشنا اپنا دلِ ناشاد جب
اُن دنوں کی یاد آتی ہے ستاتی ہے مجھے

موت کو بھی رحم میرے حال پر آتا نہیں
دیکھئے کب غم سے وہ آکر چھڑاتی ہے مجھے

ع۔ ب

# دیوانہ

ہاں! چند سال قبل یہی دیوانہ کا لفظ میرے دل پر کیسا عجیب اثر کرتا اور کس طرح میرے اُس جذبہ واحساسِ وحشت کو بیدار کرتا جو پہلے کبھی کبھی مجھ پر اس طرح طاری ہوا کرتا تھا کہ میرے رگ و پے میں ایک لرزش ایک ہیجان سا پیدا کر دیتا یہاں تک کہ خوف کا سرد پسینہ بڑے بڑے قطروں کی صورت میں میری جلد پر نمودار ہو جاتا اور ہراس سے میرے گھٹنے بجنے لگتے..... اگرچہ اب میرے لئے اس لفظ میں خاص دلچسپی ہے اور یہ میرا زیباو بہترین خطاب ہے۔

کیا مجھے آپ ایسے فرمانروا کا نام بتا سکتے ہیں جس کی سطوت وہیبت سے لوگ ایک دیوانے کی شرر فشاں آنکھوں کی بہ نسبت زیادہ ہراساں ہوں....... یا جس کی دار ورسن ایک مجنون کی گرفت سے زیادہ مضبوط و یقینی ہوا

آہاہاہا۔ اہوہوہو۔ دیوانہ ہونا بھی ایک قابلِ فخر اعزاز ہے...... آہاہاہا..... کٹہرے کے باہر ایک تند اور وحشی سفید شیر کی طرح جھانکتے جانا.... اور طویل سیاہ راتوں میں بھاری سلاسل کی بہشتِ گوش جھنکار میں دانت پیسنا اور چیخنا چلانا اور اس "بہادرانہ موسیقی" سے بے خود ہو کر خس و خاشاک پر لوٹتے پھرنا۔ آفرین صد آفرین پاگل خانے پر..... آہ یہ کیسا نایاب مسکن ہے۔

مجھے وہ دن از بر یاد ہیں جب میں دیوانگی سے ڈرا کرتا تھا..... جب میں اپنے خواب راحت سے چونک چونک اُٹھتا اور گڑگڑا گڑگڑا کر دوزانو ہو کر اس "خاندانی لعنت" سے مستثنےٰ کئے جانے کی دعائیں مانگتا..... جب میں مسرت و شادمانی کی محفلوں اور عیش وعشرت کی مجلسوں سے دور بھاگ بھاگ کر کسی دور دست کنج خلوت میں چھپ چھپ کر اپنا گراں بار اور بیزار کن وقت اُس بخار کے اُتار چڑھاؤ اور کمی بیشی کے مشاہدے میں گزارتا جسے ایک دن میرا دماغ جلا کر خاکستر کرنا تھا..... میں جانتا تھا کہ جنون کے مسموم اثرات میرے خون اور مغز استخواں تک میں سرایت کر چکے ہیں..... میں جانتا تھا کہ ہماری ایک پشت اس بلائے بے درماں کی خونی گرفت میں گرفتار گزر چکی ہے..... اور اور..... مجھے یہ بھی یقین تھا کہ میں وہ پہلا آدمی ہوں جس میں جنون دوبارہ عود کرے گا...... اور مجھے اس امر کا بھی علم تھا کہ ضرور ایسا ہو کر رہے گا۔ کیونکہ ایسا ہوتا آیا ہے اور ایسا ہوا کرے گا۔

جب کبھی میں کسی کمرے کے تاریک کونے یا میں کسی ہجوم کی نظر پڑتا اور افرادِ اژدہام کو آپس میں چپکے چپکے گویاں کرتے

اور اپنی طرف انگشت نمائی کرتے دیکھتا تو میں سمجھ لیتا کہ یہ ایک دوسرے سے مجھ دیوانے کی باتیں کر رہے ہیں۔۔۔ اور میں خاموش وہاں سے نکل کسی تنگ اور تاریک گوشہ میں جا پناہ لیتا۔۔۔۔۔ سالہا سال میرا یہی معمول رہا وہ کیسے طول و طویل سال تھے۔

یہاں (پاگل خانے) میں راتیں اکثر دراز ہوا کرتی ہیں۔۔۔۔۔۔ بہت لمبی لمبی۔۔۔۔ لیکن یہ سب اُن بے چین راتوں اور مہیب خوابوں کے مقابلہ میں ہیچ ہیں۔۔۔۔۔ اُن کی یاد اب بھی میرا خون سرد کئے دیتی ہے۔۔۔۔۔ جب عیار اور تمسخر آمیز چہروں والی بھولی بھولی روحانی شکلیں میرے کمرے کے گوشوں میں دبک جاتیں اور رات کو میرے بستر پر جھک جھک کر مجھے دیوانگی کی تعلیم دیتیں۔۔۔۔۔۔ وہ دھیمی دھیمی آوازوں میں میرے کانوں میں پھونکتیں کہ "میرے اس دیرینہ گھر کا فرش میرے دادا کے خون سے لتھڑا ہوا ہے جو جوشِ جنوں اور شدتِ دیوانگی میں خودکشی کرتے وقت اُن کے جسم سے بہ نکلا تھا۔"

ان الفاظ پر میں کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا لیکن وہ روحیں میرے دماغ میں داخل ہو کر اس زور سے چلاتیں کہ تمام کمرہ اُن آوازوں کی بازگشت سے دیر تک گونجتا رہتا۔ ان مبہم آوازوں کا دہشتناک مفہوم یہ تھا "میرے دادا سے پہلی پشت میں دیوانگی بیدار نہیں ہوئی تھی لیکن میرے دادا کے دست و پا دیر تک زنجیر و سلاسل کے رہینِ منت رہے میرے والد صحیح و سلامت، ہوش و حواس کے ساتھ اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے اس لئے اب دیوانگی کا مجھ پر نزول و ظہور ہونا ایک مسلمہ امر ہے۔"

ان مہیب آوازوں کی صداقت کا مجھے کامل یقین اور پورا پورا علم تھا۔۔۔۔ میں نے اس راز کو کئی سال پہلے بھانپ لیا تھا۔ اگرچہ لوگ مجھ سے پوشیدہ رکھنے کی کوششیں کرتے رہے۔۔۔۔۔ آہ۔۔۔۔ میں اُن سے کہیں زیادہ متفنی تھا اگرچہ وہ مجھے دیوانہ ہی تصور کرتے تھے۔

آخر کار یہ شدنی مجھ پر نازل ہو گئی۔۔۔۔۔ اور میں سخت متعجب ہوں کہ میں دیوانگی سے کیوں اتنی دیر ڈرتا رہا۔۔۔۔ میں اُس وقت بھی دنیا کے کاروبار میں مشغول و مصروف ہو سکتا تھا اور دنیا کی بہترین شخصیتوں کے ساتھ گفتگو کر سکتا تھا۔۔۔۔ مجھے میری دیوانگی کا علم تھا لیکن ان سادہ لوح دنیاداروں کو نوکِ خار کے برابر بھی مجھ پر شبہ نہ تھا۔۔۔۔۔ میں خوشی سے بلیوں اچھلتا۔ جب میں سوچتا کہ باوجود اُن کی خارا شگاف نظروں کے میں کس چالاکی سے تمام اہلِ عالم کو فریب دے رہا ہوں۔۔۔۔۔ اور جب میں سوچتا کہ کیسی کامیابی سے میں نے اپنے رازِ سربستہ کو چھپا رکھا ہے تو علیحدگی کی گھڑیوں اور تنہائی کی ساعتوں میں جوشِ مسرت سے پہروں دل کھول کر ہنسا کرتا۔۔۔۔ میرے دوست اور رفقا کتنی جلد

مجھ سے وحشت اور گریز اختیار کر لیتے اگر وہ . . . صرف . . . صورتِ حالات کے رازدان ہو جاتے!

جب میں تنہا کسی خوش فکرے کے ساتھ کھانے میں شریک ہوتا تو میں سوچ کر فرحت سے چلا اُٹھتا کہ اس کا رنگ کیسا زرد پڑ جاتا اور یہ کتنی جلد مجھ سے کوسوں دور بھاگ جاتا اگر اسے (صرف) اتنا علم ہوتا کہ اُس کا عزیز رفیق (یعنی میں) جو اُس کے نزدیک بیٹھا ایک تیز چمکدار چاقو پتھر پر لگا رہا ہے دیوانہ ہے جسے اس چاقو کو اس کے پیٹ میں بھونک دینے کی پوری قوت اور پورا اختیار حاصل ہے . . . . . . آہا کیسی دلچسپ زندگی تھی۔

دنیوی مال و منال میرے دست بستہ غلام ہو گئے . . . . میں اُس نشۂ مسرت میں مست و مخمور تھا جو میرے راز کی پوشیدگی کی وجہ سے دو چند دلفریبیوں کے ساتھ میرے سامنے جلوہ نما ہوتا . . . . مجھے ایک بڑی جاگیر وراثت میں ملی تھی . . . "قانون" کرگس چشم قانون ـــ خود دھوکا کھا گیا تھا اور ہزاروں روپے کی متنازعہ فیہ وراثت ایک "دیوانے" کے قبضے میں دے دی گئی تھی . . . کہاں تھا اب تیز چشم اور درست تدبیر داناؤں کا فہم و فراست . . . . . . اور کدھر تھا اب وکلا کا معاملہ فہم ادراک جو ہمیشہ نئے نئے قوانین کی ایجاد و اختراع کے لئے بے قرار رہتا ہے . . . . ایک دیوانے کی حیلہ وری کے ہاتھوں سب نے منہ کی کھائی!

میں اب مالدار تھا۔ لوگ میری خوشامد و تملق میں مشغول ہو گئے . . . . میں اپنے زر و مال کو بے دریغ خرچ کرتا تھا . . . عوام الناس میری تعریف و ستائش میں مصروف تھے . . . . اور وہ تینوں مغرور اور گردن فراز بھائی کیسے میرے سامنے سربسجود ہو گئے . . . . . اور وہ سفید مُو سالخوردہ پیرِ فرتوت ـــ کیسا باعزت ـــ کیسا باآبرو ـــ جاں نثارانہ میری پرستش کرتا! . . . . اس بوڑھے کی ایک لڑکی تھی جو اُن نوجوانوں کی ہمشیرہ تھی . . . . . یہ پانچوں بڑے نادار اور مفلس تھے . . . . میں دولتمند تھا . . . جب وہ میرے رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئی تو میں نے لطیف تبسم کی ایک جھلک اُس کے محتاج رشتہ داروں کے چہروں پر رقصاں دیکھی۔ کیونکہ وہ اپنے دلوں میں خود ساختہ منصوبوں اور گراں قدر معاوضوں کے خیالی پلاؤ پکا رہے تھے۔

لیکن برخلاف اس کے تبسّم میرا حق تھا . . . تبسم . . . مسکراہٹ . . . . خندۂ مسرت . . . . . قہقۂ انبساط . . . . بال اُکھاڑ اُکھاڑ کر پھینکنا . . . . اور خوشی کے مارے زمین پر لوٹ جانا صرف میرا ہی حصہ تھا . . . کیونکہ انہیں اس بات کا مطلق علم نہ تھا کہ لڑکی ایک "دیوانے" کے قبضہ میں دے دی گئی ہے . . . . . ذرا غور کیجئے! اگر انہیں صورتِ حالات کا پتہ ہوتا تو کیا وہ اپنی لڑکی کو اس مصیبت سے بچا لیتے؟ . . . . یہاں ایک ہمشیرہ کی "رغبت و رضا" اور اُس کے خاوند کے "مال و دولت" کا سوال تھا + . . . . . . .

تمام مکاری و حیلہ بازی کے باوجود میں یہاں ایک بات میں فریب کھا گیا تھا۔ اگر میں مخبوط الحواس نہ ہوتا۔ اگرچہ ہم دیوانے کافی حد تک تیز فہم ہیں لیکن وقتاً فوقتاً ہم بھی گھبرا سے جاتے ہیں —— تو میں یہ بات ضرور تاڑ جاتا کہ لڑکی ایک سرد اور سخت قبر میں ابدی نیند سونے کو عزت و آبرو سے عروس نو بن کر میرے عالی شان اور خوش منظر گھر میں آنے پر ترجیح دیتی ہے .... میں ضرور تاڑ جاتا کہ اُس کا دل اُس سیاہ چشم نوجوان پر مفتون و فریفتہ ہو چکا ہے جس کا اُس نے سوتے ہوئے ایک دفعہ نام لیا تھا .... میں ضرور بھانپ لیتا کہ وہ اُس سفید مو پیر فرتوت اور اُن مغرور بھائیوں کے عسرت و افلاس کے ازالہ اور دفعیہ کے لئے میری دولت و ثروت کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائی گئی ہے۔

اُس کے خال و خط تو مجھے اب یاد نہیں لیکن میں یہ وثوق کے ساتھ کہوں گا کہ وہ حسین تھی۔ مجھے اس کے حسن کا پورا یقین ہے! کیونکہ اکثر چاندنی راتوں میں —— جب تمام دنیا ماہتاب کی ضیا پاشی سے بقعۂ نور بنی ہوتی ہے —— میں اپنی خواب استراحت سے چونک اُٹھتا ہوں .... اردگرد تمام عالم پر سکون و سکوت طاری ہوتا ہے ... اور اس تنگ و تاریک تہ خانے (پاگل خانے) کے ایک گوشے میں ایک نحیف و نازک انسانی ڈھانچا کھڑا دیکھتا ہوں۔ اُس کی سیاہ گرہ گیر دراز زلفیں شانے سے نیچے تک لٹکتی ہیں جنہیں اس دنیائے فانی کی شدید سے شدید بادِ صرصر بھی سرِ مو جنبش نہیں دے سکتی .... اُس کی آنکھیں ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھتی ہیں ... جو نہ کبھی جھپکتی ہیں نہ بند ہوتی ہیں! ...اُف .... خاموش ... جب کہ میں ان حالات کو سپرد قلم کر رہا ہوں میرا خون سرد پڑا جاتا ہے .... یہ صورت یہ مجسمہ یہ ساکن و خاموش ڈھانچا "اُسی" کا ہے .... چہرہ زرد .... آنکھیں شیشے کی طرح شفاف .... لیکن میں انہیں اچھی طرح پہچانتا ہوں .... وہ مطلق حرکت نہیں کرتی اور ان مبہم روحانی شکلوں کی طرح جو اکثر اُس کی جگہ متمکن ہو جاتی ہیں ہرگز چیں بجبیں نہیں ہوتی .... لیکن ہاں ہہ یہ منظر میرے لئے بہت زیادہ مہیب و خطرناک ہے ... بلکہ اُن بھوتوں اور شیطانی عفریتوں سے بھی زیادہ دہشت ناک جو مجھے سالہا سال پہلے خبط و سودا کی ترغیب دیا کرتے تھے ... کیونکہ "وہ" اسی وقت تازہ تازہ قبر سے نکل کر آتی ہے .... اور اُف .... وہ موت کا مجسمہ معلوم ہوتی ہے (یہ فقرہ جملۂ معترضہ تھا)

کامل ایک سال تک میں اپنی بیوی کے چہرے کو زرد اور زرد تر ہوتے دیکھتا رہا ..... اور کامل ایک سال تک قطراتِ اشک اُس کے ماتمی رخساروں پر سے ٹپکتے مشاہدہ کرتا رہا .... لیکن وجہ معلوم نہ کر سکا اگرچہ آخر میں نے یہ وجہ معلوم کر ہی لی .... اور ... اُس کے رشتہ دار اس پیہم اشک باری کا موجب مجھ سے دیر تک نہ چھپا سکے ..... وہ مجھے نہیں چاہتی تھی .... مگر مجھے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ مجھ سے ناخوش ہے: وہ میری دولت سے متنفر تھی۔ اور اُس شان و

شوکت کو جو اُسے میسّر تھی حقارت کی نگاہ سے دیکھتی تھی —— لیکن مجھے ہرگز ایسی امید نہ تھی ۔۔۔۔ اُسے ایک اور شخص سے پیار تھا ۔۔۔۔ مجھے کبھی اس بات کا اُن دنوں گمان بھی نہیں گزرا اس حقیقت کے رونما ہوتے ہی مجھ پر عجیب احساس غالب آگیا ۔۔۔۔ اور وہ تفکرات و خیالات جو کسی پوشیدہ طاقت سے میرے دماغ میں ٹھونسے جارہے تھے میرے سر میں گردش لگانے لگے ۔۔۔ میں اپنی بیوی سے نفرت نہیں کرتا تھا اگرچہ مَیں اُس لڑکے سے سخت برہم تھا جس کے عشق و مفارقت میں وہ اب تک اشک فشاں تھی۔

میں اپنی بیوی کی خستہ اور شقاوت زدہ زندگی پر ۔۔۔۔ وہ زندگی جو اُس کے والدین کی سنگدلی کا نتیجہ تھی۔ ۔۔۔۔ رحم کھاتا تھا ۔۔۔۔ ہاں واقعی رحم کھاتا تھا۔

میں جانتا تھا کہ وہ چند دن کی مہمان ہے۔ لیکن یہ خیال کہ شاید وہ اپنی موت سے پہلے کسی بدقسمت بچے کی ماں ہو جائے جس کی آئندہ نسل کو میری دیوانگی اور جنون ورثہ میں ملے، میرے ارادے کو مستحکم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہُوا ۔۔۔ اور ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔ مَیں اُسے "قتل" کر دینے کے ارادہ کو مصمم کرنے پر مجبور ہو گیا۔

کئی ہفتے میں اُسے زہر دینے —— غرقِ آب کرنے —— اور سپردِ آتش کرنے کے منصوبے باندھتا رہا ۔۔۔ کیسا دلفریب منظر ہوگا ایک عالی شان مکان فلک بوس شعلوں کے دامن میں لپٹ رہا ہوگا اور "دیوانے" کی بیوی جل کر خاک ہو رہی ہوگی۔ کیسا ظرافت نواز مضحکہ ہوگا اور اس ہنگامۂ محشر کا بانی مبانی کون؟ صرف ایک دیوانے کی تفننِ طبع! میں دیر تک اس طرزِ عمل پر غور کرتا رہا لیکن آخر یہ خطرناک ارادہ ترک کر دیا۔

آہاہاہا ۔۔۔۔ روز بروز اُسترے کو چمڑے پر لگانا ۔۔۔ اُس کی دھار کی تیزی محسوس کرنا ۔۔۔۔ اور پھر اس گہرے اور کاری زخم کا خیال و تصور جو اس تیز اور باریک دھار کی ایک ضرب کا شرمندہ ہوگا ۔۔۔۔ یہ کیسی فرحت و مسرت تھی؟ ۔۔۔۔۔۔

آخر کار وہی سماوی روحیں جو پہلے اتنی دیر میری حامی و شریک کار رہی تھیں پھر میری مدد و معاونت کو آ موجود ہوئیں ۔ اور انہوں نے چپکے سے میرے کان میں یہ کہہ کر کہ "وقت اور موقع آپہنچا ہے" تیز اُسترا میرے ہاتھوں میں دے دیا ۔۔۔ میں نے اُسے مضبوطی سے پکڑ لیا ۔۔۔ چپکے سے اپنے بستر سے اُٹھا اور اپنی خفتہ بیوی پر جھک گیا ۔۔۔ اُس کا چہرہ اُس کے ہاتھوں میں چھپا ہُوا تھا۔ میں نے انہیں آہستگی اور نرمی سے چہرے سے سرکا دیا اور وہ بے خبری میں سینہ پر جا پڑے ۔۔۔ شاید وہ روتی رہی تھی! کیونکہ آنسوؤں کے نشان اب تک اُس کے رخساروں پر نمایاں تھے ۔۔۔ اُس کا چہرہ ساکن و مطمئن تھا — اور — اور — یہاں تک کہ جب میں نے اُس پر نظر جمائی تو اُس کے زرد خط و

خال تبسم کی ایک پُرسکون لہر سے فروزاں ہوگئے۔ میں نے چپکے سے آہستہ آہستہ اپنے ہاتھ اُس کے شانوں پر ٹیک دیئے ۔۔۔۔ وہ چونک اُٹھی ـــــ یہ محض ایک دھندلا سا نیم فراموش شدہ خواب معلوم ہوتا تھا ـــــ میں اور آگے بڑھ کر جھک گیا ۔۔۔۔ اُس نے ایک چیخ ماری اور بیدار ہوگئی ۔۔۔۔۔۔

میرے ہاتھ کی ایک اور صرف ایک جنبش ـــــ اور ـــــ وہ پھر کبھی خفیف ترین آواز بھی نہ نکال سکتی ۔۔۔ لیکن میں گھبرا گیا اور جھجک کر پیچھے ہٹ گیا۔ اُس کی آنکھیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں ۔۔۔۔ مجھے آج تک اس بات کی سمجھ نہیں آئی کہ کیا ہوا ۔۔۔ لیکن بہرحال ان آنکھوں نے مجھے مرعوب مسحور اور خوف زدہ کردیا۔ اور میں اُن کے سامنے عاجز ہوگیا ۔۔۔۔۔ وہ بستر سے اُٹھ کھڑی ہوئی ۔۔۔۔ اور ۔۔۔۔۔ ابھی تک بدستور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ رہی تھی ۔۔۔ میں لرزہ براندام ہوگیا ـــــ استرا میری گرفت میں تھا لیکن میرے اعضا نے حرکت سے جواب دے دیا۔ اُس نے دروازے کی طرف قدم بڑھایا جب وہ اُس کے نزدیک پہنچی تو اُس نے منہ پھیر کر نگاہ مجھ پر سے ہٹالی ۔۔۔۔۔ اب جادو ٹوٹ چکا تھا ۔۔۔ میں نے جھپٹ کر ایک جست میں اُس کا بازو پکڑ لیا ۔۔۔۔ وہ چیختی چلاتی شور مچاتی زمین پر ڈھیر ہوگئی۔

اب میں بغیر مزید کشمکش کے اس کا کام تمام کرسکتا تھا لیکن تمام اہلِ خانہ بیدار ہوچکے تھے ۔۔۔۔۔ میں نے سیڑھیوں پر پاؤں کی آہٹ سنی اور اُسترے کو حسبِ معمول دراز میں رکھ کر دروازہ کھولا اور مدد و استعانت طلب کی۔ وہ آئے اور اُسے اٹھا کر بستر پر لٹا دیا گیا۔ وہ گھنٹوں بے حس و حرکت پڑی رہی لیکن جب بینائی، گفتار اور زندگی دوبارہ عود کر آئی تو عقل و شعور جواب دے چکے تھے! اُس نے تند اور وحشیانہ لہجے میں بڑبڑانا شروع کیا ۔۔۔ طبیب بلائے گئے ـــــ وہ بڑے بڑے موٹے موٹے آدمی جو خوشنما گھوڑوں والی آرام دہ گاڑیوں میں نمائشی نوکروں کے ساتھ جوق درجوق میرے مکان پر آئے ہفتوں اس کے گلے کا ہار بنے رہے۔ پھر انھوں نے ایک بڑی عظیم مجلس منعقد کی اور ایک علیحدہ کمرے میں بڑی سنجیدگی سے باہمدگر مشورہ کیا ۔۔۔ جو اُن میں سب سے زیادہ سیاہ فام کامل حاذق اور مشہور و معروف تھا مجھے خلوت میں لے گیا اور "مجھے" ۔۔۔۔ مجھ "دیوانے" سے کہا ۔۔۔۔ کہ تمہیں ایک بڑے شدید حادثے کے برداشت کرنے کے لئے کمربستہ ہونا چاہیئے۔ میری بیوی مخبوط الحواس ہوچکی تھی ۔۔۔۔۔۔

وہ ۔۔۔۔ وہ طبیب ۔۔۔ ایک کھلی کھڑکی کے سامنے میرے عین قریب کھڑا تھا اُس کی آنکھیں میرے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں اور ہاتھ میرے بازو پر۔ میں ایک ہی جھٹکے میں اُسے کھڑکی میں سے نیچے زمین پر گرا سکتا تھا ۔۔ اور ایسا کرنا میرے لئے نہایت نادر مذاق تھا ـــــ لیکن ایسا کرنے میں انکشافِ "راز" کا خوف تھا ۔۔۔ لہذا

میں نے اُسے معاف کر دیا ...... چند دن کے بعد انہوں نے مجھے متنبہ کیا کہ میری بیوی زنجیر و سلاسل کے حوالے ہونی چاہیئے اور اُس کے لئے ایک محافظ و پاسبان کی ضرورت ہے ....... میں ــــ میں ــــ دیوانہ میں ــــ باہر ایسی کھلی فضا میں دوڑ گیا جہاں میری آواز کسی انسانی کان تک رسائی نہیں پا سکتی تھی ــــ اور ــــ اور ــــ اس قدر دل کھول کر ہنسا کہ تمام صحرا میرے قہقہوں کی صدا سے گونج اُٹھا۔

وہ دوسرے دن راہیٔ ملکِ عدم ہوگئی۔ سفید مو پیر فرتوت اُسے قبر تک وداع کرنے گیا۔ اُس کے مغرور اگردن فراز بھائیوں نے "اُس" کی ہیچ میرز لاش پر ایک ایک آنسو فدا کر دیا جس کے رنج و آزار کو انہوں نے ایک وقت دیدہ دانستہ کمال سنگدلی سے ٹھکرا دیا تھا .... یہ تمام واقعات میری نہفتہ خوشی و مسرت کے لئے روح پرور غذا اور جان بخش خوراک تھے .... جب ہم اُسے دفن کر کے واپس آ رہے تھے تو میں اپنے سفید رومال کی آڑ میں اس قدر دل کھول کر ہنسا کہ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

اگرچہ اُسے سپردِ خاک کر کے میں اپنے مقاصد میں کامیاب ہو چکا تھا لیکن میرا دل کسی نامعلوم وجہ سے بے چین پریشان مضطر اور ابتر ہونے لگا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ عنقریب میرا "راز" کسی دن فاش ہونے والا ہے۔

میں اُس وحشیانہ فرحت و نشاط کو جس نے میری طبیعت میں ایک ہیجان سا پیدا کر دیا تھا کسی حالت میں بھی ضبط نہ کر سکتا تھا۔ اُس کی وجہ سے میں اچھلتا کودتا، تالیاں بجاتا حتی کہ ناچنے اور چلانے سے بھی باز نہ رہ سکتا تھا۔ ... جب میں گھر سے باہر جاتا اور روزانہ مشاغل میں منہمک انسانوں کو ہجوم در ہجوم گلیوں میں ادھر اُدھر جاتے اور رقص خانوں سے آتے دیکھتا ــــ مطربوں اور مغنیوں کی کیف آور آوازیں سنتا ــــ لوگوں کو ناچتے اور گاتے مشاہدہ کرتا تو میرے جسم کا ریشہ ریشہ تارہائے رباب کی طرح لرزاں ہو کر مجھے بے اختیار اس بات پر آمادہ کر دیتا کہ میں اُن کے درمیان دیوانہ وار بھاگوں اور ان تماشائیوں میں سے ہر ایک کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں اور چیخ پکار سے آسمان سر پر اُٹھا لوں .... میں اسی جوش میں دانت پیستا ــــ پاؤں زمین پر مارتا ــــ اور تیز ناخن اپنے ہی ہاتھوں میں چبھو دیتا .... لیکن چار و ناچار صبر و ضبط کر جاتا ...... اور کوئی شخص اس راز سے واقف نہ تھا کہ میں "دیوانہ" ہوں۔

مجھے یاد ہے ــــ اگرچہ یہ آخری بات ہے جو مجھے صحیح معنوں میں یاد آ سکتی ہے کیونکہ اب میری پریشان خوابیں حقیقی مصیبتوں کے ساتھ خلط ملط ہونی شروع ہوگئی ہیں۔ اور یہاں (پاگل خانہ میں) کثرت کار اور افراطِ مشاغل کی وجہ سے دونوں میں شناخت و تفریق کا موقع بھی نہیں ملتا ــــ مجھے یاد ہے کہ میں نے کس طرح اپنے جنون کا

"راز" ظاہر و عیاں ہونے دیا.... ہا.... ہا..... میں تصور میں اب بھی اُن کی ہراساں اور خوف زدہ نگاہیں دیکھ رہا ہوں اور اس آسانی و راحت کو محسوس کر رہا ہوں جس سے میں نے انہیں اِدھر اُدھر منتشر کر دیا تھا اور اُن کے سفید سفید چہروں پر کھینچ کھینچ کر تکے لگائے تھے.... اور مجھے یاد ہے کہ کس سرعت کے ساتھ میں ان سب کو چیختا چلاتا پیچھے چھوڑ کر برق کی سی تیز رفتاری کے ساتھ اُن سے دور بھاگ گیا تھا.... جب میں اس واقعہ کی یاد تازہ کرتا ہوں تو ایک دیو کی قوت میرے دست و بازو میں آجاتی ہے ــــ یہ دیکھو ــــ یہ آہنی سلاخیں کیسے میری قوتِ بازو کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتی ہیں.... میں انہیں ایک خشک ٹہنی کی طرح توڑ سکتا ہوں.... لیکن وہ پیچ در پیچ لمبے لمبے برآمدے میری آزادی و حریت میں سدِ راہ ہیں جن میں مَیں راہ بھول جاتا ہوں اور مزید برآں وہ بھاری بھاری بھدے بھدے آہنی پھاٹک جنہیں وہ ہر وقت مقفل رکھتے ہیں ــــ وہ اس راز سے واقف ہیں کہ میں کیسا عیار اور چال باز "دیوانہ" واقع ہوا ہوں ــــ مجھے اس طرح مقید و محبوس رکھنے پر یہاں کے دربان و محافظ بھی نازاں ہیں (یہ فقرہ پھر جملہ معترضہ ہے)

آمدم برسرِ مطلب: رات دیر تک میں باہر رہا جب قبرستان سے گھر واپس پہنچا تو اُن مغرور بھائیوں میں سے متکبر ترین فرعونِ بے سامان کو اپنا انتظار کرتے پایا.... وہ اس ملاقات کی وجہ ایک اہم معاملہ بتاتا تھا.... مجھے پوری طرح یاد ہے کہ میں ایک دیوانے کی پوری پوری حقارت کے ساتھ اس سے متنفر تھا.... بہت مرتبہ میری انگلیوں نے اُسے ریزہ ریزہ کر ڈالنے کی مجھ سے اجازت طلب کی.... مجھے بتایا گیا کہ وہ بالا خانے پر ہے میں بڑی سرعت سے اوپر چڑھ گیا.... اُسے مجھ سے صرف ایک لفظ کہنا تھا.... میں نے نوکروں کو کمرہ خالی کرنے کا حکم دے دیا۔ رات بہت گزر چکی تھی.... میری زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ ہم تنہائی میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔

میں نے عمداً اور احتیاطاً اپنی آنکھوں کو اس سے دو چار ہونے سے باز رکھا۔ مجھے اب تک اس طرزِ عمل پر فخر ہے ــــ کیونکہ مجھے یقین تھا کہ میری شعلہ ریز آنکھوں سے جنون کے شرارے برس رہے ہیں.... کچھ دیر کی خاموشی کے بعد وہ گویا ہوا: "جناب کا موجودہ انتشارِ طبعی اور پراگندگیٔ خاطر اور عجیب و غریب رائے زنی میرے خیالِ ناقص میں مرحومہ کی یاد کی سخت تحقیر و بے حرمتی ہے".... بہت سے حالات و واقعات سے اندازہ لگا کر وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ میں مرحومہ کے ساتھ تسلی بخش سلوک نہیں کرتا رہا.... یہ شخص فوج میں ملازم تھا ــــ وہ گراں بہا ملازمت جو میری دولت اور اپنی بہن کے ابدی آلام و مصائب کے معاوضہ میں خرید لی گئی تھی!.... یہی وہ شخص تھا جس نے

مجھے دام تزویر میں پھنسانے اور میری دولت کو غصب کرنے کی سازش میں اقدام و پیشقدمی کی تھی......یہی وہ شخص تھا جو میرے ساتھ اپنی بہن کے "جبری" نکاح کا محرک تھا۔ باوجود اس بات کے علم کے کہ اُس بیچاری کا دل اُس طفل نما نوجوان پر فدا و نثار ہو چکا ہے.......اب میں اُس سے دوچار ہو گیا کیونکہ ایسا کرنے پر مجبور تھا۔

میں نے اس فوری تغیر و تبدیلی کو بھی محسوس کیا جو مجھ سے دوچار ہوتے ہی اس کے چہرے پر نمایاں ہو گئی......وہ بڑا ابری و بہادر تھا......لیکن اُس رنگ کافور ہو گیا اور کرسی اُس نے پیچھے سرکا لی......میں نے اپنی کرسی اُس کے نزدیک تر کر لی اور جب میں ہنسا ـــــ کیونکہ اُس وقت میں نہایت مسرور تھا ـــــ وہ رعشہ براندام ہو گیا......دیوانگی میرے دل و دماغ پر مسلط و مستولی ہوتی محسوس ہوئی......وہ مجھ سے ڈر گیا۔ میں نے کہا: تم اُس کی زندگی میں اُس کے بہت خواہاں اور مشتاق تھے؟......بہت زیادہ؟ ـــــ اُس نے بے چینی سے ارد گرد دیکھا اور کرسی کی پشت کو مضبوطی سے پکڑ لیا لیکن مہر بہ لب رہا......"بدو بدمعاش!" میں چلایا "میں نے تمہیں پا لیا! میں نے تمہاری جہنمی سازشیں سمجھ لیں! میں واقف ہوں کہ وہ شادی سے قبل کسی اور کی والہ و شیدا ہو چکی تھی۔ مجھے علم ہے مجھے تمام علم ہے۔

وہ دفعتہً اپنی کرسی پر سے کود پڑا۔ کرسی کو اوپر اُٹھا کر مجھے پیچھے کھڑا رہنے کو کہا۔ کیونکہ میں احتیاطاً آہستہ آہستہ اُس کے نزدیک ہوتا گیا تھا۔ میں بولنے کی بجائے چلا رہا تھا کیوں کہ میری رگوں میں جنون کا پُر آشوب تلاطم موجزن تھا......اور وہی "سماوی روحیں" اُس کا دل شق کر دینے پر مجھے اکسا رہی تھیں۔ میں جھپٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چلایا: "لعنت ہو تم پر ـــــ میں اُس کا قاتل ہوں ـــــ دیوانہ ہوں ـــــ میری نظروں سے دور ہو جاؤ......خون ـــــ خون ـــــ میں خون کا پیاسا ہوں"

میں نے وہ کرسی جو میرے اور اُس کے درمیان حائل تھی ایک ہی ضرب میں ادھر پھینک دی اور ہم دونوں الجھ کر دھڑ سے فرش پر گر پڑے۔

یہ مقابلہ بڑا لطیف و دلچسپ تھا۔ کیونکہ وہ ایک طویل القامت شہزور جوان اپنی زندگی کے لئے کوشاں ـــــ اور میں ـــــ میں ایک طاقتور شیر افگن دیوانہ ـــــ اُس کے خون کا پیاسا تھا......میں جانتا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت میرا مقابلہ نہیں کر سکتی......اور میں واقعی راستی پر تھا ـــــ راستی پر ـــــ اگرچہ مخبوط الحواس تھا......اُس کی طرف سے مدافعت کمزور پڑتی گئی۔ میں اُس کے سینے پر سوار ہو بیٹھا اور اُس کے بھورے بھورے گلے کو مضبوطی سے اپنے آہنی پنجوں میں پکڑ لیا۔ اُس کا چہرہ ارغوانی ہو گیا اور آنکھیں باہر نکل آئیں......ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اُس کی ٹکٹکی

ہوئی زبان میری تضحیک واستہزا کر رہی ہے ..... میں نے اور زور سے اُس کے گلے کو بھینچا۔
دروازہ پھٹ سے کھلا اور آدمیوں کا ایک گروہ چلّاتا ہوا آگے بڑھا۔ " دیوانے کو قابو کرو" " دیوانے کو پکڑو" ..... اور ..... میرا "راز" طشت از بام ہوگیا۔ اس لئے میری تمام کوششیں آزادی وخلاصی پر مرکوز ہوگئیں۔ کسی کی گرفت سے قبل میں نے پاؤں سنبھالے، حملہ آوروں پر ٹوٹ پڑا اور زورِ بازو سے اتنی آسانی کے ساتھ راستہ بنالیا گویا میرے ہاتھ میں تیغ جوہر دار تھی .... میں نے دروازہ لے لیا اور ایک لمحہ میں گلی میں تھا .... بڑی تیزی سے میں سیدھا بھاگا گیا اور کسی راہ رو تک کو بھی مزاحمت کی جرات نہ ہوئی ... میں نے اپنے تعاقب میں پاؤں کی آہٹ سنی اور رفتار کو اور تیز کر دیا۔ آہستہ آہستہ وہ آہٹ دھیمی پڑتی گئی اور آخر مفقود ہوگئی۔ ........
لیکن میں در و دیوار۔ ندی نالے۔ خشکی و دلدل۔ پھلانگتا جاتا تھا اور چلّاتا جاتا تھا۔ میری صدا ان "غیر مرئی ارواح" کی آوازوں سے مل کر اس قدر بلند ہوتی کہ تمام کرۂ باد آواز ہائے بازگشت سے بھر جاتا ...... میں جن وشیاطین کے بازوؤں پر سوار تھا جو برق کی سی سرعت وتیزی کے ساتھ ہوا کو چیرتے در و دیوار کو اکھاڑتے اور مجھے "چکر" دیتے جارہے تھے۔ حتیٰ کہ انہوں نے دھڑام سے مجھے زمین پر دے مارا ..... جب مجھے ہوش آیا تو میں نے اپنے آپ کو یہاں ـــــ یہاں ـــــ اس تنگ وتاریک کوٹھڑی میں پایا جہاں آفتابِ عالمتاب کی جہاں افروز کرنوں کو شاذ ونادر ہی باریابی ہوتی ہے ..... اور جہاں ماہتاب کی روشن شعاعیں اندر آکر صرف اُس سیاہ اور روحانی شکل (یعنی میری بیوی کی روح) کو دیکھنے میں مدد دیتی ہیں جس کا میں پہلے کہیں ذکر کرچکا ہوں۔
جب میں بیدار ہوتا ہوں تو اس محصور مقام (پاگل خانہ) کے دور دست گوشوں سے چیخنے چلانے کی آوازیں سنتا ہوں .... ان صداؤں کی حقیقت کے علم سے میں محض بے خبر ہوں ـــــ لیکن نہ یہ "اُس زرد چہرے سے" آتی ہیں اور نہ وہ اِن کی طرف اپنی توجہ مبذول کرتی ہے .... شفقِ شام کی ظلمت گستری سے لے کر صبح انور کی ضیا پاشی تک "وہ" خاموش اور بے حس وحرکت اسی گوشے میں کھڑی میری آہنی سلاسل کی موسیقی سنتی اور خس وخاشاک پر میری کلیلیں دیکھتی رہتی ہے اور ...........

..............................

فضل محمد افضل

# نوادرِ جنوں

دُور آبادی سے کوسوں بھاگتا رہتا ہوں میں
رات بھر گنتا ہوں تارے جاگتا رہتا ہوں میں

دل یہ کہتا ہے اُٹھا لُطف اور سوئے میخانہ چل
مَیں یہ کہتا ہوں خدارا جانب ویرانہ چل

جس کے دریائے تخیل میں ہمیشہ جوش ہے
کون کہہ دے گا کہ ایسا بے خبر بے ہوش ہے

عشق کی پروا، نہ دل میں حسرتِ بوس و کنار
جھومتا رہتا ہُوں پھر بھی ہر گھڑی مستانہ وار

مائلِ ویرانہ میں ویرانے کو بھاتا ہُوں میں
بے سبب گرنہیں جو اس طرف جاتا ہوں میں

غم خزاں کا ہے نہ شوقِ آمدِ فصلِ بہار
قلبِ محزوں پر مجھے حاصل ہے پُورا اختیار

بَن گئی ہے بے خودی جب سے طبیعت کا شعار
ڈھونڈھتی پھرتی ہی صادق مجھ کو میری جانِ زار

صادق ایوبی

# اردلی

اُنہیں اکٹھے رہتے چار سال ہوگئے تھے اور ایک لمحہ کے لئے بھی دونوں میں سے کسی ایک کے دل سے یہ خیال نہ بھولا تھا کہ ایک افسر ہے اور دوسرا سپاہی۔ اگر پہلے کے مزاج میں فوجی تحکم تھا تو دوسرا طاعت شعاری میں اُس کا جواب تھا۔ اور اُن دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی، وہ ناتراشیدہ خاموش محبت جو چھپی رہتی ہے اور اپنے آپ کو ظاہر نہیں کرتی، جس کی شدت کی تہ میں نزاکت کا ایک طوفان دبا رہتا ہے جو شیریں ہوتی ہے جب وہ خاموش ہو اور بے کیف ہو جاتی ہے جب اُسے زبان پر لایا جائے، جو اظہار کی دشمن ہوتی ہے اور جو ہونٹوں کو کاٹ کاٹ کر اور آنسوؤں کو دبا دبا کر اپنی کمزوری اور حساسیت کو چھپانے کی خوگر ہوتی ہے۔ انہوں نے مختصر گوئی کی مشق بہم پہنچا لی تھی اور وہ ایک دوسرے کی بات کو ایک لفظ، ایک نظر، ایک اشارے ہی سے سمجھ جاتے تھے۔ اُن کی گفتگو کا شارح وقت ہوتا تھا جو اُن کے قدموں اور اُن کے لفظوں کو نہایت پابندی کے ساتھ قرینے پر لے آتا تھا۔

"آقا، میرے لئے کوئی اور حکم ہے؟"

"نہیں"

"میں جا سکتا ہوں؟"

"جاؤ"

یہ تھا روزانہ برخاست کا قاعدہ اور اس گفتگو میں کبھی ایک لفظ کا بھی اضافہ نہیں ہوا۔ اسی طرح دن مہینے اور سال — چار سال گزر گئے، کوارٹروں میں، گھر میں، کیمپ میں، سفر میں، جنگ میں۔ اور آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر اُن کے دلوں میں ایک دوسرے کے لئے سخت اور گہری محبت پیدا ہوتی گئی۔ کسی شخص کے لئے جو اِن دونوں کی سیرت کو سمجھ سکتا اُس مسلسل خاموشی میں، اُس فوجی زبان میں، اُس نظروں کے یک لخطہ میل میں جس کا مطلب ایک طرف "میوں کرو" اور دوسری طرف "میں سمجھ گیا" ہوتا دوستی کے جذبات کا اتنا کامل اظہار ہوتا تھا جو ایک پُرکن گفتگو ہی میں بیان ہو سکتا ہے۔

میدانِ جنگ میں ایک خطرناک موقع پر اُن دونوں نے ایک دوسرے کو پہلو بہ پہلو پایا تھا۔ دشمن کی توپیں اُن سے کوئی سو قدم کے فاصلہ پر دُندنا رہی تھیں۔ اور بار بار گولے اُن کے سروں پر سے سنسناتے ہوئے گزر جاتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو بے قرار نظروں سے ڈھونڈ رہے تھے جس وقت اُن کی نظریں دوچار ہوئیں انہوں نے یہ سوچ کر اطمینان کا سانس لیا کہ "ہم ایک مرتبہ پھر بچ نکلے"۔ ایک دفعہ ایک رات سے زیادہ عرصہ انہوں نے سردی اور بارش میں کھڑے کھڑے ایک دُور کی چوکی کی محافظت میں

گزار دیا تھا۔ اُن کے پاؤں کیچڑ میں لت پت ہو رہے تھے اور تیز ہوا کے تھپیڑے آ آ کر اُن کے چہروں پر پڑتے تھے۔ پھر جب صبح ہوئی، اور اُن کو سبکدوش کرنے کے لئے محافظ سپاہی بھیجے گئے تو اُن کے چہروں پر ایک مسکراہٹ کھیل گئی، جیسے کوئی کہے "اب ہم کیمپ کو جا رہے ہیں، خوش ہو جاؤ، کیونکہ اب تم کو آرام مل سکے گا۔"

بہت مرتبہ گرمی کے دنوں میں انہوں نے طول طویل سفر کئے تھے۔ ان سفروں میں وہ دونوں سڑک کے کنارے سنگہائے میل کو گنتے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ چالیس چالیس میل چل جاتے تھے، پھر وہ اپنی پُر از سکون و اطمینان نظریں ایک دوسرے سے تبدیل کرتے تھے جو کہتی تھیں "دو اور رہ گئے ـــــ ایک کٹا ہی چاہتا ہے ـــــ اور ہم منزلِ مقصود پر ہونگے!"

لشکر گاہ میں جب وہ اپنے قلوب کو بندوقوں اور توپوں کی اُس گرج کے لئے تیار کر رہے ہوتے جو اُن کی راتوں کی نیند حرام کرنے والی تھی تو اکثر شامیں یوں گزرتیں کہ ایک جب اپنے خیمے میں استراحت کے لئے جاتا تو دوسرا اُس کو کڑکڑاتی سردی سے بچانے کے لئے اپنا لبادہ فرش پر بچھا دیتا اور پھر الگ ہو کر کہتا، "سلام آقا" فوجی افسر کو یوں معلوم ہوتا کہ اُس کے اردلی کی آواز لرز رہی ہے اور آخری لفظ اُس کے منہ سے پوری طاقت کے ساتھ نکلا ہے۔ چنانچہ وہ بھی اسی انداز سے سلام کا جواب دیتا۔ بعض اوقات جب ایک خط لا کر دوسرے کو دیتا اور دوسرا بے صبری سے اُسے لینے کے لئے اپنا ہاتھ بڑھاتا تو دونوں کے چہرے ہلکی مسکراہٹ سے چمک اُٹھتے۔

"یہ خط تمہارے گھر سے آیا ہے۔ میں اس کا اندازِ تحریر پہچانتا ہوں۔ یہ تمہاری ماں کا خط ہے،" آنکھوں ہی آنکھوں میں اُن میں سے ایک کہتا۔

"میں تمہارا ممنون ہوں۔ تم نے مجھے مسرت کا خزانہ بخش دیا ہے،" دوسرا خاموشی کی زبان میں جواب دیتا۔

یہ زمانہ بھی گزر گیا اور وہ پھر اپنی معمولی خاموش اور سنجیدہ زندگی میں واپس آ گئے۔ لیکن کبھی یہ نہ ہوا کہ افسر کے سامنے آتے ہوئے یا اُس سے رخصت ہوتے ہوئے پُر غرور سپاہی اپنے ہاتھ کو ایک شجاعانہ حرکت کے ساتھ سلام کے لئے ماتھے تک نہ لے گیا ہو اور پھر سر کو اوپر اُٹھا کر اُس نے سیدھا اُس کی آنکھوں میں نہ دیکھا ہو۔ اور جب کبھی وہ رخصت ہونے کے لئے پلٹا اُس نے ہمیشہ فوجی آداب و قواعد کی پابندی کی۔

اُنہیں ایک دوسرے کے ساتھ رہتے صرف چار سال ہوئے تھے۔ مگر سپاہی جسے ملازمت کے پہلے سال کے بعد اردلی بنا دیا گیا تھا اب اپنی مدتِ ملازمت ختم کر رہا تھا۔

ایک دن حکم موصول ہوا کہ فوج کی اُس جماعت کو سبکدوش کر دیا جائے جس سے اردلی تعلق رکھتا ہے۔

اُس دن آقا اور ملازم کی نگاہیں معمول سے زیادہ دفعہ ایک دوسرے کی طرف اُٹھ اُٹھ کر مخاطب ہوتی تھیں۔ مگر اُن کے دل نگاہوں سے بھی کچھ زیادہ کہنا چاہتے تھے۔

"میرے لئے کوئی اور حکم ہے؟"

"ہاں ہے، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تم لوگوں کو سبکدوش کردینے کا حکم آیا ہے۔ دس دن کے اندر اندر تم اس مقام کو چھوڑ دو گے"

"اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ دونوں کی نظریں جھکی ہوئی تھیں۔

"میں جا سکتا ہوں؟"

"ہاں اگر تم جانا چاہتے ہو تو جا سکتے ہو"

معمول سے زائد یہ چند الفاظ پائے شوق کو جادۂ مہر و محبت پر کہیں سے کہیں لے گئے۔

اُن کے دل ایک دوسرے کے لئے مضطرب و بے قرار تھے لیکن دونوں کی بے قراری کا ایک وجہ نہ تھا۔ ایک اپنے دوست سے جدا ہو رہا تھا، اُس دوست سے جو اُس کے لئے دوست سے بھی بڑھ کر تھا، جسے وہ بھائی سمجھتا تھا اور جسے اُس کے ساتھ ایک قسم کی فطری محبت تھی۔ دوسرا بھی بیشک اپنے دوست سے جدا ہو رہا تھا لیکن کم از کم وہ اپنے ماں باپ کے گھر کو واپس جا رہا تھا۔

اور اُس کے لئے یہ خیال بڑی مسرت کا باعث تھا کہ اتنی مدتِ دراز کے بعد اتنی تکلیفوں کے بعد اب وہ گھر پہنچنے والا ہے۔ کیمپ میں بارہا اُس نے بگل کی الم انگیز آواز سنی تھی جس کے معنی یہ ہوتے تھے کہ "روشنیاں گل کردو" پھر اُس نے خیموں میں ایک ایک بتی کو گل ہوتے دیکھا تھا اور یوں جب اُس ناپائیدار شہر پر جس کی دیواریں ٹاٹ کی بنی ہوئی تھیں ایک گہری خاموشی چھا جاتی تھی تو کتنی دفعہ ان غم افزا لمحوں میں سر کو اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے ہوئے اُس نے اپنی ماں کا خیال کیا تھا کہ "میری غریب ماں اس وقت کیا کر رہی ہوگی؟" اُس نے اکثر رات کے وقت اپنے ملکیوں کو ٹولیاں باندھ کر وہ میٹھے میٹھے گیت گاتے سنا تھا جنہیں اپنے گاؤں کے کھیتوں کی نگہبانی کرتے ہوئے گرمی کی چاندنی راتوں میں وہ خود گایا کرتا تھا۔ اُس وقت اُسے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اُس کے تمام اعزہ و اقربا اُس کے آس پاس بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ پھر اُس گیت کی چاندی جیسی صاف اور لرزتی ہوئی لے میں وہ آوازیں دب جاتیں اور گیت اُس کے دل میں اُتر جاتا۔ آہ کتنی دفعہ اُس نے ان گیتوں کو اپنی ماں کی دعاؤں کا مترادف جان کر قابلِ احترام سمجھا تھا! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ گھر پہنچنے کا خیال! خلاف توقع جا پہنچنے کا خیال اُس کے دل کو گدگدا رہا تھا گاؤں اور اُس کے مکان اُسے دُور ہی سے نظر آجائیں گے، اپنے مکان کی چھت کو وہ دُور ہی سے پہچان لے گا، اُس کے قدم تیز تیز اُٹھنے لگیں گے، جب وہ گاؤں میں داخل ہوگا تو اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا ہوگا، اُس کی چھوٹی سی بہن اب بڑی

ہوگئی ہوگی اور اُس کا بھائی بھی اب بالکل جوان ہوگا۔ لوگ خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اُس کے گرد جمع ہوجائیں گے پھر وہ اُن سے اپنا پیچھا چھڑا کر گھر کی طرف بھاگے گا، اماں اماں کہہ کر اپنی بوڑھی ماں کو بلائے گا، وہ اُسے دیکھے گی اور باہیں پھیلا کر آنسوؤں بھری آنکھوں سے اُس کی طرف آئے گی۔ اور وہ اپنے آپ کو اُس کی آغوش میں ڈال دے گا۔ اور اُس آغوش میں پہنچ کر اُس انسانی خوشی کو پالے گا جو دنیا کی سب خوشیوں سے زیادہ محترم ہے۔ یہ خیالات بجائے اُس کی تمام تلخیوں میں حلاوت پیدا کر دینے کے لئے اور تمام زخموں پر مرحم لگا دینے کے لئے کافی تھے۔

تاہم اُس کا دل نہ مانتا تھا کہ اُسے اُس کے آقا سے اس قدر جلد جدا ہونے پر مجبور کر دیا جائے۔ ایک سپاہی کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ اُس پرانے کمبل کو پھینک دے جسے سالہا سال تک اُس نے اوڑھنے بچھونے اور تکیے کے طور پر استعمال کیا ہو جس کی مدتوں اُس نے حفاظت کی ہو اور پھر اُس کا دل ایک شکست سی محسوس نہ کرے اور اُس میں محبت و موانست کی بے چینی سی پیدا نہ ہو جیسی ایک دوست کے جدا ہونے سے ہوتی ہے۔

نیک دل افسر اب متفکر رہنے لگا تھا مگر اُس نے اپنی روزمرہ کی معمولی گفتگو میں ایک لفظ کا اضافہ بھی نہ کیا۔ سپاہی کا بھی یہی حال تھا مگر دونوں کی نظر، بس بار بار اب ایک دوسرے کی جانب اٹھتی تھیں "تم مغموم ہو، میں جانتا ہوں تم مغموم ہو" اردلی اب اپنے فرائض کو پہلے کی طرح جلد جلد انجام نہ دیتا تھا، وہ اپنے آقا کی صحبت میں زیادہ دیر تک ٹھہرنے کے لئے سست ہوگیا تھا اور جدائی کی اُن گھڑیوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھا جو اُس کی طرف بڑھتی چلی آرہی تھیں۔ پہلے تو وہ ایک خاص آہستگی کے ساتھ اور پھر ایک بناوٹی سستی کے ساتھ میزوں، کرسیوں کو صاف کرنے کے لئے بڑھتا مگر اکثر اپنے خیالات میں گم ہو کر رومال کو اُن کی سطح سے اوپر ہی اوپر ہلاتا رہتا۔ اس اثنا میں اُس کا افسر سینے پر ہاتھ باندھے ہوئے بے حس و حرکت اس آئینہ کے سامنے کھڑا ہو جاتا جس میں اُس کے اردلی کا عکس پڑ رہا ہوتا۔ وہ اُس کی حرکات و سکنات کو غور سے دیکھتا اُس کے چہرے سے اُس کے جذبات کا مطالعہ کرتا لیکن جب کبھی اُن کی آنکھیں آئینہ میں ایک دوسرے سے ملنے لگتیں وہ بے اعتنائی کے انداز میں چھت کی طرف دیکھنے لگتا۔

"آقا میں جا سکتا ہوں؟"

"جاؤ"

اور سپاہی چلا گیا۔

وہ ابھی دو سیڑھیاں ہی اترا ہوگا کہ کمرے سے آواز آئی "ادھر آؤ" اور وہ پلٹا۔

"کوئی اور حکم ہے؟"

"نہیں۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا ..... نہیں نہیں اب کل ہی کرنا، جاؤ"

شاید اُس نے صرف اُسے دیکھنے کے لئے دوبارہ بلایا تھا اور جب وہ اُسے دیکھ چکا تو اُس نے اپنی نظریں اُس دروازے پر گاڑ دیں جس میں سے گزر کر اُس کا اردلی ابھی گیا تھا۔

آخر رخصت کا دن آ گیا۔ افسر اپنی چھوٹی میز پر نیم باز دروازے کے سامنے بیٹھا تھا۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد اب اردلی اُس سے آخری رخصت لینے کو آئے گا۔ افسر سگار پی رہا تھا، اُس کے دھوئیں کے مرغولے چھت کی جانب اُڑا رہا تھا اور حیران نظروں سے بادلوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دھوئیں سے بار بار اُس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے اور وہ متعجب تھا کہ میں رو تو نہیں رہا مگر ایسے لیسے بڑے بڑے آنسو کیوں میری آنکھوں سے گر رہے ہیں! وہ آنسوؤں کا باعث دھوئیں کو قرار دے کر اپنے جذبات کے متعلق نفس کو دھوکا دینا چاہتا تھا۔

اور وہ خیالات میں غرق رہا، ہاں، وہ اب روانہ ہونے کے لئے تیار ہو چکا ہوگا۔ کیوں پھر میں اُس جدائی کو اپنے دل سے لگاؤں۔ کیا جب میں نے اس لڑکے کو اپنا اردلی مقرر کیا تھا اُس وقت میں نہ جانتا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے اُسے اپنے ساتھ نہ رکھ سکوں گا؟ کیا میں واقف نہ تھا کہ اُس کی مدتِ ملازمت صرف پانچ سال ہے؟ آخر اس شخص کا ایک گھر ہے جہاں وہ پیدا ہوا اور بڑھا، اُس کے رشتہ دار ہیں جنہیں اُس نے غم کی حالت میں چھوڑا اور جن سے اب خوشی کے ساتھ وہ ملے گا۔ کیا مجھے اُس سے یہ توقع رکھنی چاہئے کہ وہ ہمیشہ کے لئے ایک اردلی کی حیثیت سے میرے پاس رہے؟ یہ میری خود غرضی ہوگی ..... میں کیا سوچ رہا ہوں؟ میں واقعی خود غرض ہوں۔ آخر احسان کا وہ کونسا بندھن ہے جو اُس کو مجھ سے جدا نہ ہونے دے؟ وہ میری کس بات کا ممنون ہے؟ میں نے اکثر اُسے اپنی بدمزاجی کا تختۂ مشق بنایا، میں نے ہمیشہ اُس کے خلاف تحکمانہ طرزِ عمل اختیار کیا ..... مگر یہ میری فطرت ہے اور میں اس کے خلاف نہیں کر سکتا۔ مناسب الفاظ مجھے نہیں ملتے اور پھر ..... ملازمت کے سلسلہ میں ایسے الفاظ کو ادا بھی کون کر سکتا ہے؟ مگر میں اُسے ایک ایسا چہرہ دکھا سکتا ہوں جس سے زیادہ انسانیت نمایاں ہو ..... اور اب وہ جا رہا ہے، وہ اپنے گاؤں کے کھیتوں میں مشقت کرنے کے لئے جا رہا ہے، وہاں وہ اپنی سابقہ طرزِ زندگی اختیار کر لے گا، رفتہ رفتہ فوجی عادات اُس کی طبیعت سے رخصت ہو جائیں گی، اسے سب کچھ بھول جائے گا ..... اپنی رجمنٹ، اپنے ساتھی، اپنا افسر، وہ بے پروا ہو کر اپنی زندگی مسرت و انبساط میں گزارے گا لیکن کیا میں اُسے بھلا سکوں گا؟ کتنا وقت درکار ہے کہ میں کسی نئے چہرے کے دیکھنے کا عادی بنوں؟ صبح کے وقت جاگنے پر مجھے ایسا معلوم ہوا کرے گا جیسے وہ نہایت تن دہی سے اپنے کام میں مصروف ہے مگر وہ نہایت خاموشی سے حرکت کر رہا ہے اور سانس بھی لیتا ہے تو رک رک کر کہیں میں وقت سے پہلے ہی نہ جاگ اٹھوں۔ آہ کتنی دفعہ میں جاگ کر بھی اُس کے نام سے اُسے نہ بلا سکوں گا، سالہا سال کی رفاقت، محبت اور خدمت گزاری اور ..... اُسے یوں جدا ہوتے دیکھنا ..... روز

بہ ہوز۔۔۔۔ لیکن یہ ہماری زندگی ہے اور ہمارے لیئے اس پر قانع ہونا ضروری ہے ۔۔۔۔۔ وہ کتنا نیک تھا اُس کا دل، وہ ایک گوہرِ گراں مایہ تھا! اگر کبھی سفر میں تکان، گرمی اور گرد سے پژمردہ وافسردہ ہوکر میں کہیں ایک لحظہ کے لیئے ٹھہر گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا تو کسی نے جھٹ میرے ہاتھوں میں پانی سے بھرا ہوا برتن دے دیا اور ایک آواز میرے پہلو میں سے آئی "تمہیں پیاس لگ رہی ہے؟"

میں نے دیکھا تو یہ وہ تھا۔ وہ چپ چاپ اپنی قطار کو چھوڑ کر پانی کے لئے بھاگ اُٹھا تھا اور خبر نہیں کہاں اور کتنی دُور چلا گیا تھا۔ پھر ایک آن کی آن میں وہ واپس بھی آگیا تھا اور ہانپتا ہوا پسینے میں ڈوبا ہوا اور بے تاب و تواں ہوکر میرے پیچھے کھڑا تھا۔ کیمپ میں اگر کبھی میں کسی درخت کے سایہ میں سوگیا اور رفتہ رفتہ سورج اپنی کرنیں میرے چہرے پر ڈالنے لگا تو فوراً کسی ہمدرد ہاتھ نے درخت کے پتوں کو ترتیب دے کر مجھ پر چھاؤں کردی یا چند اسلحہ کو جوڑ کر اُن پر ایک کوٹ ٹانگ دیا۔ یہ وہی ہوتا تھا، ہمیشہ وہی ہوتا تھا اکثر چھ سات یا آٹھ گھنٹے کے پیدل سفر کے بعد بمشکل ہم کسی جائے قیام پر پہنچ کر اپنے خیمے کھولتے تھے کہ وہ غائب ہوجاتا تھا۔ میں اُس کو ڈھونڈتا پھرتا تھا، پورے زور سے چلا چلا کر اُسے آوازیں دیتا تھا اور آخر غصہ میں آکر کہتا تھا "اب بتاؤ وہ کہاں ہے؟ کسی کو خبر بھی ہے وہ کہاں چھپ گیا؟ کیا یہ اچھی روش ہے؟ ٹھہرو، میں اسے درست کرتا ہوں"۔ اور اسی طرح اس قسم کی باتیں کہتا جاتا۔ کچھ دیر کے بعد میں دیکھتا کہ وہ دور سے گھاس کے بوجھ کے نیچے دبا ہوا، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے چلتا ہوا دائیں بائیں اُن لوگوں سے لڑتا ہوا جو اُس سے گھاس کی ایک مٹھی چھیننا چاہتے تھے، خیموں کی رسیوں میں الجھتا ہوا، دھوپ میں پھیلائے ہوئے تھیلوں اور قمیضوں کو روندتا ہوا اور لعنت ملامت کا ایک طوفان اپنے سر پر لیتا ہوا چلا آرہا ہے۔ وہ میرے پاس پہنچا، گھاس کو نیچے پھینک کر ایک لمبی سانس بھرتا اپنی پیشانی سے پسینہ صاف کرتا اور ڈرتے ڈرتے مجھ سے کہتا "میں نے تمہیں بہت انتظار دکھایا۔ مگر میں کر ہی کیا سکتا تھا۔ مجھے گھاس کے لیئے بہت دُور جانا پڑا"

پھر وہ گھاس کو زمین پر بچھا دیتا، ایک طرف اُس کے نیچے اپنا تھیلا سرہانے کے طور پر رکھ دیتا اور میری طرف مڑ کر کہتا "یوں ٹھیک ہے نا"

نیک دل آدمی، میں دل میں سوچتا، تجھ سے میری خفگی ناروا تھی۔ پھر میں اُس سے کہتا "جاؤ"۔۔۔۔۔ جاؤ اور آرام کرو، کیونکہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے"۔

"لیکن کیا یہ کافی ہے؟" وہ بہ اصرار کہتا "اگر یہ کافی نہیں تو میں ابھی جاکر اور لے آتا ہوں"

میں کہتا "ہاں ہاں، یہ بہت ہے جاؤ اور آرام کرو، جاؤ اور وقت ضائع نہ کرو"۔

اور اگر کبھی رات کو چلتے چلتے نیند سے مغلوب ہوکر میرے ڈگمگاتے ہوئے قدم مجھے سڑک کے اُس کنارے سے اس کنارے کی طرف لے جاتے اور میں کسی خندق میں گرنے کو تیار ہوتا تو اُس وقت ایک ہلکا سا ہاتھ میرے بازو کو آکر چھوتا اور مجھے آہستہ سے سڑک کے وسط کی

طرف دھکیل دیتا اور ایک دبی ہوئی اور ڈری ہوئی آواز میرے کانوں میں آتی "آقا، دیکھو آگے ایک گڑھا ہے"۔ تب بھی یہ وہی ہوتا تھا۔ میں نے اُس کے لئے کیا کیا تھا کہ وہ اس بے غرضی اور جاں نثاری کے ساتھ مجھ سے محبت کرتا تھا؟ مجھ میں وہ کیا وصف ہے جس کے لئے وہ اپنی ساری توجہ مجھ پر صرف کرتا تھا؟ مجھ پر جسے ہمیشہ اپنا ہی خیال رہتا ہے؟ مجھے یقین ہے کہ وہ اپنی زندگی بھی میرے لئے دے دے گا۔ کس وجہ سے اور کس طرح پر سیدھی سادی شکل وصورت کا یہ غریب لڑکا جس کے ہاتھ پھاوڑا چلا چلا کر سخت ہو چکے ہیں جس کا جسم محنت ومشقت سے مضبوط ہو چکا ہے، جس کی کوئی تربیت وتہذیب نہیں ہوئی، جو ایک جھونپڑے میں پیدا ہوا اور پلا اور جو شہر کے تمدن ومعاشرت سے ناواقف رہا ایک متمدن اور تہذیب یافتہ خاتون سے بھی زیادہ دھیما اور نرم مزاج پا گیا۔ وہ میری نیند اچٹ جانے کے خوف سے اپنا سانس روک لیتا ہے۔ وہ میرے کپڑوں کو بچا بچا کر ہاتھ لگاتا ہے کہ انہیں کوئی گزند نہ پہنچ جائے۔ وہ میرے خط کو اس احتیاط سے پکڑتا ہے کہ صرف اُس کے سرِ انگشت ہی اُس کو چھوتے ہیں تاکہ وہ کہیں آلودہ نہ ہو جائے اور وہ میرے ایک التفات کے تبسم اور میرے ایک مہربانی کے لفظ ہی سے اتنا خوش ہوتا ہے گویا اُسے اپنی تمام خدمت گزاری کا معاوضہ مل گیا۔ وہ اپنے ایک اشارہ میں اپنی ایک سادہ نظر میں میری پسند وناپسند دریافت کر لیتا ہے۔ یہ ایک یقینی بات ہے کہ اُس شخص کا دل جو سپاہی نہیں یا جس نے کبھی سپاہیانہ زندگی نہیں گزاری فوجی کپڑوں میں اُن نئے نئے جذبات سے آشنا ہوتا ہے جن سے پہلے وہ ناواقف تھا۔ لوگ سوائے اُس جذبہ کے جو ہمارے دلوں کو ایامِ جنگ میں جوش سے بھر دیتا ہے اور کوئی جذبہ ہم سے منسوب ہی نہیں کرتے اُن کو ہماری طبیعتوں سے کتنی کم واقفیت ہے! سپاہی کا دل نہ صرف یہ کہ کبھی بوڑھا نہیں ہوتا بلکہ بوڑھا ہو کر پھر نئی جوانی حاصل کرتا ہے اور جوانی کے لطیف سے لطیف جذبات اُس میں پیدا ہوتے ہیں۔ انہیں جذبات میں وہ رہتا سہتا ہے اور جنگ کے طوفان خیز اور خطرناک سرور سے بہت زیادہ کیف اُسے ان میں حاصل ہوتا ہے .... کوئی شخص بھی جو سپاہی نہیں میرے اُس جذبۂ شوق کو نہ سمجھ سکے گا جو مجھے اس نوجوان سے وابستہ کئے ہوئے ہے! یہ ناممکن ہے! میرے جذبات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تم متعدد راتیں کیمپ میں گزار چکے ہو یا گرمیوں کی جھلس دینے والی دھوپ میں لمبے لمبے سفر کر چکے ہو، موسلا دھار بارش میں کھڑے ہو کر پہرے دے چکے ہو، بھوک اور پیاس کی شدت میں تمہاری حالت غشی کے درجہ کو پہنچ گئی ہو اور ان سب حالات میں تمہاری معیت میں ایک دوست ہو جو تمہیں سردی کے اثر سے بچانے کے لئے اپنا کوٹ تم پر ڈال دے۔ پیاس میں تمہیں پانی کے دو گھونٹ لا دے بھوک میں غذا کے چند لقمے پیش کر دے اور اس طرح کہ خود ان سب نعمتوں سے محروم رہے۔ نوکر! ایسے شخص کو تم خانہ زاد کہہ سکتے ہو؟ نہیں ایسی باتیں اُس سے منسوب کرنا کفر ہے۔

جب یہ شخص میری دہلیز پر قدم رکھتا ہے اور محبت آمیز اطاعت کی نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ اُٹھا کر مجھے سلام کرتا ہے تو وہ اشارہ جس سے میں اُس کا سلام قبول کرتا ہوں تعظیم کے اُس اشارہ کا ہم پایہ ہوتا جو اُس کے ہاتھ کو اُس کی ٹوپی تک لے جاتا ہے۔ اور میرا یہ وفادار ہمدم آج مجھ سے رخصت ہو جانے والا ہے، مجھے چھوڑ جانے والا ہے اور پھر میں اُس کو کبھی نہ

دیکھوں گا۔نہیں! نا ممکن ہے ایسا میں اُس کے وطن میں اُس سے ملنے جاؤں گا۔ مجھے اُس کے قصبہ کا نام یاد ہے میں وہاں جاکر اُس کے گاؤں اور کھیتوں کا پتہ دریافت کروں گا میں وہاں پہنچ کر اُس کو حیران کر دونگا اور اُسے اُس کا نام لے کر پوچھوں گا "کیا تم اپنے افسر کو نہیں پہچانتے؟" "میں اپنے سامنے کسے دیکھ رہا ہوں! آقا، تم! یہاں!" وہ متاثر ہو کر جواب دے گا اور میں کہوں گا "ہاں میں تمہارے دیکھنے کے لئے یہاں آیا ہوں! آؤ میرے پیارے سپاہی، آؤ اور میرے گلے سے لگ جاؤ!"

وہ اِن خیالات میں محو ہے کہ اُسے سیڑھیوں پر کسی کے سست اور ناہموار قدموں کی آواز سنائی دیتی ہے۔ جیسے کوئی متامل اور ہچکچاتا چلا آرہا ہے اور اپنے قدموں کو روک روک کر اوپر چڑھتا ہے۔ وہ اس آواز کو بغیر اُس طرف متوجہ ہوئے سنتا ہے، آواز قریب آپہنچتی ہے اُس کے دل میں ایک فشار سا پیدا ہوتا ہے۔ وہ مڑ کر دیکھتا ہے۔ وہ وہی ہے... یقیناً وہ وہی ہے ..... اُس کا اردلی۔

اردلی کے چہرے سے پریشانی کے آثار نمایاں ہیں اُس کی آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔ وہ سلام کے لئے ہاتھ اُٹھاتا ہے پھر ایک قدم آگے بڑھ کر کھڑا ہو جاتا ہے اور اپنے افسر کو تعظیم دیتا ہے۔ مگر افسر اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیتا ہے۔

"آقا میں جا رہا ہوں"

"رخصت" افسر اپنے ہونٹوں کو بمشکل کھولتے ہوئے جواب دیتا ہے اور دوسری ہی طرف دیکھتا رہتا ہے "رخصت ... تمہیں سفر پر جانا مبارک ہو، ... اپنے گھر پہنچو ..... اور وہاں بھی ایک ایسی ہی پاک پاکیزہ زندگی بسر کرو جیسی تم یہاں کر چکے ہو، اور ... خدا حافظ"

سپاہی نے ایک قدم اور آگے بڑھایا اور لرزتی ہوئی آواز میں بولا "آقا!"

"جاؤ، جاؤ، ورنہ تمہیں دیر ہو جائے گی، جاؤ تمہیں پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔"

اور اُس نے اپنا ہاتھ بڑھا دیا جسے سپاہی نے اپنے ہاتھ میں لے کر نہایت گرمجوشی سے دبایا "تمہیں یہ سفر مبارک ہو ..... اور مجھے بھولنا نہیں۔ اپنے افسر کو کبھی کبھی یاد کر لیا کرنا۔"

غریب آدمی جواب دینا چاہتا ہے، وہ اپنی زبان سے کسی لفظ کو ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن کچھ نہیں کہہ سکتا، افسر کا ہاتھ ابھی اُس کے ہاتھ میں ہے وہ افسر کی طرف دیکھتا ہے جس کا منہ ابھی تک دوسری طرف ہے، ایک قدم اور آگے بڑھتا ہے ..... "آقا" ایک ہچکی کے ساتھ اُس کے منہ سے نکلتا ہے۔

اور وہ بھاگ کر چلا گیا۔

افسر اکیلا رہ گیا، مڑ کر اُس نے تھوڑی دیر دروازے کی طرف دیکھا پھر اپنی کہنیوں کو میز پر ٹیک کر اُس نے اپنے سر کو اپنے ہاتھوں میں چھپا لیا۔ دو بڑے بڑے آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے اور جلدی سے اُس کے رخساروں پر سے ڈھلک گئے تاکہ اُن پر کسی کی نظر نہ پڑ جائے۔ اُس نے اپنا ہاتھ اپنی آنکھوں پر پھیرا، اپنے سگار کی طرف دیکھا، جو بجھ چکا تھا اور اب وہ سچ مچ رونے لگ گیا۔ اُس نے اپنا سر اپنے بازوؤں پر گرا دیا اور اپنے آپ کو غم و اندوہ کے حوالے کر دیا۔

منصور احمد

# آہنگِ تپش

موت آتی نہیں قرینے کی
یہ سزا مل رہی ہے جینے کی

مے سے پرہیز۔ شیخ! توبہ کرو
اک یہی چیز تو ہے پینے کی

دل بھی ڈوبا جو ڈبڈبائی آنکھ
خیر ہو یارب اس سفینے کی

تمہیں کہتا ہے آئینہ خود بیں
باتیں سنتے ہو اس کمینے کی

جس پہ کندہ نہیں تمہارا نام
خاک ہو قدر اُس نگینے کی

ہو گیا جب سے بے نقاب کوئی
شمع روشن نہ پھر کسی نے کی

چشمِ تر! آبرو تو پیدا کر
یوں نہیں بجھتی آگ سینے کی

اہلِ حیرت کے دل ہیں بیٹھے ہو
آڑ پکڑی ہے آبگینے کی

اہلِ دنیا سے کیا بدی کا گلہ
اے تپش تو نے کس سے کی نیکی

عبداللطیف تپش

---

# غزل

برگشتگیٔ بخت کو یارب میں کیا کہوں
اپنا قصور مانوں، کہ تیری رضا کہوں

اپنے کیے کی آپ ہی بھگتوں سزا اگر!
تو کون ہے؟ کہ اس پہ بھی تجھ کو خدا کہوں

عقل و شعور جس کی حقیقت نہ پا سکے
دل مجھ سے پوچھتا ہے کہ میں اُس کو کیا کہوں

وعدوں نے تیرے توڑ دیا اعتبارِ حسن
وعدے کو تیرے کیوں نہ فریبِ وفا کہوں

دنیا بجھے بُرا کہے، ظالم کہا کرے
لیکن میں چاہتا ہوں تجھے مرحبا کہوں

اس حال کو کہ کوئی تمنا نہیں رہی
جز حدِ ارتقائے تمنا میں کیا کہوں

پھر تو نے چھیڑا قصۂ غمہائے آرزو
تجھ سے زباں دراز کو غاصف میں کیا کہوں

غاصف ملانوی

# دشمن

دشمن، اور وہ بھی اس قدر پست فطرت کمینہ! میری طبیعت میرے قابو سے باہر ہو رہی تھی۔ جوش اور غضب اور نفرت اور حقارت اور کینہ اور انتقام کے خلاف واعظوں کے سب اقوال مجھے یاد تھے، لیکن اُس وقت میں دنیا بھر کے واعظوں کو احمق اور کندۂ ناتراش سمجھ کر کوس رہا تھا —— اگر وہ لوگ خود ایسی صورتِ حالات سے دوچار ہوں تو انہیں قدرِ عافیت معلوم ہو۔ دوسروں پر پند و موعظت کے دفتر کھول دینا کس کو نہیں آتا؟ وہ اک جہان کی ادب آموزی کا اجارہ لئے اپنے گھر کی پُرامن چاردیواری میں بند بیٹھے رہتے ہیں اور جتنے جہاں دیدہ بنتے ہیں، اُتنے ہی دنیا کی حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ وہ کیا جانیں کہ جس گلستاں میں وہ قید ہیں، اُس کی تنگ اور دلفریب فضا کے باہر پتھریلے ٹیلے اور سنگلاخ گھاٹیاں بھی ہیں۔ دنیا صرف بلبل و قمری کی شکر افشانی کی جنت ہی کا نام نہیں، بلکہ جہنم کے اس ٹکڑے میں زہریلے بچھوؤں اور خونی سانپوں کی نیش زنی بھی بعض برگشتہ بختوں کی تلخ نوشی کی تواضع کے لئے موجود ہے۔

میرے دل میں غصہ کی آگ بھڑک رہی تھی —— وہ میرے خون سے اپنے دامن کو گلرنگ کرنا چاہتا ہے سو میں زندہ رہوں گا اور اُس کی اس آرزو کے بر آنے سے پہلے ہی اُس کو جہنم کی آگ کے شعلوں کے سپرد کر دوں گا۔

میں ایک خوفناک عزم کے ساتھ اُٹھا اور تلوار کمر میں باندھ کر گھر سے نکل کھڑا ہوا۔

آفتاب ڈھل کر افق کے قریب پہنچ چکا تھا۔ ہرے ہرے درختوں کے سائے دور دور تک پھیلے ہوئے تھے۔ پرندے شام ہونے سے پہلے پہلے اپنا آخری راگ ختم کر لینا چاہتے تھے۔ ہوا پتوں میں سرسراتی اور کوئی پُراسرار گیت گاتی ہوئی جا رہی تھی۔

ندی کے کنارے پہنچ کر میں کچھ دیر کے لئے رکا۔ اُس پار کچھ فاصلے پر اُس کے مکان کی سفید سفید برجیاں نظر آ رہی تھیں۔ آفتاب کی آخری شعاعوں نے مکان کے اردگرد کے درختوں میں آگ لگا رکھی تھی۔ دوسری طرف سورج کے سامنے سنہرے بادلوں سے پگھلے ہوئے سونے کا ایک چشمہ ابل رہا تھا اور سورج کی کرنیں پھٹے ہوئے بادلوں میں سے نکل نکل کر ندی کے پانی سے کھیل رہی تھیں۔

میری نظریں ندی کی سطح پر جم گئیں۔ مصفا پانی کی ہلکی ہلکی سی لہریں جن کے نیچے سفید سفید سنگریزے اور ریت کے نقرئی اور طلائی ذرے صاف نظر آ رہے تھے یوں معلوم ہوتی تھیں گویا بلور کی ننھی ننھی ٹکڑیاں بھی جا رہی

ہیں۔چند لمحوں کے لئے میں دنیا و مافیہا کو بھول گیا۔پھر میں نے کہا اِس جنت کو گناہگار انسان نے جہنم بنا دیا ہے۔ فطرت نے ہر چیز کو پاک بنایا ہے اور انسان کا دل سب سے زیادہ پاک ہے۔اُس وقت مجھ پر ایک پُراسرار کیفیت نے غلبہ پا لیا۔ ندی نور کا ایک ننھا سا سیلاب بن کر اُمڈی اور میرا دل اس سیلاب میں ڈوب گیا۔ پانی کی ننھی ننھی نورانی موجیں میرے دل کے اندر داخل ہوتیں، چمکتیں، اور مسکراتیں اور دل کو تلخ جذبات کی تمام آلائشوں سے پاک کرتی ہوئی پھر باہر نکل جاتیں۔کئی لمحوں تک میں اسی کیفیت میں غرق رہا۔ . . . . . اب میرا دل مسرور تھا۔ میں نے کہا دل فطرت کی امانت ہے، فطرت نے اس کو پاک بنایا ہے اور اس کو دنیا کے تند و تلخ جذبات کی کثافت سے پاک ہی رکھنا چاہئے۔

پھر میں اٹھا اور اپنے دشمن کے مکان کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا۔ میرا دل بالکل مطمئن تھا۔

وہ مجھے اپنے کمرے میں دفعتہً اور بے محابا داخل ہوتے دیکھ کر گھبرا گیا۔ وہ بزدل تھا، بہ مشکل اُس کے گلے سے یہ آواز نکلی:۔

"ارے کوئی ہے، چلو!"

میں نے تلوار کمر سے کھول کر باہر پھینک دی۔پھر میں مسکراتا ہوا آگے بڑھا اور اُس سے بغل گیر ہو گیا۔ اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔اور اُس کے چہرے پر حیرت اور خوف کی ایک کشمکش نظر آتی تھی۔ مجھے اُس وقت سچی مسرت اور حقیقی اطمینان حاصل تھا۔میرے دل میں اب بھی ندی کے شفاف پانی کی ننھی ننھی شیریں موجیں چمکتی ہوئی مسکراتی ہوئی، بہی جا رہی ہیں۔میری آنکھوں میں دو موتی کے سے قطرے، دو شفاف آنسو ٹپک کر اُس کے زرد چہرے پر بہنے لگے۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا "بھائی! فطرت نے ہمارے دلوں کو پاک بنایا ہے"!

حامد علی خاں

---

اے دوست دل از جفائے دشمن درکش | با زآئے و نکو شراب روشن درکش
با اہل ہنر دگر گریباں بکشائے | وز نا اہلاں تمام دامن درکش

حافظ

# محفلِ ادب

## مرہٹی شاعری

### جلوۂ حق کا شوق

"میری روح تیرے دیدار کی تمنا ہے اور میں تجھے دیکھنے کے لئے دن رات روتا ہوں۔ چکور ماہِ کامل کو دیکھ کر جیتا ہے۔ نئی نویلی دلہن دیوالی کے دن بڑے شوق سے اپنی ماں کے بلاوے کی راہ دیکھتی رہتی ہے۔ ایک بھوکا بچہ روتے جاتا اور بڑی چاہت سے اپنی ماں کا انتظار کرتا ہے۔ میں بھی اے خدا تیرا پیاسا ہوں! ذرا اپنے جلوے سے میری پیاس بجھا۔

دلہن اپنی سسرال کو جاتے ہوئے بار بار مڑ مڑ کر دیکھتی ہے، اسی طرح اے کیشوا میں تجھے دیکھنا چاہتا ہوں۔ بچہ اگر اپنی ماں سے بچھڑ جائے تو بے چین ہو جاتا ہے اور مچھلی پانی سے باہر آ جائے تو اُسے کبھی قرار نہیں آتا۔"

"اے خدا! تو مجھے اب تک کیوں نہیں نظر آیا؟ اگر کسی کروڑپتی کا نوجوان بچہ چیتھڑوں میں لپٹا رہے تو لوگ کس پر الزام دھریں گے؟ ایک مشہور آدمی اپنی شہرت قائم رکھنے کے لئے بے قرار رہتا ہے۔ اگر تو حقیقت میں رحیم ہے جیسا کہ لوگ تجھ کو کہتے ہیں، تو مجھ مصیبت زدہ پر رحم کر۔"

"اگر کوئی ماں اپنے بچوں کی گردن کاٹنی چاہے، تو کون بچا سکتا ہے؟ اے خدا اگر تو علیم ہے تو مجھے کیوں ترساتا ہے؟ اگر خود ایک نگہبان قزاقی پر اُتر آئے تو اُس کا کیا علاج ہے؟ اگر کوئی بادشاہ رعیت کو کھسوٹنا چاہے تو اور کون حفاظت کر سکتا ہے؟ اے خدا میں تیرے ہاتھ میں ایک پتلی ہوں جس طرح جی چاہے مجھے نچا۔"

### شبنم کے قطرے

ایک بچہ بیل پر شبنم کے قطرے دیکھ کر اپنی ماں سے کہتا ہے :-

"یہاں یہ شبنم کے قطرے کہاں سے آ گئے؟ کل شام کو تو دکھائی نہیں دیتے تھے! دیکھو اماں، یہ موتیوں کی طرح کیسے خوبصورت معلوم ہوتے ہیں، سورج کی کرنوں سے کیسے ہیروں کی طرح چمکنے لگتے ہیں۔ اچھی اماں مجھے بتاؤ یہ بوندیں پہلے کہاں تھیں اور یہاں کیسے آ گئیں؟"

ماں نے بچّے کو پیار کیا اور آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا:-

"یہ بہت دور دراز سے آئے ہیں، جہاں سورج چاند اور ستارے چمکتے ہیں اور جہاں سے ہمارے ہاں مینہ کی ہلکی پھوار آتی ہے، وہیں سے یہ آئے ہیں، تو بھی اُسی جگہ سے ہمارے پاس آیا ہے"۔

اس پر بچّے نے کہا:- مجھے ان کے دیکھنے سے بڑی خوشی ہوتی ہے، اماں! کیا میں اُن میں سے دو ایک اٹھا لوں؟"

ماں نے کہا:- "نہیں نہیں میری جان! تم ان کو نہیں لے سکتے، جب تک یہ یہاں ہیں ان کو دیکھ دیکھ کر خوش ہو، سورج ان کو بہت جلد گرم کرنوں سے اٹھا کر اپنے گھر لے جائے گا" یہ آخری جملہ کہتے ہی ماں کا دم گھٹنے لگا اور اپنے گزرے ہوئے بچوں کو یاد کر کے اُس کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں۔

اُس نے سسکیاں لیتے ہوئے دعا مانگی "اے خدا کم از کم یہی بچہ میری زندگی کی برکت بنا رہے" یہ کہہ کر اپنے بچے کو چھاتی سے لگا لیا۔

## شام کی آمد اور رات کی کیفیت

"آفتاب نے جاتے جاتے اپنی زنگیلی محبوبہ (مغرب) کا بوسہ لے لیا، اس شرم کی وجہ سے اُس کے رخسار وں کی دبِنک سرخی جھلکتی رہی، لیکن ساتھ ہی جدائی کے غم کے آثار بھی اُس کے چہرے سے نمایاں تھے۔ عین اُس وقت ایک مسکراتی ہوئی دوشیزہ ایوانِ مغرب کے دریچے میں آ کر زرنگار پردے کو کھسکاتی ہے اور اپنی سہیلیوں کو پکارتی ہے، وہ دیکھو! اُس کی آواز کے ساتھ ہی اُس کی سہیلیاں دبے پاؤں لجاتی ہوئی آتی ہیں۔ تھوڑی دیر میں آکاش کی تمام کنیائیں یہاں جمع ہو جائیں گی۔ رات کی آمد کے ساتھ ہی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آسمان کے خزانے دنیا والوں کی نظروں کے سامنے بکھیر دیئے گئے ہیں، یا پھر دھرتی نے ہیروں اور لالوں جڑا مکٹ بانکپن کے ساتھ اپنے سر پر رکھ لیا ہے۔ یہ کنیائیں رات کی رانی کے دربار میں ناچیں، گائیں گی اور سارے سنسار کو خوشی سے بھر دیں گی۔ آسمان اور زمین آنکھ مچولی کھیل رہے ہیں اور ان کا باپ (خدا) انہیں دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہا ہے۔ وہ دیکھو پورب کے منہ پر ہلکی ہلکی مسکراہٹ آ رہی ہے۔ یہ دوسری سمتیں کس کے انتظار میں چشم براہ ہیں؟ اب قرصِ مہتاب نکلا۔ یہ رات کا عاشق ہے اور اس سے ملنے آیا ہے۔ رات اور چاند یعنی بیوی اور میاں ایک دوسرے سے ملاقات کرتے ہیں۔ ستارے آسمان کے نرم بچھونے پر چاند کی دی ہوئی سبک چادر اوڑھے سوتے ہیں۔

# دِل کا تیرتھ

وہ شخص جو صاف قلب اور پاک روح رکھتا اور تمام دنیوی ہستیوں کو ایک قوتِ برتر کے مظہرات سمجھتا ہے، بجائے خود ایک تیرتھ ہے اور تمام متبرک مقامات کو پاک و صاف کرنے کی قوت اُسی سے حاصل ہوتی ہے۔

(۲) وہ شخص جو حواس پر قابو رکھتا ہے میٹھے اور سچے بول بولتا ہے اور خود غرضی جس کے دل کے پاس نہیں پھٹکتی۔ جس کی آنکھیں پرائے مال کے لئے اندھی ہوں، جو دوسروں کی عیب گوئی کے لئے گونگا ہو وہ تمام جاتراؤں اور تیرتھوں کا بانی مبانی ہے۔"

"اردو"

# کوہساروں کی شام

آہ کوہساروں کی شام بھی کس قدر دلآویز ہوتی ہے! جب طوفان زدہ آسمان، جس پر دن بھر بادلوں کا سمندر موجزن رہا ہو، خاموش نظر آتا ہے اور نیلے پہاڑوں کے سلسلے دور تک پھیلے ہوئے سکون و اطمینان کا پیام دیتے ہیں اور اُن کی گود میں ننھے ننھے بادلوں کے ٹکڑے دن کی پُر اضطراب زندگی کے بعد تھکے ہارے خواب راحت لیتے ہوئے نظر آتے ہیں، اُس وقت شفق روپہلی کرنوں سے جگمگا اُٹھتی ہے اور وسعتِ آسمان صانعِ قدرت کی وحدت و سطوت کا پتہ دیتی ہے۔

آہ! اس وقت فضا میں کبھی تو خوشی و انبساط کی لہریں اٹھتی ہیں اور کبھی غم و افسردگی کی۔ مسافرِ مشرق کی وداع کے بعد جب شام وادیوں میں درختوں پر چھا جاتی ہے تو اس حسین منظر پر ایک ہلکا سا غم چھا جاتا ہے۔

# زندگی

زندگی ایک درخت ہے، خوشی اُس کے پتے۔ پتے نکلتے ہیں، بڑھتے ہیں، اور آخر کار جھڑ جاتے ہیں۔
زندگی ایک درخت ہے، رنج اُس کی جڑیں۔ پتے جھڑ چکے، شاخیں برہنہ ہوگئیں، مگر جڑیں ابھی زمین کی آغوش میں ہنوز موجود ہیں۔

وہ تھی عارضی خوشی اور یہ ہے دائمی رنج اور اس مجموعہ کا نام ہے ——— "زندگی"

"عصمت"

# تبصرہ

**گلشنِ حیات** - مولفہ سید معین الدین احمد صاحب فیض - اس کتاب میں صوبہ بہار کے زندہ جاوید ادیب شاعر مولانا سید علی محمد صاحب شاد عظیم آبادی کی سوانحعمری اور اُن کے تلامذہ کے مختصر تذکرے ہیں - مولانا کے علمی و ادبی کارناموں کا ذکر نہایت عمدہ پیرایہ میں کیا گیا ہے - کتاب کے آخر میں مولانا کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ کلام کا انتخاب بھی درج ہے - حجم ۱۹۴ صفحات اور قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے - ملنے کا پتہ : قیس رضوی، اقبال منزل، لودی کٹرہ، شہر پٹنہ -

**لطائف الشعرا** ، مرتبہ حضرت ابوالکمال امروہی - اس کتاب میں اردو فارسی اور عربی زبان کے نہایت دلچسپ لطائف جمع کئے گئے ہیں - فرضی و وضعی اور غیر مہذب مضحکات سے پرہیز کیا گیا ہے جس سے مرتب کے مذاقِ سلیم کا پتہ چلتا ہے - دماغی کام کرتے کرتے جب ہم تھک جاتے ہیں تو ہمیں ایک ایسی ہی چیز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے - حجم ۴۴ صفحے ہے اور قیمت صرف آٹھ آنے رکھی گئی ہے - ابوالکمال صاحب امروہی، پارکر ہائی سکول مراد آباد سے طلب فرمائیے -

**باغِ فردوس** - سید ولایت علی صاحب فردوس مرحوم کی دلکش مثنوی ہے جس میں انہوں نے وہ مشہور قصہ نظم کیا ہے جسے میرزا رجب علی سرور نے "فسانۂ عجائب" کے نام سے نثر میں لکھا تھا اور جو چھپ کر بہت مقبول ہو چکا ہے - مگر پورا قصہ نظم نہیں کیا گیا بلکہ صرف ابتدائی حصہ - حجم ۴۵ صفحے ہے، اور قیمت ایک روپیہ چار آنے مقرر کی گئی ہے - الناظر پریس لکھنو سے طلب فرمائیے

**افکارِ محب** مولوی محب حسین صاحب معلمِ نسواں، توپخانہ گوشہ محل، حیدر آباد دکن کی عالمانہ اور فلسفیانہ غزلوں کا مجموعہ ہے انداز کلام سادہ اور سلیس ہے - جیسے

اے بتو صورتِ خدا ہو تم ۔۔۔ عینِ ہستی سے کب جدا ہو تم
بت پرستی خدا پرستی ہے ۔۔۔ اپنی ہستی میں خود خدا ہو تم

لیکن بعض اشعار ایسے بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں زبان پر پوری قدرت حاصل نہیں - مثلاً

لا الہ سے ہے نفی سب کی ۔۔۔ اور اللہ سے بقا ہو تم

حجم ۲۱۲ صفحے ہے - قیمت درج نہیں - جناب مصنف سے مل سکتی ہے -

**پہاڑی مقامات کی ملکہ** - پچیس صفحے کا ایک نہایت خوبصورت رسالہ ہے جسے ایجنٹ صاحب نارتھ ویسٹرن ریلوے لاہور نے شائع کیا ہے - اس میں مشہور صحت افزا مقام شملہ کے دلچسپ تاریخی حالات لکھے ہیں - سرورق پر ایک کوہستانی نظارہ کی رنگین تصویر بھی دی گئی ہے - ہمارے خیال میں رسالہ کا نام "پہاڑی مقامات کی ملکہ" کی بجائے "پہاڑی مقامات کا بادشاہ" ہونا چاہیئے -

جلد ۱۲ — نمبر ۴

# فہرستِ مضامین

## بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۲۸ء

### تصویر :- روحوں کی کشتی



| نمبر شمار | مضمون | صاحبِ مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جہاں نما | | ۷۲۲ |
| ۲ | روحوں کی کشتی کے ناخدا سے خطاب (نظم) | حامد علی خاں | ۷۲۶ |
| ۳ | سرمایۂ مشترک | مدڈرامی" | ۷۲۷ |
| ۴ | ذوقِ فطرت (نظم) | جناب میر سعادت حسین صاحب نجیبؔ | ۷۳۸ |
| ۵ | مضرابِ | جناب تاج محمد صاحب | ۷۳۹ |
| ۶ | رباعیات | جناب حامد اللہ صاحب افسرؔ میرٹھی | ۷۴۲ |
| ۷ | بکھرے ہوئے موتی | جناب محترمہ اخلاق فاطمہ صاحبہ | ۷۴۳ |
| ۸ | نشاۃ الثانیہ اور اصلاحِ مذہبی | بشیر احمد | ۷۴۴ |
| ۹ | حقّہ (نظم) | نامعلوم (مرسلہ جناب عبدالغفور صاحب مہجورؔ) | ۷۴۹ |
| ۱۰ | تاثرات (نظم) | جناب روشؔ صدیقی | ۷۵۰ |
| ۱۱ | اقوالِ زریں | جناب سید نیاز احمد صاحب ترمذی | ۷۵۱ |
| ۱۲ | رتناولی (افسانہ) | جناب منشی محمد عمر نور الٰہی صاحب | ۷۵۲ |
| ۱۳ | بزمِ یگانہ (رباعیات) | جناب میرزا یگانہؔ لکھنوی | ۷۵۸ |
| ۱۴ | بیش بہا زرد (افسانہ) | جناب شاہ عبدالرحمٰن صاحب سیوانی | ۷۵۹ |
| ۱۵ | آہ امیر علی مرحوم | جناب ابوالمکارم سلیم اللہ صاحب بی۔ اے | ۷۷۳ |
| ۱۶ | آنسو (نظم) | جناب مولوی سید ابو محمد صاحب ثاقبؔ کانپوری | " |
| ۱۷ | ایجادِ عظیم (افسانہ) | منصور احمد | ۷۷۴ |
| ۱۸ | محبت روح خاموشی بھی ہے (نظم) | بہارؔ | ۷۷۸ |
| ۱۹ | مفروضہ چینی ققنس کی تحقیق | جناب حاجی محمد صادق صاحب صادقؔ ایوبی | ۷۷۹ |
| ۲۰ | غزل | جناب ابوالمعانی اخترؔ شیرانی الافغانی | ۷۸۳ |
| ۲۱ | غزل | جناب قاضی احمد الیاس صاحب رساؔ ادھمی | " |
| ۲۲ | وقت کے بیش قیمت لمحے | منصور احمد | ۷۸۴ |
| ۲۳ | محفلِ ادب ۷۸۷ | ۲۴ تبصرہ | ۷۹۲ |

# جہاں نما

## ایران

سردار اقبال علی شاہ وہ بزرگ ہیں جنہوں نے مشرقی اسلامی ممالک کی سیاحت کے سلسلہ میں تقریباً چالیس ہزار میل کی مسافت طے کی ہے۔ اخبار "مارننگ پوسٹ" میں "مستقبل اسلام" کے عنوان سے انہوں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں ایران کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں :-

"موجودہ اسلام کی کوئی کہانی اُس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک کہ ہم اُن کوائف و حالات کا مطالعہ نہ کریں جو ایران اور افغانستان میں ظہور پذیر ہو رہے ہیں۔ ترکی اور عرب کی طرح یہاں بھی وہ یک دماغی کوششیں نمایاں طور پر نظر آ رہی ہیں جو وہاں کے بادشاہوں کے کام کو ممتاز کرتی ہیں۔ رضا شاہ پہلوی اور امان اللہ خاں دونوں ترکی کی بیداری کی تقلید کر رہے ہیں۔ دونوں انگورہ کے قومی رہنما کی طرح سمجھتے ہیں کہ مغربی اقتصادی دباؤ کا مقابلہ منظم اعتلاو ارتقاہی سے ہوگا اور اُس کے لئے محض یورپی طور طریقوں کا اختیار کرنا کافی نہیں۔

پہلوی ٹوپی جس کا پہننا ہر ایرانی اہلکار کے لئے ضروری ہے، فرانسیسی فوجی ٹوپی سے مشابہ ہے اور اُن کا لباس ہندوستانی سوار فوج کے لباس سے ملتا جلتا ہے لیکن حیران کن یہ بات ہے کہ جب ایک افسر بولتا ہے تو حافظ یا عمر خیام کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ بولتا ہے میں نے اس لئے کہا کہ میں نے کبھی کسی ایرانی کو چلاتے نہیں سنا، یہاں تک کہ قواعد کرانے والا تند و تیز سارجنٹ بھی آہستہ بولتا ہے۔

فوجی سازوسامان میں جدید ترین قسم کی بندوقیں، توپیں بلکہ ٹینک تک اُن کے پاس موجود ہیں اور طہران کے میدان سپاہ میں آپ ہر روز اُن کے دستے اور ٹولیاں دیکھ سکتے ہیں لیکن فوجی اکھڑ پن آپ اُن میں نہ پائیں گے۔ ایک دن دو سپاہی بھنے ہوئے چنے اور رس گھلے ہوئے پھل خرید رہے تھے اور اُن کے قریب ہی میں قواعد میدان کی تصویر اتار رہا تھا۔ ایک نے اُن میں سے پوچھا "ان تصویروں کو تم کیا کرتے ہو" دوسرے سپاہی نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر کہا "میں سمجھتا ہوں کہ یہ تصویریں یورپ جائیں گی"۔ پھر یہ دونوں اپنا من بھاتا کھاجا اڑاتے ہوئے مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اُسی وقت ایک موٹر آندھی کی طرح اڑتی ہوئی ہمارے پاس سے گزر گئی اور ہر سپاہی کو تعظیم کی طرف متوجہ کر گئی۔ یہ اُن کا بادشاہ تھا جو غیر متوقع طور پر کسی شعبہ کا معائنہ کرنے کے لئے جا رہا تھا۔

شام کے قریب پولیس کے ایک سپاہی سے جو چوک میں ایک چھوٹی سی چھتری کے نیچے کھڑا گاڑیوں کی آمدورفت

کی رہنمائی کررہا تھا۔ میں نے سینما کا پتہ دریافت کیا۔ وہ میرے ساتھ ہو لیا ـــ" روسی سینما یہ ہے" کہہ کر اُس نے مجھے جھک کر سلام کیا اور خود اُس ہجوم میں مل گیا جس میں مردوں کے علاوہ نقاب پوش عورتیں بھی شامل تھیں۔ میں اُن فلموں کو دیکھنے لگا جو ماسکو کے ہوائی راستوں کے ذریعہ سے ایران میں لائی گئی تھیں۔ ایک ترجمان پردے پر آنے والے الفاظ کا ترجمہ کرتا جاتا تھا، لیکن ناظرین بڑے بڑے جوش آور نظاروں کو دیکھ کر بھی ایسی دلچسپی کا اظہار نہ کرتے تھے جس سے شور و غوغا پیدا ہو۔ شاید ایسا کرنا ایرانی متانت کے خلاف تھا۔

کچھ دیر کے بعد پردے کے پیچھے سے زنانہ آواز میں ایک فارسی نغمہ سنائی دیا۔ حاضرین پر کامل سکوت طاری ہوگیا اور اُن کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ ایک نوجوان ایرانی نے مجھ سے کہا " یہ یہودی عورت اچھا گاتی ہے لیکن میری بہن کی آواز اِس سے بھی اچھی ہے مگر وہ صرف بہار کے دنوں میں کبھی کبھی اپنے باغ میں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کے سامنے گاتی ہے"۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ سچ ہے کہ تجدید کی لہر ایران میں پہنچ گئی ہے مگر ایرانیوں نے مغرب اور مشرق کے امتزاج سے ایک ایسی فضا پیدا کرلی ہے جو اُن کے ملک کے لئے موزون و مناسب ہے۔ ہاں، اسلام کی صورت بدل رہی ہے مگر اُس کا قلب کبھی نہ بدلے گا۔

دوسری رات میں مسجد سپہ سالار میں تھا جو ایرانی پارلیمنٹ کی عمارت سے متصل واقع ہے۔ اجتماع کثیر تھا کیونکہ ایک اعلیٰ درجہ کے مجتہد " جنگِ شہدا " کے متعلق صحیح معلومات سے مومنین کو مستفیض کرنے والے تھے۔ جب مجلس گرما گئی تو واعظ نے کہا " ان سب باتوں کو اب گذرا ہوا سمجھو۔ اب وہ وقت ہے کہ ہم اتحاد اور یک جہتی میں ایک دوسرے سے پیوست ہو جائیں اور اسلام کے اُس مقصد کو سمجھیں جو پیغمبرِ اسلام کے پیشِ نظر تھا" اتحاد بین المسلمین کی تحریک ایک مرتبہ پھر میری نظروں کے سامنے تھی۔ میں نے دیکھا کہ بجلی کے قمقموں کی روشنی ماند پڑ گئی یہاں تک کہ اُن میں محض ایک جھلک سی باقی رہ گئی۔ ہم سب منتشر ہو گئے اور اپنے اپنے راستے پر پڑے۔ لوگ کہتے تھے کہ روشنی اس لئے گھٹا دی گئی ہے کہ بادشاہ خود شہر کو دیکھنے نکلے ہیں۔ ٹھیک ساڑھے نو بجے بتیاں پھر روشن ہوگئیں، دورِ حاضر کا نوشیرواں اپنا دورہ ختم کرچکا تھا"۔

## ترکی میں لاطینی رسم الخط کا رواج

جاپان کی طرح ترکی میں بھی کچھ مدت سے لاطینی رسم الخط اختیار کرنے کی تحریک ہو رہی تھی، چنانچہ اس مسئلہ پر غور و خوض کرنے کے لئے ایک کمیٹی مقرر ہوئی جس کا دفتر پہلے انگورہ میں تھا، لیکن پھر قسطنطنیہ میں تبدیل کردیا گیا، تاکہ کمیٹی کے ارکان کو وزیرِ معارف اور صدرِ جمہوریہ سے مشورہ لینے میں آسانی ہو۔ اب معلوم ہوا ہے کہ ترکی حکومت کے بعض صیغوں میں لاطینی رسم الخط کا استعمال شروع ہوگیا ہے اور جہاز راں کمپنیوں نے جہازوں کے نام اسی رسم الخط میں

لکھنے شروع کر دیئے ہیں۔

غازی مصطفےٰ کمال پاشا اِس مسئلہ پر خاص توجہ صرف کرتے ہیں۔ کاظم پاشا رئیسِ مجلسِ وطنی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ پارلیمنٹ کے آئندہ اجلاس میں رسم الخط کا مسئلہ زبردست اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ تمام لوگوں کو اس کی سخت ضرورت ہے اور ترکی قوم کی داخلی اصلاح پر بھی اس کا نمایاں اثر پڑے گا۔ عربی رسم الخط کی تعقیدات ذہن میں مشکل سے آتی ہیں اور یہ ترکوں کے جاہل رہ جانے کا ایک بہت بڑا سبب ثابت ہوا ہے چونکہ جدید رسم الخط میں تعقیدات بہت کم ہیں اس لئے اس کے رواج سے عام جہالت ایک حد تک جاتی رہے گی۔"

کمیٹی نے کل بائیس حروفِ ہجا مقرر کئے ہیں W اور X کو حذف کر دیا گیا ہے۔ حروف متحرکہ آٹھ ہونگے اس لئے کہ O اور U میں سے ہر ایک کی دو آوازیں ہیں جن کا امتیاز دو فوقانی نقطوں سے ہوا کریگا جیسا کہ جرمن رسم الخط میں رواج ہے۔

جدید رسم الخط کی ترویج سے عام لوگ نیک شگون لے رہے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس سے متعلمین کی تعداد میں بھی معتد بہ اضافہ ہوگا۔

## تصنیف کا مقصد

مشہور و معروف ادیب مسٹر آرنلڈ بینٹ کے متعلق اُن کے ایک ہم عصر ڈرامانویس (جو اپنے فن میں انتہا درجہ کامیاب بھی ہیں) کہتے ہیں کہ ایک دن آرنلڈ بینٹ کے پاس ایک متین و سنجیدہ نوجوان امریکن آیا اور اُس نے دریافت کیا:

"مسٹر بینٹ جب آپ لکھتے ہیں تو اُس وقت آپ کے سامنے کون سی چیز ہوتی ہے؟"

مسٹر بینٹ نے جواب دیا "روپیہ"

نوجوان امریکن نے کہا: "نہیں، نہیں، میرا مطلب یہ ہے کہ جب آپ کسی بڑی معرکۃ الآرا تصنیف میں مشغول ہوتے ہیں تو اُس وقت آپ کے خیال میں کونسی چیز ہوتی ہے؟"

بینٹ نے پھر اُسی متانت سے کہا "روپیہ"

جب وہ امریکن نوجوان جا چکا تو وہ کامیاب ڈرامانویس صاحب جنہیں اب اس معاملہ سے خود بڑی دلچسپی پیدا ہو گئی تھی آگے بڑھے اور جیسے ایک نامی آدمی دوسرے نامی آدمی سے کوئی امر دریافت کرتا ہے حقیقت معلوم کرنے کی امید میں بینٹ سے کہنے لگے!

"بینٹ، سچ سچ بتاؤ جب تم ایک بلند پایہ تصنیف میں مصروف ہوتے ہو اُس وقت تمہارے دل میں کس چیز کا خیال ہوتا ہے؟"

مسٹر مینٹ نے جھک کر اُن کے کان میں نہایت رازداری کے لہجہ میں کہا: "روپے کا"

## خون کی تجارت

ویانا میں انسانی خون کی فروخت کا مقابلہ اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب ایک لیٹر (۱/۴ ۴ لیٹر - ایک گیلن) خون کی قیمت صرف پچاس آسٹرین شلنگ رہ گئی ہے۔

یہ خون ایک شخص کے جسم سے نکال کر دوسرے کے جسم میں داخل کیا جاتا ہے۔ ویانا میں یہ عمل اس قدر رواج پا گیا ہے کہ وہاں اس نے ایک باقاعدہ تجارت کی صورت اختیار کر لی ہے اور بعض لوگوں کا تو گزارا ہی اب اپنے خون کی فروخت پر رہ گیا ہے۔ ان میں سے بہت سے لوگ بارہ بارہ چودہ چودہ مرتبہ اپنا خون نکلوا چکے ہیں۔ ایک شخص نے سولہ مرتبہ اپنا خون فروخت کیا۔ ایلیس برگ تقسیم خون کا مرکز ہے۔ خون بیچنے والے اس جگہ جمع ہو جاتے ہیں اور یہاں سے مختلف ہسپتالوں میں حسب ضرورت بھیج دیئے جاتے ہیں۔

عسرت زدوں کے لئے خون کی تجارت دراصل آخری مامن ہے۔ تقریباً چودہ مرتبہ خون نکلوانے کے بعد وہ اپنے آپ کو بے زور اور بے زر پاتے ہیں اور زندگی کی جدوجہد کی قابلیت اُن کے دست و بازو سے مفقود ہو جاتی ہے۔

اُن مریضوں کے نام جن کی جانیں ایسے لوگوں کے خون سے بچائی جاتی ہیں پوشیدہ رکھے جاتے ہیں تاکہ خون فروش آئندہ کبھی اُن کے سامنے دست سوال دراز نہ کریں۔ اس طرح اُن کا احسان شخصی طور پر انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔

حال ہی میں خون فروشوں نے ایک انجمن قائم کرنے کی تجویز کی تھی تاکہ اُن کے خون کی قیمت بڑھ سکے لیکن یہ کوشش ناکام ثابت ہوئی اور خون کی تجارت اب تک غیر منظم دوکانداری کے اصول پر ہو رہی ہے۔

# رُوحوں کی کشتی کے ناخدا سے خطاب

لئے جارہا ہے ہمیں تو عدم کو
مگر شک نہیں اِس حقیقت میں ہم کو

کہ باطل ہے معدوم ہونا ہمارا
عدم کا خرابہ ہی آباد ہوگا

پر اِک گھر کے بسنے کو اِک کا اُجڑنا
اور اِک شے کے بننے کو اِک کا بگڑنا

سراسر یہ آئین نرا ناروا ہے
یہ دنیا ہے یا کھیل بچّوں کا؟ کیا ہے؟

ابھی نیست سے ہست میں آرہے ہیں
ابھی ہست سے نیست میں جارہے ہیں

نہ مرنے کی فرصت نہ جینے کی مہلت
نہ ہنگامِ آمد، نہ آہنگِ رخصت

بسانی ہے تجھ کو اگر کوئی بستی
فضا جس کی ہے زندگی کو ترستی

اور اُس کا بسانا ہے دشوار تجھ کو
جو ہے عجزِ قدرت کا اقرار تجھ کو

تو اِک اور آدم کو اُس میں بسادے
جو اُس دشت کو بھی گلستاں بنادے

حامد علی خاں

# سرمایۂ مشترک

**قومیت کا سنگِ بنیاد۔** سیاسیات کا یہ مسلمہ مسئلہ کہ اتحادِ زبان قومیت کا پیشرو ہے مزید بحث و تمحیص کا محتاج نہیں۔ صاف بات ہے کہ جب تک کسی ملک کی زبان ایک نہ ہو اُس کے باشندے قوم کہلانے کے حقدار نہیں ہوتے۔ چند ایسے شخص جن کی زبانیں مختلف ہوں ایک جگہ جمع ہو جائیں مگر کوئی مشترک زبان نہ جانتے ہوں تو وہ اپنا مافی الضمیر بوضاحت ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کر سکتے اور اُن کی اس خاموش ملاقات سے کوئی موانست باہمی پیدا نہیں ہوتی۔ تبادلۂ خیالات کا فقدان جس طرح انفرادی طور پر ربط ضبط کے خلاف ہے اُسی طرح قومیت کے نشو و نما کے منافی ہے۔ اس سوال پر نفسیاتی پہلو سے نگاہ ڈالیں تو ظاہر ہوتا ہے کہ اتحادِ زبان نردبان ہے اتحادِ ذہنی کی اور اتحادِ ذہنی پیش خیمہ ہے اتحادِ عمل کا اور اتحادِ عمل معراجِ قومیت ہے۔ جب زبان اس طرح ایک قوم کے سرمایۂ مشترک کی صورت اختیار کرلے اور یہ دھارا چل پڑے تو فروعی اختلافات کی پایاب ندیاں آپ سے آپ اس میں آملتی ہیں، اور جملہ منافقانہ تحریکیں بلامنتِ تدبیر اپنی موت آپ مر جاتی ہیں۔ پس جو لوگ قوم یا ملت بننا چاہیں اُن کے لئے ناگزیر ہے کہ وہ بیک زبان زبان کے سرمایۂ مشترک ہونے کو تسلیم کریں۔ ایسی زبان کو جو اتحادِ اقوام کی شیرازہ بندی میں حبل المتین کا کام دے قومی یا ملکی زبان کہتے ہیں۔

**قومی زبان۔** ہندوستان ماشاءاللہ اس قدر وسیع اور آباد ملک ہے کہ اس میں ایک برِّ اعظم کی بیشتر خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ مذاہب و السنہ کے تنوع کو چھوڑ کر بولیوں کا یہ عالم ہے کہ ہر صُوبہ بجائے خود بابل بن رہا ہے جس سے صاف نظر آتا ہے کہ ان لوگوں کے دل و دماغ ایک روش پر چل رہے ہیں۔ اس ذہنی افتراق کے انسداد کی یہی سبیل ہے کہ زبانوں اور بولیوں کی کثرت کو وحدت میں تبدیل کیا جائے اور ہندوستان کی کسی موزوں زبان کو قومی زبان قرار دیا جائے تاکہ یہ غرضِ مشترک سب کو ایک ذہنی سطح پر لے آئے۔ اس انتخاب میں زیادہ جھنجھٹ کی ضرورت نہیں۔ بس وہ زبان اٹھا لیجئے جو سب زبانوں سے زیادہ بولی اور سمجھی جاتی ہو۔ اس بارے میں مردم شماری کی رپورٹ یہ شہادت دیتی ہے کہ ہندوستان میں سب سے زیادہ وہ بولی سمجھی جاتی ہے جو ہندو اور مسلمانوں کے اتحاد اور فارسی اور بھاشا کے امتزاج سے پیدا ہوئی۔ اُسے ہندوی ریختہ، دہلوی، اردو، ہندوستانی یا ہندی

کسی نام سے موسوم کرو، فارسی دیوناگری یا رومن کیرکٹر میں لکھو، مگر زبان وہی ہے جسے عرفِ عام میں اردو کہتے ہیں اور موجودہ پنجابی، دکھنی، ملتانی، سندھی، اور ہندی اُس کی ابتدائی شکلیں ہیں۔

**دوری منزل** ۔ مگر مردم شماری کی یہ سند کافی نہیں اور اُردو کو قومی زبان بنانے میں ابھی بہت سی مشکلوں کے پہاڑ کاٹنے ہیں۔ مغائرت کے اسباب کو ملیامیٹ کرنا، مشکلاتِ تحصیل کو حل کرنا، زبان کو اس قابل بنانا کہ وہ علوم و فنونِ جدیدہ کا لنگر سنبھال سکے اور اسی قسم کے تردد ہیں جنہیں کئے بغیر یہ بیل منڈھے نہیں چڑھ سکتی۔ اہلِ زبان ہونے کا دعویٰ، مرکزِ اردو کی تخصیص، اردو ہندی کا قضیہ، شیخ و برہمن کی منافرت، صرف و نحو کی پیچیدگیاں گو محض سطحی خرخشے ہیں اور محبت و رواداری کے دریا کے سامنے خس و خاشاک سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتے مگر ہٹ دھرمی ضد اور تمنائے استبداد نے ان رائی کے دانوں کو پربت بنا رکھا ہے۔ جب تک ان کا تدارک نہ ہو جائے اور ازمنۂ ماضیہ کی طرح آج بھی ہندو اور مسلمان اردو کو اپنی مادری زبان اور سرمایۂ مشترک نہ خیال کریں اردو ہندوستان کی قومی زبان نہیں بن سکتی۔

ہم اِن امور پر محض اِس لئے اظہارِ خیال کرتے ہیں کہ وہ حضرات جو اس میدان کے مرد ہیں توجہ گرامی مبذول فرمائیں اور اپنے ناخنِ تدبیر سے اس عقدہ کو حل کر دیں ورنہ اس ضمن میں اپنا کچھ کہنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے ہمارے لئے اتنا ہی بس ہے کہ ہم نے اِن امور کو معرضِ بحث میں لانے کی جسارت کی۔

**اہلِ زبان** ۔ اہلِ زبان کہلانے کا خبط کوئی نئی بات نہیں محض اہلِ فارسی کی تقلید ہے۔ عرب ایرانیوں کو عجمی کہتے تھے۔ ایرانی شعرائے ہند کو "لوچ گویاں" کے نام سے یاد فرماتے تھے۔ ایرانیوں پر بس نہ چلا تو ہند کے مسلمان ہندو ادبائے فارسی کی زبان کے متعلق "بوئے کچوری مے آید" کہہ کر دل کی بھڑاس نکالنے لگے جب دہلی میں اردو کا چرچا ہؤا تو اہلِ دہلی نے اپنے اہلِ زبان ہونے کا اعلان کرکے ماورائے سکّانِ دہلی ہر جگہ کے باشندوں کو غیر اہلِ زبان یا بے زبان قرار دیا حتّٰی کہ لکھنؤ بایں ادعائے زبان اس لپیٹ میں آگیا درحالیکہ خود دہلی کا اردوئے معلّی لکھنو میں اس انداز سے منتقل ہؤا تھا کہ بقول علامہ طباطبائی خود "دلّی گوش بر آوازِ لکھنو ہوگئی۔ شرح غالب صفحہ ۱۵۸" لکھنو کے لئے اِس کے سوا اور کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ دہلی کی سیادت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ چنانچہ لکھنؤ میں زبان کا جدید سکول قائم ہوگیا۔ اسی طرح جب پنجاب کی باری آئی تو اُس نے بھی حلقۂ غلامی اتار پھینکا۔ اور اہلِ زبان اُس شخص کا نام رکھا جو خدمتِ زبان کی اہلیت رکھے۔ جو خواہ کوئی ہو کہیں کا رہنے والا ہو۔ زبان کی عمدگی کا معیار مکان کی بجائے عمل کو قرار دیا گیا۔ مذہب و ملت اور رنگ و مسکنت کے حجاب دور کر دیئے گئے

اگرچہ صاحبِ فرہنگِ آصفیہ (جلد اول صفحہ ۲۳۷) اہلِ زبان کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ اہلِ زبان اُس شخص کو کہتے ہیں جس کی زبان دانی مسلم الثبوت ہو" لیکن اکثر اہلِ دہلی ہنوز اس بات پر اڑے بیٹھے ہیں کہ صرف اہلِ دہلی ہی اہلِ زبان اور اردو کے واحد وارث ہیں۔ چنانچہ صاحبِ تسہیل البلاغت صفحہ ۱۵ میں فرماتے ہیں "دہلی کا ہر چھوٹا بڑا عالم ہو یا جاہل، شریف ہو یا رذیل اہلِ زبان ہے" اس سے پہلے بھی ایک صاحب "نصرت الاخبار" دہلی مورخہ ۱۱۔ اپریل ۱۸۷۸ء میں لکھ گئے ہیں "دہلی میں درباری اور بازاری زبان ایک ہے" یعنی ہر کس و ناکس جو دہلی والا ہو اہلِ زبان ہے۔ اور دربارِ ادب میں چھدامی بھٹیارا داغ کے برابر کرسی کا مستحق ہے۔ یہ دعویٰ اتنا بلند ہے کہ کچھ کہنے کی جرات نہیں پڑتی مگر دریائے لطافت میں سید انشائے دہلوی اس کا ساکت و صامت جواب بار بار دے گئے ہیں:۔

"ازراہِ حماقت فصاحت و بلاغت را مقیّد کردہ اند بتولدِ شخص در شاہجہان آباد۔ و نمیدانند کہ منبع فصاحت و معدنِ بلاغت کہ زبانِ شاں مشہور بر اردو ست سوائے بادشاہِ ہندوستان کہ تاجِ فصاحت بر سرِ اومے زیبد چند امیر و مصاحب شاں و چند زنِ قابل از قسمِ بیگم و خانم و کسبی ہستند ہر لفظے کہ در ینہا استعمال یافت زبانِ اردو باشد نہ ایں کہ ہر کس کہ در شاہجہان آباد باشد ہر چہ گفتگو کند معتبر باشد صفحہ ۲۶۴" "فصاحت در دلّی نصیبِ ہر کس نیست صفحہ ۲۲" "فصاحت بر تولدِ کسے در شاہجہان آباد نیست صفحہ ۲۳" دریائے لطافت کے ان مندرجات کے بین السطور سے عیاں ہے کہ اُس زمانے میں بھی دہلی کی طرف سے اس قسم کے دعاوی ہوتے تھے جنہیں خود دہلی کے فصحا لغو سمجھتے تھے۔ اُس زمانے میں جن کے دم سے چراغِ فصاحت بقولِ انشا دہلی میں روشن تھا اُن میں سے اب کسبیاں ہوں تو ہوں باقی سامان رخصت ہو گئے۔ زمانۂ حال میں مرزا یاس اس کے متعلق چراغِ سخن صفحہ اول میں تحریر فرماتے ہیں "۱۸۵۷ء کے غدر سے پہلے یہ مشہور تھا کہ اردو زبان فقط دہلی اور لکھنؤ والوں کی ملک ہے۔ اور اس میں کسی اور کا حصہ نہیں۔ اس وقت تک یہ خیال کسی حد تک صحیح تھا مگر غدر کے بعد یہ خیال بالکل باطل ثابت ہو گیا۔ آج بھی بعض لوگوں کا خیال ہے کہ زبانِ اردو کے مالک بلا شرکتِ غیرے لکھنو اور دہلی والے ہیں مگر یہ صرف اُنہیں لوگوں کا خیال ہے جو کبھی اپنی چار دیواری سے باہر نہیں نکلے جنہیں یہ نہیں معلوم کہ زمانہ کہاں سے کہاں نکل گیا اور اردو کہاں سے کہاں پھیل گئی" بہرحال اگر اس دعوے کو تسلیم کیا جائے تو زبانِ اردو کی حیثیت محض مقامی ہو جاتی ہے اور وہ قومی زبان نہیں رہتی۔ یہ دعویٰ کر کے یہ حضرات زبان کو فائدہ پہنچانے کے بجائے الٹا نقصان پہنچا رہے ہیں۔

**مرکزِ زبان** ۔ یہ دعویٰ گزشتہ ادعا کی صدائے بازگشت ہے۔ اہلِ دہلی فرماتے ہیں کہ دہلی ایامِ قدیم سے زبانِ اردو کا مرکز ہے اور چاہتے ہیں کہ جو الفاظ، محاورات اور اصطلاحات چلن پائیں اُن پر اہلِ دہلی کی مُہر ہو۔ ہم مرکزِ زبان کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں مگر ایک مجلس کی شکل میں۔ تاکہ چار کھونٹ کی زبان ہموار ہو اور تباین و تضاد کا اندیشہ نہ رہے۔ لیکن مقامی مرکزیت سراسر مآل اندیشی کے خلاف ہے۔ اس امتیاز سے تبختر و استبداد کے علَم بلند ہونگے۔ اور اُن کے سایہ میں بغض اور حسد اور رشکِ رقابت کے بازار گرم ہونگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ سرمایۂ مشترک منتشر ہو جائے گا اور اُردو ہندوستان کی قومی زبان بننے سے عاجز ہو جائے گی۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ انتزاعِ سلطنتِ مغلیہ سے پہلے دہلی اور لکھنو کو مرکزیت کی منزلت حاصل تھی اور انہیں زیب دیتی تھی۔ نشر واشاعتِ زبان مشاعروں اور مکتبوں تک محدود تھی کتابیں کمیاب تھیں اور اُن کا معقول التزام فقط دارالسلطنت میں ممکن تھا۔ کیونکہ رسل و رسائل اور آمد و رفت کے وسائل ناقص تھے۔ پایۂ تخت علوم و فنون کا مرکز، تجارت کی منڈی اور روایاتِ بذل و سخا کا محلِ وقوع تھا۔ اور بلا شبہ ایسی جگہ میں زبان مفصلات کی بہ نسبت زیادہ پنپ سکتی ہے۔ دراصل دہلی اور لکھنؤ سے مراد وہ اینٹ پتھر نہیں جن سے لال قلعہ جامع مسجد اور قیصر باغ کی دیواریں کھڑی ہوئیں، بلکہ دہلی و لکھنؤ عبارت ہے اُن خوبیوں سے جو افسوس ہے کہ اب نہیں اور مرکزیت کا دعوےٰ ساتھ لے گئیں۔

وہ تو باقی ہی نہیں جن سے کہ دہلی تھی مراد
دھوکا اب نام پہ دہلی کے نہ کھانا ہرگز (مجروح)

ہم کہتے ہیں کہ اگر سلطنتِ مرحوم قائم بھی ہوتی تو دورِ حاضر کے پریس ریل ڈاک اور تار کی مستعدی کے ہوتے مقامی مرکزیت کی بہت کم ضرورت رہتی۔ بے شک سلطنت کے سایہ میں زبان بہت ترقی کر سکتی لیکن مرکز بے معنی چیز ہو جاتی۔ اب بھی جس شہر میں یہ باتیں ہوں اُسے مرکزِ زبان بنانے میں ترجیح دے سکتے ہیں لیکن فرعونِ بے سامان کا سکّہ نہیں چل سکتا۔

صاحبِ تسہیل البلاغت (صفحہ ۱۱) مندرجہ ذیل اصول وضع کر کے دہلی کے مرکز ہونے کی ضرورت کو ثابت کرتے ہیں:۔

**الف** ۔ وہ زبان اُس خاص قریہ میں پیدا ہو اور وہاں سے تمام ملک میں پھیلے۔

**ب** ۔ شہر کے خاص و عام وہی زبان بولیں یہ نہیں کہ خواص کی زبان کچھ اور ہو اور عوام کی کچھ اور۔ جیسے لاہور میں

خواص کی زبان اردو اور عوام کی پنجابی ہے - پورب کے عام لوگ پوربی بولتے ہیں اور خواص اردو۔

ج۔ اس شہر میں ایسے بہت سے لوگ ہوں جو زبان کو تراش خراش کر خوشنما اصلاحیں دیں، موثر اور دل نشین انداز بیان نکالیں - نئے نئے اسالیب بیان پیدا کریں اور زبان کو ایسی وسعت دیں کہ وہ ہر طرح کے ادائے مطلب پر قادر ہو جائے۔

د۔ ان لوگوں کے کلام دوسرے لوگوں کے لئے زبان دانی میں سبق آموز ہوں:۔

لازم ہے کہ ہم ان پر سلسلہ وار نگاہ ڈالیں۔

الف - کا جواب کلیتاً نفی میں ہے - اردو زبان نہ دہلی میں پیدا ہوئی نہ وہاں سے دیگر ملکوں میں پھیلی حکیم نجم الغنی فرماتے ہیں "یہ صرف شاہ جہاں کا اقبال ہے کہ یہ زبان اُس کے اردو کی طرف منسوب ہوئی ورنہ بنا اُس کی اُس زمانہ میں پڑ گئی تھی جب کہ مسلمانوں کا قدم پہلے پہل ہندوستان میں آیا (بحر الفصاحت صفحہ ۲۸)" حکیم شمس الدین قادری ایک قدم اور آگے بڑھتے ہیں "تاریخ زبانِ اردو کا یہ حصّہ اگر روشنی میں لایا جائے اور اس کی بنیاد پر اردو زبان کی عہد بعہد ترقیاں مطالعہ کی جائیں تو ماننا پڑتا ہے کہ آلِ سبکتگین کے زمانہ میں اردو کی ابتدا ہوئی - اردوئے قدیم صفحہ ۱۸" خدا جانے یہ حضرات معموں میں کیوں باتیں کرتے ہیں اور صاف کیوں نہیں کہہ دیتے کہ آلِ سبکتگین کی حکومت پنجاب میں تھی لاہور اُن کا مستقر تھا اور یہیں زبانِ اردو کا سنگِ بنیاد رکھا گیا - اب رہا یہ سوال کہ زبان مُلک میں پھیلی کس طرح تو اس بارے میں یہ عرض ہے کہ "غوریوں کے عہد میں یہ زبان لاہور سے دہلی پہنچی وہاں سے خلجی اسے گجرات اور دکھن لے گئے - محمد تغلق جب دہلی کو اجاڑ کر دولت آباد کو آباد کرنے پر آمادہ ہوا تو یہ زبان ان نو آبادکاروں کی زبان بن کر دکھن میں پھیل گئی - (دیباچہ پنجاب میں اردو از حافظ محمود شیرانی صفحات د ھ) وہاں سے پھر ولی اورنگ آبادی کا دیوان آتا ہے - اور دہلی میں دکن کی طرح زبانِ اردو ادبی حیثیت اختیار کرتی ہے - اور محمد شاہ کے عہد سے شاہ عالم ثانی کے زمانے تک اردو صرف دلّی کی مِلک رہی اس سے ظاہر ہے کہ زبان کی ابتدا بھی لاہور سے ہوئی جو اس زبان کا جنم بھوم ہے۔

ب - یہ درست نہیں - آج کل کا اندازہ تو ہر شخص آسانی سے دہلی جا کر لگا سکتا ہے اور ماضی کے متعلق سُننئے سیّد انشا کیا ارشاد فرماتے ہیں۔

"اگر چنیں باشد ساکنانِ مغل پورہ چہ تقصیر کردہ اند کہ زبانِ ایشاں معیوب و خلافِ اردو شمردہ شود با فرزندانِ سادات بارہہ کہ در دار الخلافت می باشند از کجا گفتگوئے ایشاں سند نباشد - دریائے لطافت صفحہ ۹" رہا لاہور تو اُسی کے

متعلق میرزا صاحب کو تسامح ہوا ہے۔ اس شہر میں سب لوگ کیا ہندو کیا مسلمان اردو ہی بولتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ عوام قدیم اردو میں بات چیت کرتے ہیں جسے دکنی کی طرح پنجابی کہتے ہیں اور خواص وہ اردو جو ذرا اسنور گئی ہے پنجابی دراصل کوئی جداگانہ زبان نہیں بلکہ اردو کے دورِ ارتقا کی ابتدائی یا درمیانی منزل کا نام ہے چنانچہ مولوی سید احمد مرحوم فرہنگِ آصفیہ جلد ا صفحہ ۲۳۵۰ میں تحریر فرماتے ہیں۔ "پنجابی میں اکثر ہندی الفاظ اپنی اصلی ہیئت پر موجود ہیں" یعنی پنجاب میں زبان کی وہی حالت رہی مگر دہلی میں اُس نے زیادہ مہذّب شکل اختیار کرلی۔

ج۔ اسلاف کے ذکرِ خیر کو چھوڑ کر کوئی تفصیل سے نہیں بتا سکتا کہ عہدِ رواں میں اہلِ دہلی نے کون کون سے نئے اسالیب بیان پیدا کئے اور زبان کو کیا وسعت دی۔ اس عہد میں لے دے کے فرہنگ آصفیہ ایک کام کی چیز پیدا ہوئی جس کی طباعت کا سہرا لاہور کے سر ہے اور امداد کا فخر دکن کو۔ اگر یہ دو طاقتیں بروئے کار نہ آتیں تو سید احمد اُس کی اشاعت کی حسرت قبر میں ساتھ لے جاتے۔ بلکہ اخبار عام لاہور مورخہ ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۱ء کا یہ مبہم فقرہ بہت معنیٰ خیز ہے کہ "خود اہلِ دہلی کی عنایت تھی جو مصنف کو بہت عرصہ تک پریشان ہونا پڑا" اب سنئے حکیم نجم الغنی رامپوری جیسا ایک غیر جانبدار گواہ جس کا پنجاب دہلی اور لکھنؤ کسی سے بھی تعلق نہیں کیا کہتا ہے "زباندانانِ لکھنؤ کو الفاظ کی تراش و خراش کا بڑا خیال رہتا ہے اور حضراتِ دہلی ایسی باتوں کو فضول سمجھتے ہیں۔ بحر الفصاحت صفحہ ۲۸"

ہم ذیل میں وہ اصلاحات درج کرتے ہیں جو فصحائے لکھنؤ نے دورِ حاضر میں یعنی امیر اور داغ کے بعد زبان میں کیں۔ حامیانِ دہلی بھی ارشاد فرمائیں کہ اس دور میں اُن کے "یاں" کیا کارنمایاں ہوئے؟

(۱) صیغۂ امرِ حاضر میں "یو جیو" کا اضافہ نہ کرو جیسے آئیو۔ جائیو۔ آئیے۔ جائیے کہو۔

(۲) جب ترکیب فارسی ہو تو آخر لفظ کے نون کا اعلان نہ کرو۔ جیسے تابع فرماں۔

(۳) مضارع کے صیغوں میں واؤ زیادہ نہ کرو۔ مثلاً آویں جاویں نہ کہو۔ آئیں جائیں بولو۔

(۴) جو لفظ خود جمع ہے اُس کی جمع بقاعدہ اردو بنانا ناجائز ہے جیسے احباب سے احبابوں

(۵) فارسی میں "ہا" علامتِ جمع ہے اس کے استعمال سے احتراز لازم ہے۔ جیسے گُلہا۔ داغہا۔ ہزارہا۔

(۶) آخر کلمہ کی یائے معروف کو مشدّد استعمال نہ کرنا چاہئے۔ جیسے۔ کیوں کیا حال "بتائیے" دل کا۔

(۷) "رشکِ گل" "رشکِ پری" "غیرتِ ماہ" وغیرہ الفاظ جن سے کنایتًا معشوق مراد ہوتا ہے بغیر اشارہ کے استعمال کرنا غیر مطبوع ہے۔

(۸) مصادرِ فارسی کا استعمال متروک ہے مثلاً "بعدِ مُردن" کی جگہ اب پسِ مرگ یا بعدِ مرگ بولتے ہیں۔

(۹) تا - جو - جب - غرض - کاش اور گو کے ساتھ "کہ" کا اضافہ خلافِ فصاحت ہے -
(۱۰) جو شخص مر گیا ہو اُس کے نام کے ساتھ "صاحب" کا لفظ لگانا معیوب ہے -
(۱۱) مصدر کی جگہ ماضی کا صیغہ استعمال نہ کرو - مثلاً - آیا چاہئے - دیکھا چاہئے -
(۱۲) "ساتھ" اور "ہاتھ" کو "بات" اور "رات" کے ساتھ قافیہ نہ کرو -
(۱۳) "اوپر" کی جگہ جو "بر" کے معنوں میں آتا ہے "پر" استعمال کرو
(۱۴) لفظِ فارسی یا عربی اور ہندی کے درمیان واؤ عاطفہ نہ لاؤ -
(۱۵) جو نون آخر الفاظِ فارسی یا عربی میں بلا ترکیب ہو اُسے باعلان استعمال کیا جائے - باستثنا خزاں - رواں طپاں - عیاں - وغیرہ -
(۱۶) مضاف الیہ میں نون واقع ہو تو اس کا اعلان نہ کرو -
(۱۷) "اور" کہ حرفِ عطف ہے اس میں ظاہر ہونا واؤ اور رائے مہملہ کا ضرور ہے -
(۱۸) بائے موحدہ کو الفاظِ عربی اور فارسی کے قبل نہ لگاؤ - مثلاً بوقتِ صبح - بہنگامِ شام -
(۱۹) عرصہ بمعنی دیر کے لئے وقفہ استعمال کرو -
(۲۰) آتے ہے - جائے ہے کی جگہ آتا ہے جاتا ہے کہو -
(۲۱) رکھا - چکھا - اٹھا کو حرفِ اوسط کی تشدید سے استعمال کرو -
(۲۲) اِس باب میں کی بجائے اِس بارے میں استعمال کرو -
(۲۳) لفظِ ہر کو جمع کے ساتھ استعمال نہ کرو (دیباچۂ نور اللغات و بحر الفصاحت صفحہ ۴۳ و اصلاحِ زبانِ اردو)

مندرجہ ذیل الفاظ جو داغ و امیر اور اُن کے معاصرین نے استعمال کئے ہیں متروک قرار دیئے:-

مارے - باعث - (امیر) یہ خبر سنتے ہی میں مارے خوشی کے مر گیا -
نجانے - نہ معلوم (شاد) کیا گذرتی ہے نہ جانے وطن آواروں پر -
آپی - آپ ہی - (داغ) ہم نظر آپی چرا جاتے ہیں اکثر دیکھ کر -
آخر کو - آخر - (نوح) آخر کو گذر جائے گی میری شبِ ہجراں -
آسا - مانند (امیر) شمع آسا کبھی جلتے کبھی روتے گذری -
اتنے لئے - اِس واسطے - (امیر) لوٹتا ہوں نہ خنجر فقط اتنے لئے میں -

اخیر۔ آخر۔ (داغ) اخیر کچھ نہ بنی صبر اختیار کیا۔
اس طرح سے۔ اس طرح (داغ) اس طرح سے آئے کہ نہ آئے مرے آگے۔
امداد۔ مرحمت (داغ) جو عطا غیر کو ہو وہ مجھے امداد نہ ہو۔
اے بلبلو۔ اے زاہدو۔ (شاد) حباب وار تم اے بلبلو اُبھر لینا۔
بارے۔ ایسا ہو۔ (امیر) بارے جھپٹ کے میں نے گلے سے لگا لیا۔
برابر میں۔ ساتھ میں (داغ) آپ کیوں میرے برابر میں چلے آتے ہیں۔
برخلاف۔ خلاف (داغ) کس درجہ برخلاف ہے دل کس قدر خلاف۔
بلا۔ بغیر (جلیل) ملنے لگا ہے مجھ سے بلا واسطہ وہ شوخ۔
بل بے۔ واہ رے (شاد) بل بے ناکامی کہ ہے حسرت ہی حسرت جانِ زار۔
بن۔ بغیر (آتش) دام میں لاکر کیا جب بن چھری مجھ کو حلال۔
پیر۔ پاؤں (داغ) جب اُس کی بات کا کوئی سر ہو نہ پیر ہو۔
تڑپن۔ تڑپ (شاد) دکھائیں کس طرح تڑپن دلِ مضطر کی ڈرتے ہیں۔
تلک۔ تک (امیر) جب تلک تم تھے کشیدہ دل تھا شکووں سے بھرا۔
تلے۔ نیچے (داغ) وہ دل ہے جو ترے تلووں تلے ہوا پامال
جُوں تُوں۔ بہرطور (داغ) ہوگیا جُوں تُوں گذارا ہوگیا۔
خود سے۔ آپ سے آپ (جلال) خود سے ادھر نہ جائیں ہم۔
دلا۔ اے دل (امیر) دلا ہم سے گلہ اُس دلربا کا۔
سدا۔ ہمیشہ (شاد) سدا دید بازی میں اے شاد گذری
سمیت۔ ساتھ (شاد) آئے تھے تنہا چلے رنج و غم و ارماں سمیت۔
سر پر سے۔ سر سے (داغ) صدقہ کر ڈالیں ترے سر پر سے ہم۔
سندیسا۔ پیغام (داغ) آئے ہیں آپ محبت کا سندیسا لے کر۔
صفا۔ صاف (داغ) سچ یہ ہے صاف جو ہوتا ہے صفا کہتا ہے۔
کتنے۔ کیسے (شاد) دیکھنے میں غریب کتنے ہیں۔

کمتی۔ کم (شاد) کیا لہو رونے سے کمتی شاد مجھ ناشاد کو۔

کون مدت۔ کتنی مدت (داغ) کون مدت سے ہے عادت مجھے تنہائی کی۔

میاں۔ صاحب (امیر) کیوں میاں کیا ڈھونڈتے پھرتے ہو کیا جاتا رہا۔

ناپیدا۔ ناپید (داغ) مدعا یہ تھا کہ پیدا کر کے ناپیدا کروں

نگھرا۔ بے گھر (امیر) نگھرا کر کے تو ہیں آپ سدھارے گھر کو۔

وار۔ باری (داغ) کم نصیبی اس کو کہتے ہیں کہ میرے وار پر۔

وصلت۔ وصال (شاد) خواہش وصلت نے پھاڑا جامۂ یوسف جواں۔

وال۔ وہاں (امیر) وال جام سے دریغ یہاں سے صبوپسند۔ (قرار اصطلاحات صفحہ ۲۳ لغایت ۵۰)

یہ اصطلاحات اچھی ہوں یا بُری اس سے بحث نہیں۔ لیکن یہ معلوم ہونا چاہئے کہ کون اُن کے موجد ہیں۔ سند جواز کہاں سے ملی۔ اگر اردو صرف لکھنؤ کی زبان ہے تو جو چاہیں کریں ورنہ جو اس وقت اُس کی خدمت کر رہے ہیں ان سے استصواب لازم آئے گا۔ حکومت قانون بناتی ہے تو رعیّت کی رائے لیتی ہے اور یہاں تو مساوات اور برادری کا معاملہ ہے

زبان کی اصلاح کے علاوہ لکھنؤ کو ڈراما، مرثیہ، سلام، ناول اور ریختی رنگین کا تفنن کسی شمار میں نہیں، لکھنؤ کے ایجادہیں نعت میں بھی لکھنؤ نے بہت کام کیا ہے۔ امانت۔ دلگیر۔ انیس، دبیر، نفیس، اوج، محسن، امیر، سرشار اور رجانصاحب کے مدِّمقابل پیدا کرنے میں دہلی کی سرزمین عاجز نظر آتی ہے لیکن یہ لفظی زیب و زینت حقیقت کی نگاہ میں چنداں وقعت نہیں رکھتی۔ اس سے فہم و ادراک، علوم جدیدہ کے انکشاف اور تراجم میں کوئی مدد نہیں ملتی، زبان میں کوئی وسعت نہیں ہوتی، البتہ ذرا رنگ شوخ ہو جاتا ہے۔ ہم آیندہ چل کر بتائیں گے کہ اُن کی جدّت طرازیوں نے زبان کے اثر کو محدود کر دیا ہے اور تصنع و تکلف کی بدولت تاثیر، شیرینی اور گھلاوٹ میں فرق آ رہا ہے۔ ہاں اگر سرمایۂ کمال فقط زبان ہی زبان ہے اور معاملہ بندش روزمرہ اور محاورہ ہی علم و فضل کی کل کائنات ہے اور زبان میں مزید وسعت کی ضرورت نہیں تو اور بات ہے۔ لیکن اگر جدید علوم سے اردو کو مالامال کرنا ہے۔ اگر اردو کو مغربی زبانوں کے دوش بدوش دیکھنا ہے تو ایسے لغات اور محاورات اردو میں آ گر رہیں گے جن سے موجودہ فصاحت کے کان ہنوز نا آشنا ہیں۔ اِن اگلے وقتوں کے لوگوں سے کوئی پوچھے کہ یہ غزل، قصیدے اور طلسمات کے پرانے سکّے کب تک دکھاؤ گے۔ زمانہ بدل گیا اور اگر زمانہ کے ساتھ یہ نہ بدلے تو کہیں ٹھکانا نہ ملے گا۔

وہ دن گئے جب علم و ادب محض تفریح کے سامان تھے۔ اب تو زندگی کا مدار انہی پر ہے۔ جو زبان زیادہ علوم کو اپنے دامن میں پناہ دے گی وہی پھولے پھلے گی۔ اور صرف حسنِ صوری محفلِ علم میں درخور کا ضامن نہ ہوگا۔ یہ تعلیوں کا نہیں، کام کا وقت ہے۔ اردو کب تک کھلونا بنی رہے گی۔ اسے اب مادی اور ذہنی ترقی کا آلہ بنا دیجیے۔ اسے سرمایۂ مشترک سمجھئے اور مل کر کام کرنا سیکھئے۔ ڈیڑھ اینٹ کی مسجد میں یہ جمِ غفیر کس طرح سمائے گا۔

ھ۔ یہ قول واضح نہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ طالبانِ علم مرکز میں حاضر ہو کر کسبِ فیض کریں تو اس کے متعلق عرض ہو چکا کہ دورِ حاضر میں اس زحمت کی ضرورت نہیں۔ اگر آپ کا یہ خیال ہو کہ باکمالوں کے دواوین سے محاسنِ زبان ڈھونڈ کر نکالے جائیں، محاورات جمع کئے جائیں، تراکیب کی فرد مرتب ہو، تذکیر و تانیث کی فہرست قلم بند کی جائے، تو معاف فرمائیے، آج کل ہر دنیا دار سے اس کھڑاگ کی توقع نہیں ہو سکتی۔ اہلِ لکھنؤ کی طرح دستور العمل بنا کر دکھائیے۔ مگر آپ نے تو اس طرف توجہ ہی نہیں کی اور جب کسی نے کچھ پوچھا بھی تو انگلی پکڑ کر جامع مسجد کی سیڑھیوں پر لڑھکنے کے لئے چھوڑ آئے۔

ہندی اور اُردو۔ زبانِ اردو کی عالمگیر حیثیت اختیار کرنے میں یہ شاخسانہ سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اصل میں صرف آپس کا ہنسی مذاق تکدرِ خاطر کی حد تک جا پہنچا ہے۔ ہندو اپنے قابلِ احترام بزرگوں کی طرح اردو کی خدمت میں کمر بستہ تھے، مگر مسلمانوں میں ہندو دوست اور رواداری پسند ہستیاں چھنجنے لگیں۔ چند غیر ذمہ دار مسلمان نوجوانوں نے ہندؤں کی زبان پر حرف رکھنا شروع کیا اور اُن کی زبان کا نام "دھوتی پرشادوں کی بھاشا" رکھا۔ اسی پر بس نہیں بلکہ متروکات کا خنجر اُٹھایا اور بہت سے معصوم ہندی الفاظ کا سر اڑا دیا۔ ضد اور کش مکش نے اس پر کفایت نہ کی بلکہ ایسے محاورات جو ہندؤں سے خاص تھے فصاحت کے متبائن قرار دیئے۔ اور فارسی و عربی کے غیر مانوس الفاظ کا ایک لشکر اردو میں داخل کر دیا۔ متحمل مزاج اور آشتی پسند ہندو تو پی گئے لیکن اُن میں آتش مزاج نوجوانوں کی قلت نہ تھی انہوں نے بڑے تپاک سے اس چیلنج کا استقبال کیا اور اُنہی ہتھیاروں سے مقابلہ کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے جو اُن کے حریفوں نے چھانٹے تھے۔ رسم الخط کے لئے دیوناگری منتخب ہوئی عربی فارسی کی جگہ سنسکرت نے سنبھالی وہ تلمیحات اور اصطلاحات جو مسلمانوں سے وابستہ تھیں متروک قرار پائیں۔ ہندی پر پرزے سنبھال کر اردو کے سامنے ڈٹ گئی۔ ہمارے عندیہ میں گو اردو موجود ہے اور اُس کا ستارۂ اقبال روشن ہے لیکن اس جنگ میں اُس کی ماہیت کھو گئی اور اس نام سے پکارے جانے کے قابل نہ رہی۔ اردو اُس سرمایۂ مشترک کا نام تھا جو فارسی اور بھاشا کے اتصال سے پیدا ہوا جب بھاشا کی علیحدگی سے اس میں پراگندگی آگئی تو اردو کے

خیمے خود بخود اکھڑ گئے اور قصر اقبال متزلزل ہوگیا۔ ہندوؤں نے بھی ہندی کی چندی نکالنے میں کسی آل اندیشی کا ثبوت نہیں دیا، بلکہ جوش غضب سے ہندوستان کی قومیت پر وہ چرکا لگایا ہے جس کا اندمال قرنوں میں ہو تو ہو۔ اردو ہندو مسلمان اتحاد کی ایک زندہ یادگار ہے جسے ہمارے بزرگوں نے بڑی جانکاہی سے استوار کیا تھا۔ اس میں رخنہ ڈالنا قصر قومیت کی بنیادیں اکھیڑنا ہے اس کے علاوہ پرانی بھاشا کو پھر سے زندہ کرنے میں انہوں نے اُلٹی زقند بھری ہے اور زبان کی ترقی یافتہ شکل سے اغماض کرکے اس کی ابتدائی ہیئت کی پرورش کرنے لگے ہیں۔ گویا وہ ازسرِنو وہی کام کر رہے ہیں جو ایک مدت کا ہو چکا ہے۔ بعینہٖ یہی عالم اُن پنجابی حضرات کا ہے جو پنجابی کو اردو سے علیحدہ خیال کرکے اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

ہندو اپنی فطرت کے مطابق ذرا بردباری سے کام لیتے تو اُن مسلمانوں کو انہیں کے منتخب طریق میں جواب دے سکتے تھے۔ وہ قوم جو ٹیک چند بہار، ہرگوپال تفتہ، سرب سنگھ دیوانہ، طوطا رام شایان، مادھو رام سرشار اور کیفی جیسے فارسی دان پیدا کر سکتی ہے کیا وہ فارسی ہی میں مسلمانوں کا منہ بند کر سکتی تھی؟

اب وقت کا تقاضا یہی ہے کہ رسم الخط خواہ دیوناگری ہو یا فارسی مگر زبان وہی رہے جسے اردو کہتے ہیں۔ موجودہ اردو میں غیر مانوس فارسی اور عربی الفاظ نہ لائے جائیں اور ہندی کو سنسکرت کے بھولے بسرے شبدوں سے سرفراز نہ فرمایا جائے۔ ورنہ قومی زبان بنانے کا خیال دل سے نکال دو اور لڑے جاؤ۔ ارشد کہتے ہیں کہ ؎

زبانِ ترکی کو کون ناداں بھلا بنائے کا برج بھاشا
زبانِ ہندی پہ کون جاہل بھلا کرے گا گمانِ اردو

لیکن وہ یہ شاعرانہ رو سے فرما گئے ہیں ورنہ حضرت داغ کی تو یہ رائے ہے۔ ؎

کہتے ہیں اُسے زبانِ اردو جس میں نہ ہو رنگ فارسی کا

یعنی اردو سے فارسی رنگ نکالو تو جو باقی رہتا ہے وہ ٹھیٹھ اردو ہے۔

(باقی)

"ڈرامی"

# ذوقِ فطرت

پئے تسکینِ خاطر حس اگر ہو تو یہی بس ہے
یہ ساکت رات یہ ٹھنڈی ہوا یہ چاندنی بس ہے

انہیں کی دید سے ہوتی ہے پیدا تازگی جاں میں
سحر کی نورپاشی، دلفریبی شام کی بس ہے

ضرورت انجمن کی ہے نہ حاجت ہے احبّا کی
یہ تنہائی یہ کنجِ عافیت یہ خامشی بس ہے

نہیں ثروت نہ ہو جمعیتِ خاطر نہیں کچھ کم
دو روزہ زندگی میں زیست اطمینان کی بس ہے

بہت کافی ہے مجھ کو سیرِ باغ و کوہ و صحرا کی
گیاہ و لالہ و گل سے مری دلبستگی بس ہے

کہوں کیا چھاؤں سے ہوتی ہے کیسی قلب کو فرحت
مری تسکینِ دل کو سایۂ اشجار ہی بس ہے

حقیقت میں یہی ہے انبساطِ روح کا سامان
یہ غنچوں کا تبسّم اور پھولوں کی ہنسی بس ہے

نظر افروز کیا ہی جلوہ ہے اس حسنِ رقصاں کا
نگاہِ نکتہ بیں کے واسطے اک تیتری بس ہے

کبھی ہے کوک کوئل کی کبھی پی پی پپیہے کی
نشاطِ طبع کو وہ راگ اور یہ راگنی بس ہے

بہت دل کو لبھاتی ہیں صدائیں آبشاروں کی
یہ موسیقیِ حقیقت کی یہ صوتِ سرمدی بس ہے

مجھے بےخود بنانے کو مجھے مدہوش کرنے کو
مرے ہی گیت کافی ہیں مری ہی بانسری بس ہے

گھٹا میں ہائے کیا عالم ہے بگلوں کی قطاروں کا
اگر ہے ذوقِ نظارہ تو نظارہ یہی بس ہے

یہ وادی یہ شجر یہ جھیل یہ طاؤس یہ سارس
انہیں سے شاد ہوں اتنا ہی لطفِ زندگی بس ہے

نجیب ان سے نہیں ہے کوئی اندیشہ برائی کا
درختوں اور پرندوں ہی سے اپنی دوستی بس ہے

میر سعادت حسین نجیب

# ضریاب

تاریخ کی ورق گردانی کرنے سے بسا اوقات ایسے اشخاص کے حالاتِ زندگی نظر سے گزرتے ہیں۔ جو اپنے فن میں لاثانی اور اپنے دائرہ عمل میں بے مثال تھے مگر جن کو زمانے نے ایسا فراموش کر دیا کہ اُن کی یاد میں آنسو بہانا تو درکنار کوئی نام لینے والا بھی نہیں رہا۔ ان ہی ہستیوں میں سے وہ ماہِ آسمانِ موسیقی تھا جس نے مطلع فارس سے نکل کر مطلعِ بغداد پر جھلک دکھائی اور اندلس پر ضیا پاشی کرتا ہؤا وہیں غروب ہو گیا۔

ضریاب جو سلطان عبد الرحمٰن ثانی شاہِ اندلس کے زمانے میں مشہور ترین آدمی گزرا ہے فارس میں پیدا ہؤا اور خلیفہ ہارون الرشید کے دربار کے مشہور مغنی اسحاقِ موصلی کا شاگرد بنا، یا یوں کہئے کہ اسحاقِ موصلی سے فنِ موسیقی کی ابجد پڑھ کر اُس نے وہ کمال پیدا کیا کہ استاد کی شہرت اور فخر کا باعث ہؤا۔ یہاں تک کہ معلم متعلم کو نگاہِ رشک سے دیکھنے لگا۔

اسحاقِ موصلی کے ساتھ ضریاب بھی ہارون الرشید کے دربار میں علوم و فنون کی محفلوں میں شمولیت کے لئے جایا کرتا تھا۔ اس کی ذہانت اور حافظہ جسے ظاہر کرنے کا اسے اکثر موقع مل جاتا تھا سمجھنے والے دلوں میں طرح طرح کی امیدیں پیدا کرتا تھا اور دُور بین نظروں کو اُس کا مستقبل شاندار دکھائی دیتا تھا۔ ایک روز خلیفہ کے حضور میں نغمۂ سرود جاری تھا اور تمام ماہرینِ فن جمع تھے۔ جب ضریاب کی باری آئی تو بدقسمتی سے اُس نے وہی راگ جو اسحاق گا چکا تھا اُسی سر سے گانا شروع کیا اور استاد پر سبقت لے گیا۔ محفل کے برخاست ہونے پر بادشاہ نے اُسے حکم دیا کہ یا تو بغداد کو ہمیشہ کے لئے خیرباد کہہ دے یا مرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ضریاب نے جلاوطنی کو موت پر ترجیح دی اور بغداد سے نکل کر اندلس کی راہ لی۔

یہاں اُن دنوں عبد الرحمٰن ثانی سریرِ مملکت پر جلوہ افروز تھا اور شاہانِ اسلام کا تخت ایک صدی سے زیادہ عرصے کی حکومت کے بعد اب بالکل مستحکم ہو چکا تھا۔ بغداد کی علمی اور ادبی مجلسوں کی شہرت اور دربارِ ہارون الرشید کی شان و شوکت سُن کر سلطان کے دل میں دار الخلافۂ اندلس (قرطبہ) کو رشکِ بغداد بنانے کا شوق تھا اس لئے اُس نے ضریاب کا بڑے شوق سے خیر مقدم کیا۔ سکونت اور خوراک کے علاوہ جس کا انتظام اُس نے اپنے ذمے لیا ایک معقول وظیفہ اور دیگر حقوق عطا فرمائے۔ اس طرح بے وطن ضریاب اپنے ہنر کی بدولت بہت مالدار ہو

گیا اور آرام و آسائش سے زندگی بسر کرنے لگا۔

قدرشناس سلطان اُس کے علم و ہنر اور قابلیت پر اس قدر مفتون ہُوا کہ جب یہ عندلیب فارس اپنی راگنی چھیڑتا تو گھنٹوں بیٹھا سنا کرتا اور اکثر کھانے میں بھی اپنے ساتھ شریک کرلیتا۔ ضریاب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اس لئے وہ مختلف مضامین پر دیر تک گفتگو کرسکتا تھا۔ وہ شاہانِ سلف کے کارنامے ادبی حکایتیں اور علمی باتیں سُنا کر سلطان کی محفل کو گرم رکھتا تھا۔ اُس کو ایک ہزار سے زیادہ نظمیں یاد تھیں اور اُن میں سے ہر ایک نظم کو ایک مخصوص سُر کے ساتھ گایا کرتا تھا۔ اُس کا قول تھا کہ اُس نے تمام سُر ہوا کی حرکت اور اس کی فطری آواز سے سیکھے ہیں۔ اُس نے چار تاروں کی بجائے عود میں پانچ تار لگائے اور اُس کے بجانے کا طریقہ دوسرے ماہرینِ فن سے مختلف ہونے کے علاوہ اِس قدر موثر تھا کہ جو بھی سن پاتا تھا اُس کو پھر دوسرے کے راگ میں لطف نہ آتا تھا۔

جو شخص اُس کے پاس علم موسیقی سیکھنے کے لئے آتا تھا اُس کا امتحان ایک عجیب و غریب اور نرالے طریقے سے کرتا تھا۔ وہ اُسے اپنے پاس بٹھا کر اونچی سے اونچی آواز کے ساتھ گانے کا حکم دیتا۔ اگر آواز بہت ہلکی ہو تو اُس کی کمر کے گرد ایک پٹی بندھوا تا جس سے اُس کی آواز بلند ہو جاتی۔ اگر اُس کی زبان میں کوئی رکاوٹ یا تتلاہٹ ہو تو اُس کا علاج بھی عجیب ذریعے سے کرتا تھا۔ متعلم کا منہ اس قدر کھلواتا جتنا وہ کھول سکے۔ اُس کے بعد وہ اُس کو لفظ "آہ" کہنے کا حکم دیتا تھا۔ اگر وہ شخص لفظ "آہ" کافی بلند آواز سے نکال سکے تو اُس کو اپنا شاگرد بنا لیتا تعلیم و تربیت میں مصروف ہو جاتا اور سمجھ لیتا کہ اُس کی تتلاہٹ دور ہو جانے والی ہے ورنہ نکما سمجھ کر چھوڑ دیتا۔

ضریاب طرزِ کلام اور آدابِ محفل سے خوب واقف تھا۔ اُس کے زمانے میں کوئی شخص اُس سے زیادہ خوش خلق اور خندہ پیشانی نہ تھا ان صفات نے ہر شخص کے دل میں اُس کی صحبت کا شوق پیدا کر دیا تھا۔ ہر مہذب گھر میں اُس کے نام اور قابلیت کا چرچا تھا۔ تمام اندلس میں وہ طرزِ معاش طرزِ لباس اور طریقِ خورد و نوش کا رہنما تھا۔ اُس کو دیکھ کر لوگوں نے اپنے بال کٹوانے کا طریقہ بدل دیا۔ اندلس میں کئی قسم کے کھانے اُسی کے اختراع کردہ ہیں اور ایک قسم کی پلیٹ بہت دیر تک اُسی کے نام سے منسوب رہی۔ دھات کی بجائے شیشے کے برتنوں میں پہلے اُسی نے شراب نوشی شروع کی، پھر تمام لوگ اُس کے نقشِ قدم پر چل پڑے۔ چمڑے کے بستر پر سونے اور چمڑے کی چٹائیوں پر کھانا کھانے کی مثال پہلے اُسی نے پیش کی۔ وہ اس بات پر بہت زور دیا

کرتا تھا کہ موسمِ سرما کے گرم کپڑے پہنتے پہنتے ایک دم گرمیوں کا باریک لباس زیبِ تن کرلینا بہت بُرا ہے بجائے اس کے لباس کو بتدریج تبدیل کرنا چاہیئے۔

جو کچھ بھی وہ لوگوں کے سامنے پیش کرتا لوگ اُسے ضروری اور افضل و احسن سمجھ کر بغیر کسی اعتراض کے اختیار کرلیتے تھے۔ یہاں تک کہ امورِ معاشرت میں بادشاہ بھی اُس کی پیروی کرتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ عبدالرحمٰن ثانی اپنے عہدِ حکومت میں چار اشخاص کے زیرِ اثر رہا (۱) یحییٰ جو اُس کے زمانے کا بہت بڑا مذہبی عالم تھا (۲) ملکہ زینب (۳) اُس کا غلام نصر اور (۴) ضریاب سیاسی جھگڑوں میں پڑنے سے ضریاب بہت بچتا تھا اس لیئے اُس نے اپنے اثر کو امورِ معاشرت ہی تک محدود رکھا اور انتہا تک پہنچایا۔

تاج محمّد

---

# غُصّہ

ناراضگی پر رات نہ پڑنے دو۔

---

غصہ حماقت میں شروع ہوتا ہے اور ندامت میں ختم۔

---

وہ شخص جاہل ہے جو غصّے میں نہ آسکے اور وہ عقلمند جو غصّے میں نہ آئے۔

---

غصّہ ور آدمی اپنا منہ کھول دیتا ہے اور اپنی آنکھیں بند کرلیتا ہے۔

---

غصّے میں پہلے وہی آتا ہے جو راستی پر نہ ہو۔

گلچیں :

# رُباعیات

(۱)

جب اشکوں سے آنکھ میری بھر آتی ہے
بجلی سی چمک کے تیری نظر آتی ہے
ہوتا ہوں جو غم سے دل پریشاں جیسے
لٹی ہوئی آکے صبح آتی ہے

(۲)

پیدا اک ہوک شور سے کسی کے دل میں
کیسا ہی ہو دل اثر کرے کسی کے دل میں
کیسا ہی بجھا ہوا ہو دل افسر
ایسی آہ کو دل سے نکلے گھر کرے کسی کے دل میں

(۳)

دنیا کیا ہے یہ بھول جانا ہوگا
دنیا میں بہشت اک بنانا ہوگا
راحت میں ہر شخص کو میسر ہوگی
اللہ اللہ کیسا زمانا ہوگا

(۴)

راحت کے لئے خمار کی پرستش ہوگی
ہے کس زمانے کو ضرورت ہوگی
زندہ ہیں تو ہم بھی دیکھ لیں گے افسر
دنیا جسے کہتے ہیں وہ جنت ہوگی

حامداللہ افسر میرٹھی

# حُقّہ

ہے خاک میں جوش آب کا آتش کا ہوا کا
دریائے عناصر میں ہے طوفان بلا کا
یعنی لبِ شاعر پہ ہے پیغام خدا کا
سب ہاتھ اٹھاؤ کہ ہے یہ وقت دعا کا
اس شان سے اس طرز سے حقّے کی ثنا ہو
ہر طرف سے اک نعرۂ یا صلِّ علیٰ ہو

دیکھو نہیں معشوق سے کم بانکپن اِس کا
کیا حسن کے سانچے میں ڈھلا ہے بدن اِس کا
ہے پھولوں کی چادر سے بنا پیرہن اِس کا
پھولا پھلا رہتا ہے ہمیشہ چمن اِس کا
سوزاں ہے چلم آتشِ رُخسار کی صُورت
اور اُس پہ دھواں گیسوئے خمدار کی صورت

جو بات ہے حقہ میں کسی شے میں نہیں ہے
یہ کیفیت افیوں میں نہیں مے میں نہیں ہے
گُڑ گُڑ سا ترنم بھی کسی لَے میں نہیں ہے
جو لُطف ہے اِس نَے میں کسی نَے میں نہیں ہے
اللہ رے بلاغت تری اللہ رے آواز
اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز ہے اعجاز

حقّے کا جو دشمن ہے وہ انسان کا دشمن
ہوش و خرد و عقل کا اوسان کا دشمن
ایمان کا ایقان کا عرفان کا دشمن
ہندو کا مسیحی کا مسلمان کا دشمن
دنیا کے لئے باعثِ عشرت ہے تو یہ ہے
عقبیٰ کے لئے چشمِ بصیرت ہے، تو یہ ہے

دنیا میں مساوات ہی حقّے ہی کے دم سے
تخصیصِ ملاقات ہی حقّے ہی کے دم سے
خاطر ہے مدارات ہی حقّے ہی کے دم سے
جو چیز ہے جو بات ہی حقّے ہی کے دم سے ۔ :

ہستی میں اولوالعزمیٔ ہمت ہے تو حقّہ
پستی میں خیالات کی رفعت ہے تو حقّہ

محفل میں ہوں یا بیٹھے ہوں آرام سے گھر میں
یا جاتے ہوئے ہوں کہیں گاڑی کے سفر میں
ہے اس کا دھواں سینے میں اور شکل نظر میں
یہ دلبر دمساز یہ معشوق ہے بر میں

ہم اور کسی شے کا اجارا نہیں کرتے
حقّے کی جدائی کو گوارا نہیں کرتے

ہے چرخ پہ جب تک رخِ خورشید منوّر
اور فرش پہ تابندہ ہیں جب تک زر و گوہر
جب تک مئے توحید کے چلتے رہیں ساغر
جب تک ہے ترا نام زمانے کی زباں پر

یارب تو جو دائم ہے تو دائم رہے حقّہ
یہ بزم سلامت رہے قائم رہے حقّہ

مرسلہ عبد الغفور مہجور

---

# تاثرات

ترے حجاب میں ہے شانِ بے حجابانہ
حریم راز ہے تیرا جہانِ افسانہ
جمالِ یار! تجھے بے نیازیوں کی قسم
بس ایک جلوہ "بشانِ نیازمندانہ"
وہ لب کھلیں تو تڑپ جائیں سینکڑوں نغمے
وہ آنکھ اُٹھے تو برس جائے کیفِ میخانہ
ابھی تو دُور ہے رسوائیٔ گناہِ نظر
کہ پردہ پوش ہیں انداز ہائے مستانہ
نگاہِ غیر! محبت کی لغزشوں کو نہ دیکھ
کہ یہ جہان ہے "نا آشنائے بیگانہ"

رَوِش جو کوئی نگاہِ عمیق سے دیکھے
ہر ایک ذرّۂ تاریک ہے ضیا خانہ

رَوِش صدیقی

# اقوالِ زرّیں

تمہارا محبت آمیز سلوک تمہیں دائرۂ احباب کا مرکز بنا دے گا۔ اپنے تئیں پاک اور دلکش بنائے رکھو۔ ایک عالم کو تمہارے ساتھ بےغرض محبت اور حقیقی عشق پیدا ہو جائے گا۔

عالمگیر وہی ہے جس نے اپنے نفس کو فتح کیا ہو۔

صحیح خیالات اور صحیح کوششیں لامحالہ صحیح نتائج پیدا کریں گی۔

بےعقل انسان اپنے حصولِ مقصد کی محض خواہش کرتا ہے اور بےصبری کا اظہار۔ خلاف ازیں ایک عاقل کامیابی کے لئے سچّی کوشش کرتا ہے اور انتظار۔

ہر وہ شخص جو اپنی ذات پر حکومت کر کے اپنے تئیں قابو میں رکھ سکتا ہے صحیح معنوں میں دوسروں پر حکمرانی کرنے کا مجاز ہے۔

پہلی منزل میں صحیح خیالات میرے ساتھ ساتھ تھے اور دوسری میں پاکیزگیٔ کلام۔ تیسری منزل میں نیک اعمال کی ہمراہی نے مجھے یکایک اُس تخت پر متمکن کر دیا جو فردوسِ بریں کو مزیّن کئے ہوئے تھا۔

ہر تندرست و توانا شخص جو صبح دم کے خاموش اور بےبہا لمحات کو نیند کے خمار میں ضائع کرتا ہے ہرگز ہرگز عظیم الشان رفعت حاصل نہیں کر سکتا۔

جیسے سورج کی روشنی سے ایک نابینا شخص محروم رہتا ہے اسی طرح صداقت کے ضیا پاش نور سے محض وہ لوگ محروم رہتے ہیں جن کی بصیرت پر خودغرضی نے چھاپا مار کر اُنہیں بصارت سے محروم کر دیا ہو۔

سخاوت و صداقت لازم و ملزوم ہیں۔ جس انسان میں سخاوت کا عنصر غالب ہو اُس کی فطرت میں صداقت کوٹ کوٹ کر بھری ہوتی ہے۔

جس طرح ہر شے کا سایہ اُس کے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور آگ پر پھونکنے کے بعد دھوئیں کا اُٹھنا لازمی ہے۔ اسی طرح ہمارا ہر فعل اور ہمارا ہر عمل تاثرات سے بری نہیں۔ ہماری ہر عشرت اور ہماری ہر عسرت ہمارے خیالات اور ہمارے اعمال کا لازمی نتیجہ ہیں۔

ماخوذ

سیّد نیاز احمد ترمذی

# رتناولی

(یہ کہانی سری ہرش دیو والئی قنوج کے رتناولی ناٹک سے ماخوذ ہے۔ انہوں نے ساتویں صدی عیسوی کے نصف اول میں چند نہایت دلآویز ڈرامے لکھے جنہیں سنسکرت زبان میں درجۂ امتیاز حاصل ہے۔ اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ پراچین ہندوستان کے ادیب پلاٹ کی ترتیب پر کس قدر قدرت رکھتے ہیں)

کسی زمانہ میں وتس (موجودہ الہ آباد) کا ایک راجہ اپنی راجدھانی کوسمبی میں راج کرتا تھا جس کا نام اُدین تھا اُس کے منتری یگندرائن کو یہ لگن تھی کہ کسی طرح اُس کا سوامی پرتھوی راج ہو جائے۔ آخر ایک رشی نے اُسے بتایا کہ سنہال (سیلون) میں بکرم باہو ایک راجہ ہے جو تمہاری مہارانی واسودتا کا ماموں ہے اُس کی ایک بیٹی ہے جسے رتناولی کہتے ہیں اس سے تمہارے راجہ کی شادی ہو تو پرتھوی راج کا تلک ملے۔

یہ سُن کر یگندرائن نے کسی کو کانوں کان خبر نہ کی اور چپکے سے ایک ایلچی سیلون روانہ کر دیا کہ رتناولی کا ڈولا لے آئے۔ جب ایلچی سیلون پہنچا تو بکرم باہو ویسے تو بڑے تپاک سے پیش آیا مگر رشتہ سے اس لئے انکار کیا کہ بیٹی کو بھانجی کا سوت بنانا اچھا نہیں۔ ایلچی اپنا سا منہ لے کر چلا آیا مگر یگندرائن کے دل پر اُس کا کچھ اثر نہ ہوا اور اُس نے سیلون میں اپنے آدمی بھیج کر یہ خبر اڑا دی کہ رانی واسودتا کے محل کو اچانک آگ لگ گئی اور وہ جل کر خاکستر ہو گئی۔ یہ بات اڑتے اڑتے بکرم باہو کے کانوں تک پہنچی اور اُس نے اسے سچ سمجھا۔ جب یگندرائن کو پتہ ملا کہ بکرم باہو پر اُس کا جادو چل گیا تو اُس نے وہی سندیسہ دے کر ایک اور ایلچی اُس کے پاس بھیجا۔ اب انکار کی کوئی گنجائش نہ تھی راجہ نے اپنے ایک اہلکار واسوبھوٹ کے ساتھ رتناولی کو جہاز پر سوار کر دیا۔ اکلوتی بیٹی کو جس قدر بھی جہیز ملے تھوڑا ہے مگر اُس نے رتناولی کو جو موتیوں کی مالا دی اُس کا جواب دنیا بھر میں نہ تھا۔ ایک لڑی کی مالا تھی مگر ساری دنیا کے جوہری اُس کی قیمت نہیں آنک سکتے تھے۔ جہاز کچھ دن تو آرام سے چلتا رہا لیکن ایک دن سمندر میں طوفان آیا جہاز بھنور میں پھنسا اور ڈوب گیا۔ رتناولی سمندر میں غوطے کھا رہی تھی بس معلوم ہوتا تھا کہ پانی کا ایک اور ریلا اُس کے پران لے کر رہے گا۔ اتنے میں کوسمبی کے ایک سوداگر کا جہاز وہاں آ نکلا۔ اُس نے یہ دشا دیکھتے ہی جھٹ اپنے ملاحوں کو اُس کے بچانے کا حکم دیا ملاح کود پڑے اور ادھ مری رتناولی کو ہاتھوں ہاتھ جہاز پر پہنچا دیا۔ سوداگر کو جب رتناولی کا حال معلوم ہوا تو اُس نے بادبان

کا رخ پھیرا اور کوسمبی کو واپس چل پڑا۔ جب وہاں پہنچا تو سیدھا گیندراٹن کے پاس گیا۔ ساری رام کہانی سنائی اور رتناولی کو اُس کے سپرد کر کے چلا آیا۔ منتری رتناولی کو لے کر مہارانی واسودتا کے پاس گیا اور کہا کہ ایک سوداگر کو یہ لڑکی سمندر میں ڈوبتی ہوئی ملی تھی لیکن اس کا کچھ اور حال اُسے معلوم نہ تھا۔ شکل صورت سے کسی اچھے گھر کی معلوم ہوتی ہے۔ یہ مہارانی کی داسیوں کی سوبھا بڑھائے گی۔ واسودتا نے مان لیا اور سمندر کو دھیان میں رکھ کر اُس کا نام ساگریکا رکھا۔ لاکھوں داسیوں کی مالکہ پرتھوی راج کا تلک دلانے والی رتناولی آج ہاتھ باندھے داسیوں کی قطار میں کھڑی ہے۔ مایا مایا نیرے کھیل نیارے۔

ہولی کے دن تھے سارا شہر رنگ رلیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ رنگ اڑ رہا تھا۔ ہون ہو رہے تھے۔ ہولی کے گیت گائے جا رہے تھے۔ رنواس میں پوجا کی نیاریاں ہو چکیں تو رانی نے آ کر سب کچھ دیکھا بھالا تسلی ہوئی تو ایک داسی کو راجہ کے بلانے کو بھیجا۔ رانی کے پاس ساگریکا کھڑی تھی۔ اُس کے چہرے کی دمک سورج کو ماند کر رہی تھی۔ اُس کی آنکھوں میں پریم کی دنیا سوتی تھی۔ گدرایا ہوا جوبن سڈول جسم سے مل کر مدہوش سماں پیدا کر رہا تھا اُس کے سادے لباس میں ہزار پھبن تھی۔ اُس کی سادگی پر لگاوٹ مٹی جا رہی تھی۔ اُس کی زبان پر گھلاوٹ نثار ہوتی تھی۔ اُس کا نیچی نظروں سے دیکھنا دیکھنے والوں کو سنسار کے اتار چڑھاؤ دکھا رہا تھا۔ رانی ایک نظر میں بھانپ گئی کہ ساگریکا کو راجہ کی نظروں سے اوجھل رکھنا رنواس کے راج کی خیر منانا ہے۔ راجہ نے ڈیوڑھی میں قدم رکھا ہی تھا کہ ساگریکا کسی کام پر بھیجی گئی۔ آسمان سمجھ گیا کہ چاند سورج کی جوت سے ڈر کر منہ ڈھانپ رہا ہے۔ ساگریکا سامنے سے ٹل تو گئی مگر ایک درخت کی اوٹ لے کر پوجا کا نظارہ دیکھنے لگی۔ دیوتا کی پوجا ہو چکی تو رانی اپنے سوامی کی پوجا کرنے لگی۔ ساگریکا نے راجہ کو دیوتا سمجھا۔ اِسے بڑا اچنبھا ہوا کہ ہندوستان میں جیتے جاگتے چلتے پھرتے دیوتا پوجا کے وقت پرکاشت ہوتے ہیں۔ پاس تو نہ جا سکتی تھی وہیں کھڑے کھڑے پوجا کی رسمی ادا کر کے ایک طرف کو نکل گئی۔ اتنے میں بھاٹ آ گیا اور کبت اچارنے لگا۔ اب ساگریکا سمجھ گئی کہ وہ دیوتا نہ تھا بلکہ وتس کا راجہ تھا جس سے اُس کی شادی قرار پائی تھی۔ دیوتا ہو یا راجہ اُس کی تصویر اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر رہی تھی اور ہٹنے کا نام نہ لیتی تھی۔

پوجا کے ساتھ ساری چہل پہل ختم ہوئی اور رنواس میں معمولی کام کاج ہونے لگا تو ساگریکا چنبیلی کے جھنڈ کی تنہائی میں اپنے خیالوں سے کھیلنے لگی۔ بھوج اِس کے سامنے تھا اور گیروے کی ڈلی ہاتھ میں۔ بے خبری کے عالم میں بے پروائی کے انداز سے وہ کچھ لکیریں کھینچتی رہی لیکن تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتی ہے کہ ان لکیروں نے ایک تصویر کی شکل اختیار کر لی ہے اُس کے اچنبے کی کوئی حد نہ رہی جب اُس نے دیکھا کہ یہ ہو بہو اُس تصویر کا چربہ ہے جو ابھی اُس نے

دل ہی آ نکلتی ہے اور کبھی اُس کی آنکھوں سے جھانکتی ہے۔ یہ سچ ہے کہ لگن پھل سے بے پروا ہوتی ہے اور یہ بھی درست کہ حسن کا پرتو آنکھوں پر ایسی پٹی باندھتا ہے کہ انجام کا دھڑکا نظروں میں نہیں جچتا مگر یہ مدن کے سدھ پجاریوں کی باتیں ہیں۔ ساگریکا نے پہلی بار اِن مہاراج کو پرنام کیا تھا۔ اس لئے اُس کا کوئی دوش نہیں کہ کیوں اُس نے رسوائی کے کھٹکے سے اپنے اس پریم پتر کو پھاڑنے کا دھیان کیا۔ بدھی کہتی تھی اری کیا کرتی ہے آگ سے نہ کھیل۔ مٹا دے۔ اس کا نشان تک نہ رکھ۔ دھو ڈال، لگن چلاتی تھی نہ تو ایسی چیزیں ہر روز نہیں ملا کرتیں مدن کی اس دین کو بسنت کی اس نشانی کو سنبھال کر رکھ۔ ہوا تک نہ لگنے دے۔ ساگریکا جذبات کی اس جھوڑ کے تماشے میں مگن تھی کہ ایک اور داسی سوسنتگا دبے پاؤں آئی اور پیٹھ پیچھے سے تصویر اُڑا لی۔ اُسے دیکھ کر پوچھا "اچھی یہ کس کی تصویر بنائی ہے؟" ساگریکا نے جواب دیا "وہی دیوتا تو ہیں جن کی آج پوجا ہو رہی تھی۔ سوسنتگا بولی "پر ایک کسر رہ گئی۔ دیوتا جی مہاراج اکیلے گھبرا رہے ہونگے۔ اُن کی دیوی بھی پاس بر جتی تو بات تھی" یہ کہہ کر اُس نے رنگ اُٹھایا اور ساگریکا کی سورت بنا دی۔ ہمجولیوں میں ہنسی ٹھٹھول بول چال میں داخل ہے ایسی باتوں کی اتنی ہی کائنات ہوتی ہے کہ اِدھر سنی اُدھر بھلا دی۔ بس۔ پر اس میں ایک راز کھل رہا تھا۔ اس لئے ساگریکا بہت بگڑی مگر اس بگاڑنے بناؤ کی صورت پیدا کر دی۔ اُس کا چہرہ کنول روپ ہو گیا۔ اور پسینے نے اس پر اوس بر سا کر وہ سماں پیش کیا کہ اگر اندر بھی دیکھتے تو جھوم جاتے۔ سوسنتگا ساگریکا کی طرح الہڑ کنیا نہ تھی وہ جانتی تھی کہ کام دیوتا جب کسی پر ریجھتے ہیں تو اُس کی کیا گت بناتے ہیں۔ اُسے پتہ تھا کہ مدن کے بان جو گھاؤ کرتے ہیں اُن کو جھانک کر دیکھو تو دل کی دنیا ہتھیلی کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ ساگریکا کی یہ گرمی دیکھ کر سوسنتگا ہنس پڑی اور میٹھی میٹھی باتیں کر کے ساگریکا کو ایسا لبھایا کہ اُس نے اپنے دل کی بات اُسے کہہ سنائی۔ سوسنتگا نے اُسے لاکھ ڈھارس بندھائی پر وہ اس واقعہ کو سپنا ہی سمجھتی رہی۔ وہ یہی چاہتی تھی کہ اِن باتوں کا تانتا نہ ٹوٹنے پائے۔ اِن میں ایک رس تھا، ایک نشہ تھا جس کا مزہ اُس نے آج تک نہ چکھا تھا۔ ہر لفظ جو سوسنتگا کے منہ سے نکلتا تھا ساگریکا کے کانوں تک پہنچتے ہی راگنی بن جاتا تھا۔ اتنے میں ملڑ ہوا کہ طویلے سے ایک بندر چھوٹ کر رنواس میں گھس آیا ہے اور جو اُس کے ہتّے چڑھتا ہے اُسے نوچ ڈالتا ہے۔ یہ سن کر ساگریکا اور سوسنتگا کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تصویر کو وہیں چھوڑ چھاڑ کر بھاگ کھڑی ہوئیں۔ اور دور کھڑی ہو کر تماشا دیکھنے لگیں۔ راجہ کے بدو شک وسنتک پیٹ پکڑے دوڑ پھاند رہے تھے انہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ آج ہنومان بلیدان کر رہیں گے۔ جب ہانپ گئے تو چنبیلی کے اُس جھنڈ میں گھس گئے اور دم لینے کے لئے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔ راجہ بھی ساتھ لگا ہنستا ہوا پہنچ گیا۔ اصل

ہیں یہ صرف دل لگی تھی، وسنتک کو بنانا چاہتے تھے، نہ کوئی بندر چھوٹا نہ رنواس میں آیا۔ راجہ کی شکل دیکھی تو وسنتک کی ڈھارس بندھ گئی۔ اوسان درست ہوئے تو سامنے تصویر پڑی پائی۔ اٹھائی اور راجہ کو دے دی۔ وسنتک جی کو اپنے سوا کسی کی شکل نہ بھاتی تھی اور اس لیئے انہیں کسی کی تصویر کو دیکھنا تک گوارا نہ تھا۔ راجہ کی نظر تصویر پر پڑی تو اچھل پڑا۔ ساگریکا اور سوسنتگا یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں اور یہ سننے کے لیئے کان لگائے کھڑی تھیں کہ راجہ کیا کہتا ہے۔ راجہ نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور اُس مصوّر کو جس نے اُس کی تصویر بنائی تھی آسمان پر پہنچا دیا۔ اب سوسنتگا آگے بڑھی اور کہنے لگی کہ مہاراج بناؤ کا سماں ہے میں نے اتنے جتن سے اپنی سہیلی ساگریکا کی تصویر بنائی اور وہ الٹا مجھ سے بگڑ رہی ہے۔ اب سرکار ہی بیچ بچاؤ کرا دیں تو بات بنتی ہے۔ راجہ اور وسنتک دو سہیلیوں کی صلح کرانے چلے۔

ساگریکا انہیں اپنی طرف آتے دیکھ کر کچھ کھوسی گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لاجونتی کی ڈالی جسے کسی نے چھوا ہو جھوم رہی ہے۔ ساگریکا کو دیکھ کر وسنتک جی کی آنکھیں چندھیا گئیں اور ایسے بوکھلائے کہ چلا کر کہنے لگے "او ہو، او ہو۔ اس کے سامنے اوپسرا اپسرا کیا مال ہیں۔ سنسار میں ایسی اُوپ روپی سندری کہاں سے آگئی برہما بھی اس کی ٹکر کی لڑکی پیدا کرنے سے رہے جب اسے بنایا ہوگا تو حضور نے بھی گھڑیوں اپنے ہاتھ چومے ہونگے مہاراج یہ دیوی بھوکی دکھائی دیتی ہے اور برہمن کا پیٹ بھی خالی ہے۔ کہیں تو بھوجن کا سربندھ ہو جائے" یہ انوکھی باتیں سُن کر ساگریکا پر گھڑوں پانی پڑ گیا اور وہ ہرن کی طرح بھاگنے لگی۔ مگر راجہ نے کلائی پکڑ لی۔ اب ساگریکا ایک بے روح بدن ایک بے حس بُت تھی جس میں چلنے پھرنے بولنے چالنے کی سکت نہ رہی تھی۔ ابھی راجہ کے ہزاروں سوالوں میں سے اُس نے ایک کا بھی جواب نہ دیا تھا کہ وسنتک نے رانی آگئی، رانی آگئی کی ہانک لگائی۔ یا اُس نے رانی کو دُور سے آتے دیکھ لیا تھا۔ بہر صورت میں تھوڑی دیر کے بعد رانی سچ مچ آتی دکھائی دی اور راجہ نے وسنتک سے کہا کہ جھٹ پٹ تصویر کو چھپائے تاکہ رانی نہ دیکھنے پائے۔ وسنتک نے تصویر تو بغل میں داب لی اور تھوڑی دیر کے بعد بھُول گئے۔ مگر باتوں ہی باتوں میں جوش آگیا اور ہاتھ کھل گئے اور تصویر زمین پر آرہی۔ ایک داسی نے اُٹھا کر رانی کو دے دی۔ اپنے پتی کے پہلو میں غیر استری کی تصویر کو دیکھ کر رانی آگ بگولا ہوگئی۔ ترچھی نظروں سے راجہ کو دیکھا۔ زہر بھری آنکھ وسنتک پر ڈالی اور انہوں نے سمجھا کہ اس بگڑی ہوئی بات کا بنانا اس کا کام ہے۔ وسنتک نے راجہ کو اشارہ کیا کہ گھبرائیے نہیں۔ چٹکیوں میں سب کچھ راس کیئے دیتا ہوں یہ کہہ کر رانی کی طرف منہ کرکے بولے "مہارانی آپ نے دیکھا اب سرکار کا ہاتھ کس قدر صاف ہوگیا

ہے اور اپنی تصویر کیا پیاری اتاری ہے"۔ راجہ نے اس طرح مسکراتے ہوئے دیکھا۔ گویا داد مانگ رہے ہیں۔ رانی نے راجہ سے کہا " یہ دوسری کون اس ٹھسّے سے بیٹھی ہیں" راجہ نے جواب دیا " یہ صرف خیال کی پیدائش ہے اس کی اصل آج تک ہم نے نہیں دیکھی" وسنتک نے جھٹ جنیو ہاتھ میں لے کر کہا " مہارانی۔ سرکار سچ کہتے ہیں برہمن بھی سوگند کھا رہا ہے کہ آج سے پہلے ایسی شکل دیکھی ہو تو دیدے پھٹ جائیں" ساگریکا کو تو وہ پہچان گئی مگر اس تصویر کی پہیلی اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔

رانی نے اپنے خاص بھروسے کی داسیوں سے صلاح کی۔ تریا چلتر کا جادو جاگا۔ بہت سوچ بچار کے بعد یہ ٹھہری کہ وسنتک سے کہا جائے کہ ساگریکا رانی کے کپڑے پہن کر پھول بن کے نچلے حصے میں راجہ سے ملنا چاہتی ہے۔ اگر یہ چال پٹ پڑی تو بھانڈا صاف پھوٹ جائے گا۔ یہ چال پوری اُتری اور راجہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ جو جگہ ملاپ کے لئے ٹھہرائی گئی تھی رانی وہاں پہلے ہی پہنچ گئی۔ راجہ آیا اور رانی کو ساگریکا سمجھ کر پریم بھاؤ کی باتیں کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تو رانی چُپ سنتی رہی آخر اُس نے گھونگٹ اٹھایا تو راجہ کی آنکھیں کھلیں۔ رانی بغیر منہ سے بولے چپکے چلی گئی۔ اور اس چپ کی داد یہ ملی کہ راجہ اُسے ڈھونڈنے لگا۔

ادھر ساگریکا راجہ کی تلاش میں باولی ہوئی پھرتی تھی اُس نے سمجھا کہ سب نے مِل کر اُسے بنایا ہے۔ وہ کچھ ایسی کٹ گئی کہ جان پر کھیلنے پر اُتر آئی۔ اُس نے دوپٹے میں گرہ دے کر اُسے پیپل کے درخت سے لٹکا دیا۔ وہ گرہ میں گردن ڈال کر لٹکنے ہی کو تھی کہ راجہ رانی کو ڈھونڈتا ہؤا آنکلا۔ اور ساگریکا کو رانی سمجھ کر اُسے منانے لگا۔ " جب رانی کی تیوری پر بل آتا ہے تو میں بے کل ہو جاتا ہوں۔ جب وہ اداس ہوتی ہے تو سنسار میری آنکھوں میں اندھیر ہو جاتا ہے۔ جب وہ بگڑتی ہے تو میں سر جھکا دیتا ہوں" اتنا ہی کہا تھا کہ راجہ کو اپنی غلطی کا پتہ لگ گیا۔ اور یہ کہہ کر بات کو الٹا یا " پھر یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ وہ رانی ہے مگر وہ موتی جو پریم کے ساگر سے اُچھلتے ہیں تمہارے پاؤں پر ڈالتا ہوں"۔

رانی ایک درخت کی آڑ سے یہ سب باتیں سُن کے سامنے آئی اور کہنے لگی " مہاراج جو کہتے ہیں دل سے کہتے ہیں اس میں سندیہ کا سان گمان نہیں" رانی چلی گئی۔ ساگریکا ہوا ہو گئی تو راجہ یہ سوچتا ہؤا اپنے شیش محل کو گیا کہ ساگریکا کو رانی کے کرودھ کی آنچ سے بچائے۔

راجہ نے ساری رات اسی ادھیڑبن میں گذار دی۔ دن چڑھا تو وسنتک پوجا پاٹ کر کے یہ بڑا اتلک لگا کر آئے۔ راجہ نے چھوٹتے ہی پوچھا " کہو ساگریکا پر کیا گزری" وسنتک نے منہ ڈھیلا کر کے اور رونی صورت

بنا کر کہا "بس کچھ پوچھئے نہیں۔ لٹیا ڈوب گئی۔ اب سنجوگ کی کوئی آس نہیں"۔ راجہ یہ سمجھا کہ ساگریکا چل بسی اور اُسے غش آ گیا۔ وسنتک کی کوشش سے جب اُسے ہوش آیا تو وسنتک بولے "مہاراج آپ سنتے سناتے تو ہیں نہیں اور بے ہوش ہونے کو دوڑ پڑتے ہیں۔ اِن دنیا چاری کی باتوں کے بعد مجھے یہ کہنا تھا کہ رانی نے ساگریکا کو اوجین بھیج دیا ہے۔ اور پھر مجھے یہ مالا آپ کو دینا تھا جو ساگریکا آپ کے لئے چھوڑ گئی ہے"۔ راجہ مالا دیکھ کر اُٹھ بیٹھا۔ اُسے چوما، دل سے لگایا، اور گلے میں ڈال لیا۔ اتنے میں اوجین کا ایک مداری آ گیا جو بھان متی کے کھیلوں میں جگت گورو مانا جاتا تھا۔ اُس نے کہا مہاراج کیا دیکھیں گے چاند زمین پر اُتر آئے، پہاڑ ہوا میں تیرنے پھریں پانی میں آگ اُگے، چاند کی بغل میں سورج نظر آئے، جو مہاراج چاہیں وہی ہو جانے سکیئے تو وہی سامنے آکر پرنام کرے جو من میں بس رہی ہے"

راجہ نے رانی کو بھی بلا لیا اور تماشا شروع ہؤا۔ برہما کنول پر سوار ہو کر آئے۔ اندر اپنے مکنے ہاتھی پر بیٹھے اپنی ساری رونق سمیت دکھائی دیئے۔ مداری نے اس طرح کے کئی شعبدے دکھائے۔ چاروں طرف واہ واہ ہو رہی تھی۔ کہ یگندرائن کے نوکر داسو بھٹ کو لے کر آئے جو رتنا ولی کی طرح سمندر سے بچ نکلا تھا۔ تماشا بند ہو گیا تو داسو بھٹ نے اپنی آپ بیتی سنانی شروع کی۔ ابھی اُس نے تھوڑا سا حال ہی بیان کیا تھا کہ شور مچ گیا۔ اور رنواس میں آگ لگ گئی۔ آگ لگ گئی کی آوازیں آنے لگیں۔ یہ سن کر مہارانی واسودتا کے اوسان خطا ہو گئے۔ گھبرا کر بولی کہ مہاراج میں ساگریکا کو ایک کوٹھڑی میں بند کر آئی تھی۔ اُس کے بچاؤ کا اپاؤ کیجئے۔ اگر اُس پر آنچ آئی تو میں کسی میں منہ دکھانے کے قابل نہ رہوں گی۔ راجہ آگ کی لپٹوں کو پھاندتا ہؤا گیا اور ساگریکا کو نکال لایا۔ یہ آگ نری لاگ تھی جو یگندرائن کے کہنے پر مداری نے لگائی تھی۔ اب رانی نے ساگریکا کا حال بتایا۔ مالا اور داسو بھٹ کی تائید سے ثابت ہو گیا کہ ساگریکا اور رتنا ولی ایک ہی دیوی کے نام ہیں۔ اتنے میں یگندرائن آئے اور انہوں نے سب اونچ نیچ سمجھائی راجہ بگڑنے کو تھا کہ وسنتک کی باتوں پر سب کو ہنسی آ گئی۔ واسودتا بھی مان گئی اور راجہ اودین اور راجکماری رتنا ولی کی شادی ہو گئی۔

نور الٰہی
محمد عمر

# بزم یگانہ

(۱)

کیوں کھول دیئے در ازل کے ناحق
پیچ میں پھنسے اپنی اجل کے ناحق
ہاں کیوں نہ اٹھے شور انا الحق پہ وبال
بربار اٹھ بیٹھے کے بل کے ناحق

(۳)

ہر گام پہ استخارہ کرتے نہ بنی
تھی دل سے لگی کنارہ کرتے نہ بنی
دیوانہ بنا ہے کیا کدھر جاتا ہے
منزل کی طرف اشارہ کرتے نہ بنی

(۲)

یاران شباب رات کٹنے کی ہے
بجھتا ہے کنول ہوا پلٹنے کی ہے
محفل میں ہیں جھوٹے منہ ہوئے سے کب
آنکھیں کھلنے کی دل اچٹنے کی ہے

(۴)

موجوں سے لپٹ کے پار اترنے والے
طوفان بلا سے نہیں ڈرنے والے
سمجھیں نہ چلا تو جان پر کھیل گئے
کیا چال چلے ہیں ڈوب مرنے والے

میرزا یگانہ لکھنوی

# بیش بہا زمرّد

شیفرڈ اپنے پیر کھڑکی کی چوکھٹ پر پھیلائے ہوئے بید کی ایک بوسیدہ کرسی پر بیٹھا کسی خیال میں محو تھا۔ سوادِ شام پورٹر سٹریٹ کو اپنی سیاہ نقاب میں آہستہ آہستہ چھپا رہا تھا لیکن شام کی تاریکی سے اس سڑک کی کوئی تحقیر نہیں ہوتی تھی۔ اِس لئے کہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک پورٹر سٹریٹ میں کوئی خوبی ایسی نہ تھی جو کسی راہ گیر کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتی ہو۔

شیفرڈ بیٹھا دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ دنیا کے کسی گوشہ میں بیس ہزار روپے کی گراں قدر رقم پنہاں ہے جو میری جائز میراث ہے۔ کاش مجھے بھی معلوم ہو جاتا کہ یہ رقم کہاں پوشیدہ ہے۔ بہر کیف جہاں کہیں ہو، ہے ضرور، مگر میرے لئے تو یہ رقم ایسی ہی ہے جیسے خشک گھاس کے ڈھیر میں ایک سوئی۔

اُس کی اس اُدھیڑ بُن کی وجہ یہ تھی کہ ایک سال قبل اڈمنڈ گرانڈن نامی ایک شخص لندن میں مرا۔ یہ شخص کسی وقت بہت دولت مند اور شیفرڈ کا گہرا دوست تھا لیکن نامساعدتِ روزگار کے ہاتھوں اُس کی تونگری کا خاتمہ ہو گیا۔ اُس کے زوال کے اسباب میں ایک بیش بہا انگوٹھی کا پُر اسرار طور پر غائب ہو جانا بھی ایک منحوس سبب تھا۔ اس انگوٹھی میں نہایت نایاب زمرد کا ایک ٹکڑا نصب تھا۔ زمرد کے آس پاس دو چھوٹے چھوٹے ہیرے بھی جڑے تھے۔ مرنے والے نے اپنے وصیت نامہ میں لکھ دیا تھا کہ یہ گمشدہ انگوٹھی مِل جائے تو شیفرڈ اس کا جائز وارث ہوگا۔ انگوٹھی کے زمرد کی قیمت کم از کم بیس ہزار روپیہ تھی، لیکن موجودہ حالت میں ایسی وراثت بیس پیسوں کے برابر بھی نہ تھی۔ شیفرڈ مغربی ممالک سے مفلسی اور تہی دستی کی حالت میں واپس آیا اور لندن پہنچتے ہی اس کو اُس وصیت نامہ کی اطلاع ملی۔ ایسی مفلسی میں لندن کا قیام اُس کے لئے سوہانِ روح ہو رہا تھا۔ اگر ایسے وقت میں یہ بیس ہزار کی رقم اُس کے ہاتھ آجاتی تو وہ مغربی ممالک میں جاکر عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا۔ انہی خیالات میں محو وہ آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا۔

"اگر میں اس وہم میں مبتلا رہا تو کیا عجب ہے کہ میرا دماغ خراب ہو جائے۔ میں کچھ احمق نہیں۔ اس لئے مجھے اس روح فرسا خیال سے باز آنا چاہئے۔ وہ زمرد اس وسیع کرۂ ارضی کے کسی گوشہ میں ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ بحرِ عمیق کی تہ میں ہو۔ یا کسی شاہزادی کی نازک انگلی کو زیب دے رہا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کسی شاطر جوہر کے صندوق میں ہو۔ یا خاک میں مل چکا ہو اور اُس کے ذرّے ہوا میں منتشر ہو چکے ہوں۔ بہر نوع میں متوفی گرانڈن کا بے وجہ ممنون ہوں۔ خیر اپنے دل و دماغ

سے اس خیال کو نکالے دیتا ہوں"

اتنے میں پشت کے کمرہ سے کسی کے مسلسل کھانسنے اور کراہنے کی دردناک آواز آئی - اس آواز میں کچھ ایسا درد تھا کہ شیفرڈ بےچین ہوگیا - وہ طبعًا دوسروں کی تکلیف سے بہت متاثر ہو جاتا تھا - آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا:

"اُف یہ مقام کیسا گندہ ہے! اگر میں فورًا اس ناپاک جگہ کو خالی نہ کردوں تو کیا عجب ہے کہ میری صحت اور اُس کے ساتھ ساری امیدیں خاک میں مل جائیں - یہاں کی گندگی اور فلاکت میری رگ و پے میں پیوست اور میرے دل و دماغ میں سرایت کر جائے گی - آہ کاش میں اُس کا خیال . . . . . ."

اچانک اسکو یہ محسوس ہؤا کہ کوئی اُس کا نام لے کر پکار رہا ہے - وہ کان لگا کر سننے لگا - لیکن پھر کھانسی کی آواز نے اُسے کچھ نہ سننے دیا - وہ اُٹھ کھڑا ہؤا اور اُس طرف چل دیا - کھانسی کی آواز رکی اور اُس نے کسی کو صاف اپنا نام لے کر پکارتے سنا - وہ ساتھ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہؤا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولا -

"کیا میں تمہاری مدد کرسکتا ہوں؟"

**بیمار** - "کیا آپ کا نام مسٹر شیفرڈ ہے؟

**شیفرڈ** - "جی ہاں"

**بیمار** - (رُک رُک کر) "براہ . . . . کرم . . . . . آگے . . . . آیئے . . . . میں . . . . آپ . . . . . سے . . . . . کچھ کہنا . . . . چاہتا . . . . . ہوں"

کمرے کی کثیف حالت دیکھ کر شیفرڈ کے سارے جسم میں لرزہ پیدا ہوگیا - درو دیوار کی حسرت زا صورت چھوٹی سی موم بتی کی ٹمٹماہٹ ، اور ان سب سے دردناک نظارہ ایک مریض کے نحیف و نزار جسم کا تھا جو ایک گوشے میں پڑا ہؤا تھا - وہ مریض کی طرف بڑھا اور یوں مخاطب ہؤا :-

"تمہاری یہ حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہؤا" مریض ایک جوان شخص تھا جس کے ماتھے پر پسینے میں بھیگے ہوئے اور اُلجھے ہوئے سیاہ بالوں کی لٹیں پڑی ہوئی تھیں اور رخسارے شدتِ بخار سے تمتما رہے تھے -

"درست ہے" موخرالذکر نے ہلکے تبسم کے ساتھ جواب دیا "میں اچھا ہو جاؤں گا - اور بالفرض نہ بھی ہؤا تو کیا ، بیٹھ جایئے میں ڈر رہا ہوں کہ قوتِ گویائی اب جواب دے رہی ہے - مجھے آپ سے پیشتر ہی ملنا چاہیے تھا ، لیکن میں ہمیشہ اس کو ٹالتا رہا"

شیفرڈ نے کہا "تم آہستگی سے باتیں کرو - میں سن لوں گا - اشارہ سے صرف اتنا بتادو کہ میں کس طرح تمہاری

مدد کر سکتا ہوں"، تین چار منٹ کے وقفہ کے بعد مریض نے آہستہ آہستہ کہنا شروع کیا۔

"آپ ایک ماہ سے لندن میں ہیں، لیکن مجھے دو تین روز ہوئے اطلاع ملی کہ آپ یہاں پورٹر سٹریٹ میں مقیم ہیں۔ اس لئے میں نے یہیں یہ کمرے لیا۔ علاوہ ازیں مجھے پہلا مکان اس لئے چھوڑنا پڑا کہ وہاں والوں نے مجھے مدقوق سمجھ کر نکل جانے کو کہا تھا۔ حالانکہ یہ دق نہیں ہے، پھیپھڑے صرف متورم ہو گئے ہیں اور بہت جلد میں اس مرض پر قابو پا لوں گا۔"

شیفرڈ (تسلی کے لہجہ میں)۔ "ہاں! ہاں! اچھا تو تم مجھ سے کیوں ملنا چاہتے تھے؟"

بیمار۔ میں آپ کو آپ کی گم شدہ چیز کا پتہ لگانے میں مدد دینا چاہتا ہوں۔ وہ انگوٹھی جو مسٹر گرانڈن نے تمہیں ورثہ میں دی تھی بہت قیمتی ہے۔ اور مجھے یہ معلوم ہے کہ اس وقت وہ کہاں ہے۔"

گفتگو کی جدوجہد سے مریض نڈھال ہو رہا تھا۔ اُس کی یہ حالت دیکھ کر شیفرڈ اپنی حیرت و استعجاب کو بھول گیا اور اُس کو دلاسا دینے لگا۔

"ذرا دیر دم لے لو۔ تاکہ تمہاری حالت سنبھل جائے"

مریض۔ "بجا فرمایا۔ مگر ڈر ہے کہ اگر میری حالت نہ سنبھلی۔ اور مجھے قبر کا منہ...... خیر... میں یہ کہہ رہا تھا۔ کہ میں انگوٹھی کے راز سے واقف ہوں۔ یعنی وہ میں نے ہی اڑائی تھی"۔

یہ سُن کر شیفرڈ کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اور وہ کسی قدر سکوت کے بعد بولا۔

"تمہیں نے لی تھی؟"

مریض۔ "ہاں میں نے ہی چرائی تھی۔ میں اُس وقت مسٹر گرانڈن کا خدمت گار تھا۔ میرا نام بریڈلے ہے۔ جب یہ واقعہ پیش آیا اُس وقت وہ بڈفورڈ سکوئر کے مکان نمبر ۲۲ میں رہتے تھے۔ جس کا مالک مسٹر ہیرنگ ہے۔ وہ انگوٹھی مجھ کو غسل خانہ میں ملی تھی۔ مسٹر گرانڈن نے غسل سے پہلے اتار کر رکھ دی اور غسل کے بعد وہیں چھوڑ کر چلے گئے۔ میری حالت اُس وقت ناداری کی تھی کیونکہ جو کچھ اپنے پاس اندوختہ تھا وہ ایک دن پیشتر میں گھوڑ دوڑ میں ہار چکا تھا۔ میری باتیں سُن رہے ہو؟"

شیفرڈ۔ "حرف بہ حرف"

بریڈلے۔ "اس مکان کے زیریں حصہ میں پشت پر ایک کمرہ کتب خانہ کا ہے۔ اس کمرہ میں آتشدان کے اوپر دو لمبے شمعدان رکھے رہتے ہیں۔ جو پہلے مسٹر گرانڈن کے تھے۔ لیکن چونکہ مسٹر ہیرنگ اُن کی اکثر تعریف کیا کرتا تھا۔ اِس

لیئے اُس نے ہدیتاً مسٹر ہیرنگ کو دے دیئے۔ میں نے اُن کو بارہا خود صاف کیا تھا اور مجھے یہ معلوم تھا کہ اُن کے پیندے کھُل جاتے ہیں۔ میں اِس کمرہ میں پہنچا اور انگوٹھی کو روئی میں لپیٹ کر شمعدان کے پیندے میں رکھ دیا۔ میرا ارادہ تھا کہ موقع پا کر اُس کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔ لیکن اس واقعے کے بعد ہی میرے آقا اور مسٹر ہیرنگ آپس میں لڑے اور مجھ کو پھر اس مکان میں جانے کا موقع نہیں ملا۔"

مسلسل باتیں کرنے کی جدوجہد سے تھک کر بیمار نے آنکھیں بند کرلیں اور خاموش ہوگیا۔

اِن باتوں کا علم ہو جانے کے بعد یہ ناممکن تھا کہ شیفرڈ انگوٹھی کے حصول کی تمنا میں بے قرار نہ ہو جاتا۔ تھوڑی دیر کے انتظار کے بعد اُس نے سوال کیا۔

"کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ انگوٹھی اب تک اُسی مقام پر ہے؟"

بریڈلے۔ "یقین تو کیسے ہو سکتا ہے، البتہ قرین قیاس یہی ہے۔

شیفرڈ۔ "فرض کرو کہ تمہارے بعد کسی نے شمعدان کو صاف کرتے وقت کھولا ہو اور انگوٹھی اُس کے ہاتھ لگ گئی ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "اور اگر وہ شخص بددیانت ہو تو انگوٹھی پا کر خاموش ہوگیا ہو۔"

بریڈلے۔ "ہاں یہ بھی ممکن ہے۔"

شیفرڈ۔ "لیکن اس میں تو کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ وہ انگوٹھی میری ہے۔"

بریڈلے۔ "یقیناً آپ ہی کی ہے۔"

شیفرڈ۔ "تو پھر شاید تم یہ نہیں چاہتے کہ میں براہِ راست مسٹر ہیرنگ کے پاس جاؤں اور ان سے سارے واقعات کا اظہار کردوں، کیونکہ اس حالت میں تم مشکلات میں پھنس جاؤ گے۔ کیوں؟"

بریڈلے۔ "قطعی نہیں۔ آپ اگر چاہیں تو مجھ کو کسی نہ کسی طرح صاف بچا سکتے ہیں۔ اور پھر میں ایسا بیمار ہوں کہ مجھے کسی نتیجہ کی پروا نہیں۔ میری خواہش صرف اتنی ہے کہ میں انصاف پر رہوں۔ یقین مانیئے کہ اس واقعہ سے پہلے اور اس کے بعد آج تک میں نے کبھی کوئی ایسی حرکت نہیں کی۔ خدا شاہد ہے کہ ہمیشہ میرا ضمیر مجھ کو اس حرکت پر ملامت کرتا رہا ہے اور اُس دن کے بعد آج تک مجھے راحت نصیب نہیں ہوئی۔"

شیفرڈ۔ "اگر تمہیں اتنی ہی ندامت ہے تو پھر مجھے کون سی شے وہاں جانے اور اپنی انگوٹھی کا مطالبہ کرنے سے باز رکھ سکتی ہے؟"

بریڈلے:۔ "یہ سچ ہے مگر مجھے اس میں شک ہے۔ میرے آقا اور پیرنگ کی عداوت لین دین سے متعلق تھی۔ اور نوبت عدالت تک پہنچی تھی۔ لیکن فیصلہ مسٹر پیرنگ کے خلاف ہوا۔ لہٰذا وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ میرے ساتھ بے انصافی ہوئی۔ ما سوا اس کے وہ خلقاً نہایت کنجوس ممسک اور غاصب واقع ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ وہ تمہیں کسی بہانہ سے ٹال دے۔ یا تم سے کہہ دے کہ کسی دوسرے وقت آؤ۔ یا کم از کم شمعدان کو دیکھتے وقت تمہاری موجودگی کو پسند نہ کرے لیکن مسٹر شیفرڈ خدا عالم الغیب ہے میں اُس کی برائی نہیں کرتا مجھے خوف ہے کہ صرف تمہارے مطالبہ پر وہ چپکے سے بیش بہا زمرد تمہارے حوالے نہیں کرے گا۔ اگر میں تندرست ہوتا تو میرا ارادہ تھا کہ چونکہ میں نے خود انگوٹھی وہاں رکھی تھی جو بہت ممکن ہے اب تک وہیں ہو۔ اس لئے میں خود ہی . . . ۔ (کھانسی کی شدت سے جملہ پورا نہیں کر سکا)

شیفرڈ منتظر رہا۔ پریشان کن خیالات میں محو ہوگیا۔ جب مریض کو سکون ہوا تو بولا۔

"تمہارا یہ ارادہ تھا کہ چھپ کر انگوٹھی نکال لاؤ؟"

بریڈلے۔ "ہاں تمہاری خاطر یہی کرتا"

شیفرڈ۔ "اور تم مجھے کیا رائے دیتے ہو؟"

بریڈلے۔ "میں کیسے کہوں۔ میری نیت تو یہی تھی کہ کسی طرح تمہاری چیز تم کو مل جائے۔ اگر میرے امکان میں ہوتا تو آج ہی رات کو یا زیادہ سے زیادہ کل رات تک متوقع تھا کیونکہ پیرنگ شہر سے کہیں باہر گیا ہوا ہے اور پرسوں واپس آجائے گا۔ باغ کے اندر سے گذر کر اس کمرہ میں داخل ہونا کچھ دشوار نہیں ہے۔ اگر تم جانا چاہو اور کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے تو تمہارے بچاؤ کے لئے یہ کافی ہے کہ میں چوری کا اقرار کرلوں لیکن تم کو ایسی رائے دینے کی مجھے جرات نہیں ہوتی۔ صرف بات آپڑی تو اپنا خیال ظاہر کر دیا۔

ممکن ہے کہ اس موذی مرض کے پنجہ سے مجھے نجات مل جائے اور . . . . . . . اور . . . " دوبارہ کھانسی کی وجہ سے جملہ ناتمام رہا۔ اور وہ اتنا نڈھال ہوگیا کہ شیفرڈ نے اس ملاقات کو ختم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرہ میں آگیا۔

چند منٹ پیشتر جو خیالات اُس کے لئے بے معنی اور مہمل تھے۔ اب وہی معنی خیز ہوگئے۔ وہ پائپ سلگا کر پینے لگا اور سوچنے لگا۔

"اب یہ امر تو واضح ہے کہ اس بدنصیب شخص سے مجھے صرف اس بنا پر مخاصمت نہیں ہوسکتی کہ اُس نے انگوٹھی چُرائی تھی۔ کیونکہ اگر وہ اِس زمرد کو نہ چراتا تو یقیناً مسٹر گرانڈن کی دوسری جائداد کے ساتھ یہ بیش قیمت انگوٹھی

بھی تلف ہوجاتی ۔ موجودہ صورت میں اس کے ملنے کی بہت کچھ امید پیدا ہوگئی ہے ۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا میں مسٹر پیرنگ کی واپسی کا انتظار کروں ؟ نہیں ۔ میں اپنی رگ و پے میں محسوس کرتا ہوں کہ یہ سخت غلطی کا مترادف ہوگا ۔ پیرنگ کے نام سے مجھ کو نفرت سی ہوگئی ہے ۔ میں نے کبھی اس نام کے کسی شخص کو ایماندار اور عالی حوصلہ نہیں دیکھا ۔ بالمشافہ مل کر اُس سے انگوٹھی کا طلب کرنا محض نادانی ہے ۔ وہ بآسانی مجھ کو یہ کہہ کر دھوکا دے سکتا ہے کہ انگوٹھی وہاں ہے ہی نہیں ۔ میں اُس نزدیک اجنبی ہوں ۔ نہ میں زردار ہوں نہ میرا کوئی دوست ایسا ہے جو اُس پر اپنا اثر ڈال سکے ۔ اُس نے اگر موقعے سے فائدہ اٹھانا چاہا تو میرے بنائے کچھ نہ بن پڑے گا ۔ اگر وہ اتنا ہی حریص ہے جیسا کہ برڈیے کے بیان سے ظاہر ہوا ۔ تو بس اُس کا اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ گرانڈن کے مقدمہ میں میرے ساتھ ناانصافی ہوئی تھی اب خدائی فیصلہ ہوگیا ۔ بجائے پیرنگ کے پاس جانے کے قانونی مشورہ لینا زیادہ مناسب ہوتا لیکن اس کے لئے بھی روپیہ کی ضرورت ہے ۔ اور یہاں ٹکا پاس نہیں ۔ بفرضِ محال عدالت میں چارہ جوئی بھی کروں تو پیرنگ کو باقاعدہ اطلاع ہونی ضروری ہے ۔ اور اطلاع ملتے ہی وہ انگوٹھی کو ڈھونڈ لے گا اور عدالت کے اندر اثبات بالغی میں جو کچھ بیان کرے تسلیم کرلیا جائے گا ۔

" لہذا یہ صاف ظاہر ہے کہ بجز اس کے کوئی چارہ نہیں کہ میں خود اس مکان میں جاؤں ۔ ممکن ہے کہ اس راہ میں بھی کانٹے ہوں ۔ تو کیا انسان اپنی مملوکہ شے کے چرانے کا استحقاق رکھتا ہے ؟ جواب تو صریح نفی میں ہے مگر ایسی صورت میں بھی میں اپنی رہائی کے لئے دلیل پیش کرسکتا ہوں ہرچہ باداباد ، دو ایک گھنٹے میں گرینڈ لے سٹریٹ کے مکان نمبر ۲۲ کا ایک سرسری معائنہ ضرور کرنا پڑے گا "

× × × × × × × × × × × ×

رات کے گیارہ بج چکے ہیں ۔ رشیفرڈ اپنے خیالات میں غلطاں و پیچاں گرینڈلے سٹریٹ میں سے گزر رہا ہے ۔ جاتے جاتے وہ ایک مکان کے سامنے ٹھہر گیا اور تاریکی میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا ۔ اب اُس کی سمجھ میں آیا کہ مکان کے باہر کھڑے ہوکر دیکھ بھال کرنے اور اُس کے اندر چور کی طرح داخل ہونے میں بڑا فرق ہے اُس کی زندگی مصائب کے تھپیڑوں سے محفوظ نہ تھی ۔ لیکن نقب زنی کی ابتدائی مشق کے لرزہ انگیز احساس کا یہ پہلا تجربہ تھا ۔ وہ دل کو بار بار یہ سمجھانے کی کوشش کرتا کہ حقیقی معنوں میں یہ چوری نہیں ہے لیکن دل پر ایسا خوف طاری تھا کہ سر سے پیر تک بید کی طرح کانپ رہا تھا ۔ تین بار ارادہ کرکے آگے بڑھا ، مگر ہمت نہ ہوئی آخر اس خیال سے تقویت ہوئی کہ مکان میں اندھیرا ہے اور پرسوں تک کے لئے خالی ہے ۔ اگر اب فائدہ نہ اُٹھایا تو

پھر ایسا موقع ہاتھ نہ آئے گا۔ اس مکان کے پہلو میں ایک گلی مکان کے اندر جانے کے لئے تھی۔ شیفرڈ بے پاؤں اس گلی میں داخل ہوگیا اور دروازے پر پہنچا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک جست میں وہ دیوار پھاند کر اندر اُتر گیا۔ اور پہلا کام یہ کیا کہ دروازے کی چٹخنی کھول دی۔ تاکہ اگر فرار کی ضرورت پیش آئے تو جلد نکل بھاگے۔

آگے بڑھ کر اُس نے دیکھا کہ ایک چھوٹا سا پائین باغ ہے جس کی پختہ دیواریں ہر چہار طرف ہری بیلوں سے ڈھکی ہوئی ہیں۔ مکان کا پچھلا حصہ بھی تاریک تھا۔ لیکن پڑوس کے ایک مکان کی کھڑکی سے اُس کے کچھ حصہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ شیفرڈ اس روشنی کے گل ہو جانے کا منتظر رہا۔

اس روشنی سے اتنا فائدہ اس کو ضرور ہوا۔ کہ اُس مخصوص کمرہ کا پتہ چل گیا جس میں بریڈلے کے بیان کے مطابق شمعدان رکھے ہوئے تھے۔ یہ کمرہ نصف بیضاوی شکل کا تھا اور اُس کے سامنے ایک چھوٹا سا چوبی بالاخانہ تھا جہاں سے پائیں باغ میں اترنے کے لئے زینہ بنا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ روشنی جس کی وجہ سے اُس کے دل پر خوف غالب تھا ناگہان بجھ گئی۔ آنِ واحد میں زینہ کی راہ سے وہ بالاخانہ پر پہنچا۔ اور کمرے کی کھڑکیوں کے قدِ آدم دروازوں کو ٹٹول کر ایک دروازے کو دھکا دیا۔ دھکا دیتے ہی زور کی آواز ہوئی۔ اور دروازہ کھل گیا۔ آواز سے سہم کر شیفرڈ جھٹ بالاخانہ سے اتر کر پائین باغ میں ہو رہا۔ لیکن ہر سمت خاموشی تھی۔ اس لئے پھر وہ زینہ سے بالاخانہ پر اور وہاں سے کمرے میں جا پہنچا۔ کامیابی اور حصولِ آرزو کی امید سے اُس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ اگر وہ شمعدان اسی کمرے میں ہے تو یقیناً گوہرِ مقصود ہاتھ آگیا۔ اُس نے جیب سے دیا سلائی نکال کر جلائی۔ اُس کی مختصر سی روشنی میں پہلے اُس کی نظر جس پر پڑی وہ ایک شخص تھا جو لمبا کوٹ اور فلٹ ٹوپی پہنے دائیں ہاتھ میں ایک پستول لئے اُس کے سامنے کمرے کے اندرونی دروازے پر کھڑا تھا جیسے ہی اُس کی نظر اُس شخص پر پڑی دو باتیں اُس کے ذہن میں آئیں اول یہ کہ پیرنگ خلافِ توقع اس وقت یہاں کیسے آگیا۔ دوسرے یہ کہ اگر اُس نے پستول چلا بھی دیا تو صرف میری ٹانگوں میں گولی مار سکتا ہے۔ موخرالذکر خیال کے آتے ہی اُس کے دل کو ڈھارس بندھی۔

اُس کے مقابل نے اطمینان کے لہجہ میں کہا۔ "دیکھنا دیا سلائی کو بجھنے نہ دینا"۔ یہ الفاظ ایسے ہی حاکمانہ لہجے میں ادا کئے گئے تھے جیسے کوئی مسلح آدمی کسی نہتے شخص کو مخاطب کرتا ہے۔

"اسی دیا سلائی سے اس شمع کو روشن کرو"۔ یہ کہتے ہوئے شیفرڈ کو پستول کی زد میں رکھ کر اُس نے آتشدان پر سے ایک شمع اتار کر میز پر رکھ دی۔ شیفرڈ نے حکم کی تعمیل میں جھٹ جھک کر شمع جلا دی۔

مالک مکان نے اپنے ناخواندہ مہمان سے کہا "میں نے دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ تم نے دروازہ توڑ ڈالا۔ شاید تم سمجھے تھے کہ مکان خالی ہے۔"

**شیفرڈ۔** (مایوسی کے لہجہ میں) "ہاں"

اُس وقت اُس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اور دل ہی دل میں اپنی حرکت پر نفرین کہہ رہا تھا۔ یہ تو سچ ہے کہ اُس کے پاس جواب تھا۔ لیکن اُس کا اثر کیا تھا؟

**وہی شخص۔** "اور تمہاری قسمت نے تم کو دھوکا دیا۔ بالکل خاموش کھڑے رہو گے تو میں تم کو کوئی ضرر نہیں پہنچاؤں گا"

یہ کہہ کر متکلم نے آتشدان پر ٹیلیفون کا رسیور اپنے ہاتھ میں لے لیا۔

**شیفرڈ۔** (لجاجت کے ساتھ) "ذرا ٹھیرئیے۔ کیا آپ مسٹر پیرنگ ہیں؟"

**وہ شخص۔** "آخر تمہارا مقصد؟"

**شیفرڈ۔** "کیونکہ آپ یقین کریں یا نہ کریں۔ مگر میرے پاس یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ ہے"

**وہ شخص۔** "یہ وجہ پولیس کو بتا سکتے ہو"

**شیفرڈ** (گھبرا کر) "ٹھہرئیے۔ خدا کے لئے جلدی نہ کیجئے۔ میں ایک ایسے شخص کا نام لوں گا جس سے ہم دونوں واقف ہیں یعنی اڈمنڈ گرانڈن"

ٹیلیفون کا رسیور ہاتھ میں لئے پیرنگ نے (کیونکہ یہ پیرنگ ہی تھا) چیں بہ جبیں ہوکر شیفرڈ کو گھور کر دیکھا۔

**شیفرڈ** (کلام جاری رکھتے ہوئے) "وہ کبھی تمہارا دوست تھا اور میرا بھی۔ اپنے وصیت نامہ میں وہ اپنی زمرد اور ہیرے کی انگوٹھی میرے نام لکھ گیا۔ مجھے اب اتفاقیہ طور پر یہ معلوم ہوا ہے کہ وہ انگوٹھی آپ کی لاعلمی میں یہاں پوشیدہ ہے"

**پیرنگ۔** "یہ کہو۔ تو تمہارا نام یقینی ....... لیکن فرض کرو کہ تم اپنا نام خود بتاؤ"

پیرنگ کی پیشانی کی شکنیں مٹ گئیں۔ اور اُس نے رسیور کو آتش دان پر رکھ کر موم بتّی کی روشنی میں اس آنے والے کی طرف گھور کر کہا "دیکھو جیب کے قریب ہاتھ نہ لے جاؤ۔ معلوم ہوگیا کہ تم افترا پردازی میں طاق ہو"

**شیفرڈ۔** "اگر مجھے آپ اتنا وقت دیں کہ میں واقعات کا اظہار کروں۔ تو آپ پر یہ روشن ہو جائے گا کہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں وہ حرف بہ حرف سچ ہے"

**پیرنگ۔** "گھبراؤ نہیں۔ تمہیں وقت کافی مل جائے گا۔ کم از کم دو سال"

شیفرڈ۔ (لاپروائی سے) مجھ کو اس میں کسی قدر شک ہے۔ میں اپنا نام اور یہاں اس مشتبہ حالت میں آنے کی وجہ بآسانی بیان کردوں گا۔"

پیرنگ "یعنی اس کی وجہ کہ تم میرے مکان میں اس طرح رات کو کیوں گھسے؟"

شیفرڈ۔ "ہاں اتنی ضرور میری غلطی ہے۔"

پیرنگ۔ "خیر مجھ کو تم سے بحث کی ضرورت نہیں۔ تمہارے افسانہ کا اتنا حصہ ضرور سچ ہے کہ شیفرڈ نامی ایک شخص کو اُس کے دوست مسمی اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنے وصیت نامہ میں ایک زمرد کی انگوٹھی لکھ دی تھی، جو اُس وقت غائب ہو چکی تھی۔ اب اگر تم وہی شیفرڈ ہو۔ تو تم کو کون سی شئے انگوٹھی کا علی الاعلان مطالبہ کرنے سے مانع تھی؟"

شیفرڈ۔ "یہ کہ انگوٹھی کھو چکی تھی۔ اور اب اس کے حصول کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں پہلے اس کا پتہ لگا لوں۔ مسٹر پیرنگ اتنا تو آپ سمجھ سکتے ہیں؟"

پیرنگ "اچھا تو آپ یہ فرماتے ہیں کہ اس مکان میں آپ اُسی انگوٹھی کی جستجو میں تشریف لائے ہیں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں میں نے یہی عرض کیا کیونکہ جس شخص نے وہ انگوٹھی چرائی تھی اُس نے اس کو اسی مکان میں چھپا دیا تھا۔"

پیرنگ۔ "اُسی مکان میں؟"

شیفرڈ۔ "ہاں مسٹر پیرنگ اسی مکان میں۔ بلکہ اسی کمرہ میں"

پیرنگ "اسی کمرہ میں؟"

شیفرڈ۔ "ان دو...... لیکن اس سے کیا فائدہ۔ میں دیکھتا ہوں کہ آپ میری باتوں کو باور نہیں کرتے۔"

پیرنگ "اب تک نہیں.... اچھا ٹھہرو۔ یہ تم سے کس نے کہا کہ وہ بیش بہا انگوٹھی میرے مکان میں پوشیدہ ہے؟"

شیفرڈ۔ "جس نے اُس کو چُرا کر یہاں چھپایا تھا۔"

پیرنگ "دروغ گویم برروئے تو۔ اچھا تو وہ کون شخص ہے؟"

شیفرڈ۔ "یہ شخص مسٹر گرانڈن کا ملازم تھا۔ جب میں سفر سے وطن واپس آیا تو اُس نے مجھ کو ڈھونڈ نکالا اور مجھ سے اپنے اس ارتکاب جرم کا اقبال کیا۔ درحقیقت اس سے یہ فعل طمع کے عارضی اثر میں آکر سرزد ہوا تھا اور وہ ہمیشہ اپنی اس حرکت پر نادم رہا اور اُس کی تلافی کے لئے موقعہ کا منتظر۔ اس وقت وہ سخت بیمار اور

جاں بلب ہے"

پیرنگ "خوب! میں مسٹر گرانڈن کے ملازموں سے واقف ہوں۔ اُس شخص کا نام کیا ہے؟"

شیفرڈ "ابھی میں اس کو ظاہر کرنا نہیں چاہتا"

پیرنگ "میں سمجھتا تھا۔ آئے اب گرفت میں! کہاں گئی آپ کی سچائی؟"

شیفرڈ "اگر آپ مجھ کو مجبور کریں گے۔ تو میں آپ کو یہاں سے سیدھا اُس آدمی کے پاس لے چلوں گا"

پیرنگ "یعنی تمہارے ہمراز چور کے پاس؟ بس اب زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ اتنی دیر تک میں تم سے اس لئے سوالات کرتا رہا کہ تمہارے برجستہ سفید جھوٹ میں لطف آرہا تھا۔ اچھا تو آپ اپنے دعوے پر اب بھی قائم ہیں کہ وہ زمرد کی انگوٹھی میرے مکان میں موجود ہے؟"

شیفرڈ۔ "بہت ممکن ہے کہ اسی کمرہ میں ہو"

پیرنگ۔ "بہت ممکن ہے؟ اچھا کس مقام پر"

شیفرڈ اب تذبذب کی حالت میں تھا۔ اس شخص کا لب ولہجہ، سنگدلی اور حریص نگاہیں بریڈے کے بیان کی صاف تائید کر رہی تھیں۔ لہذا کافی ہوشیاری اور احتیاط کی ضرورت تھی۔

پیرنگ "میں منتظر ہوں (ترش روئی کے ساتھ) وہ زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے؟"

عجب کشمکش اور امید وبیم کا وقت تھا وہ کسی قدر مایوسانہ لہجہ میں بولا۔

"اگر وہ وہیں ہے جہاں مجھے بتایا گیا ہے تو اگر آپ اجازت دیں تو میں اُس کو ڈھونڈ نکالوں"

پیرنگ "میرے بھولے بھالے دوست خبردار! اگر تم نے اس کمرے کی کسی چیز کو ہاتھ لگایا۔ اس پستول کی گولی فی الفور تمہارے سینہ کے پار ہوگی۔ اگر تم محض جھوٹ نہیں بولتے، حالانکہ میرا تو یہی خیال ہے، تو اپنے بیان کے ایک جزو ہی کی تائید میں مجھ کو یہ بتادو کہ وہ انگوٹھی کس جگہ پر ہے۔ بتاؤ۔ جلد بتاؤ"

شیفرڈ (سخت مایوسی اور پیچ وتاب کے لہجے میں) "اس کو چھپائے ہوئے کچھ عرصہ ہوا۔ کیا عجب ہے کہ کسی نے اُس کو پہلی جگہ سے نکال کر کہیں اور رکھ دیا ہو۔ اُس کا اسی مقام میں ہونا یقینی نہیں ہے۔ بہر کیف اگر جہاں میں بتاؤں وہاں انگوٹھی نہ ہوئی تو آپ میرا بیان صریح جھوٹ سمجھیں گے"

پیرنگ "کچھ بھی سہی۔ تم کو اپنا بیان سچ ثابت کرنے کا ایک موقعہ تو ہے؟ کہاں ہے۔ بولو"

"ان دونوں شمعدانوں میں سے ایک میں" یہ الفاظ شیفرڈ کے لب تک آکر رہ گئے۔ اور وہ اس خیال میں

خاموش کھڑا رہا کہ ایسے وقت میں بھی کسی کو اس کا موقع نہ دینا چاہیئے کہ وہ میری چیز پر قابض ہو جائے۔ اگر میں نے رازافشا کر دیا تو پھر کونسی شے پیرنگ کو اس سے باز رکھ سکتی ہے کہ وہ فوراً مجھ کو اپنے مکان سے یہ کہہ کر نکال دے کہ ابھی میں اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ میں تم کو پولیس کے حوالہ نہیں کرتا۔ اور اس طرح میری انگوٹھی پر قابض ہو جائے۔ شیفرڈ کو اس کا کامل یقین بھی تھا کہ اگر موقع ملا تو پیرنگ ضرور ایسا ہی کرے گا۔

**شیفرڈ** ۔ (باآواز بلند) "اچھا پھر بلاؤ پولیس کو۔ میں پولیس کا خاموشی کے ساتھ منتظر رہوں گا۔ یہ یقینی امر ہے کہ میں زیادہ دنوں تک حراست میں نہیں رہ سکتا۔ اس لئے کہ مجھ کو یہ ثابت کرنا دشوار نہ ہوگا۔ کہ میں وہی شیفرڈ ہوں جس کو اڈمنڈ گرانڈن نے مرتے وقت اپنی زمرد کی انگوٹھی دی تھی۔ علاوہ ازیں پولیس میرے مخبر چور کی شہادت ضرور لے گی۔ جو میرے موافق ہوگی۔ صرف تمہارے مکان میں گھسنے کے الزام میں سزا پاؤں گا۔ لیکن اس کے بعد قانون میری جائز وراثت مجھ کو دلائے گا۔ جاؤ میں تیار ہوں۔ تمہاری ایسی تیسی!"

پیرنگ نے اب دیکھا کہ شیفرڈ کے چہرے سے اطمینان اور استقلال کی جھلک نمایاں ہے۔

**پیرنگ** ۔ (شیفرڈ کو بغور دیکھتے ہوئے) "فرض کر لو کہ تم سچ کہتے ہو۔ یہ تو میں کہتا نہیں کہ تم سچ ہی کہتے ہو۔ مگر ممکن ہے کہ تمہارے بیان میں صداقت ہو۔ تاہم اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا کہ تم میرے مکان میں چور کی طرح داخل ہوئے ہو۔ اگر میں اتفاقیہ طور پر ایک دن پیشتر واپس نہ آجاتا تو تم یہاں جو چاہتے کرتے۔ تمہارا یہ فعل سخت قابلِ نفرین ہے۔"

شیفرڈ خاموش کھڑا سنتا رہا۔ بعض حالتیں ایسی ہوتی ہیں کہ انسان کو معافی مانگتے بھی شرم آتی ہے۔

**پیرنگ** "پس اگر تم جھوٹ نہیں بولتے۔ تو بھی اگر میں تم کو پولیس کے حوالہ کر دوں تو اقدامِ سرقہ کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔"

**شیفرڈ** "میں نے تو یہ اقرار کر لیا ہے۔ اس کا اعادہ فضول ہے۔۔۔"

**پیرنگ** ۔ اور اگر انگوٹھی یہاں نہ ملی تو تمہاری مایوسی کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور قرینہ ہے بھی یہی۔ ایسی حالت میں تم کو میری بات مان لینی چاہیئے۔ خواہ وہ انگوٹھی یہاں ہو یا نہ ہو۔ ہر حالت میں میں تم کو پانچ سو روپیہ دوں گا۔ اور صورتِ حال کو مدنظر رکھتے ہوئے میرا یہ سلوک فیاضانہ ہے۔"

شیفرڈ اس کی یہ باتیں سن کر حیران رہ گیا۔ اب اُس کو صاف نظر آنے لگا کہ پیرنگ میرے بیان کو سچ تسلیم کرتا ہے۔ مگر میری موجودہ حالت سے فائدہ اُٹھانے کی کوشش میں ہے۔ معاملہ کا رُخ یوں پلٹ جانا بالکل خلافِ اُمید

تھا۔ اور طمانیت بخش۔ کیونکہ اُس کو محسوس ہو رہا تھا کہ اب میں کشاں کشاں حوالات میں جانے سے محفوظ ہوں۔ اِس اطمینان کے ساتھ ہی اُس کو یہ محسوس ہُوا کہ ایسے بیش بہا زمرد کے عوض میں پانچ سو کی رقم میرے لئے باعثِ توہین ہے۔ وہ سوچنے لگا کہ ایک شخص کے مکان میں اس طرح داخل ہونا صریح غلطی تھی۔ اور اس کے صلہ میں نقصان کے ساتھ رہائی کا موقعہ ملے تو جائے شکر و امتنان ہے اُس نے کنکھیوں سے یہ دیکھ لیا تھا کہ دونوں شمعدانوں پر تازہ ملمع ہے اور یقیناً ان کو ملازمین ہر وقت صاف کرتے رہتے ہونگے۔ ممکن ہے کہ انگوٹھی نکل گئی ہو۔ پس پانچ سو روپیہ لینے سے انکار کرنا سراسر حماقت ہوگی۔ اور اپنی گرفتاری بھی یقینی ہے۔ اب رہا یہ دعویٰ کہ اس کے بعد قانوناً میں اپنی انگوٹھی حاصل کر سکتا ہوں بیوقوفی ہے۔

**پیرنگ** :۔ "دیکھو سمجھ لو۔ میں تمہارے ساتھ بہت نرمی اور نیکی کا سلوک کر رہا ہوں"۔

**شیفرڈ** :۔ "یہ ورثہ میرے لئے بہت گرانبہا ہے۔ تم دیکھتے ہو کہ اس کی خاطر میں نے اپنے آپ کو مصیبت میں گرفتار کر لیا ہے"۔

**پیرنگ** "صرف اتنا بتا دو کہ وہ انگوٹھی کس مقام پر ہے۔ اور پانچ سو روپیہ اسی وقت لے لو۔ ممکن ہے کہ تم غلط پتہ بتاؤ۔ پھر بھی یہ رقم تم کو دینے کو تیار ہوں۔ پانچ سو روپیہ اس چیز کے لئے جو ممکن ہے پہلے ہی غائب ہو چکی ہو اور اس کو بھی مدنظر رکھو کہ ممکن ہے کہ تمہارے مخبر نے تم سے جھوٹ بولا ہو۔ تم اُس کی باتوں پر ضرورت سے زیادہ بھروسا رکھتے ہو"۔

**شیفرڈ**۔ "لیکن انگوٹھی تو بیس ہزار روپے سے کم کی نہیں ہے"۔

**پیرنگ** "لیکن اُس کے ملنے کی امید موہوم ہے"۔

**شیفرڈ** :۔ "خیر اب تو میں تمہارے قبضے میں ہوں"۔

**پیرنگ** :۔ "اور باوجود اس کے میں تمہارے ساتھ رحمدلی اور فیاضی سے پیش آرہا ہوں۔ اپنے اختیارات کا استعمال کرنے کے بجائے تمہارے ساتھ سلوک کرنے کو تیار ہوں"۔

**شیفرڈ** :۔ "غالباً تم یہ بھی چاہو گے کہ میں تمہیں ایک تحریر دے دوں۔ جس کی رو سے میں اپنے حق سے دست بردار ہو جاؤں"۔

**پیرنگ** :۔ "ہاں۔ صرف ایک سطر اس مضمون کی کہ تم اپنا ورثہ یعنی انگوٹھی میرے ہاتھ بالعوض پانچ سو روپیہ نقد فروخت کر چکے ہو۔

شیفرڈ۔"خوفناک قربانی!"

پیرنگ۔"ہاں اس حالت میں جب کہ تمہیں کامل یقین ہو کہ انگوٹھی کا یہاں وجود بھی ہے"

شیفرڈ۔(مایوسانہ لہجہ میں)"اچھا مجھے منظور ہے"

پیرنگ نے بکس میں سے کاغذ نکال کر شیفرڈ کو دے دیا۔ اور شیفرڈ نے بیٹھ کر لکھنا شروع کیا۔ چند الفاظ لکھ کر پیرنگ سے مخاطب ہوا۔"تو آپ مجھے روپیہ انگوٹھی کا پتہ بتانے سے پہلے دیں گے؟ اس وقت تو میں آپ کے قابو میں ہوں"

پیرنگ نے"ہاں مجھے منظور ہے" کہہ کر بکس کھولا اور اس میں سے سو سو کے پانچ نوٹ نکال کر شیفرڈ کے ہاتھ میں دے دیئے۔ اور اس نے شمار کر کے جیب میں رکھ لئے۔

"لکھنا ختم کرو اور یہ کاغذ مجھے دو۔ اور ساتھ ہی ساتھ اپنا راز بھی بتاتے جاؤ۔ پھر تم جانے کے لئے آزاد ہو۔ راستہ میں شاید اپنی چالاکی پر مسکراؤ گے کہ میں نے خوب دھوکا دیا۔ انگوٹھی کہیں ہے اور بتایا کہیں"

شیفرڈ لکھنے کو پھر جھکا۔ اور دو تین الفاظ اور لکھ کر رک گیا۔ اس کے دل میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اس نے مجھے روپیہ دینے سے قبل راز معلوم کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ یہ ممکن تھا کہ وہ مجھے پہلے راز بتانے پر مجبور کرتا۔ دل میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہی اس نے اس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ اب تک وہ موم بتی کی طرف پشت کئے کھڑا تھا۔ لیکن اس وقت وہ کسی قدر مڑ گیا تھا۔ اور روشنی اس کے چہرے کے کچھ حصہ پر پڑ رہی تھی۔ نگاہ پڑنی تھی کہ شیفرڈ کے دماغ میں یک بیک بجلی کی سرعت کے ساتھ یہ احساس ہوا کہ پیرنگ اور برڈلے ایک ہی شخص ہے۔ یہ خیال اتنا تیز اور موثر تھا کہ شیفرڈ کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل پڑی۔ وہ چاہتا تھا کہ غور کرنے کا موقع ملے۔ لیکن وقت بہت تنگ تھا۔

ہوٹل کا اندھیرا کمرہ، جہاں ایک گوشے میں ایک بیمار پڑا دم توڑ رہا تھا جس کی صورت دھندلی روشنی میں صاف نظر نہیں آتی تھی، اس کی خوفناک کھانسی اور سر کے الجھے ہوئے بال یہ سب کچھ دھوکا اور فریب تھا اور وہ یہی پیرنگ تھا۔ برڈلے نام کا کوئی شخص نہ تھا۔ اسی شخص نے اس کو اپنے مکان میں جانے کی ترغیب دی اور اس کے پیچھے پیچھے خود آیا۔ ممکن ہے کہ اس سے پہلے ہی چلا آیا ہو۔ اب شیفرڈ کی سمجھ میں آیا کہ یہ سب دام اسی کے لئے پھیلایا گیا تھا۔ اب شیفرڈ کے ذہن میں یہ بات آئی کہ کیوں پیرنگ پورٹر سٹریٹ میں ایک ہفتہ تک مقیم رہا اور کیوں اس نے برڈلے کا فرضی نام اختیار کر کے اس کو مصنوعی قصہ سنایا۔ ہو نہ ہو وہ زمرد کی انگوٹھی

پیرنگ کے پاس ہے جس کو وہ اب تک چھپائے ہوئے تھا۔ تاکہ موقع پاکر اُس کے مالک کو دام میں لے آئے اور اِس طرح بیس ہزار روپیہ کی انگوٹھی کا صرف پانچ سو روپیہ میں مالک بن بیٹھے۔

اِن خیالات سے اُس کے رگ و پے میں ہیجانی کیفیت طاری تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا ترکیب اختیار کرنا چاہیئے۔ صرف ایک صورت تھی۔ اور وہ اُس کی سمجھ میں آگئی۔ لیکن اگر وار خالی گیا تو کیا ہوگا؟ پہلے اپنی قوت عمل پر کافی بھروسا ہونا ضروری تھا۔

اُس نے لمبی سانس لی، اور قلم رکھ کر کاغذ اور اپنی مہمل تحریر پر نظر ڈالی۔ پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ایک ہاتھ سے اُس کاغذ کو پیرنگ کی طرف بڑھایا اور اُس کے چہرے کو غور سے دیکھنے لگا۔ آنکھیں ملتے ہی پیرنگ جھجک کر پیچھے ہٹا۔ اس کا ہٹنا تھا کہ شیرِ غراں کی طرح شیفرڈ نے اِس زور کے ساتھ جھپٹ کر پیرنگ کا گلا پکڑا کہ دونوں زمین پر آرہے۔ پیرنگ نیچے تھا شیفرڈ کے دونوں گھٹنے اُس کے سینے پر تھے اور وہ دونوں ہاتھوں سے اُس کی شہ رگ کو دبا رہا تھا۔ پیرنگ کی آنکھوں میں اندھیرا چھا گیا۔ شیفرڈ نے گھرک کر کہا "او جھوٹے بدمعاش، تیری ساری چالیں ظاہر ہوگئیں۔ جلد بتا میری زمرد کی انگوٹھی کہاں ہے ورنہ ......"

**پیرنگ** "خدا کے لئے رحم! رحم! میں نہیں جانتا۔ میں مر رہا ہوں"۔

"اگر جان تجھے عزیز ہے تو فوراً بتا انگوٹھی کہاں ہے؟"

"اس صندوقچہ میں جس میں سے نوٹ ......"

شیفرڈ نے اپنی پوری طاقت سے پیرنگ کا کالر پکڑ کر اُس کو کھڑا کیا اور کھینچتا ہوا صندوقچہ کے قریب لے گیا۔ خالی ہاتھ سے صندوقچہ میں سے ایک سبز ریشمی ڈبیہ ملی جس میں وہی زمرد کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی رکھی ہوئی تھی۔ اُس نے ڈبیہ کو جیب میں ڈالا اور ایک زور کا دھکا ایسا دیا کہ پیرنگ فرش پر چاروں شانے چت گر کر کچھ دیر کے لئے بے ہوش ہوگیا۔ اُس کو اسی حالت میں چھوڑ کر وہ نہایت اطمینان کے ساتھ جس راہ آیا تھا اُسی راہ نکل گیا۔

گرینڈلے سٹریٹ میں پہنچ کر اُس نے جیب سے سگریٹ نکال کر سلگایا۔ اس سگریٹ میں اس وقت کچھ عجیب ہی مزہ آرہا تھا۔ اُس نے اپنی جیب کو تھپکی دی جس میں اس وقت بیس ہزار روپیہ کی بیش بہا زمرد کی انگوٹھی تھی اور کہا "حق بحقدار رسید۔ دوست گرانڈن تمہارا شکریہ!"

**شاہ عبدالرحمٰن سیوانی**

# آہ امیر علی مرحوم

شکوۂ بختِ نارسا کیجے — گلۂ جورِ ناروا کیجے
زندگی کا جب اعتبار نہ ہو — آرزوؤں کو لے کے کیا کیجے
کیوں الجھئے فریبِ ہستی میں — کیوں نہ اب ترکِ مدعا کیجے
زیست اور اُس کی کیفیت معلوم — دل کو کیوں وقفِ مدعا کیجے
زندگی ایک دردِ پیہم ہے — کیوں نہ اس درد کی دوا کیجے
ماجرائے حیات کیا کہئے — شرحِ آلام تابکجا کیجے

مختصر یہ کہ داغ داغ ہے دل
سوزِ پنہاں سے اک چراغ ہے دل

اب کسے فکرِ بادۂ سرجوش — شمع افسردہ اور بزم خموش
اُٹھ گیا دہر سے وہ پیکرِ عقل — کیوں نہ ہو تار تار دامنِ ہوش
فخرِ طوسی و رشکِ دوانی — جس کی ہر بات تھی پیامِ سروش
اُس کی آنکھیں نشاطِ فردا پر — اور زباں اُسکی وقفِ لذتِ دوش
نہ رہا دہر میں امیرِ علی — کلکِ رنگیں تھا جس کا لالہ فروش

بزم نظارہ سوز تھی جس سے
یعنی عالم فروز تھی جس سے

کس لئے دل کو بے قرار کریں — گلۂ عمرِ مستعار کریں
موت کا بھی جب اعتبار نہیں — زندگی ہی کا اعتبار کریں
مرنے والے کی طرح کانٹوں سے — پہلے ہاتھوں کو ہم فگار کریں
پھر اسی خارزار سے پیدا — اک نیا باغِ پُر بہار کریں
زندہ کرنے کا اختیار نہیں — اُس کا مسلک ہی اختیار کریں
آؤ بحرِ جہاں کی موجوں سے — گرم میدانِ کارزار کریں

زندگی لالہ زار ہو جائے
یہ چمن پُر بہار ہو جائے

ابوالمکارم سلیم اللہ

# آنسو

اے مرے آنسو کبھی بیکار ہو جاتا ہے تُو — اور کبھی دامن پہ بن جاتا ہے اک نقشِ وفا
تیری قیمت کچھ نہیں بنتی نگاہوں میں کبھی — اور کبھی بنتا ہے تو گنجینۂ صدق و صفا

پرورش پاتا ہے تو قلبِ حزیں میں اسطرح — جس طرح چشمِ صدف میں گوہرِ شہوار
تیرے سینے میں ہیں پنہاں رازہائے رنج و غم — تو ہے پچھلی کیف پرور صحبتوں کی یادگار

تو کبھی پھولوں میں بن جاتا ہے قطرہ اوس کا — اور کبھی تاریک بادل میں ستارے کی ضیا

جلوہ گر ہوتا ہے تو بجلی کے پہلو میں کبھی — اور کبھی تو خود ہی بن جاتا ہے شعلہ قہر کا

دیکھ کر تجھ کو کبھی ہوتا ہے سینہ غم سے شق — اور کبھی آنکھوں میں بن جاتا ہے تو وجہِ نشاط
ترجمانِ حالِ دل ہے غم کی خاموشی میں تو — اک سمندر ہے اگر حاصل ہو تجھکو انبساط

تو ہی مظلوموں کی فریادِ دل کا ہے فریاد رس — غم کے شعلوں کو بجھا دیتا ہے دل میں آکے تو
ختم ہو جاتی ہے کلفت تیری طغیانی کے بعد — نغمۂ عشرت سنا دیتا ہے دل میں آکے تو

مولوی سید ابو محمد ثاقب کانپوری

# ایجادِ عظیم

ایک اتوار کی صبح کا ذکر ہے، شیطان خدا کی تلاش میں نکلا اور اُس نے اُسے پالیا۔ شیطان نے کہا: "اے خدائے بزرگ و برتر! تو انسانوں کی وجہ سے کیوں پریشانیوں میں مبتلا ہوتا ہے؟ ...... کیا تو نہیں جانتا کہ یہ کیسی ناکارہ جنس ہیں؟ ..... انہیں میرے حوالے کردے اور ان سے خود کوئی سروکار ہی نہ رکھ! یہ تو ایک فکرِ عبث ہیں؛ بدکردار اور احمق!"

مگر خدا نے جس کی طبیعت اُس وقت کسی ہرزہ درائی کے سننے کے لئے تیار نہ تھی ذرا درشتی سے جواب دیا:

"نکل جا یہاں سے، پاجی اور ملعون، مَیں آج کے دن ایسی نابکار شکایات سننا نہیں چاہتا!"

"اے قدوس و ........"

"بس بس! وہ احمق کیسے ہو سکتے ہیں جب میں نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا؟ وہ کیوں کر احمق ہو سکتے ہیں؟"

"سچ ہے، تو نے اُنہیں اپنے نمونے پر پیدا کیا، لیکن تو نے ہی اُن کے دماغوں میں ایک کجی بھی رکھ دی۔ اگر تیری عظمت و جبروت مجھے اجازت دے تو میں کہوں کہ ......"

خدا نے سختی سے کہا: "خاموش! دُور ہو جا یہاں سے ...... قنوطی! مجھے غصہ میں نہ لا! ..... کیوں تُو یہاں ایسی جھوٹی کہانیاں سنانے آتا ہے؟ میری مخلوق احمق کیوں ہو؟ ..... میں تو اُن کو احمق نہیں دیکھتا!"

ابلیس نے کہا: "اے ذاتِ پاک تجھے اِس لئے معلوم نہیں کہ اُس دن سے ---- لیکن پہلے اِس واقعہ کے اظہار کی جرأت کے لئے تجھ سے ہزار بار معافی مانگتا ہوں ---- تجھے یاد ہے؟ ... جب انہوں نے تیرے رُخِ انور کی توہین کی تھی تو نے اُن کے ہاں نزول نہیں فرمایا۔"

"کیا؟ .... میری توہین؟ ...... کب؟ خدا نے چیں بہ جبیں ہو کر پوچھا، اور ایک بناوٹی فراموشی کے آثار اُس کے چہرے سے ظاہر ہونے لگے ---- یا، کون جانتا ہے کہ حقیقت کیا تھی؟ شاید وہ سچ مچ بھول گیا ہو، کیونکہ خدا سے ہر بات ممکن ہے اور وہ جامع صفات ہے۔

"کیا تجھے یاد نہیں؟ اُن دو چوروں کے ساتھ .... ایک پہاڑی پر جب ......"

خدا نے گفتگو کا موضوع بدلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا: "ٹھیک! تھوڑا ہی عرصہ گزرا۔ کیا اُن

لوگوں میں تو بھی تھا ؟"

"ہاں، اے قادرِ مطلق! میرا گزارا ہی اور کس بات پر ہے؟ میں دن رات اُن کے ساتھ ہوتا ہوں، حتیٰ کہ نیند میں بھی ...... میری ہی آغوش میں تو وہ پرورش پاتے ہیں اور میری ہی حفاظت میں وہ جیتے ہیں! میرے سوا اور کون اُن کو سیدھا راستہ دکھانے والا ہے؟ مگر وہ احمق ہیں! اُن کو پڑھاتے ہوئے مجھے صدیاں گزر گئیں مگر سب اکارت گیا، وہ بڑے ہی غبی ہیں!"

پطرس نے دیکھا کہ خدا کو اب غصہ آرہا ہے اس لئے انہوں نے مداخلت کر کے کہا: "ہاں، ہاں! ہم تجھے اچھی طرح جانتے ہیں! خدا ثبوت چاہتا ہے، صرف الفاظ یہاں کام نہیں آتے ...... ہٹ! اپنی مزخرفات سے ہمارے کانوں کو نہ بھر ...... اپنا راستہ لے ورنہ تیرے کانوں کو کھینچ کھینچ گز گز بھر کا کردوں گا!"

غریب شیطان کیا کرتا، وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا کیونکہ وہ سمجھ گیا تھا کہ پطرس نے مذاق نہیں کیا، لیکن اُس نے دل ہی دل میں کہا: "تم ثبوت مانگتے ہو؟ اب تمہیں ثبوت ہی لاکردوں گا ... اور بہت سے!"

سو وہ چلتا رہا، چلتا رہا، یہاں تک کہ غروبِ آفتاب کے وقت وہ ایک جرمن شہر میں پہنچ گیا جو دو دریاؤں کے درمیان امن سے بستا تھا۔ جونہی وہ شہر کے دروازے میں سے گزرا اُس نے اینجلوس کی آواز سنی۔ شیطان کا رُواں رُواں کانپ اُٹھا اور وہ ٹھہر گیا ...... اپنی حلقہ دار دم کو لپیٹے ہوئے اور اپنے تیز تیز ناخنوں کو ہتھیلیوں میں چبھوئے ہوئے وہ اُس وقت تک وہاں کھڑا رہا جب تک اُس آواز کی گونج فضائے شام میں جذب ہو گئی۔ پھر وہ جلد جلد قدم اٹھاتا ہوا شہر میں داخل ہو گیا اور فی الفور ایک ایسے شخص سے مخاطب ہوا جس کی داڑھی ناف تک پہنچی ہوئی تھی۔

"گٹن برگ صاحب تسلیم! مزاج تو اچھے ہیں آپ کے؟"

اور ...... وہ دوست بن گئے۔ ایک چیز سے دوسری اور دوسری سے تیسری میں ہوتے ہوئے آخر وہ ایک لکڑی کے تابوت میں سما گئے۔ یہاں وہ بڑی دیر تک آپس میں گفتگو کرتے رہے لیکن جو کچھ شیطان نے اُس نیک آدمی سے کہا اُسے صرف شیطان جانتا ہے۔ اسی سے اندازہ کر لو کہ گٹن برگ کو اُس رات نیند نہ آئی اور خیالات نے اُس کے دماغ میں ایک تلاطم برپا کئے رکھا۔ اس کے بعد راتیں اسی طرح گزر گئیں اور اُس کی پلک سے پلک نہ لگی۔ وہ ہزاروں منصوبوں اور ارادوں، تدبیروں اور تجویزوں کے ساتھ مصروفِ جنگ رہا، اچھے اچھے منصوبوں کو اُس نے توڑ مروڑ کر ایک طرف پھینک دیا اور بُرے بُروں کو انتخاب کر لیا۔ اسی طرح بہت سے دن اور بہت سی راتیں گزر گئیں، یہاں تک آخر

بڑی کاوش کے بعد اُس نے چھاپے کا پریس ایجاد کیا!

تواب ...... کاغذ کو مضبوطی سے تھامے رہو! چھاپو ........ اور چھاپو ........ اور چھاپتے ہی چلے جاؤ!

پہلے پہل یہ کارخانہ کسی حد تک آہستہ آہستہ چلتا رہا مگر شیطان کا فکر بلند ہے۔ اُس نے دیکھا کہ پہیے اُس کی منشا کے مطابق تیز نہیں چلتے۔ سو اُس نے پہیئے کو اپنی دُم کے بیچ میں لپیٹ لیا اور لو! —— سرعتِ رفتار پیدا ہو گئی ...... اب وہ اُس وقت تک دم نہیں لیتا جب تک فی گھنٹہ دس لاکھ صفحے چھپ کر، گنے جا کر، بند ہو کر، مہریں لگ کر اور ڈاک کے ساتھ شامل ہو کر ریل کی سڑک پر نہیں پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں پھر وہ اپنی دُم کو گاڑی کے پہیوں میں پھنسا دیتا ہے اور اُسے نوے میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلاتا ہے۔ ذرا اپنے مطالب کی اشاعت کے لئے اُس کی عجلت پسندی ملاحظہ کیجے۔

بہت عرصہ نہیں گزرتا کہ پطرس جنت کے دروازے پر ایک خطرناک شور سنتے ہیں، جیسے فتنۂ تاتار بیدار ہو کر آ گیا ہو۔ سیٹیوں، نعروں اور گالوں سے آسمان گونج اٹھتا ہے اور فضا غبار آلود ہو جاتی ہے!

"یہ کیا ہے؟ ...... یہ کیا ہے؟"

یہ شیطان ہے، جو ایک دو دو گاڑی کو الہام، فلسفہ اور قانون کی کتابوں اور نئے پرانے اخباروں اور رسالوں سے لاد کر لایا ہے۔ ملعون ان تمام کو پہلے نیچے اُتارتا ہے اور پھر اس انبار کو اٹھا کر بے تحاشا خدا کی طرف بھاگتا ہے۔

خدا کہتا ہے "ناکارہ، بدمعاش! تو پھر یہاں آ گیا؟

"ہاں اے قادرِ مطلق!"

"تو کیا خبر لایا ہے؟"

"ایک معمولی سی لے علم و فضل کے مالک۔ یہ گڑ گڑا کر حاضر ہوا ہوں۔ ثبوت تو نے مانگا تھا، ثبوت ہی لایا ہوں ..... محترم پطرس! مجھے ممنون فرمائیے۔ اپنی عینک لگا لیجئے اور ذرا آپ بھی دیکھئے ...... " شیطان نے تمام چیزیں خدا کو اور پطرس کو دکھا دیں۔

خدا اور پطرس حیران رہ گئے۔ دونوں ایک دوسرے کے منہ کی طرف دیکھنے لگے۔

"اے حی و قیوم، کیا میں سچا نہیں ہوں؟"

خدا کچھ جواب نہیں دیتا۔

"جناب پطرس، کیا میں سچا نہیں ہوں ؟

پطرس بھی کچھ جواب نہیں دیتے۔

کچھ دیر کے بعد خدا پوچھتا ہے "اچھا، تو تمہارا مطلب کیا ہے"؟

"یہی کہ انسانوں کو میرے حوالے کر دے، جیسا کہ معاہدہ ہُوا تھا"۔

خدا تنگ آکر جواب دیتا ہے: "ہاں! لے جاؤ ان کو اور مجھے تنہا چھوڑ دو"۔

شیطان خوشی سے اچھلتا کودتا چل پڑتا ہے۔

"ٹھہر! ۔ ۔ ۔ ۔ بے ہودہ کار، ۔ ۔ ۔ ۔ کہاں جاتا ہے؟"

"اُن پر اپنا قبضہ جمانے کے لئے"۔

"کیا؟ ۔ ۔ ۔ اور یہ خباثت تو یہیں پھیلا جائے گا؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُٹھا اس سب کو! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر مجھے پھر کبھی معلوم ہوا کہ تو ایسی بے ہودگی لے کر یہاں آیا ہے تو میں پطرس سے کہہ کر تیری دُم کٹوا دوں گا، سنا؟"

چنانچہ شیطان نے تمام انبار سمیٹ کر اپنے سر پر رکھ لیا اور دُم دبا کر وہاں سے بھاگا۔

اس طرح نوعِ انسان نے کتاب خانے اور دار العلوم بنانے سیکھے تاکہ زمانہ اُن کی عقل و دانش کو تباہ نہ کر سکے۔

"بیڈ وینو" منصور احمد

---

جس طرح رات اپنی تاریکی میں التجائے روشنی پنہاں رکھتی ہے اسی طرح میری بے خبری کے عمق میں یہ آواز گونجتی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو + جس طرح طوفان جب وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ امن شکن ہوتا ہے۔ اپنی نہایت بھی امن ہی میں تلاش کرتا ہے، اسی طرح میرا انحراف تیری محبت کو صدمہ پہنچاتا ہے، اور پھر بھی صدا یہی ہے کہ میں تجھے چاہتا ہوں اور صرف تجھی کو +

ٹیگور

---

# محبّت رُوحِ خاموشی بھی ہے

محبت رُوحِ خاموشی بھی ہے جانِ سخن بھی ہے
گلستانِ مسرّت بھی ہے صحرائے محن بھی ہے

اِسی سے زیست ترّیں ہے اِسی سے موت سیمیں ہے
محبت نُورِ ہستی بھی ہے تنویرِ کفن بھی ہے

جُدا دنیا سے ہے لیکن ہے اِک دنیا تصوّر کی
محبت کا چمن خلوت بھی ہے اور انجمن بھی ہے

وہ نکہت ہے محبت جس میں دنیا بھر کی خوشبو ہے
محبت بوئے گل بھی عطر بھی مشکِ ختن بھی ہے

جھلکتی ہے ہمیشہ اِس کی یک رنگی میں رنگینی
بیابانِ محبت دشت بھی ہے اور چمن بھی ہے

مری تیری محبت بس کہ ہے تصویرِ عصمت کی
کہ اے دلبر مری، تُو میری دلبر بھی بہن بھی ہے

میں تیرے پاس رہتا ہوں تُو میرے پاس رہتی ہے
مرا مسکن تری فرقت میں غربت بھی وطن بھی ہے

جدا اُس سے نہ رہ دم بھر جدائی میں تری اے جاں
بہارِ کم سخن بیدل بھی ہے اور خستہ تن بھی ہے

بہار

# مفروضہ چینی ققنس کی تحقیق

(نوشتہ آنریبل-ایم، یو، ہاچسوکا)

جو لوگ چینی آرٹ اور لٹریچر سے واقفیت رکھتے ہیں وہ اُن دو پرندوں سے بھی آشنا ہوں گے جنہیں اہلِ چین "فینگ ہوانگ" اور "لوآں" کہتے ہیں اور اہلِ جاپان "ہواؤ" اور "لوآن" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ "فینگ ہوانگ" کو مغربی لغات اور فرہنگوں میں ققنس لکھا گیا ہے۔ مدت سے میرا خیال ہے کہ یہ دونوں پرندے خاکدانِ ارضی میں موجود تھے جس بات نے مجھے اس نتیجے پر پہنچایا ہے وہ وہ فرق تھا، جو چھوٹے اور بڑے "ققنس میں کیا گیا تھا۔

بڑے پرند کو "یوٹسو" کہتے تھے۔ عمر کے لحاظ سے اُس کی شکل وصورت کو پہچان لینا اور لانبی لانبی قامت کے شکاری پرندوں میں اُسے ڈھونڈ لینا ایک متبصر کے لئے کچھ مشکل کام نہیں ہے۔ وہ بغیر کسی دقت کے اُس کی شناخت کر لیتا ہے۔ میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ "ققنس" اور "لوآں" محض خیالی اور مفروضہ پرندے نہیں ہیں۔ بلکہ اُن کی ہستی موجود ہے، لیکن وہ آنکھوں سے اوجھل رہتے ہیں۔ خصائص اور مدارج کے لحاظ سے یہ دونوں پرندے آپس میں گہری مشابہت رکھتے ہیں۔ اس دعوے کی دلیل یہ ہے کہ تشریحاتِ قدیمہ میں "فینگ ہوانگ" کا سر مرغ کی مانند، گردن سانپ جیسی، ٹھوڑی ابابیل کی سی، پشت کچھوے کی طرح اور دُم مچھلی کی مانند بیان کی گئی ہے۔ پانچ رنگ اور لمبائی چھ فٹ بتائی گئی ہے۔

آؤ اِن تشریحات کو ذرا وضاحت کے ساتھ بیان کریں۔

۱۔ **سر مرغ کا سا۔** "ققنس" کا سر بہت کچھ پالتو مرغ کے سر سے ملتا جلتا ہے۔

۲۔ **سانپ جیسی گردن۔** اُس کی پتلی گردن اس طرح سے گردش کرتی ہے جیسا کہ سانپ کا پھن عالمِ غیظ وغضب میں لہراتا ہے۔

۳۔ **ابابیل کی ٹھوڑی۔** البتہ یہ مشابہت اور مماثلت کچھ قدر قرینِ قیاس نہیں ہے۔

۴۔ **کچھوے کی پشت۔** ققنس کی پیٹھ پر بے ترتیب نقطے اور دھاریاں ہوتی ہیں۔ پروں کے نیچے یہ نقطے شکلِ مسدس کے ضلعوں کی طرح اور بھی بے ترتیب ہو جاتے ہیں۔ پروں کے اوپر جو نقطے ہوتے ہیں وہ لکیروں اور دھاریوں سے مل جاتے ہیں جنہیں دیکھ کر گمان ہوتا ہے کہ وہ کچھوے کی کھال ہے۔ بعض قدیم کتابوں میں "ققنس"

کی پیٹھ کو چیتے کی کھال سے تشبیہ دی گئی ہے۔

۵- مچھلی جیسی دُم - "ققنس" کی دُم بالکل اُس مچھلی سے ملتی جلتی ہے جو بغیر کسی حرکت کے زمین پر چپٹی پڑی ہو۔

۶- پانچ رنگ - اس کے یہ معنی ہیں کہ وہ کئی رنگ رکھتا ہے۔

۷- چھ فٹ لمبائی - یہ مسلمہ امر ہے کہ پچھلے زمانے میں چین میں جو فٹ رائج تھا وہ عہدِ حاضر کے فٹ سے بہت چھوٹا تھا۔ اور ملک کے اقطاع و اکناف میں اُس کے مختلف اندازے تھے۔ اس لحاظ سے اُن کی پیمائش کو زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ خصوصیت کے ساتھ اِس پیمائش میں یہ تعین نہیں کیا گیا کہ یہ لمبائی سر سے پاؤں تک زمین پر بیٹھے ہوئے کی گئی ہے یا کسی درخت پر بیٹھے ہوئے سر سے دُم تک کی گئی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اہلِ چین اعداد و شمار میں بہت محتاط نہیں ہیں۔ وہ مبالغہ آرائی کے خوگر ہیں۔

یہ ہے "ققنس" کی ماہیتِ جسمی کا تذکرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی وضع و قطع بہت کچھ تیتر (آرگس) سے ملتی جلتی ہے۔ جیسا کہ ڈارون تیتر کے پروں کے متعلق لکھتا ہے کہ:- "اُس کے پَروں پر نہایت ہی دلربا اور دل کش ٹیڑھی ترچھی کالی لکیریں ہوتی ہیں۔ اور نقاط سے گمان ہوتا ہے کہ وہ کسی چیتے اور تیندوے کی کھال ہے"۔ ؎۱

اب ہمیں اُن کی آوازوں کے متعلق سوچنا چاہئے۔ بدقسمتی سے میں نے نہ تو تیتر کی آواز سُنی ہے اور نہ ہی "ققنس" کی۔ لیکن "ہیوم اور مارشل" کے صفحہ ایک سو ایک پر بعنوان "ہندوستان، برما، اور سیلون کے شکاری پرند" یہ عبارت درج ہے۔ "نر عموماً دس بارہ دفعہ "ہو ہو" کی آواز نکالتا ہے۔ جب وہ کریز چھوڑتا ہے تو یہ آواز ٹھیر ٹھیر کر آتی ہے۔ جس کا جواب فوراً ہی آس پاس سے مل جاتا ہے۔ بندوق کی آواز اور بندروں کے گزرنے کی چاپ اور آہٹ سے وہ اکثر مشتعل ہو کر بولنے لگتا ہے۔

مادہ کی آواز اچھی طرح سے سمجھ میں آتی ہے۔ وہ "ہاؤ۔ اُو۔ وو" کہتی ہے۔ آخری "وو" پر بہت زور دیتی ہے اور دس بارہ دفعہ سرعت کے ساتھ دہراتی ہے لیکن اُس کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔ حتیٰ کہ "اُو۔ وو" کو ایک دوسرے سے ہم آہنگ کر دیتی ہے۔ نر اور مادہ دونوں کی آواز بہت دور سے سنائی دیتی ہے خصوصاً نر کی آواز تو ایک میل سے بھی زیادہ فاصلے پر سنائی دیتی ہے"۔

یہ عبارت تیتر (آرگس) سے تعلق رکھتی ہے۔ لیکن "ققنس" کی آواز بھی اِس کی آواز سے ملتی جلتی ہے۔

---

؎۱ Descent of man, vol. ii, P. 141.

میرے خیال میں "فینگ" سے نر اور ہوانگ سے مادہ اس لئے مراد لی جاتی ہے کہ اُن کی آواز فینگ اور "ہوانگ" سے میل کھاتی ہے۔ امریکا کا مشہور عالمِ علم طیور لکھتا ہے کہ "ملایا میں تیتر کی آواز" کوآن" اور "کوانگ" سمجھی جاتی ہے۔ سکائی کے وحشی "لواک"۔ سیامی "کی اِک" اور سماٹرا کے دیسی باشندے "کوئی ویو" یا "کوآڈ" ترجمہ کرتے ہیں۔ اس لئے اُن ممالک میں اس پرند کا یہی نام پڑگیا ہے۔" [۱]

جب چین کے "ققنس" اور تیتر کی تحقیق ہو چکی تو "ققنس" کی ہستی سے انکار کرتے نہیں بنتی اور جو شبہات اُس کے وجود کے لئے ظاہر کئے جاتے ہیں وہ وہم باطل ہیں۔

تیتر کا شکار بندوق سے بڑی مشکل سے کھیلا جاتا ہے۔ پھر "ققنس" کا تو کیا کہنا۔ وہ ہمیشہ آنکھوں سے اوجھل رہتا ہے اور اُسے دُور سے بھی ایک نظر دیکھ لینا محال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا بھر میں صرف چار ہی ایسے عجائب خانے ہیں جن میں اُس کے ڈھانچے ملتے ہیں۔ چنانچہ مسٹر بیبی لکھتے ہیں "اس قسم کے پرندے سب سے زیادہ پوشیدہ رہتے ہیں۔ ہم اُن کے آس پاس رہتے ہیں، اُن کی آوازیں سنتے ہیں اور اُن کی رقص گاہوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوتے ہیں لیکن انہیں دیکھ نہیں سکتے۔ راتوں کو اکثر اُن کی آوازیں ہمارے کانوں میں آتی رہتی ہیں۔ جس سے اہلِ چین کے خیالی اور فرضی "ققنس" کی اصلیت و واقفیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے"۔ [۲]

اس پرند کی ظاہری شکل و صورت اور اُس کے خصائص کا اندازہ کرکے ایک محقق اُسے تلاش کر سکتا ہے۔ چینی ادبیات میں "سفید فینگ" اور "سفید لُواں" کا ذکر کئی بار ملتا ہے۔

چین میں تیتر کا نظر آجانا نیک شگون اور سعادت سمجھی جاتی ہے۔ اِس کے ظاہر ہونے کو امن و امان اور کسی بڑے پارسا کے پیدا ہونے کی نوید سمجھا جاتا ہے اور یہ عقیدہ اب تک اہل جاپان کے دلوں میں راسخ ہے۔ یہ امر مسلمہ ہے کہ سفید تیتر [۳] شہنشاہِ "طینجی" "ٹیمو" اور "شوٹو" کو ہدیۃً پیش کئے گئے تھے۔

مَیں نہیں جانتا کہ مشرقی مصنفین نے "ققنس" اور "لوآں" کے متعلق دادِ تحقیق دی ہے یا نہیں لیکن یورپ میں [۴] اُس کی باقاعدہ تحقیق و تدقیق شروع ہے۔ اے نیوٹن سابق پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی جو ممتاز عالمِ علمِ طیور تھے "جامع العلوم" "توشوچی چنگ میں لکھتے ہیں کہ "فینگ" کی تصویر صرف وہی مصور بنا سکے گا جس نے مور کو دیکھا ہو۔ فینگ کی وضع قطع بہت کچھ تیتر سے ملتی جلتی ہے [۵]

---

[۱] A monograph of the Pheasants By William Beebe. (Vol. iii, P. 118)

[۲] A monograph of The Pheasant (Vol, iv, P. lxxxi)

[۳] Tori, Vol, ii, No. 9, P. 248. [۴] Giles, Adversaria Sinica, (Vol. I, P.P. 9, 10)

(آرگس) کے متعلق مجھے پروفیسر نیوٹن سے کلی اتفاق ہے۔ لیکن مجھے اس بات سے قطعًا اتفاق نہیں ہے کہ "ققنس" مور کو دیکھ کر پہچانا جا سکتا ہے۔ میرے دلائل حسبِ ذیل ہیں:-

"کینگ" کے لغوی معنی سوراخ کے ہیں جس سے پتہ چلتا ہے کہ اُس کی دُم پر آنکھوں جیسے نشان ہوتے ہیں۔ یہ خاصیت "ققنس" کے کسی قدیم نام کے ساتھ بیان نہیں کی گئی۔

چینی اور جاپانی زبان میں بعض ایسی اصطلاحیں بھی موجود ہیں۔ جن میں لفظ "فینگ" آتا ہے۔ مثلًا

(۱) "ققنس" کے سر کی سی بط (کلغی دار بط)۔ اُس کی کلغی پیچھے کی طرف مڑی رہتی ہے۔ لیکن مور سے بالکل نہیں ملتی۔ مور کا تاج عمومًا اوپر کو اُٹھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

(۲) "ققنس" کی دم کی مانند کھجور کا درخت۔

(۳) "ققنس" کی دم کی سی سنہری مچھلی۔

ان میں "فینگ" کا استعمال مور کے لئے کہیں نہیں کیا گیا۔ جو دُم اور کلغی کے لحاظ سے اُن پرندوں سے کوئی مناسبت نہیں رکھتا۔

آخر میں میری تجویز ہے کہ چین کے اس خیالی پرند کو "ققنس" کہنا جائز نہیں ہے اور نہ ہی اس بات کا کہیں ثبوت ملتا ہے کہ یہ مرغِ آتش نفس خود ہی جل بجھ کر ختم ہو جاتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اس پرند کو اپنی آواز کی مناسبت سے "ہُو اُو" کہا جائے تو دوسرے ناموں سے کہیں زیادہ موزوں ہوگا۔

صادق ایوبی

خدایا از تو زاہد حُور مے طلبد قصور ش بیں
بہ جنت می گریزد از سرِ کوئیت شعورش بیں
بہ این زہد و بہ این تقویٰ بہ این سالوسِ خود، مارا
ز رحمت دور می داند خداوندا شعورش بیں

# غزل

دلِ حزیں سے خلشِ کاریِٔ ستم نہ گئی! ابھی تک، اُن کی نگاہوں کی خوئے رم نہ گئی!!
ملی، نہ سعیِ برہمن سے زاہدوں کی مراد چراغِ دیر سے تاریکیٔ حرم نہ گئی!
ہنوز عشق سے اندازِ بے کسی نہ چھٹا! ہنوز حسن سے رنگینیٔ ستم نہ گئی!
حرم میں حضرتِ زاہد نے لاکھ سر مارا جبیں سے تیرگیٔ سجدۂ صنم نہ گئی!
بتوں کو نکلے ہوئے مدتیں ہوئیں لیکن ہنوز فطرتِ بُت سازیٔ حرم نہ گئی!
مزاجِ حسن سے، بے باکیٔ ستم نہ مٹی دماغِ عشق سے، افسردگیٔ غم نہ گئی
طلوعِ صبحِ حقیقت ہے، ذرہ ذرہ مگر ابھی کشاکشِ بت خانہ و حرم نہ گئی!

وہ میری شوخ نگاری پہ لکھتے ہیں اختر
ابھی تک، آپ کی گستاخیٔ قلم نہ گئی!؟

اختر شیرانی

# غزل

قصہ ہائے سوزشِ غم درجِ عنواں ہی رہے دل میں جو تھے چند قطرے زیبِ مژگاں ہی رہے
شمع پر معصوم پروانوں کا گرنا ہائے ہائے یہ گرفتارِ فریبِ عہد و پیماں ہی رہے
تو ہی بتلا دے کریں اب جستجو تیری کہاں عمر بھر ہم ڈھونڈتے اپنی رگِ جاں ہی رہے
جیب و دامن کی نہ لی وحشت میں تم نے کچھ خبر وائے ناکامی کہ مصروفِ گریباں ہی رہے
گھر میں مجبورِ سلاسل آبلہ پا دشت میں ہم گرفتارِ جنونِ فتنہ ساماں ہی رہے
وائے حسرت جل گئے سب نونہالانِ امید داغہائے سوزِ الفت دل میں پنہاں ہی رہے

ہو گیا اپنا چمن افسوس تاراجِ خزاں
دل کے ارماں اے رسا بس دل کے ارماں ہی رہے

رسا

# وقت کے بیش قیمت لمحے

کاروباری لوگ اپنے مال کی ساخت پرداخت اور فروخت کو حتی الامکان موثر بنانے میں، تجارت کو مستحکم کرنے اور اس کو فروغ دینے کے لئے طرح طرح کے طریقے سوچتے ہیں، اور غیر ضروری محنت اور غیر ضروری تفصیلات کے قطع کرنے میں اپنی انتہائی کوشش صرف کردیتے ہیں لیکن کتنے کم ہیں وہ لوگ جو اپنی خانگی زندگی میں وقت کو موثر بنانے کے لئے اپنی توجہ خرچ کرتے ہیں۔ اور بیش قیمت لمحے اور گراں بہا ساعتیں بچا لیتے ہیں۔

دنیا میں رہنے کے لئے جو فرصت تمہیں ملی ہے وہ اتنی زیادہ نہیں جتنی تم اسے سمجھ رہے ہو۔ اگر تم اپنی عمر کو ساٹھ سال بھی فرض کرلو تو اُن میں سے بیس سال تم بستر ہی میں صرف کردیتے ہو۔ گویا تمہاری مختصر سی زندگی کے دو قرن سوتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔

اُن بیس اور چار چوبیس گھنٹوں کو جو ہر روز تمہیں خبر بھی نہیں ہوتی اور وہ گزر جاتے ہیں کسی نے تمہارے عرصۂ زندگی پر خوب پھیلایا ہے۔ اس ساٹھ برس کی مدت میں وہ سال بھی شامل ہیں جو بچپن اور لڑکپن میں گذرے:۔

بیس سال نیند میں،
تین سال کھانے میں،
نو مہینے دسترخوان پر کھانے کے انتظار میں،
سترہ سال چھ مہینے کام میں،
سات سال چھ مہینے مسرت کے تعاقب میں۔
چھ سال تین مہینے سیر اور دوسری ورزشوں میں،
دو سال چھ مہینے بناؤ سنگار میں،
دو سال چھ مہینے بالکل کچھ نہ کرنے میں۔

ہر وقت گھڑی کی ٹک ٹک ہمیں یاد دلاتی رہتی ہے کہ وقت گزر رہا ہے اور ہم اپنی زندگی کا اس قدر حصہ اپنے پیچھے اپنی دسترس سے باہر چھوڑ آئے ہیں۔ گھڑی کے ہر کھٹکے کے ساتھ عمر کا ایک لمحہ ٹوٹ کر گرتا ہے اور دوبارہ اُس میں پیوست نہیں ہو سکتا۔ ہم اُسے پھر کبھی استعمال نہیں کرسکتے۔ ہم ہمیشہ کے لئے اس سے محروم ہو گئے۔ ہر لمحہ اور ہر

گھڑی اور ہر روز اور ہر ہفتہ جسے ہم بلا استفادہ گزر جانے دیتے ہیں یا اس سے کامل فائدہ حاصل نہیں کرتے، انجام کار ہمارے خلاف ایک شاہد بنے گا۔ یہ زندگی کی سب سے زیادہ قیمتی چیز کے ضائع کرنے کا الزام ہم پر لگائے گا۔ وہ قیمتی چیز جو درحقیقت خود زندگی ہے، کیونکہ وقت زندگی اور زندگی وقت ہے۔

اب میں سمجھتا ہوں کہ اکثریت اُن لوگوں کی ہے جو اپنی عملی زندگی کے اوقات کو از سرِ نو ترتیب دے کر کم از کم ایک گھنٹہ بچا سکتے ہیں۔ ہم میں سے بہت ایسے ہیں جو زیادہ سوتے ہیں۔

یہ لازم نہیں ہے کہ چونکہ بیداری کے وقت ہماری آنکھیں خواب آلود ہوتی ہیں اس لئے ہمیں زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر ہم نو یا آٹھ گھنٹے بستر میں گزارتے ہیں، بلکہ اگر ہم اس وقت کا اکثر حصّہ سوتے ہوئے بھی صرف کرتے ہیں تو اِس سے یہ لازم نہیں آتا کہ اگر ہم ایک گھنٹہ یا اس سے کچھ زیادہ اس میں سے وضع کرلیں گے تو ہم بیمار ہو جائیں گے۔ اس تھوڑے وقت میں قدرتی طور پر ہم پہلے سے اچھی طرح سوئیں گے، کیونکہ گہری نیند ہی قابلِ لحاظ ہے۔ بچوں کے سوائے سب کے لئے سات گھنٹے کی گہری نیند کافی ہے۔ اور مجھے اس میں شک ہے کہ نوجوانوں کو اس سے زیادہ نیند کی ضرورت ہے۔ اگر وہ لوگ جن کا جسم مضبوط ہے اور جن کی صحت اچھی ہے سات گھنٹے سوئیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی نیند پوری کرلی۔

سوچو کہ کسی شخص کے لئے اپنی عملی زندگی کے زمانے میں ایک گھنٹہ روزانہ بچا لینے کے کیا معنی ہونگے! اُن کی زندگی ان زریں ساعتوں کی دولت سے مالا مال ہو جائے گی!

میں نے لوگوں کو اکثر یہ شکایت کرتے سنا ہے کہ اُنہیں مطالعہ کے لئے فرصت نہیں ملتی اور اُن کا تمام وقت کام کاج اور میل ملاقات میں صرف ہو جاتا ہے۔ وہ اس معاملہ میں متاسف معلوم ہوتے ہیں لیکن پھر بھی وہ اس دماغی کاہلی اور سستی کو جو اُن پر مستولی ہو چکی ہے زیر کرنے کی جرأت اور حوصلہ نہیں رکھتے۔ سچ یہ ہے کہ اگر اُن لوگوں کو موجودہ فرصت سے دہ چند فرصت بھی میسر آجائے تب بھی انہیں پڑھنے یا کسی اور قسم کی ترقی کرنے کے لئے وقت نہیں ملے گا۔ اگر ہمیں کسی بات سے حقیقی دلچسپی ہے تو یاد رکھو کہ اُس کے لئے ہمیں وقت بھی مل جائے گا۔ کیا ہمیں ہمیشہ اُس کام کے لئے وقت نہیں مل جاتا جس کو ہمارا دل چاہتا ہے؟ کیا تم مجھے کوئی ایسا نوجوان دکھا سکتے ہو جسے دن رات کسی چیز کی لگن لگی رہے اور اور پھر اُس کے لئے اُسے وقت نہ ملے؟

کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ پندرہ منٹ روزانہ میں جو چوبیس گھنٹوں کی ایک ادنیٰ سی کسر ہے تم کیا کیا کچھ کر سکتے ہو؟ کیا تم نے کبھی غور کیا ہے کہ ادبیات کا کتنا علم تم اپنے دماغ میں جمع کر سکتے تھے؟ تاریخ، سیاسیات اور ایسے کتنے ہی علوم پر عبور حاصل کر سکتے تھے اگر تم صرف اِن انقلاب پرور لمحات کو کام میں لاتے۔

ہارورڈ کے سابق صدر ایلیٹ کا قول ہے کہ اچھی قسم کے ادبیات کا ہر روز پندرہ منٹ تک بہ غور مطالعہ کیا جائے تو چار سال کے عرصہ میں ایک شخص عمدہ ادیب بن سکتا ہے اور اُس میں وسعتِ قلب اور وقعتِ نظر پیدا ہو سکتی ہے۔

اب اگر پندرہ منٹ روزانہ سے انسان اتنی ترقی کر سکتا ہے تو خیال کرو کہ ساٹھ منٹ کے امکانات کیا ہونگے؟ ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے تو وہ اپنی قابلیت کو کہیں سے کہیں پہنچا دے گا، اور علم کے موتیوں سے اپنی زندگی کا دامن بھر کر مالا مال ہو جائے گا۔

کیا تمہیں علم ہے کہ ایک گھنٹہ روزانہ کام کرنے سے تھوڑے ہی عرصہ میں تم کئی ایک زبانوں کے ماہر بن سکتے ہو؟ کیا تم جانتے ہو کہ روزانہ ایک گھنٹہ صرف کرنے سے تم معمولی زندگی سے ایک بہت بلند زندگی حاصل کر سکتے ہو؟

تم سمجھتے ہوگے کہ تم غریب ہو اور تمہیں کوئی موقع حاصل نہیں لیکن اگر تم جانتے کہ تمہارے قلب کے اندر کتنے زر و جواہر جمع ہیں اور تمہارے فارغ اوقات میں کتنی دولت پوشیدہ ہے تو تم حیران رہ جاتے۔ آہ کاش کہ میں نوجوانوں کے دلوں پر نقش کر سکتا کہ غریب سے غریب لڑکے اور غریب سے غریب لڑکی کے لئے اُس کے فارغ اوقات میں عظیم سے عظیم امکانات موجود ہیں!

بہت کم لوگوں کو اندازہ ہے کہ ترقی کے لئے اُن کے پاس درحقیقت کتنا وقت موجود ہے۔ وہ جو کہتے ہیں کہ ہمیں کتابیں اور رسالے پڑھنے کے لئے یا ترقی کے کسی اور طریقے کو اختیار کرنے کے لئے وقت نہیں ملتا۔ واقعی فارغ اوقات کی اصلیت سے ناواقف ہیں۔ وہ سمجھتے ہی نہیں کہ کتنا وقت وہ بے مصرف باتوں بے حاصل کاموں اور بے فائدہ خیالوں میں گزار دیتے ہیں۔ میرے دوستو، خیال تو کرو کہ اگر تمہاری جگہ لنکن ہوتا تو وہ ان لمحات سے کتنا کام لیتا جنہیں تم اکارت کھو دیتے ہو۔ اور تمہاری یہ عادت ایک ایسی عادت ہے جو تمہاری تمام زندگی کو بداخلاق بنا دے گی۔

جب نوجوان میرے پاس اس معاملہ میں مشورہ لینے آتے ہیں کہ ہم کیونکر اپنی ذات سے بہتر سے بہتر کام لے سکتے ہیں تو میں ہمیشہ یہ جاننے کی کوشش کرتا ہوں کہ وہ اپنے وقت کی کس حد تک قدر کرتے ہیں۔ اگر میں دیکھتا ہوں کہ وہ گزرتے ہوئے وقت سے ہر موقع کو جذب کر لینے کے لئے بے قرار ہیں تو میں جان لیتا ہوں کہ اُن میں کامیاب ہونے کی اور قابلیتیں بھی موجود ہیں، کیونکہ یہ صفت کسی شخص میں اکیلی نہیں پائی جاتی۔ کامیابی کی صفات ہمیشہ یکجا ملتی ہیں۔ وہ بے کاروں اور کاہلوں میں نہیں ملتیں، اُن میں جن کا کوئی مقصد اور کوئی مطمح نظر نہیں ہوتا۔

مارڈن

منصور احمد

# محفلِ ادب

## امید

### ۱

فضائے اثیر کی خاموش اور پُرسکون دنیا ہماری ہنگاموں سے معمور اور پرشور دنیا سے بالکل ہی مختلف تھی۔ اس عجیب وغریب دنیا میں صرف ایک عورت آباد تھی۔ اور ہماری دنیا کے کروڑ ہا دلوں پر اُس کی حکومت تھی۔ اُس کی عمر کا صحیح اندازہ کون لگا سکتا تھا جب سے دنیا پیدا ہوئی وہ اسی طرح موجود تھی۔

ہاں اس کا وجود ہمیشہ سے تھا۔ دنیا اُس کے بغیر قائم نہ رہ سکتی تھی۔ وہ ہمیشہ سے نوجوان تھی۔ اور آخر تک ویسی ہی رہی۔ اُس کا نام "امید" تھا۔ اور "امید" کبھی بوڑھی نہیں ہوسکتی۔

اُس کے بال لمبے اور سنہرے تھے اور اُس کا نورپاش چہرہ حسین اور روشن تھا اگر اُسے کوئی چاند کے بالمقابل بیٹھے ہوئے دیکھ لیتا تو شاید وہ کہہ سکتا کہ چاند اُس کے چہرے سے کسبِ نور کرتا ہے اُس کی زندگی میں لاکھوں قسم کے انقلاب رونما ہوئے لیکن ہمیشہ اُس کے چہرے سے ایک بچے کی سی بے لاگ معصومیت ہویدا رہی۔ کیونکہ وہ امید تھی اور "امید" کو دنیا کی کثافتوں سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ہماری دنیا کے ایک ایک ذرّہ میں دل موجود تھا۔ اور ان سب پر اُس کی حکومت تھی۔ وہ ہر دل میں دوسرے سے بڑھ کر مسرور نظر آتی تھی۔ لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ خود اُس کا دل بھی ویسا ہی مسرور تھا؟ کیا اُسے وہ شے جسے حقیقی معنوں میں مسرّت کہا جاسکتا ہے حاصل تھی؟

اُس کا مسکن نور کے بنے ہوئے ایک بلند پہاڑ کی چوٹی پر تھا۔ وہ اکثر اپنا چہرہ اپنے گھٹنوں میں چھپائے رکھتی تھی۔ اُس کے بال اُس کے شانوں پر بکھرے رہتے تھے اُس کے پاؤں کے قریب ایک چشمہ بہتا تھا جس کا پانی جلتے ہوئے آنسوؤں کی طرح گرم تھا۔

### (۲)

شاید قیامت بہت ہی نزدیک تھی۔ کائنات کا آخری دن قریب آرہا تھا۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھی، ایک ملکہ کے انداز میں آہستہ آہستہ دھیمے دھیمے قدم اُٹھاتی ہوئی۔ آج اُس کا چہرہ محزون

اور افسردہ تھا۔ اُس کے اعضا کسی ناتمام محنت سے تھکے ہوئے اور سست معلوم ہوتے تھے۔ اُس نے اپنا رباب ہاتھوں میں اٹھایا اور پھر اُسے دُور پتھروں پر پھینک دیا جب سے دنیا پیدا ہوئی یہ رباب دنیا تک امید کے نغمے پہنچاتا تھا لیکن اب وہ اُسے بے کار چیز سمجھ کر چھوڑ رہی تھی۔ اپنی جائے قیام پر ایک وداعی نگاہ ڈال کر آہستہ آہستہ وہ ہماری دنیا کی طرف نیچے کو اتر آئی۔ اُس کا سفید لباس موتی کی طرح دمکتا ہوا معلوم ہوتا تھا اور اُس کی سیاہ پلکیں آنکھوں پر جھکی ہوئی تھیں۔

سمندر کے کنارے تک پہنچ کر وہ رُک گئی اُس نے کہا "میں دنیا میں امید بن کر آئی تھی لیکن اپنے ہر مقصد سے ہمیشہ کوسوں دور رہی۔ امید کبھی بر نہیں آئی۔ میں ناکام ہوں ہمیشہ سے ناکام۔ میرا وجود دنیا میں صرف ایک سراب کی مانند رہا۔ میں خود بھی نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں اور کون میرے ہر مقصد کو ساتھ ساتھ مٹاتے جا رہا ہے۔ مجھے شک ہے کہ میں کچھ ہوں ہی نہیں۔ کیا میرا کام صرف لوگوں کو فریب میں مبتلا رکھنا ہی تھا۔ اب میں اس پُر اسرار زندگی سے اکتا گئی ہوں۔ میں خود اپنی ہستی سے بھی بے خبر ہوں میں دنیا میں کسی سے اپنے دل کا راز نہیں کہہ سکتی۔ میں جو ہر دل کی مونس و ہمراز ہوں۔ میرا کوئی ہمراز نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ میری روح بھی میرے جسم سے بیگانہ ہے۔ اگر میں اپنے دل کی بات کسی ایک متنفس سے بھی کہہ دیتی تو یہ دنیا کبھی کی اجڑ کر رہ گئی ہوتی۔ اُف یہ تنہا زندگی، یہ فریب کی زندگی۔ میں اس سے اکتا گئی ہوں"۔

اُس نے اپنا سر اوپر کو اُٹھایا اور کائنات پر ایک گہری نگاہ ڈالی۔ اب بھی لوگ امید کے فریب میں مبتلا تھے۔ بہت دور ایک بوڑھا اپنے ننھے بچے پر جھکا ہوا کھڑا تھا۔ اُس کے دل میں امید تھی "میرا بچہ بڑا ہوگا۔ اور میرا خدمت گذار ہوگا"۔ یہ امید ہی تھی جو اُسے یہ سمجھنے کا موقع نہ دے سکتی تھی کہ بچے کے بڑا ہونے تک خود وہ دنیا میں موجود نہیں ہوگا۔ کئی لوگ جن کی تقدیر میں عمر بھر کے لیے ناکامی لکھی جا چکی تھی امید کے فریب میں مطمئن نظر آتے تھے۔

سورج کل پھر اسی آب و تاب سے چمکنے کی امید پر اپنی آرام گاہ میں اطمینان کی نیند سویا پڑا تھا۔ اور چودھویں رات کے جگمگاتے ہوئے چاند کے دل میں بھی ایک امید تھی۔ کل سے اُس کا زوال شروع ہوگا، لیکن آخر ایک دن پھر وہ اسی طرح آسمان پر جلوہ گر ہوگا۔ ستارے اپنے دل کی کسی پُر کیف امید سے خوش ہو کر جھلملا رہے تھے۔

ننھے ننھے پھول گھاس میں سے سر نکال کر جھانک رہے تھے۔ شاید اپنے انجام سے بے خبر انہیں ایک دائمی زندگی کی امید تھی۔ اور پانی کے کنارے اُگے ہوئے چھوٹے چھوٹے پودے ایک دن بلند ہونے کی امید پر خوش ہو ہو کر جھومتے تھے۔ خاک کے ایک ایک حقیر ذرہ کے دل میں بھی امید جلوہ گر تھی۔

اُس نے کہا "آج یہ فریب ختم ہوتا ہے"۔ وہ پانی میں اتر پڑی اور اب اُس کے پاؤں پانی میں ڈوب چکے تھے۔ آہستہ آہستہ وہ آگے کی طرف گہرے پانی میں جا رہی تھی۔ پانی اُس کی گردن کو چھو رہا تھا جب اُس نے مڑ کر دنیا کو الوداع کہی۔

اب تک دنیا نا امید نہ ہوئی تھی۔ آخری بار اُس نے تبسم کیا۔ وہ مسکرانے لگی سمندر کی تیز موجوں میں دفعۃً موتی چمک اُٹھے ایک تند و تیز لہر اٹھی اور امید نے اپنے خوبصورت چہرے کو ہمیشہ کے لئے پانی میں چھپا لیا لیکن ابھی اُس کے بال پانی کی سطح پر چمک رہے تھے۔

موت آگے بڑھی اور اُس نے امید کو اپنے آغوش میں لے لیا سمندر کا پانی دفعۃً رک گیا اب اُس کے دل کوئی امید نہ تھی

دنیا صرف امید سے قائم تھی۔

ارض و سما نا امید ہو ہو کر اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ چاند، سورج، اور ستارے اب کس امید سے اپنی جگہ پر قائم رہتے۔

اور وہ لوگ جو خدا جانے کس امید پر قبروں میں گہری نیند پڑے سوتے تھے اب اُٹھ اُٹھ کر باہر آرہے تھے۔

امید مر چکی تھی اور صبحِ قیامت نمودار ہو رہی تھی

"نور جہاں"

---

## اجنبی

صنمِ فرنگ، قمر جبیں، بتِ سیم رنگ، غضب حسیں
وہ عذار نازک و شرمگیں کہ رقیب ساغرِ آتشیں
وہ ہوا میں کاکلِ عصفریں کہ شہابِ ثاقبِ شب رواں
ورقات غنچہ گلاب گوں، و دو لبِ گداز پُر از فسوں
مژۂ درازِ کج و نگوں میں نہاں دو دیدۂ نیلگوں
کہ سحر کے پردۂ ارغواں میں فضائے گنبدِ آسماں
تجھے میں نے دیکھا ہے اک نگہ، نہیں مجھ سے تو ذرا آشنا
ترے عشق میں ہوں میں مبتلا بسلاسلِ المِ و بلا
مجھے کیا پتہ کہ ہے اب کہاں، تجھے کیا خبر گئی کس کی جاں

(ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم) (بحرِ سفید، جہاز شہر کلکتہ ۱۹۱۴ء)

"اردو"

---

## پیغمبر

اُس دم سے جب کہ منصفِ ازلی نے میرے ضمیر کو روشن کیا اور اپنا پیغام پہنچانے کا حکم دیا مجھے ہر شخص کی پیشانی پر اُس کے گناہ اور اُس کے بُرے ارادے لکھے ہوئے نظر آنے لگے۔ (انسانیت پر سے یہ دھبہ مٹانے کے لئے) میں

نے محبت اور حق پرستی کی پاک تعلیم دینا شروع کی جس کے جواب میں میرے عزیزوں اور دوستوں نے سب سے پہلے مجھ پر پتھر مارے۔ میں نے اپنی قوم کے ماتم میں سر پر خاک ڈالی اور ننگے ہاتھ ننگے بدن شہر سے نکل بھاگا۔ اب میں ویرانوں میں بسر کرتا ہوں اور اس غربت میں میرا خدا کسی نہ کسی طرح مجھے روزی پہنچاتا رہتا ہے۔ میرے دل پر خدا کے احکام کا نقش ہے، چڑیاں اور جانور سب میری فرماں برداری کرتے ہیں، اور راتوں کو ستارے میری آواز بن کر جگمگاتے ہیں۔ لیکن جب کبھی شہر میں سر جھکائے قدم بڑھائے گذرتا ہوں تو بوڑھے تمام بچوں کو اپنے گرد جمع کرتے ہیں اور خود ستائی سے مسکراتے ہوئے کہتے ہیں "دیکھو بچو تمہارے لئے یہ ایک مثال ہے! یہ آدمی مغرور تھا۔ ہماری زندگی اسے نہیں بھائی ہمارے ساتھ رہنا گوارا نہ ہوا۔ بیوقوف یہ ہمیں یقین دلانا چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے خدا خود بول رہا ہے۔ دیکھو بچو، اسے اچھی طرح دیکھو! دیکھو یہ کیسا غمگین دبلا پتلا، مایوسی سے پیلا پڑ گیا ہے، دیکھو کیسا پھٹے حال کا فقیر ہو کر رہ گیا ہے۔ کیسی حقارت سے سب اسے دیکھتے ہیں۔

لیرمنتوف ـــــــ "جامعہ"

## محاسبۂ نفس

بڈھا سونے سے پہلے دارالمطالعہ کے ننگے فرش پر ٹہل رہا ہے۔ جب تک اپنی ذات پر آخری محاکمہ نہ کرلے اور جب تک گذشتہ چوبیس گھنٹوں میں سے ہر ایک گھنٹے کا سختی سے جائزہ نہ لے لے اُس وقت تک نیند کہاں۔ روزنامچہ میز پر کھلا پڑا ہے اور اس کا سفید صفحہ چشم ضمیر کی طرح اُسے گھور رہا ہے۔ وہ دن کے ایک ایک لمحے پر تنقیدی نگاہ ڈالتا اور ایک ایک گھڑی کی جانچ پڑتال کرتا ہے۔ اُسے غربت زدہ کسان عورت یاد آتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ مَیں ایک حقیر درہم دینے کے سوا اُس کی کچھ مدد نہ کر سکا۔ اُسے یاد آتا ہے کہ میں ایک فقیر کو دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اُسے اُن درشت خیالات کی یاد ستاتی ہے جو اس کے دل میں بیوی کے متعلق پیدا ہوئے وہ اپنی تمام لغزشیں اور فروگذاشتیں بے کم و کاست روزنامچہ میں درج کرتا ہے اور اس دن کے اندراج کو یوں ختم کرتا ہے۔

"پھر پورا نہ اُترا۔ روح پھر مفلوج ہی رہی۔ کافی نیکی نہ ہو سکی۔ پھر ثابت ہؤا کہ عام عالم انسانیت کی بجائے گرد و پیش کے لوگوں کے ساتھ محبت کرنے کا مشکل کام مجھے ابھی آیا ہی نہیں۔

پھر وہ اگلے روز کی تاریخ اور اُس کے ساتھ تین پُر اسرار حروف "اگر زندہ رہا"، درج کرتا ہے۔

کام ختم ہو گیا۔ دن کا خاتمہ ہؤا۔ جھکے ہوئے کندھوں کے ساتھ سونے کے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اپنے بھاری بُوٹ سے پاؤں نکال لیتا ہے۔ کپڑے اتار کر بستر پر دراز ہو جاتا ہے۔ اب اُسے موت یاد آتی ہے۔ خیالات اُس کے دماغ کی

فضا میں گرمِ پرواز ہیں اور آہستہ آہستہ یوں غائب ہو جاتے ہیں جیسے جنگلوں کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں تیتریاں۔ نیند اُس کے دماغ کے دروازے پر منڈلا رہی ہے۔

"ہیں! یہ کیا؟" وہ تلملاکر اُٹھ بیٹھتا ہے۔ کیا یہ پاؤں کی آواز نہ تھی؟

ہاں ساتھ والے کمرہ میں ایک قدم۔ ہلکا دزدیدہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ پھرتی سے مگر بے آہٹ بستر سے کودتا ہے اور اپنی شعلہ بار آنکھ روزنِ در سے لگا دیتا ہے۔

ہاں ایک روشنی سی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کوئی چراغ بکف کمرے میں گھسا ہوا ہے۔ اور میز کی تلاشی لے رہا ہے روزنامچہ کی ورق گردانی میں مصروف ہے اور اُسکی روح کے رازہائے سربستہ کو بے نقاب کر رہا ہے۔

یہ اُس کی بیوی صوفیا انڈریونا ہے۔ مشتاق و مضطرب و بے قرار ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہر طرف چشمِ تجسس اس کی روح کی گہرائیوں میں اتر جانے اور اُس کے نہانخانۂ دل کے حریمِ قدس تک پہنچنے کے لئے بیتاب ہے۔

وہ غصہ سے لرزہ براندام ہے۔ ایک حرکتِ اضطراری کے ساتھ وہ زنجیرِ در کو پکڑتا ہے۔ تاکہ تلملکر دروازہ کھولے اور بیوی کی گت بنائے، مگر آخری لمحہ میں سنبھل جاتا ہے کہ "شاید یہ بھی امتحان ہی ہو" اور چپ چاپ دبے پاؤں بستر کی طرف لوٹتا ہے مگر نیند کہاں!

ٹالسٹائی، اپنے زمانہ کا سب سے بڑا، سب سے قابل شخص یہاں لیٹا ہوا ہے۔ اُس کا گھر اُس کا پردہ در، اُس کا دل شکوک و شبہات کی روح فرسا کشمکش میں مبتلا، اور اُس کی روح ناقابل بیان تنہائی میں غرق ہے +

"مخزن"

# شاعری کا مستقبل

"شاعری کا مستقبل نہایت وسیع ہے اِس لئے کہ جوں جوں زمانہ گزرتا جائیگا۔ ہمیں اِس امر کا احساس ہوتا جائیگا کہ ہماری زندگی کے لئے صرف ایک سہارا باقی ہے اور وہ شاعری ہے۔ ایسی شاعری جو زندگی کے اعلیٰ اور برتر مقاصد کے لائق ہو۔ دنیا کے سبھی عقائد متزلزل ہوئے ہیں، کونسا اصول تھا جس پر اعتراض نہیں کیا گیا اور کونسی روایت ہے جو بالآخر بے بنیاد ثابت نہیں ہوئی؟ مذہب نے بھی نشوونما حاصل کیا ہے تو چند حقائق کی بدولت۔ ہمارے تمام مذہبی جذبات انہیں حقائق سے وابستہ ہیں لیکن یہی حقائق ہیں جو اب ناپائیدار ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ صرف شاعری ہے جس کو سوائے خیال کے اور کسی چیز سے بحث نہیں"

میتھیو آرنلڈ

"صوفی"

# تبصرہ

**دنیا کا محسن**۔ جناب میرزا بشیر الدین محمود احمد صاحب قادیانی کی وہ طویل و بسیط تقریر ہے جو انہوں نے ۱۷ جون ۱۹۲۸ء کے دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ سیرت، بے نظیر قربانیوں اور عدیم المثال احسانات پر ایک مجمعِ عام میں فرمائی۔ یہ جلسہ اس غرض سے منعقد کیا گیا تھا کہ ملک کے تمام مذاہب کے پیروؤں تک یہ پیغام پہنچایا جائے کہ وہ دنیا کے تمام ادیان کے بزرگوں اور ہادیوں کا ادب و احترام کریں۔ رسولِ کریم صلعم کی ذاتِ گرامی کے متعلق مخالفین نے جو طرح طرح کی بدگمانیاں پیدا کر رکھی ہیں اس کتاب کے مطالعہ سے یکسر دور ہو جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں اس کی بکثرت اشاعت ہونی چاہیئے۔ حجم ۱۱۱ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ بک ڈپو دار الاشاعت قادیان سے طلب فرمائیے۔

**جین دھرم**۔ مصنفہ مہرشی شوبرت لال جی۔ جین مت دنیا کے قدیم ترین مذاہب میں سے ہے۔ اور بہ قولِ مصنف اخلاق، پاکیزگی، لطافت اور روحانیت کے نقطۂ خیال سے انسانی کمال کی مجسّم تصویر بن جانا جینی ہونا ہے۔ خدا کی نسبت جینیوں کا خیال ہے کہ وہ آفریدگارِ عالم نہیں، بلکہ انسان ہی مکمل ہو کر خدا کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کتاب میں جین دھرم کی تاریخ فلسفہ عقاید اور بزرگوں کے حالات درج ہیں۔ مذاہب کے ساتھ شغف رکھنے والوں کے لئے دلچسپ کتاب ہے۔ حجم ۷۶ صفحات اور قیمت چار آنے ہے۔ پتہ:۔ سکرٹری جین منتر منڈل دھلی۔

**طفلِ اشک**۔ اِس نام سے مولوی محمد محسن صاحب صدیقی، بی، اے علیگ نے ایک نہایت عمدہ انگریزی ناول کا ترجمہ کیا ہے۔ افسانہ میں یورپ کی شریفانہ اور کامیاب زندگی کا نمونہ پیش کیا گیا ہے اور جنابِ مترجم نے یہ مقصد پیش نظر رکھا ہے کہ وہ لوگ جو یورپ کی تقلید اندھا دھند کر رہے ہیں وہاں کی اچھی باتوں کی بھی تقلید کریں۔ اور اپنے عادات اور اخلاق کی اصلاح کریں۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور اندازِ تحریر دلچسپ ہے۔ حجم ۴۰۰ صفحات قیمت تین روپے آٹھ آنے۔ مطبع رہبر دکن، افضل گنج، حیدر آباد دکن سے طلب فرمائیے۔

**سوشیلا**۔ مصنفہ خان قدرت اللہ خاں صاحب دیوانہ بریلوی محلہ کرنیل گنج کانپور۔ ۴۸ صفحے کا ایک دلچسپ اور سبق آموز قصہ ہے جس میں اصول تحفظ زچہ و بچہ پر ضروری باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ تمام اصول، علمِ طب کی مسلم الثبوت کتابوں اور جدید ترین تحقیقات سے اخذ کئے گئے ہیں اور اُن کو ایسے سادہ پیرائے میں لکھا ہے کہ عورتیں بڑی آسانی سے استفادہ کر سکیں گی اور شوق سے پڑھیں گی۔ ہمارے خیال میں حفظانِ صحت کی انجمنوں کو ایسی کتابیں خرید کر مفت تقسیم کرنی چاہئیں۔ قیمت پانچ آنے مقرر ہے۔ جنابِ مصنف سے ملتی ہے۔

# فہرست مضامین

جلد ۱۴ — بابت ماہِ نومبر ۱۹۲۸ء — نمبر ۵

تصویر:- پروازِ الفت



| نمبر شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | جہاں نما | | ۷۹۴ |
| ۲ | نواہائے راز (نظم) | حامد علی خاں | ۷۹۸ |
| ۳ | | | ۷۹۹ |
| ۴ | غزل | حضرتِ آزاد انصاری | ۸۱۱ |
| ۵ | سرمایۂ مشترک | "ڈرامی" | ۸۱۲ |
| ۶ | چشم (نظم) | جناب پروفیسر رام پرشاد صاحب کھوسلہ ناشاد، ایم اے | ۸۲۳ |
| ۷ | غزل | جناب غلام محی الدین صاحب جوش | ۸۲۴ |
| ۸ | کھویا ہوا احترام کس طرح حاصل کیا جاسکتا ہے | جناب محمد ضیاء الدین صاحب شمسی | ۸۲۵ |
| ۹ | تجلیات (نظم) | حضرتِ امین حزیں | ۸۲۸ |
| ۱۰ | تجربات | جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی بی، اے | ۸۲۹ |
| ۱۱ | اپنی ماں سے (نظم) | بشیر احمد | ۸۳۱ |
| | تصویر۔ پروازِ الفت | | |
| ۱۲ | مصوّر کا شہکار (افسانہ) | جناب سید بدر الحسن صاحب شرفی رضوی | ۸۳۴ |
| ۱۳ | نوائے راز (نظم) | جناب مولوی ابو الفاضل رازؔ چاندپوری | ۸۵۳ |
| ۱۴ | دیو خونخوار (افسانہ) | منصور احمد | ۸۵[illegible] |
| ۱۵ | ہجوم جلوہ (نظم) | جناب ماسٹر راہ [illegible] | [illegible] |
| ۱۶ | غزل | حض[illegible] | |
| ۱۷ | محفل ادب | | |
| ۱۸ | نئی کتابیں | | |



[illegible] صاحب

[illegible] سلطان پوری

# جہاں نما

## جاپان میں تحریکِ خواتین

اب تک جہاں جہاں خواتین کی تحریکیں بار آور ہوئی ہیں اُن میں سے جاپان کی مثال ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے۔ بنگ ایسٹ میں ایم میٹا نے خواتین کی اُن کامیابیوں کو گنایا ہے جو انہوں نے مختلف شعبوں میں حاصل کی ہیں:-

**قانونی**۔ خواتین [illegible] ضابطہ سند مختار [illegible] اور قانون [illegible] فوجداری میں اس قسم کی ترمیم کرانے [illegible] کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے آئندہ مختارِ عدالت کا عہدہ انہیں مل سکے گا۔ اور حفاظتِ عفت و عصمت جو اس سے قبل صرف عورتوں کے لئے ضروری تھی اب مردوں کے فرائض میں بھی داخل سمجھی جائے گی۔ اس ملک میں اگر عدالت کے سامنے اس قسم کا کوئی مقدمہ پیش ہوتا تھا تو صرف عورتوں کو مجرم گردانا جاتا تھا لیکن ڈائٹ کے گزشتہ اجلاس میں حکومت نے جو قانون منظور کیا ہے اُس کی رو سے مرد اور عورت دونوں کو جرم کی ایک جیسی سزا ملا کرے گی۔

**سیاسی**۔ خواتین ڈائٹ کی معرفت حکومت سے اپنی اُس عرضداشت کو منظور کرانے میں کامیاب ہوگئی ہیں جس کی رو سے مستقبلِ قریب میں انہیں شہریتِ عامہ کے حقوق حاصل ہوجائیں گے اور اُن کو ہر ایک سیاسی عضویت میں حصہ لینے کا حق حاصل ہوگا۔

**معاشری**۔ ٹوکیو مسلن کمپنی نے کارکن لڑکیوں کی اس آزادی کو تسلیم کرلیا ہے کہ وہ جس وقت چاہیں کارخانے سے باہر جاسکتی ہیں۔ اب تک وہ شرائطِ ملازمت کی پابندی میں ایک قیدی کی سی زندگی گزارتی رہی ہیں۔ عنقریب دوسرے کارخانوں میں بھی اس مثال کی تقلید کی جائے گی۔ بڑی بڑی جہاز ران کمپنیوں نے محسوس کرلیا ہے کہ عورتوں میں بھی کپتان بننے کی قابلیت موجود ہے۔ چنانچہ اس ملک میں پہلی خاتون کپتان مس سوشی کو کاٹاپاما مقرر ہوئی ہیں۔

**تعلیمی**۔ خواتین کی تحریک سے آخرکار حکومت کو ترغیب ہوئی ہے کہ وہ عورتوں کی اعلیٰ صنعتی تعلیم کے لئے پینتیس ہزار ین کے [illegible] سے ایک مدرسہ قائم کرے۔

[illegible] نے غیر سرکاری طور پر خواتین کے لئے ایک کالج کھول رکھا [illegible] معاشیات کی تعلیم حاصل کیا کریں گی۔ اسی طرح خواتین

کے لئے ایک بڑا تجارتی مدرسہ قائم ہے اور اب حکام کو آمادہ کیا گیا ہے کہ وہ خواتین کو بھی فضیلت کی سندیں حاصل کرنے کی اجازت دیں۔ چنانچہ خاتون پروفیسر کونوکو یوسوئی کو فضیلتِ طبعیات کی سند مل بھی گئی ہے۔

## سیاسیات اور پتلونیں

یہ عجیب بات ہے کہ جب لوگوں کے عقائد تبدیل ہوتے ہیں تو وہ اس کا اظہار لباس کی تبدیلی سے کرتے ہیں اور یہ تبدیلی عموماً ٹانگوں کے پہناوے میں ہوتی ہے۔ لیکن ہمیشہ ایسا نہیں ہوتا بعض اوقات یہ تبدیلی سر کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے۔ مثلاً اصلاحات کے سلسلہ میں مصطفےٰ کمال نے پہلا قدم یہی اٹھایا کہ فیض پہننے کے متعلق امتناعی احکام جاری کئے اور ہر شخص کو ہیٹ پہننے پر مجبور کیا۔

لیکن عقائد کی علامت کے طور پر پاجاموں کا ذکر خصوصیت کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔ جارج فاکس نے "انجمن الاخوان کی بنا ڈالی تو اُس نے اپنے لئے چمڑے کی برجیس بنوائی۔ جس کا یہ مطلب تھا کہ اُس نے دنیا اور اُس کی نمود و نمائش سے قطعِ تعلق کر لیا ہے۔ اسی طرح جب نیومین نے ظاہر کرنا چاہا کہ اُس نے منفرد مذہب انگلستان سے رشتہ توڑ کر کیتھولک مذہب سے جوڑ لیا ہے تو اُس نے پہلی دفعہ اس کا اظہار یوں کیا کہ دعوت میں ہلکے نیلے رنگ کی پتلون پہن کر آیا۔

انقلابِ فرانس بجائے خود ایک پتلونوں کا معاملہ تھا۔ اگر کوئی گھٹنوں والی برجیس پہنے نظر آتا تھا تو اُسے امرا میں سے سمجھ کر قتل کر دیتے تھے۔ اور اگر پیوست پاجامہ پہنے ہوتا تھا تو اُس سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

روس میں آج کل یہ تحریک زوروں پر ہے کہ کوئی قوم پرست سفید پتلون نہ پہنے ٹینس کھیلنے کے لیے عموماً سفید پتلون پہنی جاتی ہے، لیکن بالشویکوں کا خیال ہے کہ اس کے لئے صرف بنیان کافی ہے۔

## موت وحیات کی جنگ

پروفیسر فیوڈور انڈریف جو ملکِ روس میں علم الحیات کے بڑے ماہر ہیں کہتے ہیں کہ صرف بڑھاپے کی موت طبعی کہی جاسکتی ہے اور کسی خاص مرض سے موت کا واقع ہو جانا غیر طبعی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا ہے کہ ایسی صورتوں میں قطعی موت واقع نہیں ہوتی +گو دل اور اعضائے تنفس اپنے وظائفِ حیات سے رک جاتے ہیں لیکن باقی جسم میں بعض اوقات ہفتوں زندگی موجود رہتی ہے۔

پروفیسر موصوف کا عقیدہ ہے کہ موت جسم پر آہستہ آہستہ وارد ہوتی ہے اور جب جان نکل جاتی ہے تو بہت دنوں تک جسم زندہ رہتا ہے۔ دل کی حرکت اس لئے رک جاتی ہے کہ وہ زہروں سے آلودہ یا محصور ہو جاتا ہے اور اگر اسے صاف کر دیا جائے تو دوبارہ اُس سے کام لیا جا سکتا ہے۔

انھوں نے انسانوں اور حیوانوں کی نعشوں پر تجربات کئے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے کئی ایک کتوں کو جن کا تنفس بند ہو چکا تھا اور جن کا دل ٹھہر چکا تھا اپنی دواؤں کے استعمال سے زندہ کر دیا ہے اور پھر وہ سالہا سال تک زندہ رہے ہیں۔

یہ تجربات امید دلاتے ہیں کہ ہم کسی وقت موت کے ساتھ کامیاب جنگ کر سکیں گے۔

## بیر کی بجائے دود

ریاست ہائے متحدہ کی حکومت کے شعبۂ زراعت نے اندازہ لگایا ہے کہ ۱۹۲۶ء میں سالِ ماسبق کی بہ نسبت چار ہزار ملین پونڈ زیادہ دود صرف ہؤا ہے جب سے امریکا میں شراب نوشی کو ناجائز قرار دیا گیا ہے دود کی کھپت بے انتہا بڑھ گئی ہے۔

گوالے اور شیر فروش شراب کی ممانعت سے بڑے خوش ہیں جو روپیہ پہلے بیر پر خرچ کیا جاتا تھا اب دود پر خرچ ہو رہا ہے۔ اور جو روپیہ پہلے شرابی والدین پیدا کرتا تھا اب صحت ور بچے پیدا کر رہا ہے۔

جمہوریہ کے وہ باشندے جو مدتِ دراز تک وطن سے باہر رہنے کے بعد واپس آتے ہیں امریکن زندگی کی یہ خصوصیت دیکھ کر حیران رہ جاتے ہیں کہ گھروں، ہوٹلوں اور کلبوں کے اندر بہت بڑی مقدار میں دود صرف ہو رہا ہے۔ آج سے بیس سال پہلے شاذونادر ہی کوئی نوجوان دود پیتا دیکھا جاتا تھا لیکن اب مرد وعورت کثرت سے دود استعمال کرتے ہیں۔

## بربط نواز چیونٹیاں

اُن تمام جوہروں کے علاوہ جن کے لئے چیونٹی حضرتِ سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے مشہور ہے اس میں موسیقی دانی کا بھی ایک جوہر موجود ہے جس کا انکشاف آج کل کے زمانے میں ہؤا ہے۔ چیونٹیوں کی بعض اقسام ایسی بھی ہیں جو ایک شور انگیز ساز رکھتی ہیں یہ شکم کے اوپر ایک ذرا سا ابھرا ہؤا بربط ہوتا ہے اور قریب ہی مضراب بھی واقع ہوتا ہے۔ جب یہ مضراب بربط سے رگڑ کھاتا ہے تو ایک نہایت ہلکا اور لطیف راگ اس میں سے پیدا ہوتا ہے

اس حقیقت کا انکشاف ڈاکٹر رابرٹ سٹیگر نے کیا ہے جنہوں نے ایک کوہستانی سفر کے دوران میں بڑی بڑی سرخ چیونٹیوں کا ایک گھونسلا دیکھا جس میں سے عجیب وغریب قسم کی آوازیں آرہی تھیں۔

## کوہِ نور کی سرگزشت

ایک انگریزی سینما کمپنی کوہِ نور ہیرے کی دلچسپ سرگزشت کی فلم بنا رہی ہے۔کہانی تاریخی حقائق پر مبنی ہوگی، جسے سرای ڈینیزن راس لکھیں گے۔ ملکہ معظمہ نے جو اس کی تیاری میں دلچسپی سے حصہ لے رہی ہیں اُن خاص کاغذات میں سے معلومات بہم پہنچائی ہیں جو اُن کے قبضہ میں تھے۔کوہِ نور جو دنیا کا چھٹا بزرگ ترین ہیرا ہے ۱۸۵۰ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے ملکہ وکٹوریہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔کمپنی کے ہاتھ یہ راجہ رنجیت سنگھ کی وفات اور پنجاب کے الحاق کے وقت آیا۔اُس وقت اس کا وزن ۱۸۶ ½ قراط تھا لیکن امسٹرڈم کے صناعوں نے اُسے ایسی بے شعوری سے تراشا کہ اب اُس کا وزن صرف ۱۰۶ ½ قراط رہ گیا ہے۔

روایت تو اِس کی قدامت کے بہت سے افسانے سناتی ہے لیکن اس کی معلومہ تاریخ بھی کچھ کم ہیجان آور نہیں ہے۔ ۱۳۰۴ء میں یہ شہنشاہِ دہلی علاءالدین کے قبضہ میں تھا اور اُس کے دو صدی بعد خاندانِ مغلیہ کے بانی ہمایوں کو ملا۔وہ غالباً یہی ہیرا تھا جسے اورنگ زیب نے تختِ طاؤس میں آنکھ کے طور پر نصب کر رکھا تھا۔ گو بعض محققین کے نزدیک تختِ طاؤس والا ہیرا "مغلِ اعظم" تھا جو گولکنڈہ کی کانوں سے دستیاب ہؤا اور کوہِ نور جس کا ایک ٹکڑا ہے۔ ۱۷۳۹ء میں کوہِ نور ایرانی فاتح نادرشاہ کے ہاتھوں میں آیا اور اُس کے ورثا سے راجہ رنجیت سنگھ کو ملا۔

## سرمایۂ مشترک

مجھے افسوس ہے کہ ہمایوں کے آخری گذشتہ پرچے میں اس عنوان کے تحت میں اہلِ دہلی کے متعلق بعض ایسی بحثہ چینیاں کی گئیں جن سے ہمارے چند دہلوی دوستوں کو بجا طور پر رنج ہؤا+ہمایوں ہمیشہ ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہتا ہے جن سے ذاتیات کی بُو آئے یا جن میں بے جا طعنہ آمیزی کا رنگ غالب ہو+اس مضمون کی بعض باتوں کو ایک اور ایسے طریقے میں ادا کیا جا سکتا تھا جن سے اوروں کی دل آزاری نہ ہوتی+

بشیر

# نواہائے راز

مَیں نغمہ سراسر بہ سراے یار ہوں تیرا
وارفتہ ہوں، دیوانہ ہوں، بیمار ہوں تیرا

جیسا بھی ہوں مَیں، خوش ہوں کہ نسبت تو ہے تجھ سے
اے دوست! جو تو گل ہے تو میں خار ہوں تیرا

سو پردہ میں تُو، اور میں ہر پردہ سے باہر
تُو سر بہ سر انکار، میں اقرار ہوں تیرا

"کُن" شرح سے بیگانہ تھا مَیں شرح ہوں کُن کی
تُو معنیٔ مستور، میں اظہار ہوں تیرا

وارستہ پرستش سے کہیں حُسن نہ دیکھا
ڈھونڈا مجھے تُو نے کہ پرستار ہوں تیرا

گھبرا گیا تُو بھی تنِ تنہا دو سرا میں
دمساز ہوں، ہمراز ہوں، غمخوار ہوں تیرا

آتی ہے ترے دل کی صدا میرے لبوں سے
میں پردہ میں گویا لبِ گفتار ہوں تیرا

میرے لئے تُو سر بہ گریباں ہے ازل سے
جو حل نہ ہو، وہ عقدۂ دشوار ہوں تیرا

زندانِ دو عالم سے کہاں بھاگ کے جاؤں
دے مجھ کو رہائی کہ گرفتار ہوں تیرا

اِس دل سے کبھی نقشِ وفا مٹ نہیں سکتا
سَو بار مٹا مجھ کو، مَیں سو بار ہوں تیرا

حامد علی خاں

# غزل

شکر ہے کہ دل دے کر یارِ دلربا پایا
یعنی جس قدر کھویا اُس سے کچھ سوا پایا

خنجرِ فنا کھا کر ثمرۂ بقا پایا
زیست کی بنا ڈھا کر زیست کا مزا پایا

جبر کرنے والوں نے جبر کر کے کیا پایا
صبر کرنے والوں نے صبر کا صِلہ پایا

جس نے ہر دو عالم کو چشمِ غور سے دیکھا
اُس نے ہر دو عالم سے تم کو ماورے پایا

ہم نے بے نشاں ہو کر آپ کا نشاں ڈھونڈا
ہم نے آپ کو کھو کر آپ کا پتا پایا

شادرہ کے بھی شاکر، رنج سہ کے بھی شاکر
بندۂ محبت کو بندۂ رضا پایا

ہم کو بتکدے میں بھی شانِ حق نظر آئی
ہم نے بتکدے کو بھی خانۂ خدا پایا

صرف اِک غمِ الفت وجہِ صد خوشی دیکھا
ورنہ ہر تعلق کو رنج و غم فزا پایا

ہاں متاعِ راحت بھی قیمتی سہی لیکن
جنسِ دردِ الفت کو جنسِ بے بہا پایا

سچ تو یہ ہے رندوں کا حال پھر غنیمت ہے
اِتقا پسندوں کو صرفِ اِتقا پایا

اے ندیمِ دُور اندیش میں نے عشقِ جاناں میں
یہ نہ پوچھ کیا کھویا، اِس کو دیکھ کیا پایا

اِس میں شک نہیں آزادؔ شوخ بھی ہے منہ پھٹ بھی
کچھ سہی، مگر اُس کو آدمی کھرا پایا

حکیم آزادؔ انصاری

# سرمایۂ مشترک

(بہ سلسلۂ اشاعت گزشتہ)

**ہندو اور اُردو۔** ہندوؤں کے ساتھ جو زیادتی کی گئی اُس کا ذکر مجملاً ضمن گذشتہ میں ہو چکا۔ اب ہم یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہندوؤں کا زبانِ اردو پر کیا استحقاق ہے اور انہوں نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہم ایک دفعہ پھر کہے دیتے ہیں کہ جب تک ہندو مسلمان متحدہ کوشش اور یک جہتی سے کام نہ لیں گے اردو زبان کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اہلِ ہند کو مولوی حبیب الرحمٰن صاحب شروانی کے یہ الفاظ گوشِ ہوش سے سننے چاہئیں "ریختہ کہو اردو کہو۔ ہندی کہو۔ جو نام چاہو رکھو۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان کی عام رائج زبان ہندو اور مسلمان اہلِ ادب کی محنتِ مشترکہ کا ثمر ہے۔ ابتدائے شاعری سے لے کر انتہا تک یہ اشتراکِ محنت عیاں ہے (دیباچہ تذکرہ میر حسن صفحہ ۱۲) ایسے جید مفتی کی شہادت کے سامنے کسی کم سواد مسلمان کا وراثت بلا شرکتِ غیرے کا دعوے دار ہونا بے معنی ہے۔ اب اردو زبان کے کہنہ مشق ادیب۔ دیرانہ محسن۔ اور اقلیم سخن کے جہاں نورد سیاح ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کی زجر بھی ملاحظہ فرمایئے "متوسط درجہ کے تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کو ہنوز اُس ذمہ داری کا احساس نہیں ہوا جو اُن پر اپنی زبان کی تحصیل اور اپنی ادبیات کی خدمت کے سلسلہ میں عائد ہوتی ہے۔ نہایت رنج و کرب سے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ شمالی ہند کی ادبیات نے وطنیت کے اُس غلط مفہوم سے بے حد صدمات اُٹھائے ہیں جسے فرقہ وارانہ جذبات سے الگ کرنا مشکل ہے۔ صوبہ جاتِ متحدہ کے بعض مقامات پر ایسے تعلیم یافتہ ہندو دیکھنے میں آتے ہیں اور انہیں دیکھ کر طبیعت منغص ہو جاتی ہے جن کے دماغ میں یہ بات سمائی ہے کہ ہندی اُن سے متوقع ہے کہ وہ اُس اردو زبان اور اردو ادب سے کلیتاً خالی الذہن ہو جائیں جس میں ایک دو پشت پہلے اُن کے بزرگ دادِ سخن دیا کرتے تھے۔ اُن مسلمان نوجوانوں سے ملنا بھی کچھ کم انقباضِ خاطر کا موجب نہیں ہوتا جن کے لب پر ہمیشہ یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہندو اردو کی طرف ملتفت نہیں ہوتے۔ اگر ان بھلے مانسوں سے کوئی پوچھے کہ حضرت پہلے یہ تو فرمایئے کہ آنجناب نے زبانِ اردو کی کیا خدمت کی ہے تو بغلیں جھانکنے لگیں۔ اِس پر یہ ادعا کہ آپ ہی زبانِ اردو کے واحد محافظ اور تنہا اجارہ دار ہیں۔" (تقریب تاریخِ ادبیاتِ اردو مولفہ رام بابو سکسینہ بزبان انگریزی) لالہ سری رام اپنی غیرفانی تصنیف خمخانۂ جاوید جلد (۱) صفحہ ۶۱۲ میں لالہ ٹیک چند بہار کے متعلق فرماتے ہیں "اور نادر شاہی دارو گیر کے وقت

بھی قزلباش سپاہیوں سے فارسی لغات و محاورات کی تحقیق کرتے پھرتے تھے۔ اللہ اللہ ایک وہ سچّے قوم اور ملک کی خدمت کرنے والے تھے اور ایک اس زمانہ کے اہلِ علم ہیں کہ اپنی مادری زبان (اردو) کی درستی اور تکمیل کی طرف متوجہ نہیں ہوتے" اس بارے میں گارسان دتاسی کہتا ہے کہ بے شمار ہندو ایسے ہیں جن کی تصانیف اردو میں موجود ہیں اور پہلے تو وہ فارسی میں بھی شعر کہتے تھے۔ اُس کے اندازہ میں ۸۰۰ خالص اردو کے ہندو شعرا اس وقت موجود ہیں۔ گویا ذی فہم مسلم و ہندو پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ اردو زبان کو سرمایۂ مشترک سمجھو اس کے حصے بخرے کرنے کا خیال تک دل میں نہ لاؤ۔ ورنہ یہ بزرگوں کے وقت کا اندوختہ خورد برد ہو جائے گا۔ مسلمان کافر نعمت ہیں اگر زبان کے سلسلہ میں ہندو ادبا کی خدمات کا اعتراف نہ کریں۔ ہندو اپنے بزرگوں کے سچّے جانشین نہیں اگر وہ بزرگوں کی اس امانت کو سینہ سے نہ لگائیں۔ منشی دیبی پرشاد نے "تذکرۂ شعرائے ہنود" ایک ضخیم جلد میں مرتب کر کے شائع کیا ہے جس میں سینکڑوں ہندو شعرا کا ذکر ہے۔ لیکن ہم ذیل میں ایسے ہندو ادبا کے اسمائے گرامی درج کرتے ہیں جو یا تو جگت استاد تسلیم کئے گئے ہیں یا صاحبِ دیوان ہیں۔ یا بنوعِ دیگر ناموری کے مستحق ہیں درجۂ اوسط و ادنیٰ کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔

(۱) ولی اورنگ آبادی کی غزلوں میں گوبند لال امرت لال اور کھیم داس کے نام جا بجا آتے ہیں۔ بلکہ ایک آدھ غزل میں تو بعض ناموں کو ردیف قرار دیتے ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ اصحاب اگر سخن گو نہ تھے تو بھی اُن کی سخن فہمی میں کلام نہیں۔ ورنہ ولی کیوں ذکر کرتا۔ (دیباچہ کلیات ولی مرتبہ احسن مارہروی صفحہ ۶۳)

(۲) رائے آنند رام مخلص فارسی کے زبردست شاعر بیدل کے شاگرد ریختہ بھی کہتے تھے (تذکرہ میر تقی صفحہ ۸)

(۳) ٹیک چند بہار فارسی میں جگت استاد کا رتبہ رکھتے ہیں فارسی کا ضخیم لغات موسومہ بہارِ عجم محمد شاہ کے زمانہ میں مرتب کیا۔ ریختہ میں کافی ذخیرہ چھوڑا۔ تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۴)

(۴) بندرابن راقم شاگرد میر تقی و میرزا سودا۔ جتنا قد چھوٹا تھا اتنا ہی فکر بلند تھا (تذکرہ میر تقی صفحہ ۱۵۳)

(۵) رائے پریم ناتھ موزوں۔ موزوں طبع شاعر۔ فارسی و ریختہ میں کامل۔ خطاطی اور کمانداری میں ماہر تھا۔ (تذکرہ میر حسن صفحہ ۵۱)

(۶) سنتوکھ رائے بیتاب بہت خلوت دوست تھے اُس زمانہ میں یہ رباعی کہہ گئے ؎

یاں آکے ہم اپنے مدعا کو بھولے — مل مل کے غیروں سے آشنا کو بھولے
دنیا کی تلاش میں گنوائی سب عمر — اس مس کی طلب میں کیمیا کو بھولے

(تذکرہ میر حسن صفحہ ۶۵)

(۷) آفتاب رائے رسوا۔ آپ کے کلام میں درد کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ فارسی و ریختہ ہر دو میں دادِ سخن دیتے تھے۔ دائم الخمر تھے۔ میت کو اُن کی وصیت کے مطابق شراب سے غسل دیا گیا (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۰۳)

(۸) ہلاس رائے رنگین۔ ریختہ اور فارسی دونوں کے شاعر تھے۔ ( " " صفحہ ۱۰۵)

(۹) لالہ خوشوقت رائے شاداب۔ میرحسن کہتے ہیں۔ منشی است۔ نثر خوب مے نویسد۔ بہ شعر

دیکھ اُس کے منہ پہ زلفِ سیہ فام کے تئیں

کیا زیب دی ہے کفر نے اسلام کے تئیں

بہ داد پاتا ہے۔ مضمونِ خوب یافتہ است (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۰) رائے بھکاری داس عزیز۔ میرحسن کہتے ہیں۔ شاعرِ زباندان سیلِ طبعش روان و توسنِ خامہ اش دواں۔ (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۱) رائے لکھ رام عاقل۔ شاعر تو خوب تھے مگر پنجابی (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۲۶)

(۱۲) بدھ سنگھ قلندر۔ میرحسن کے ہمعصر دولت مند تھے عشق کے ہاتھوں قلندری اختیار کی۔ کیا مزے کا شعر کہا ہے۔ ؎

چھپا ہے مانگ میں دل جا کے اب میں ڈھونڈوں کدھر　　　کہ آدھی رات ادھر ہے اور آدھی رات اُدھر

(تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۵۴)

(۱۳) لالہ کاش ناتھ۔ آپ بھی پنجابی ہیں۔ (تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۶۴)

(۱۴) راجہ رام نرائن موزون۔ حزین کا شاگرد اور فارسی میں صاحبِ دیوان ہے۔ سراج الدولہ کی طرف سے عظیم آباد کا صوبہ دار تھا۔ جب اِس کی شہادت کی خبر پہنچی تو دیوانہ وار روتا تھا اور اپنا فی البدیہہ شعر پڑھتا تھا ؎

غزالاں تم تو واقف ہو کہو مجنوں کے مرنے کی　　　دوانا مر گیا آخر کو ویرانے پہ کیا گذری

(تذکرہ میرحسن صفحہ ۱۷۳)

(۱۵) عجائب رام منشی مرشد آبادی۔ ( " " ۱۸۶)

(۱۶) لالہ نول رائے وفا۔ زیورِ علم و عمل سے آراستہ ہے ( " " ۲۰۴)

(۱۷) لالہ سورج نرائن صاحب خاطر۔ ظہیر کے ارشدِ تلامذہ سے ہیں۔

(۱۸) پنڈت سورج پرشاد خورشید۔ وکیل فرخ آباد۔ دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(۱۹) منشی جگن ناتھ خوشتر لکھنوی - واجد علی شاہ کے منصدی تھے - رامائن اور گیتا کا ترجمہ اردو نظم میں کیا ہے - (خمخانہ صفحہ ۸۳)

(۲۰) منشی جبکیہ رلئے خیال - شاہ نصیر کے ہمعصر تھے -

(۲۱) پنڈت رتن ناتھ دریا لکھنوی - شاگرد حضرت رشک، فارسی میں عالم بے بدل اور زبردست نقاد تھے -

(۲۲) منشی چندن لال دلگیر - مذہب آبائی کو ترک کر کے مسلمان ہوگئے - ناسخ کے شاگرد تھے مرثیہ کہنا شروع کیا - نواب سعادت علی خاں کے زمانہ کے مرثیہ گو شعرا کے سرتاج تھے - مراثی کا ضخیم مجموعہ طبع ہو چکا ہے - امانت آپ کے شاگرد تھے -

(۲۳) رائے سرب سنگھ دیوانہ بعہد شاہِ عالم ثانی چار دیوانِ فارسی اور ایک دیوان اردو ان سے یادگار ہے حسرت استادِ جرات آپ کے شاگرد تھے -

(۲۴) منشی خوب چند ولی - شاگرد نصیر صاحبِ دیوان و تذکرہ معیار الشعرا کے مصنف -

(۲۵) راجہ رام کشن راجہ - صاحبِ دیوان -

(۲۶) مہاراجہ بلوان سنگھ راجہ - صاحبِ دیوان - موسومہ گلِ ریاض

(۲۷) سروگ بجے سنگھ والئے ریاست بلرام پور - شاگرد جواہر سنگھ جوہر صاحبِ دیوان ۳۰۴

(۲۸) لالہ بھگونت رائے راحت کاکوری، امانت سے تلمذ تھا مثنویات "زہرہ، بہرام، نلدمن،" "سوزِ عاشقانہ" آپ سے یادگار ہیں -

(۲۹) دیوان جان بہاری لال راضی - صاحبِ دیوان - گلستاں، بوستاں - اور انوار سہیلی کا اردو نظم میں ترجمہ کیا -

(۳۰) حکیم سکھانند رقم دہلوی نصیر کے شاگرد صاحبِ دیوان -

(۳۱) منشی جگت موہن لال رواں دورِ حاضر کے مشہور شعرا میں شمار ہے -

(۳۲) منشی رام سہائے رونق لکھنوی شاگرد ناسخ

(۳۳) منشی پیارے لال رونق دہلوی شاگرد داغ و رآسخ - رونقِ سخن کے علاوہ ایک دیوان اور مرتب کیا - دہلی کے مشہور رسالہ کمال کے آپ ہی ایڈیٹر تھے -

(۳۴) دیوان دیا کرشن ریحان لکھنوی - شاگرد موجی رام موجی و مصحفی و جواہر سنگھ جوہر ان کا دیوانِ اردو "ریحانِ سخن" چھپ گیا ہے -

(۳۵) لالہ بینڈو لال زارؔ بلگرامی شاگرد منشی طوطا رام عاصؔی اردو و فارسی میں صاحبِ دیوان۔ انشائے گلزارِ فصاحت فارسی کے مصنف۔

(۳۶) راجہ چھنولال زیبؔ۔ آپ کا دیوان طبع ہو چکا ہے۔

(۳۷) راجہ جسونت سنگھ پرؔوانہ شاگرد مصحفی صاحبِ دیوان تھے۔

(۳۸) پنڈت منولال پرؔیشان شاگرد شاہ نصیر۔

(۳۹) رائے ٹیکارام تسؔلی ۔ ریختہ میں مصحفی اور فارسی میں میرزا ناصر کے شاگرد تھے ۔ دواوین کا نایاب کتب خانہ ہزارہا روپیہ کے صرف سے مہیا کیا تھا۔

(۴۰) منشی رام سہائے تسؔلی۔ حاتم علی مہر کے شاگرد غنچۂ مراد و نغمۂ آرزو دو دیوان مرتب کئے۔

(۴۱) منشی رام سہائے تمنؔا لکھنوی، فارسی اردو اور بھاشا میں عالمانہ تبحر رکھتے ہیں۔ دوارکا پرشاد افقؔ اور ماتا پرشاد نیسان کے بھائی ہیں اور افضل التاریخ کے مصنف ہیں۔

(۴۲) لالہ مادھورام جوہرؔی فرخ آبادی شاگردِ منیر دیوان شائع ہو چکا ہے۔ اِن کے فرزند شیو پرشاد جوہری بھی بلند پایہ شاعر تھے۔

(۴۳) منشی جواہر سنگھ جوہرؔ خلف منشی بختاور سنگھ راقمؔ فارسی میں ناطق اور اردو میں خواجہ وزیر سے تلمذ تھا۔ پانچ دیوان تصنیف کئے جو چھپ چکے ہیں۔

(۴۴) سردار کیسرا سنگھ جہانگیؔر امرت سری شاگرد بیان ویزدانی مخزن کے دورِ اول میں بہت نام پیدا کیا۔ پنجاب میں آج تک کوئی غزل گو اس پایہ کا نہیں ہوا۔

(۴۵) جھبن ناتھ جھبنؔ دہلوی بہارِ دانش کا نظم اردو میں ترجمہ کیا۔

(۴۶) پنڈت برج نرائن چکبست لکھنوی دورِ حاضر کے اُن جوانمرگ مستند شعرا سے ہیں جن کی ذات سے اردو کو بہت کچھ امیدیں تھیں۔

(۴۷) منشی دنی رام حسرؔت دہلوی۔ فارسی میں صاحب دیوان اور اردو کے مشہور شاعر۔

(۴۸) پنڈت اجودھیا پرشاد حیرؔت لکھنوی شاگرد جرأت صاحبِ دیوان و مثنویات۔

(۴۹) رائے پریم ناتھ دہلوی دو ہزار شعر کا دیوان یادگارِ زمانہ ہے۔

(۵۰) رائے بہادر منشی شیو نرائن شاگرد غالب۔

(۵۱) منشی رام سنگھ آزادؔ دہلوی۔ بعد تحصیلِ علم نابینا ہوگئے افسوس دیوان تلف ہوگیا۔

(۵۲) پنڈت امرناتھ آشفتہؔ دہلوی شاگرد تنویر دہلوی صاحبِ دیوان۔

(۵۳) ماسٹر پیارے لال آشوبؔ دہلوی۔ پنجاب میں جدید اردو کو آپ کی سعی سے رواج ہوا۔

(۵۴) پنڈت بشن نرائن ابرؔ لکھنوی۔ دفتر گلزار کشمیر کے مصنف۔

(۵۵) پنڈت راج نرائن ارمانؔ دہلوی۔

(۵۶) راجہ پرمانند افسرؔ والئی راج۔

(۵۷) منشی دوارکا پرشاد افقؔ لکھنوی۔ شاگرد منشی شنکر دیال فرحت ٹاڈر راجستان مہابھارت اور راماین کے مترجم۔

(۵۸) دیوان پنڈت امرناتھ مدنؔ اکبری۔ دیوان فارسی مع غزلیاتِ اردو شائع ہوچکا ہے۔

(۵۹) راجہ پیارے لال الفتیؔ دہلوی۔ مثنوی نیرنگِ تقدیر کے مصنف ہیں۔

(۶۰) راجہ گردھاری پرشاد باقیؔ حیدرآبادی۔ دیوان بقائے باقی، بھاگوت گیتا فارسی، کیشو نامہ۔ کلیاتِ یادگارِ باقی اور قصائدِ باقی آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۱) منشی مہاراج بہادر برقؔ شاگرد آغا شاعر نئے طرز کے اچھے کہنے والوں میں ہیں۔

(۶۲) پنڈت چندربھان برہمنؔ۔ ایک دیوانِ فارسی اور منشیات اُن سے یادگار ہیں۔ ریختہ میں بھی کچھ کہا کرتے تھے۔ شاہجہان کا زمانہ دیکھا ہے

(۶۳) پنڈت سندر لال بسملؔ لکھنوی شاگرد ناسخ صاحبِ دیوان۔

(۶۴) پنڈت موتی لال بسملؔ دہلوی۔ دو کتابیں فنِ مسمریزم پر انگریزی سے اردو میں ترجمہ کیں۔

(۶۵) منشی دیبی پرشاد بشاشؔ۔ افسانۂ خرد افروز۔ گلدستۂ ادب۔ وقائع راجپوتانہ۔ احکامِ نوشیرواں۔ تاریخِ ترکانِ ہند۔ تذکرۂ شعرائے ہنود آپ سے یادگار ہیں۔

(۶۶) لالہ کشن نرائن بیتابؔ بنارسی صاحبِ دیوان۔

(۶۷) پنڈت نرائن پرشاد بیتابؔ مشہور ڈراما نگار۔

(۶۸) راجہ ہرکشن سنگھ بیدارؔ۔ امرتسر میں دیوان شائع ہوچکا ہے۔

(۶۹) لالہ بالمکند بے صبرؔ بلند شہری شاگرد غالب و تفتہ، فارسی اور اردو دونوں میں صاحبِ دیوان۔

(۷۰) سالگ رام سالکؔ۔ دیوانِ ریختہ اور کلامِ نعت شائع ہوچکا ہے۔

(۷۱) منشی دیبی پرشاد سحر بدایونی۔ آپ کی تصانیف:۔ خلاصۃ المنطق۔ معیار الاملا، محیط المساحت، مراۃ الکلام اور دو دیوان جن میں سے ایک کا نام سحر سامری ہے۔

(۷۲) منشی اقبال ورما سحر۔ زمانۂ حال کے نامور شاعر ہیں۔ شکنتلا کا ترجمہ نظم اردو میں کیا ہے۔

(۷۳) منشی ادہم سنگھ سردار امرت سری شاگرد جلال لکھنوی۔

(۷۴) پنڈت رتن ناتھ سرشار اردو میں ناول کے ایجاد کا سہرا آپ کے سر ہے۔

(۷۵) منشی درگا سہائے سرور جہان آبادی۔ ایک از بس بلند پایہ طبیعت تھی۔ آپ شباب ہی میں اردو کو داغِ مفارقت دے گئے۔

(۷۶) منشی للتا پرشاد۔ شاد۔ میرٹھی ایڈیٹر اخبار ناظم الہند۔

(۷۷) مہاراجہ سرکشن پرشاد۔ شاد

(۷۸) لالہ بالمکند۔ شاد ہنکی۔ مقالہ نگار۔

(۷۹) منشی ٹھاکر پرشاد شاداں لکھنوی۔ صاحب دیوان گذرے ہیں۔

(۸۰) مسٹر پیارے لال۔ شاکر۔ مذہباً عیسائی۔ شاگرد شوکت، اڈیٹر اخبار ادیب مرحوم الہ آباد۔ والعصر لکھنو۔

(۸۱) پنڈت دیا شنکر نسیم لکھنوی شاگرد آتش صاحب مثنوی گلزارِ نسیم۔

(۸۲) جوالا پرشاد برق۔ شیکسپیر کے متعدد ناٹکوں کو اردو میں منتقل کیا۔

(۸۳) رامجی بائی سکنہ نارنول ۱۸۴۷ء تک زندہ تھی۔

(۸۴) پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی دورِ حاضر کے مسلم الثبوت نقاد۔ شاعر۔ مورخ۔ ڈرامانگار۔ اور کثیر التصنیف ادیب جن کو لکھنو بھی تسلیم کرتا ہے۔

(۸۵) لالہ تلوک چند محروم۔

(۸۶) لالہ بالک رام شاد

(۸۷) منشی نوبت رائے نظر مرحوم۔

(۸۸) منشی دلورام کوثری نعت میں خوب نام پیدا کیا ہے۔

(۸۹) پنڈت تربھون ناتھ ہجر لکھنوی۔ اودھ پنچ کے نامی نامہ نگار۔

(۹۰) لالہ پریم چند افسانہ مختصر کے طرح انداز

(۹۱) لالہ بہاری لال مشتاق دہلوی تلمیذ غالب۔

(۹۲) لالہ سری رام جامع تذکرۂ خم خانۂ جاوید۔

(۹۳) لالہ چرنجی لال صاحب مخزنِ محاوراتِ اردو

(۹۴) بال مکند گپتا المعروف شیسو شنو۔

(۹۵) پنڈت امرناتھ مدن ساحر دہلوی۔ جن کے دم سے دہلی میں باضابطہ مشاعروں کا نام و نمود قائم ہے۔

مزید تلاش سے یہ فہرست اور بھی طویل ہو سکتی ہے۔ مگر مسلمانوں پر جتانے کے لئے کہ ہندو بھی اردو میں معراجِ کمال حاصل کرنے سے عاری نہیں اور ہندوؤں کو یہ بتانے کے لئے کہ اردو سے تغافل انہیں بزرگوں کی کس قدر وراثت سے محروم کر دے گا اتنا ہی بس ہے۔

**اردو اور فارسی** ۔ یہ ہم کئی بار بتا چکے ہیں کہ اردو اُس زبان کا نام ہے جو فارسی اور بھاشا کے ملاپ سے پیدا ہوئی، اس لئے لازم تو یہ تھا کہ اُردو میں فارسی اور بھاشا کا توازن قائم رہتا۔ اور ان سے استمداد میں دامنِ عدل ہاتھ سے نہ جانے دیا جاتا۔ لیکن ہوا اِس کے برعکس۔ بھاشا کے اثر کو کم کرنے میں سعیِ بلیغ سے کام لیا گیا اور اردو کو فارسی کی باندی بنا دیا گیا۔ اُن تلمیحات سے جو خاص ہندوستان سے متعلق تھیں ارادتاً اعراض کیا گیا اور بھاشا کے الفاظ بے سود و بلا وجہ مجلسِ اردو سے نکال باہر کئے گئے۔ ایسی زبان بازاری قرار پائی جس میں ہندی تلمیحات اور الفاظ نمایاں ہوں۔ ایران اور عرب سے تلمیحات و تشبیہات لائی گئیں۔ عربی بحور اور اوزان میں شعر کہنے لگے۔ فارسی کی صرف و نحو کی بنا پر اردو کی صرف و نحو مرتب ہوئی اردو زبان ایران سے سند لینے لگی اور ایسی زنجیروں میں جکڑی گئی کہ فارسی کے اشارہ کے بغیر ہلنے تک کی سکت نہ رہی۔ اس پر اب یہ شرطیں زیادہ کی جاتی ہیں کہ عربی اور فارسی کے الفاظ اُس صورت میں بولے جائیں جو اُن کی عربی یا فارسی یا ترکی میں ہے۔ صرف عربی اور فارسی کے الفاظ مضاف و مضاف الیہ ہوں۔ واو عاطفہ صرف عربی و فارسی کے الفاظ میں آئے۔ کوئی ترکیب استعمال نہ کی جائے جب تک کہ فارسی سے اُس کی سند نہ ملے۔ فارسی میں تو جھروکا درشن، ڈالی انبہ، کھچڑی بریانی، جائز بلکہ ملوک الکلام لیکن اردو میں ناجائز۔ بہت اچھا اگر آپ فارسی کی واو عاطفہ کو ہندی لفظوں کے مس سے محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو اس میں آپ کی فارسی کا کیا ہرج ہے اگر ہندی کے الفاظ میں وہ واو استعمال کی بجائے جو اور کی تخفیف ہے اور ہندی میں استعمال ہوتی ہے۔ ہندی کی دیاکرن (صرف و نحو) میں یہ فقرہ آتا ہے "ناگر یہ میں ماترا و ورن کی گنتی کا کوئی بندھن نہیں رہتا۔ ماترا اور ورن کے درمیان جو "و" ہے اس کے

استعمال میں آپ کیا اعتراض کر سکتے ہیں۔ وہ ستم شعار جو تحصیلِ زبان کو دہلی یا لکھنؤ کے قیام پر موقوف رکھتے ہیں۔ اس کے بعد یہ ارشاد فرمائیں گے کہ فارسی سیکھنے کے لئے ایران جاؤ اور عربی کے لئے حجاز کی زیارت کرو۔ گویا زبان سیکھنے کے لئے پاؤں میں چکر ہونا شرط ہے۔ جو قوم "زبان کی خاطر معانی کی پروا نہ کرے اُس سے زبان کو دولتِ علوم سے مالا مال کرنے کی توقع عبث ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ زبان میں ایسی غرابت پیدا ہو گئی ہے کہ اُس کا سیکھنا عربی، سنسکرت اور عبرانی سے کم مشکل نہیں۔ اِس ایک زبان کے سیکھنے کے لئے عربی و فارسی کی مزاولت لازم اور ایران و عرب کی تاریخ میں دستگاہ کامل درکار ہے، اور یہ بھی کم ضروری نہیں کہ ہندی تہذیب کو فراموش کرنے کا ڈھنگ آتا ہو۔ بچوں کے سامنے جو صرف و نحو آتی ہے اُس کی اصطلاحات عربی کے سراسر اغیر مانوس الفاظ میں وضع کی گئی ہیں۔ جن کے معنی بچے تو کیا اُستاد بھی نہیں سمجھ سکتے۔ اِن اصطلاحات کو بچے رٹ لیتے ہیں اور مارے باندھے از بر کر لیتے ہیں لیکن اُن کے معنی انہیں اُس وقت تک نہیں آتے جب انہیں یاد رکھنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ علمِ بیان و معانی کا جاننا بھی عربی و فارسی کی تحصیل چاہتا ہے۔ عروض کی تو پوچھئے ہی نہیں کلیتہً عربی میں ہے کیا مزے کی بات ہے کہ اردو کے موتی عربی کی میزان میں تولے جاتے ہیں۔ اور ڈھاکہ کی ململ تازی گز سے ناپی جاتی ہے۔ یہ لچھن تو ملک کی عام زبان بننے کے نہیں۔ وہ زبان جو دنیا و ما فیہا کو خیر باد کہنے کے بغیر نہ آئے اُسے آج کل کے زمانہ میں کون سیکھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔ رسم الخط کی بے عنوانی اور تذکیر و تانیث کے اختلافات دوسرے اسباب ہیں جو زبان کو گورکھ دھندا بنا رہے ہیں۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ان عقدوں کا حل کس طرح کیا جائے؟ ہم فارسی کی تقلید میں اس قدر آگے نکل گئے ہیں کہ ایک قدم بھی پیچھے ہٹ نہیں سکتے۔ اور اس لئے اردو کو فارسی کے تاثرات سے پاک کرنا خیالِ خام ہے۔ مگر ان قیود کی گرفت ڈھیلی ہو سکتی ہے اور بھاشا کے عنصر کو شوخ کرنے سے بہت سی آسانیاں پیدا کرنے کے علاوہ مغائرت کی بڑھتی ہوئی رَو رُک سکتی ہے۔

رسم الخط کی اصلاح کے بعد سب سے ضروری کام یہ ہے کہ صرف و نحو کو انگریزی گرامر کے سانچے میں ڈھالا جائے جیسا کہ ہندی میں کیا گیا ہے۔ اصطلاحات کے لئے ایسے الفاظ منتخب کئے جائیں جو مانوس ہوں یا آسانی سے سمجھ میں آسکیں۔ مروجہ عربی اصطلاحات کو یک قلم ترک کر دینا اگر قرینِ مصلحت نہ ہو تو اُن کے بجائے جدید آسان اصطلاحات لکھ دی جائیں اور اس نئے انتخاب میں ہندی مترادفات کو مدِ نظر رکھا جائے۔ عربی بحور و اوزان قائم رہیں مگر بھاشا کے "ماترا وورن" کا استعمال بھی ناجائز نہ رہے۔ اضافت اور واو عطف کے متعلق تمام قیود اٹھا دیئے جائیں اور اُن کے استعمال کو ذوقِ سلیم پر چھوڑا جائے۔ وضعِ اصطلاحات کے قواعد ہندی کی طرح صرف و نحو کا جزو بنائے

میں اور ان قواعد کے مطابق الفاظ بنانے کا اذنِ عام دیا جائے (پروفیسر وحید الدین سلیم مرحوم اس بارے میں بہت کچھ کام کر چکے ہیں۔ اور اب تھوڑی سی محنت سے قواعد مرتب ہو سکتے ہیں) بھاشا کے وہ الفاظ اور ہندوؤں کے وہ محاورات جنہیں فالن اور سید احمد لغات میں داخل کر چکے ہیں ٹکسالی تسلیم کئے جائیں۔ تذکیر و تانیث کی فرد پر نظرِ ثانی کی جائے۔ اور لاہور حیدر آباد لکھنؤ اور دہلی کے کثرت سے رواج کی بنا پر کلیہ قرار دیا جائے مثلاً

| لفظ | دہلی | لکھنؤ | لاہور | قابلِ قبول |
|---|---|---|---|---|
| ناک | مؤنث | مؤنث | مذکر | مؤنث |
| التماس | مذکر | مؤنث | مؤنث | مؤنث |
| رسم | مؤنث | مذکر | مؤنث | مؤنث |
| دسترس | مؤنث | مذکر | مؤنث | مؤنث |

اس طرح جب اس اصول کو زیر نظر رکھ کر قصہ طے ہو جائے تو اُس کے مطابق تذکیر و تانیث کا ایک قطعی فیصلہ ہو سکتا ہے۔ ورنہ زبان میں یگانگت پیدا نہ ہوگی۔ مروجہ اصول کو جانے دیجئے ہر قاعدہ کے اس قدر مستثنیات ہیں کہ سنسکرت میں بھی نہ ہونگی۔ اِس کے آسان اور جامع قاعدے نئے سرے سے مرتب کرنے کی ضرورت ہے جو ہر چہار مقاماتِ مذکور پر حاوی ہوں۔ اس طرح متروکات پر غور کیا جائے اور جو الفاظ ہنوز زندہ رہنے کی صلاحیت رکھتے ہوں اور محض کسی ضد کے باعث گردن زدنی قرار دیئے گئے ہوں اُنہیں پھر زبان میں داخل کیا جائے۔ عربی و فارسی کے غیر مانوس و ثقیل الفاظ رخصت کئے جائیں سوائے اُن الفاظ کے جو زبان پر چڑھ گئے ہوں۔ الحاق کے لئے عربی "ال" کے بجائے اضافت سے کام لیا جائے۔

اِن خیالات کو اربابِ ذوق کے سامنے پیش کرنے میں محض خدمتِ زبان منظور ہے۔ حاشا کسی صاحب شان کی دل آزاری یا کسرِ شان مدنظر نہیں۔ ہمارے خیال میں ان تجاویز پر عمل پیرا ہونے سے زبان کا حلقہ وسیع ہو جائے گا، اس میں ہندوستان کی ملکی و قومی زبان بننے کی اہلیت زیادہ ہوگی اور تحصیلِ زبان آسان ہو جائے گی ہندو و مسلم کا تفرقہ کم کرنے کا ایک زبردست آلہ ہاتھ آ جائے گا، تعصب کا عیب دُور ہوگا، زبان ایک سرمایۂ مشترک بن جائے گی جس کی ملکیت میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی، پنجابی، یوپی والے، دہلوی، لکھنوی، بنگالی، بہاری

اور دکنی وغیرہ کی تخصیص نہ رہے گی۔ اور

قسمتِ بادہ باندازۂ جام ست ایں جا

پھر ناموری اور تفوق کا مدار قابلیت پر ہوگا اس سے آگے تفصیلات ہیں مگر کیوں اور کہاں۔ اور کیونکہ کا فیصلہ کرنے کے لئے انجمن ترقیٔ اردو اور آپ کا آرگن موجود ہیں۔ "پنجاب اور اردو" کے علاوہ اور بہت سے مباحث بخوفِ طوالت رہے جاتے ہیں۔ خیر۔ لیکن اگر یہی سطور کوئی فائدہ مند نتیجہ پیدا کریں تو شاید اتنا بھی ناکافی نہ ہو۔ ممکن ہے کہ جو علاج ہم نے بتایا ہے تیر بہدف نہ ہو لیکن اگر نباضان زبان اس طرف توجہ کریں تو ہم سمجھیں گے کہ ہماری سعی مشکور ہوئی۔

"ڈرامی"

# تصنیف

مصنف کا انتخاب کرو جیسے تم اپنے دوستوں کا کرتے ہو۔

اپنے دل میں دیکھ اور لکھ

مصنف کی دو زبردست قوتیں نئی چیزوں کو ہر دلعزیز اور ہر دلعزیز چیزوں کو نت نئی چیزیں بناتی رہنا ہے۔

جو مصنف بنے اس لئے کہ مشہور ہو اُس بیوقوف کی مانند ہے جو بازار میں جائے تاکہ لوگ اُسے دیکھیں

مصنف بننا چاہتے ہو تو پہلے طالب علم ہو

گلچیں

# چشم

اے چشم تُو دُرِ بے بہا ہے — تو جلوۂ قدرتِ خدا ہے
اِنسان کی آبرو ہے تجھ سے — دیدار کی آرزو ہے تجھ سے
بجلی کی طرح چمک رہی ہے — ہیرے کی طرح دمک رہی ہے
ہے پھول کنول کا ماند تجھ سے — شرماتا ہے دیکھ چاند تجھ سے
دو ابرو لئے کماں کھڑے ہیں — گویا کہ دو پاسباں کھڑے ہیں
جب تک کہ ہیں تیز تیرِ مژگاں — محفوظ ہے تیرا گنجِ پنہاں
آتے جو نظر ہیں چاند تارے — تیری ہی نظر کے ہیں اشارے
تُو نورِ خدا کا ایک پارہ — تُو صبحِ امید کا ستارہ
گر تُو ہے تو جینے کا مزا ہے — گر تُو نہیں، زندگی بلا ہے
کیا سیرِ جہاں دکھا رہی ہے — ہستی کا مزا چکھا رہی ہے
ہے رنگ کبھی وفا کا تجھ میں — ہے قہر کبھی جفا کا تجھ میں
کیا شے ترے جام میں بھری ہے — جادو ہے کہ سحرِ سامری ہے
مستی سے بھرا ہے جام تیرا — ہے مستِ سیاہ نام تیرا
گردش سے تری جہان پلٹا — تُو پلٹی تو آسمان پلٹا
کچھ سوز ہے کچھ گداز تجھ میں — کچھ ناز ہے کچھ نیاز تجھ میں
کتنے ترے حسن پر ہیں مائل — کتنے ہیں جہاں میں تیرے گھائل
کُشتے ہیں کئی تری حیا کے — غمزے ترے تیر ہیں قضا کے
دل چھین لیا تری ادا نے — وارفتہ کیا تری رضا نے

ناوک فگنی کہاں سے سیکھی | یہ دل شکنی کہاں سے سیکھی
مستانہ مجھے تو پھر بنا دے | پھر جلوۂ بے خودی دکھا دے
پھر پیشِ نظر وہی سماں ہو | پھر عیش کی رات کا گماں ہو
بچپن کی وہ مستیاں کہاں ہیں | وہ بادہ پرستیاں کہاں ہیں
کیا بھول گئیں وہ پہلی باتیں | دن عیش کے بہشتی کی راتیں
دل رنج سے جب نہ آشنا تھا | جانب سے نہ غیر کی گِلا تھا
جب دِل کو نہ تھی یہ بے قراری | تھی لب پہ کبھی نہ آہ وزاری

تاریکیٔ شب کو دُور کر دے
دامن میں سحر کا نُور بھر دے

رام پرشاد کھوسلہ ناشاد

# غزل

اب وہ رنگینیٔ بہار کہاں! | آہ! وہ بزمِ زرنگار کہاں!
ذرے تھے تابِ حسن سے پُرنور | ہائے وہ دشتِ زرنگار کہاں!
آرزو سے رہی نہ دلچسپی | اب فریبِ وصالِ یار کہاں!
کر چکے نذر آپ دل اپنا | اب ہمیں اس پہ اختیار کہاں!
عہد و پیماں تو باندھتے ہیں وہ | بات کا اُن کی اعتبار کہاں!
کیفیت انتظار کی مت پوچھ؟ | دل کو تنہائی میں قرار کہاں!

جوش لیبے خیالِ خام کو چھوڑ
تو کہاں؟ اور وہ نو بہار کہاں؟

جوش

# کھویا ہُوا احترام

## کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

دو بھائیوں کے متعلق ایک کہانی بیان کی جاتی ہے کہ انہیں بکریاں چُرانے کے الزام میں گرفتار کر کے ایک قاضی کی عدالت میں پیش کیا گیا۔ جرم ثابت ہو جانے کے بعد قاضی نے حکم دیا کہ وہ چار سال تک اُس نہر پر کام کریں جو رفاہِ عام کے لئے شہر کے باہر کھودی جا رہی تھی۔ چونکہ اُس زمانہ میں جرائم کو روکنے کے لئے عبرتناک سزائیں دی جاتی تھیں تاکہ پھر کسی دوسرے آدمی کو امنِ عامہ میں خلل انداز ہونے کا حوصلہ نہ ہو سکے اس لئے سزا کی میعاد مجرموں کی پیشانیوں پر داغ دی جاتی تھی۔ چنانچہ ان دونوں بھائیوں کی پیشانیوں پر ۴[1] (چار) کا ہندسہ داغ دیا گیا۔

سزا کی میعاد گزرنے کے بعد دونوں بھائی رہا کر دیئے گئے۔ ایک بھائی اُس ذلت کو جو اُس کی پیشانی پر ہمیشہ کے لئے ثبت کر دی گئی تھی، برداشت نہ کر سکا اور شرم کے مارے کسی دور دراز ملک کو بھاگ گیا جہاں کے باشندے اُس کے جرم سے قطعًا ناواقف تھے لیکن افسوس وہاں بھی اُسے اطمینانِ قلب نصیب نہ ہو سکا کیونکہ اُس کی پیشانی پر چار کا عدد دیکھ کر لوگ حیران ہو جاتے پھر اُس سے اس کا سبب دریافت کرتے اور اپنی حیرانی رفع کرنے کے لئے اُس سے مختلف قسم کے سوالات کر کے اُسے پریشان کر دیتے۔ یہ سوالات اُس کے دل کو پارہ پارہ کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ تھے۔ چنانچہ عرصۂ دراز تک وہ مختلف ملکوں میں اپنی اس دوامی ذلت کو چھپانے کے لئے گھومتا رہا اور عنفوانِ شباب ہی میں مر کر ایک گمنام قبر میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

دوسرے بھائی کو بھی اپنی اس بے عزتی کا احساس ہُوا لیکن وہ اپنے بھائی کی طرح کمزور دل و دماغ کا انسان نہ تھا۔ اُس نے اپنے دل میں کہا " میں اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ میں نے بکریاں چُرائی تھیں لیکن مَیں اسی جگہ رہ کر اپنا کھویا ہُوا احترام حاصل کروں گا"۔

زندگی کے دن گزرتے گئے، اُسی خاموشی اور تیزی کے ساتھ جس طرح کہ وہ گزر جانے کے عادی ہیں، اور

---

[1] عربی زبان میں ۴ کا عدد یوں ع بھی لکھا جاتا ہے۔

یہ اپنے عزم میں پختہ انسان ایک شریف اور دیانتدار آدمی کی طرح اپنے دن بسر کرتا رہا - وہ نیک نیتی سے اپنے کام سرانجام دیتا اور ہر فرد بشر کے ساتھ نہایت خلوص و محبت سے پیش آتا - وہ ہر بیمار پڑوسی کی تیمارداری کرتا اور ابنائے وطن کی خدمت گذاری کو اپنا نصب العین سمجھتا - ایک دن کوئی اجنبی اُس شہر میں آیا اور بوڑھے آدمی کی پیشانی پر م کا ہندسہ دیکھ کر اُس نے شہر کے ایک باشندہ سے دریافت کیا "کیوں جناب آپ مجھے بتا سکتے ہیں کہ اس سفید ریش بزرگ کی پیشانی کا نشان کیا معنی رکھتا ہے"؟

یہ سنتے ہی شہری ایک گہری سوچ میں پڑ گیا پھر چند لمحوں تک سوچنے کے بعد کہنے لگا" یہ بہت عرصہ کی بات ہے اس لئے اس کی تفصیل تو میرے حافظہ کی پناہ میں نہیں رہی لیکن جہاں تک میرا خیال ہے یہ حرف "علیہ السلام" کا مخفف ہے"۔

کتنا رحم آتا ہے دوسرے بھائی کی حالت پر جو تمام دنیا کی تلخی، ذلت اور رنج و غم کا احساس لئے کر در بدر پھرتا رہا لیکن پھر بھی اپنے جرم کو لوگوں کی آنکھوں سے پنہاں نہ رکھ سکا - جہاں کہیں وہ جاتا لوگوں کی حیرت طلب نگاہیں اس کی طرف اُٹھتیں کیونکہ انسانوں کی آنکھیں ہر نئی اور عجیب شے دیکھنے کی آرزومند ہوتی ہیں اور وہ خود ایک عجیب چیز اپنی پیشانی پر نمایاں کئے ہوئے تھا۔

دنیا میں ایسی باتیں بھی ہیں جن سے انسان بھاگ کر اپنی عزت و حرمت بحال رکھ سکتا ہے - مثلاً کسی شخص کے پڑوسی یا ابنائے وطن غیر منصفانہ طور پر اُس کے خلاف ہوں اور یہ مخالفت نتیجہ ہو ناواقفیت یا تنگ سوز تجارتی، مذہبی یا معاشرتی تعصب کا تو وہ دیگر محلہ یا ملک میں نقل مکان یا ہجرت کر سکتا ہے اور وہاں اپنی قسم کے لوگوں میں اتنی ہی مسرت یا خوشی حاصل کر سکتا ہے جس کا کہ وہ اپنی خصلت یا عادت کے سبب حقدار ہو - اس حالت میں اُس نے اپنی شہرت کے سوا کچھ نہیں کھویا، اُس کی حرمت اور عزت نفس اُس کے ساتھ ہے۔

اگر اُس نے ذاتی اغراض یا نفس پرستی کے جذبات سے مجبور ہو کر کوئی ایسا فعل کیا ہے جس سے اُس کی شہرت اور ذاتی احترام بھی کھو یا گیا ہو تو اُس حالت میں بھاگ جانا بُرے حالات کو بدترین صورت میں تبدیل کر دیگا —— کون نہیں جانتا کہ اس محدود دنیا میں ضمیر کے کچوکوں سے بچنا ازبس محال و ناممکن ہے۔

اگر ایسا شخص کسی ہمسایہ ملک میں بھاگ کر چلا جائے اور وہاں اپنی عزت اور وقار قائم کر لینے میں کامیاب بھی ہو جائے تو دو خدشے ہر وقت اُس کی جان کھاتے رہیں گے - اول، یہ خوف کہ اُس کا کوئی واقف حال وہاں آ کر اُس کے گذشتہ حالات سے لوگوں کو واقف نہ کر دے - دوم، اس بات کا احساس کہ وہ بزدل اور کمزور ہے اور وہ لوگ

ابھی تک اُسے نفرت وحقارت کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں جن سے بھاگ کر آیا تھا۔

کیا کوئی شکست خوردہ پہلوان اُس وقت تک اپنا کھویا ہوا احترام حاصل کرسکتا ہے تاوقتیکہ وہ اسی جگہ اسی آدمی کو پچھاڑ نہ دے جس نے اُسے ذلت آمیز زک دی تھی؟ محمد غوری کی سپاہ نے ۱۱۹۱ء میں جب تراوڑی کے میدان میں شکست کھائی اور اُن سپاہیوں کے ساتھ جو میدانِ جنگ سے فرار ہوگئے تھے، جو سلوک ہوا اُس کا حال تاریخ دان طبقہ کو اچھی طرح معلوم ہے۔ جوَ کے توبرے اُن کے منہ کے ساتھ بندھوا کر غور کے بازاروں میں انہیں پھرایا گیا۔ گویا وہ انسان نہ تھے گدھے تھے لیکن دو سال بعد جب انہیں ہزیمت خوردہ سپاہیوں اور سرداروں نے ۱۱۹۳ء میں پانی پت کے میدان میں پرتھی راج اور اُس کے تمام مددگاروں کی افواج کو شکست دے کر اسلامی حکومت ہندوستان میں قائم کردی تو وہی ذلیل گدھے بادشاہ کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے ——— گم شدہ چیز اسی جگہ تلاش کی جاسکتی ہے جہاں وہ کھوئی گئی ہو۔ تراوڑی میں اپنی سپاہیانہ حرمت کھو کر غور میں تلاش کرنا نہ صرف غیر ممکن ہے بلکہ جنون کا اظہار ہے۔

اس نکتہ کو اچھی طرح سمجھ لو اور یاد رکھو کہ جمہور کا حافظہ نہایت کمزور ہے، اس لئے نہیں کہ اُن کے دماغ کمزور ہوتے ہیں بلکہ اس لئے کہ غیروں کی شہرت واحترام کے متعلق وہ زیادہ دیر تک اپنے دل و دماغ کو پریشان نہیں کرنا چاہتے۔ اس زمانہ میں جب ہر شخص قوت لایموت کی الجھنوں میں الجھا ہوا ہے۔ ٹھنڈی راکھ کے نیچے دبی ہوئی چنگاریاں تلاش کرنے کے لئے کسی کے پاس بھی وقت نہیں اس لئے کھویا ہوا وقار حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں آج کی رائیں آج کے تاثرات پر قائم کی جاتی ہیں کل کے تاثرات پر پھر نئی آرا قائم ہونگی۔

اگر ایک بدنام کھلاڑی مقابلہ کی دوڑ میں جیت جائے تو بہت کم لوگ ہونگے جو اُس کی گذشتہ ناکامیوں کا تذکرہ کریں گے اور اُن میں بھی زیادہ تعداد اُن حاسدوں اور دشمنوں کی ہوگی جو بلاوجہ اُس کے ساتھ حسد اور دشمنی رکھتے ہیں اور ایسے کم عقل لوگوں کی کسی زمانہ میں بھی کمی نہیں رہی۔ جب بغداد کا مشہور چور ابنِ ساباط بغداد ہی میں رہ کر ایک عالمِ باعمل اور متقی و پرہیزگار انسان بن سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ آپ اور میں اپنے وطن میں رہ کر اپنے قصوروں کی تلافی نہ کرسکیں۔

(ماخوذ) محمد ضیاء الدین شمسی

# تجلّیات

(۱)

ہٹا گیا ہے کچھ ایسا مری نگاہ میں حسن
کہ جیسے نالوں میں ہے حسن میری آہ میں حسن
مثال حسن کی دنیا میں تو ہے آپ اپنی
ترے عتاب میں ہے حسن تری چاہ میں حسن

(۲)

ترے جمال کی رنگینیوں کا شیدا ہوں
ترے کمال کی خود بینیوں کا شیدا ہوں
یہ واہ واہ جو کرتا ہوں لطف لے لے کر
ترے ہی حسن کی نمکینیوں کا شیدا ہوں

(۳)

تری نگاہ سے سرشتِ فنا پہ ہنستے ہیں
ہمیں وفورِ عشق سے تیرے قضا پہ ہنستے ہیں
چمن کے خون سے رنگیں ہیں انگلیاں تری
وہ کام کر کے محبت خطا پہ ہنستے ہیں

(۴)

کمال حسن ازل کا ظہور ہے عالم
ظہور یار کی آغوش نور ہے عالم
سب ایک نور ہے جو شش جہت میں پھیلا
امین سمجھے ہیں یہاں اور طور ہے عالم

امین حزیں

# تجربات

(۱) دنیا میں صرف ایک ہی چیز یقینی ہے ۔ موت

(۲) ایک فقیر سے کسی نے پوچھا کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے ۔ اُس نے جواب دیا "مرنا سچ اور جینا جھوٹ"!

(۳) ہر شخص کی زندگی میں ایک وقت ضرور آتا ہے جب وہ موت کی خواہش کرتا ہے بعض من چلے تو اس گھڑی جان پر کھیل جاتے ہیں اور بعض نامعلوم عواقب کے خوف سے زندہ درگور زندگی بسر کرنے پر ہی قناعت کرتے ہیں۔

(۴) خودکشی پر دو مختلف پہلوؤں سے نگاہ ڈالی جا سکتی ہے :-

الف - یہ سراسر بزدلی ہے کہ تکالیف سے گھبرا کر موت کی پناہ ڈھونڈی جائے ۔ ہمت و مردانگی کا تقاضا ہے کہ مصائب و حوادث کا مقابلہ کر کے مخالف قوتوں کو زیر کیا جائے ۔

ب - اس سے بڑھ کر اور کیا دلیری ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی جانِ شیریں کا خاتمہ خود اپنے ہاتھ سے کر دے ۔ بے وقار زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔

(۵) موت مرنے والے کے لئے پیغامِ راحت ہے اور پس ماندگان کے واسطے نزولِ بلا ۔ ہم اس لئے نہیں روتے کہ مرنے والا جان سے گذر گیا ۔ ہم تو اُن نقصانات پر روتے ہیں جو اُس کی موت سے ہمیں برداشت کرنے پڑیں گے آہ خودغرض و ظاہردار انسان !!!

(۶) اگر ہماری زندگی دنیا ہی میں ختم ہو جاتی اور مصائب کا کلی خاتمہ موت کے ہاتھوں ہو سکتا تو نوے فیصدی لوگ موت کی ہم آغوشی پر آمادہ ہو جاتے ۔ مگر پہلی بات یقینی نہیں۔

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے ۔ مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

(۷) فلسفیوں میں بھی اختلاف ہے ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جہانِ آب و گل سراسر دھوکا اور فریب ہے ۔ اس کے دام میں آ جانا جہالت ہے ۔ دوسرا گروہ کہتا ہے یہی سب کچھ ہے ۔ لذائذ جیات سے خوب جی بھر کر متمتع ہو لو کیسی حماقت ہے کہ موہوم چیز کی امید پر ، جس کا سرے سے وجود ہی نہیں ، ہم دنیا کی لذتوں سے کنارہ کش ہو جائیں ۔ اُس شخص سے زیادہ بیوقوف کون ہو گا جو دریا سے پیاسا واپس آ جائے ؟

بعض نے میانہ روی اختیار کی ہے ۔ وہ کہتے ہیں نہ یہ دھوکا ہے نہ وہ جھوٹ ۔ یہ چند روزہ زندگی تیاری ہے

اُس حیاتِ جاوداں کے لئے جہاں نہ موت ہے نہ اختتام۔ زندگی کا خاتمہ نہیں ہوتا۔ یہ تو ایک سمندر ہے جس کا کنارہ نہ ہو ایک تسلسل ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔ تکمیلِ حیات کے لئے موت کے دروازہ سے گذرنا ضروری ہے

موت اِک زندگی کا وقفہ ہے　　　یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

یا

موت کو سمجھے ہیں غافل اختتامِ زندگی　　　ہے یہ شامِ زندگی صبحِ دوامِ زندگی

(۸) انسان دنیا میں آتا ہے تو سینکڑوں کو ہنساتا ہے۔ جاتا ہے تو سینکڑوں کو رلاتا ہے۔

(۹) ہم دنیا میں آتے ہوئے بھی روتے ہیں اور جاتے ہوئے بھی۔

(۱۰) جس چیز سے مفر نہ ہو اُس سے ڈرنا حماقت ہے۔ موت سب کے لئے یقینی ہے۔

(۱۱) موت کے سامنے شاہ و گدا برابر ہیں۔ خوش نصیب ہے وہ جس کی آخری گھڑیاں اطمینان سے گزریں۔

(۱۲) تم قبر کے عذاب سے ڈرتے ہو اور وہ جنہیں زندگی میں عذابِ قبر سے واسطہ پڑ گیا کہاں جائیں؟

(۱۳) موت کا ایک وقت مقرر ہے۔ لیکن کون جانتا ہے کب آجائے۔

(۱۴) ہر شے کی ابتدا و انتہا ہے۔ **کل من علیہا فان**

(۱۵) لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے　　　اپنی خوشی سے آئے نہ اپنی خوشی چلے

**عاشق بٹالوی**

---

**مسرت** ۔ آہ میں تجھے کن لفظوں میں یاد کروں تیرا نام بھی میرے لئے اجنبی ہو چکا ہے۔ افسوس میں نے تیری بہت ناقدری کی مجھے تیری موجودگی میں تیرا کچھ احساس نہ ہوا۔ میری مثال اُس اندھے کی طرح تھی جو شب کی سیاہی اور صبح کی سفیدی میں کچھ تمیز نہیں کر سکتا۔ لیکن آہ جب تو مجھ سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئی اور غم کا تاریک بادل میرے دل پر چھا گیا۔ اُس وقت مجھے معلوم ہوا کہ تیری موجودگی میں مجھے کس قدر راحت اور اطمینان نصیب تھا۔ تیرے پرتو سے ہر ایک چیز مجھے کس قدر مسرور و شاداں نظر آتی تھی۔ ایک ایک ذرہ مجھے خوشی سے رقص کرتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ دنیا اب بھی وہی ہے۔ وہی چاند وہی سورج وہی گلشن ساری کائنات وہی ہے لیکن تو نہیں اس لئے یہ سب چیزیں مجھے بے جان اور افسردہ نظر آتی ہیں۔ میں نے تجھے چھوڑ کر اپنا سب کچھ کھو دیا وہ پہلا سا سکون وہ اطمینان اب مجھے کبھی نصیب نہیں ہوا۔ میری آنکھیں تیرے لئے خون کے آنسو روتی ہیں ......

لیکن اب وہ تجھے دیکھنے کی آرزومند نہیں کیونکہ میرا دل اب تجھ سے ناآشنا ہو چکا ہے

**گمنام**

رافت نے نہایت متانت آمیز تبسم کے ساتھ کہا "دنیا کی ہر شے کا یہی انجام ہے"
میں نے کہا "یہ سچ ہے مگر کیا کروں مجھے اِس ملاقات سے سیری نہیں ہوئی"
اُس نے ہنس کر جواب دیا "سیری نہ ہونا ہی لطف و مسرت کا نام ہے"
میں نے جواباً کہا "آپ کا کہنا بالکل صحیح ہے لیکن ......"
"دخل در معقولات سے معاف فرمائیے گا۔ مجھے کچھ عرض کرنا ہے" اُس نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔
"فرمائیے" میں نے جواب دیا۔
رافت نے کہا "میں آپ کی ذرہ نوازی سے ایک ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتا ہوں اگر آپ منظور کریں"
میں نے مجبوراً اپنی عادت کے خلاف عالمِ امکان کی وسعت پر خیال کرتے ہوئے کہا "بسر و چشم۔ ارشاد"
رافت نے کہا "جب آپ یہاں سے رخصت ہونے لگیں تو کم از کم دو تین روز کے لئے غریب خانہ پر تشریف کر مجھ کو ممنون ہونے کا موقع دیجئے۔
ہر چند میرے پاس کافی وقت تھا مگر ذاتی اہمیت کے نفسی مسئلہ پر غور کرتے ہوئے میں نے جواب دیا "فرصت تو نہیں مگر آپ کی نوازش اور عزت افزائی نے مجبور کر دیا"
شکریہ ادا کرتے ہوئے رافت نے دریافت کیا "یہاں آپ کے دن قیام فرمائیں گے"
میں نے کہا "بمشکل تین دن ٹھیروں گا"
رافت نے زیر لب کچھ حساب لگاتے ہوئے مجھ سے کہا "تو آ
میں نے کچھ توقف کر کے جواب دیا "انشا اللہ"
اس مختصر گفتگو کے بعد میں رافت سے رخصت ہو کر
محبت، استغنا، علمی ذوق اور گفتگو کے موثر لیکن نرالے انداز
کہ وہ بھی میرا مشتاق تھا جس کی صحت و صداقت اُس
قائل کر دیا کہ واقعی دل کو دل سے راہ ہوتی ہے
کام سے فراغت پانے پر میں شنبہ
رافت کی قیام گاہ قصبہ سے الگ
پر مشتمل تھی۔ بڑا کمرہ باغیچہ کے وسط میں ایک

جس میں ایک طرف ایک پلنگ بچھا تھا اور دوسری طرف ایک چٹائی کے اوپر ہرن کی کھال بچھی تھی۔ قبلہ رخ دیوار میں ایک الماری تھی جس کے اوپری درجہ میں چند کتابیں، دوسرے درجہ میں چرمی بیگ، آئینہ کنگھا اور تیل کی دو خوبصورت شیشیاں رکھی تھیں۔ کمرہ کے دو رخوں پر دو دروازے اور تین کھڑکیاں تھیں۔ تیسری جانب ایک بڑی کھڑکی تھی چوتھی طرف ایک دروازہ دوسرے حصہ میں جانے کا تھا۔ دوسرے حصہ کو ملاقات کا کمرہ کہئے یا چھوٹا سا کتب خانہ۔ طول میں یہ خواب گاہ سے بڑا تھا۔ اُس کے دو رخوں پر کھڑکیوں کی بجائے دو خوشنما الماریاں دیوار کے اندر بنی ہوئی تھیں ہر ایک الماری کے پانچ پانچ درجے تھے۔ چاروں الماریوں میں اردو، ہندی، فارسی اور انگریزی زبان کی مختلف علوم پر چیدہ چیدہ کتابیں حسنِ ترتیب سے چنی تھیں۔ الماریوں کے بیچ میں ایک ایک دروازہ تھا تیسری دیوار میں ایک کھڑکی اور اُس کے دونوں طرف دو الماریاں تھیں۔ ایک میں مصوری کا پورا سامان احتیاط سے رکھا تھا۔ اور دوسری میں بھی کچھ مصوری کا سامان قلم دوات، قلم تراش اور چند اقسام کے رنگین و سفید کاغذات رکھے ہوئے تھے۔ الماریوں کے پہلوؤں پر مختلف قدرتی مناظر کی تصویریں لگی تھیں۔ نیچے چٹائی کا پورا فرش تھا۔ جس پر موٹے کھدر کی ایک صاف چاندنی بچھی تھی۔ دونوں حصوں کے چاروں طرف پھوس کا برآمدہ تھا۔ جس کے اوپر مختلف بیلیں خوب پھیلی اور چھائی ہوئی تھیں۔ پھول اور پتیوں سے کہیں پھوس نظر نہ آتا تھا۔ برآمدہ کے آگے کھلا ہوا چبوترہ تھا۔

، پاس مختلف خوشنما پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ جن کے کنارے کنارے روشیں بنی تھیں کیاریوں
کے ساتھ پھلوں کے درخت قطار در قطار لگے تھے۔ بڑے کمرے کے چپ و راست
والے کمرے کے بھی دو حصے تھے ایک میں باورچی خانہ تھا اور دوسرا کھانا کھانے
ضروری سامان تھا۔ دوسرے کمرے میں باغبانی وغیرہ کا سامان رکھا تھا تینوں
ہ کا کہیں وجود نہ تھا۔

ف ترکاریوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے اور باغیچہ کے

رہیچ گھومتا، لہراتا ہوا سامنے والے بڑے تالاب میں

ا ور رومان نظر آتی تھی ہر چیز اور ہر بات میں

ب

رافت کی دلچسپی اور انتہائی انہماک کا ثبوت مجھے اس امر سے ملا کہ اُس نے باغچہ کی ہر ایک شے اور ایک ایک درخت اور پودے کے فرداً فرداً حالات مجھ سے بیان کئے اور بیان کرتے وقت اُس کا چہرہ شادمانی و مسرت سے دمک اُٹھتا تھا۔

وہ مجھ سے اس درجہ خلوص و محبت سے پیش آیا کہ اس سے پہلے میرے خیال میں بھی یہ نہ آتا تھا کہ دنیا والوں میں بھی ایسا خلوص و انس ہوسکتا ہے۔ لیکن سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ باغچہ کے قریب جو غربا اور عوام کا طبقہ رہتا تھا رافت اُن سے بھی ہمیشہ ویسے ہی خلوص و محبت سے پیش آتا تھا۔

رافت ایک کشیدہ قامت، متناسب الاعضاء، خوش رو، چھریرے بدن کا نوجوان تھا، اس وقت اُس کی عمر پچیس چھبیس سال کی ہوگی۔ اُس کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ وہ تنہا رہتا تھا۔ باغبانی وغیرہ کے کاموں میں اُس کے دیہاتی بھائی شریک و سہیم رہتے تھے اور جو کچھ ترکاریوں وغیرہ سے آمدنی ہوتی تھی وہ انہیں لوگوں میں تقسیم کر دیتا تھا۔ اُس کی ذاتی ضروریات بہت ہی مختصر تھیں۔ باغچہ کی مصروفیت کے علاوہ رافت کی دو اور بہترین دلچسپیاں تھیں۔ ایک مطالعہ کتب اور دوسری مصوری۔ مصوری میں اُسے کمال حاصل تھا۔ اُس کے مختصر کتب خانہ کی دیواروں پر جو تصویریں لگی تھیں وہ اُس کی مصوری کا بہترین نمونہ تھیں۔

ایک دن ہم دونوں اسی کتب خانہ میں بیٹھے مختلف بحثوں پر گفتگو کر رہے تھے کہ مصوری کے موضوع پر بات چیت ہونے لگی۔ رافت نے فنِ مصوری پر ایک مبصرانہ اور مدلل تقریر کی۔ اُس نے بیان کیا کہ فنونِ لطیفہ میں مصوری و نقاشی کا کیا رتبہ ہے۔ اُن کا احاطہ کس قدر وسیع ہے۔ اس فن میں کیا کیا نکات اور خوبیاں ہیں۔ مصوری کو شاعری پر کہاں تک فوق حاصل ہے۔ زمانۂ قدیم میں اس فن نے کس قدر نشو و نما پائی اور قرونِ وسطیٰ میں کس قدر تکمیل کی۔ دنیا کی کون کون قوموں نے کیا کیا صنعتیں مصوری میں ایجاد و اختراع کیں اور اُن کو کہاں تک کمال پر پہنچایا۔ مشرقی اور مغربی مصوری میں کیا فرق و امتیاز ہے۔ چینیوں نے اس فن میں کیا کیا کمالات حاصل کئے۔ ایرانیوں اور ہندیوں نے کیا کیا جدت طرازیاں کیں۔ عہدِ مغلیہ میں اس فن نے ہندوستان میں کس قدر ترقی کی۔ قدیم یونان، روم اور مصر کے مصوروں اور نقاشوں نے کس درجہ اس میں کمال حاصل کیا۔ اور پھر عہدِ حاضر میں یورپ نے کیا کیا ترقیاں اس فن میں کیں۔ آخر میں مختصر تبصرہ اور تنقید کرتے ہوئے اُس نے مصوری اور نقاشی کے مستقبل پر روشنی ڈالی۔ میں حیرت و استعجاب سے اُس کا منہ دیکھ رہا تھا کہ اس شخص کو اس فن میں کس درجہ عبور اور تبحر حاصل ہے۔

تقریر ختم کرنے کے بعد رافت نے کمرہ کی تصویریں اتاریں اور ہر ایک تصویر کو دکھا دکھا کر اُن کے نکات، باریکیاں اور

خوبیاں بیان کرنا شروع کیں۔ میں مجسمۂ حیرت بنا ہوا کانوں سے اُس کے سامعہ نواز الفاظ سن رہا تھا اور آنکھوں سے اُن باصرہ فروز قدرتی مناظر کو جنہیں ایک انسان کے بہترین تخیل نے معمولی قلموں کے ذریعہ سے اپنی انگلیوں کی جنبشوں سے اور زیادہ حسین بنا کر ہمیشہ کے لئے کاغذی پیرہن میں زندہ کر دیا تھا دیکھ رہا تھا جب وہ اُن تصاویر کو دکھا چکا تو اُس نے ایک الماری کھولی اور تصویروں کا ایک خوشنما مرقع نکالا اور "میری ساری زندگی کا سرمایہ صرف یہ مرقع ہے" کہہ کر اُس نے وہ مرقع میرے ہاتھ میں دے دیا۔ اس میں کل چوبیس تصویریں تھیں۔ میں ایک ایک تصویر کو دیکھ رہا تھا اور خود عالمِ تحیر میں تصویر بنا ہوا تھا۔

رافت شادمانی کی تصویر بنا ہوا تبسم کے ساتھ کبھی مجھ پر نظر ڈالتا تھا اور کبھی ان تصاویر پر۔ اس مرقع میں زیادہ تر تصویریں قدرتی مناظر کی تھیں۔ باغچہ کے مختلف حصص کے مختلف مناظر اور قرب و جوار کے دیگر پُرفضا مقامات کی بھی تصویریں مرقع میں شامل تھیں۔ کئی تصویروں میں دیہاتی زندگی کے بہترین نمونے دکھائے تھے۔ صبح شام اور چاندنی راتوں کے منظروں کے ساتھ مختلف نسائی جذبات اور دلی تاثرات کو بحسن و کمال نمایاں کرتے ہوئے صنفِ نازک کی کئی اعلیٰ تصویریں کھینچی گئی تھیں۔ جن میں امید، وفا، محبت، فراق، رشک اور معصومیت کے اعلیٰ ترین تخیل کے بہترین نقوش صفحۂ قرطاس پر نظر آتے تھے۔ چند روحانی تصویریں بھی تھیں۔ ان تصویروں کو دیکھنے کے بعد میری نظر ایک تصویر پر پڑی۔ یہ تصویر ایک خوش نما فیدک میں رکھی تھی۔ میں نے اُسے اُٹھایا اور رافت کی طرف دیکھا۔ اُس کے چہرہ پر اس تصویر کے اٹھانے سے پہلے تو عجیب متذبذب کیفیات نمایاں ہوئیں۔ پھر چند لمحات میں ان کیفیات نے نیا رنگ اختیار کر لیا۔ اُس کے لبوں پر تبسم تھا لیکن مصنوعی۔ آنکھوں سے حسرت و شوق کے جذبات نمایاں تھے۔ چہرہ پر رنج و مسرت کے خفیف آثار ساتھ ساتھ ظاہر ہو رہے تھے۔ مجھے رافت کے اس تغیر پر تعجب ہوا اور تصویر کے دیکھنے کا اشتیاق بڑھ گیا۔ میں نے فیدک سے تصویر نکالی۔ تصویر کے اوپر باریک گلابی ابری کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ میں نے ابری کو ہٹا کر تصویر کو دیکھا۔ تصویر کیا تھی رافت کا شہکار اور مصوری کا اعجاز تھا۔ پہاڑی منظر دکھایا تھا۔ ایک اونچی پہاڑی سے چشمہ نکل کر اُس کے دامن میں بہہ رہا تھا۔ چٹانوں پر سبزہ کا فرش تھا۔ کہیں کہیں جنگلی بوٹیوں کے پھول نظر آ رہے تھے۔ چشمہ کے کنارے ایک درخت لگا تھا۔ اُس کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ آسمان پر گہرے گہرے بادل چھائے تھے۔ چاند کا کچھ حصہ سیاہ بادل کے ٹکڑے میں چھپ گیا تھا۔ چاندنی چھٹکی تھی۔ درخت کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارے پر ایک سرو قد، دبلی، پتلی نوجوان عورت کالی ساڑھی باندھے شفاف رواں پانی میں پاؤں ڈالے ایک پتھر پر عجیب دلفریب انداز سے بیٹھی ہوئی تھی۔ پانی میں ماہتاب کا انعکاس اُس کے قدموں پر لوٹ رہا تھا۔ لمبے لمبے سیاہ بال اُس کے شانوں پر بکھرے تھے

سر کے اوپر سے ساڑھی سرک گئی تھی۔ کتابی چہرہ تھا۔ رخساروں اور لبوں پر ہلکی سرخی دوڑی ہوئی تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے معلوم ہوتے تھے اُس کی نظریں پرندے پر تھیں۔ سیدھا ہاتھ دل پر تھا اور دوسرے ہاتھ کا بازو کہنی سے کچھ اوپر سیدھے ہاتھ کے پنجے سے ملا ہوا تھا۔ تین سبک انگلیاں بائیں رخسارہ پر تھیں اور چھنگلی لبوں کے کونہ پر۔ اور انگوٹھا زنخداں والی ہڈی کے نیچے لگا ہوا تھا۔ زیوارت سے سارا جسم معرا تھا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے۔ لیکن غور کرنے سے اُن میں امید کی ایک ہلکی جھلک نظر آتی تھی۔ آنکھوں سے حسرت اور انتظار کی کیفیات ہویدا تھیں۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی کی یاد میں اُس کا دل تڑپ رہا ہے۔ عجب پرکیف اور موثر سماں دکھایا تھا۔ تصویر کے نیچے عربی خط میں سنہرے حرفوں سے "الفت" بہت خوشخط لکھا ہوا تھا۔

میں بہت دیر تک مبہوت بنا اس تصویر کو دیکھا کیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس وقت جب کہ میں اس طرح تصوّر کے دیکھنے میں مدہوش تھا، رافت کے چہرہ پر کیا کیا اثرات مرتب ہوتے رہے۔ تصویر سے یکبارگی نظر ہٹا کر میں نے رفت سے کہا "الفت کی بجائے فراق کیوں نہ لکھا؟"

رافت نے اپنے چہرہ کو متبسّم بنا کر کہا "پھر بتاؤں گا"

میں نے کہا "بہتر" اور اُس کے اس جواب نے خدا جانے کیا کیا اور خصوصیات پیدا کر دیں کہ میں پھر دوبارہ تصویر کے دیکھنے میں محو ہو گیا۔

"رافت!" میں نے کہا "آپ کا کمال اور ارفع تخیل میری تعریف و توصیف سے مستغنی اور بے نیاز ہے! اُن کی تعریف کرنا آپ کی توہین کرنا ہے۔ مگر مجھے افسوس اور حیرت ہے کہ ایک ایسی یکتا سرمایۂ ناز ہستی اس طرح ایک گوشۂ گمنامی میں اپنی زندگی بسر کرے!"

رافت یہ سُن کر ہنسا اور کہنے لگا "بھائی کیا کہوں مجھے کچھ ایسی ہی زندگی میں سکون اور راحت نصیب ہے دولت حشمت اور جاہ و شہرت کی ہوس انسان کو زندگی کے صحیح نصب العین، حقیقی مقاصد، سچی مسرت اور پاکیزگی سے بہت دور لے جا کر گناہوں اور غموں کے خوفناک غار میں گرا دیتی ہے اور وہ شخص زندگی کی بہترین نعمتوں کو کھو بیٹھتا ہے۔ اکثر اوقات اُس کی زندگی اُس کے لئے ایک ناقابلِ برداشت بار ہو جاتی ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں؟ میری مصوری پر جو آپ نے اظہارِ خیال کیا یہ محض آپ کا حسنِ ظن ہے۔ یہ تصویریں جو آپ نے دیکھیں یہ تو محض مصوری کا ایک بہت معمولی کھیل ہے۔ اصل مصوری اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے!" آخری جملہ کو ختم کر کے اُس نے فوراً روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "خیر چلئے اُس سامنے والی پہاڑی پر چلیں"

میں بغیر کچھ کہے اُس کے ساتھ ہولیا۔ میری نگاہوں میں وہی الفت کی تصویر پھر رہی تھی اور اس میں اس درجہ محویت تھی کہ میں رافت کی گفتگو پر تنقید نہ کرسکا۔ میں سوچ رہا تھا کہ رافت کی زندگی "الفت" کی تصویر کے ساتھ یقیناً کوئی تعلق رکھتی ہے اور یہی اُس کی زندگی کا راز ہے اور اس راز کو معلوم کرنے کے لئے میں بہت بے چین اور مضطرب تھا۔

ہم دونوں باغیچہ سے ہوتے ہوئے چشمہ کے کنارے کنارے چلے۔ چڑھائی پر ہم جارہے تھے۔ آفتاب غروب ہوچکا تھا۔ ماہتاب ضیا باریاں کررہا تھا۔ باغ سے کچھ ہی فاصلہ پر چڑھائی ختم ہوئی۔ ہم لوگ کچھ آگے بڑھے اور تھوڑا فاصلہ طے کرنے پر مجھے ہوبہو وہی الفت کی تصویر والا منظر اور موقع نظر آنے لگا۔ یہ ایک بڑا مسطح مرتفع حصہ سامنے والی پہاڑی ہی کا تھا۔ چشمہ اوپر سے بہہ رہا تھا شفاف پانی کا پیچ در پیچ چٹانوں پر سے چاندنی میں لہرانا اور میدان میں آہستہ آہستہ بہنا بہت بھلا معلوم ہوتا تھا۔ اُس کی روانی میں ماہتاب کا انعکاس شوخیاں دکھا رہا تھا۔ کرنیں مچل رہی تھیں۔ آس پاس کہیں کہیں ڈھاک اور تیندو وغیرہ دشتی درخت محویت کے عالم میں کھڑے نظر آتے تھے۔ جیسا تصویر میں دکھایا تھا اسی طرح ایک درخت چشمہ کے کنارہ لگا تھا اور اُس کے سامنے چشمہ کے دوسرے کنارہ پر ویسا ہی ایک پتھر رکھا تھا۔ البتہ آسمان پر بادل نہیں چھائے تھے۔ نہ درخت کی شاخ پر کوئی پرند بیٹھا تھا۔ اور نہ پتھر کے اوپر کوئی عورت بیٹھی تھی۔ میں وہیں پتھر کے قریب کھڑا ہوگیا۔ میں نے رافت سے کہا "کیا آپ نے الفت کی تصویر اسی مقام پر کھینچی ہے؟

رافت نے جواب دیا "آپ کا خیال درست ہے"۔

"اچھا کچھ دیر اسی چشمہ کے کنارے بیٹھئے"، میں نے کہا۔

رافت نے کہا "مناسب" اور ہم دونوں وہیں بیٹھ گئے۔

"رافت!" میں نے کہا "یہ منظر خود ہی بہت دلفریب اور روح افزا ہے مگر آپ کے قلم کی موشگافیوں نے صفحۂ قرطاس پر اس منظر میں غضب کی شعریت پیدا کردی"۔

رافت بولا "یہ آپ کی ستائش اور قدر افزائی ہے" اور خاموش ہوگیا۔

"رافت!" میں نے اُسے مخاطب کرکے اس طرح سلسلۂ سخن چھیڑا "اُس نام کی تشریح تو کیجئے"۔

"آپ نے فراق نام محض تصویر کے موضوع پر تجویز کیا ہے اور میں نے اُس عورت کے نام پر"،

"کیا اس عورت کا نام ہی الفت ہے؟"

رافت نے اثبات میں جواب دیا۔ میں نے پوچھا " تو کیا یہ تصویر اُس کی زندگی کا ایک رخ بھی ہے"؟
اس نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا " محبت کے موضوع پر ہم دونوں میں کئی دن متواتر گفتگو ہوتی رہی جس قدر آپ کو اس مبحث سے دلچسپی ہے شاید اسی حد تک مجھے بھی ہے۔ اگرچہ دونوں کے نظریوں میں بہت کچھ اختلاف ہے۔ آپ کا یہ فلسفہ کہ محبت کا مقصد، غرض اور غایت صرف محبت ہی ہے اور اس کی ارتقائی معراج محبوب سے بے نیاز ہو جانا ہے، میرے نظریہ کا نقیض ہے۔ آپ کا نظریہ خود غرضی کی تعلیم دے کر محض تخیل کے فریب میں مبتلا کرتا ہے۔ میرے خیال میں محبت صرف محبوب سے ملنے کا وسیلہ اور اُس کی تسلیم و رضا حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور اُس کی دلیل دلی تاثرات مشاہدات اور واقعات ہیں اور آپ کے نظریہ کا ثبوت محض ظنی اور خیالی ہے۔ . . . . . . . "

رافت کی یہ گفتگو میں بہت بے چینی سے سن رہا تھا۔ کیونکہ میں الفت کی زندگی کے حالات سننے کے لئے ہمہ تن شوق بن رہا تھا۔ میں نے پہلے خیال کیا کہ شاید رافت نے الفت کی زندگی کے واقعات بیان کرنے کے سلسلہ میں یہ تمہید شروع کی ہو۔ مگر معاً خیال آیا کہ کہیں وہ میری توجہ کو نفسی اصول کی تحت میں اس مبحث پر منعطف تو نہیں کرنا چاہتا! کیونکہ اس درمیان میں وہ میری فطرت کا بہت کچھ رازدار بن گیا تھا۔ اس لئے میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا کہ " اس نظریہ اور فلسفہ پر تو پھر کبھی مفصل گفتگو ہو گی۔ اس وقت تو آپ الفت کی زندگی پر تبصرہ کیجئے"۔ چونکہ میں اُس کی طبیعت سے خوب واقف اور بے تکلف ہو چکا تھا اس لئے اس طرح استفسار کرنے پر مجھے کچھ تذبذب نہیں ہُوا۔

رافت نے ہنستے ہوئے کہا " آپ کا اشتیاق بہت بڑھ گیا ہے ؟ "

میں نے اُس کا جواب صرف تبسم سے دیا۔ رافت نے اپنی نگاہیں زمین پر جمالیں اور کچھ دیر سوچنے کے بعد اُس نے " اچھا سنئے " کہہ کر اس طرح داستان شروع کی :-

کل شام کو جو شخص چبوترے پر بیٹھا آپ سے باتیں کر رہا تھا اُس کا نام کریم ہے۔ الفت اسی کی بھانجی ہے۔ والدین کے سایۂ عاطفت سے وہ غریب بچپن ہی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی تھی۔ اُس کی پرورش اور تربیت کی تنہا ذمہ دار میری والدہ مرحومہ تھیں۔ الفت کی ماں والدہ صاحبہ سے بہت محبت کرتی تھی۔ اس لئے اُس نے آخری وقت الفت کو والدہ کے سپرد کر دیا تھا۔ الفت کا سارا خاندان غریب کاشتکار پیشہ ہے۔ والدہ مرحومہ ان لوگوں کا بہت خیال رکھتی تھیں اسی وجہ سے یہ خاندان مجھ سے اب بھی بہت محبت کرتا ہے۔ میرے والد ماجد کا انتقال ہو چکا تھا۔ والدہ مرحومہ اس مکان میں رہتی تھیں جو باغیچہ کے شمالی جانب ہے اور جس میں اب کریم رہتا ہے۔ ہاں تو والدہ صاحبہ نے الفت کو بہت شفقت اور محبت سے پالا کیونکہ میرے سوا اُن کی کوئی دوسری اولاد نہ تھی۔ میں اُس زمانہ میں ہمیر پور کے انگریزی مدرسہ میں تعلیم پاتا تھا۔
مدرسہ کی تعلیم کا آخری سال تھا۔ میں سالانہ امتحان دے کر یہاں آیا۔ والدہ صاحبہ علیل تھیں۔ کئی ڈاکٹروں اور

حکیموں کا علاج ہوتا رہا لیکن مشیتِ ایزدی کو منظور ہی کچھ اور تھا۔ چند مہینے کی علالت کے بعد انہوں نے مجھے "خدا حافظ" کہہ کر اِس دارِ فانی سے ہمیشہ کے لئے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اُس وقت میری عمر سولہ سال کی ہوگی اور الفت غالباً بارہ تیرہ برس کی تھی۔

چند اعزہ تعزیت میں آئے تھے انہوں نے بہت کوشش کی کہ میں اُن کے ہمراہ چلوں لیکن میں کسی کے ساتھ نہیں گیا۔ کچھ دنوں کے بعد سب لوگ اپنے اپنے وطن کو چلے گئے اور میں تنہا رہ گیا۔

والدہ صاحبہ کے فراق کا صدمہ کچھ ایسا صدمہ نہ تھا کہ میں اُسے اُس وقت برداشت کر لیتا۔ بیمار ہؤا اور ایسا سخت بیمار کہ زندگی کی کوئی امید نہ تھی۔ شروع میں بخار آیا کیا۔ اُس میں بداحتیاطی سے ہوا لگ گئی۔ پھر کیا! سرسام کا بہت سخت حملہ ہوا۔ یہی لوگ جنہیں آپ میرے "دیہاتی بھائی" کہتے ہیں میرے معالج اور تیماردار تھے۔ لیکن پھر بھی ان بیچاروں کو چوبیس گھنٹوں کی فرصت کہاں! سب سے زیادہ کریم اور اُس کے عزیز میرا خیال رکھتے تھے لیکن ان سب میں صرف ایک الفت کی ذات تھی جو برابر راتوں جاگتی رہتی اور ہر طرح سے میرا خیال رکھتی۔ اول اس کے دل پر والدہ مرحومہ کا صدمہ ہی کیا کم تھا! اس پر میری علالت۔ اور اس وقت اس کی عمر ہی کیا تھی۔ سرسام کی حالت میں تو مجھے اُس کے اس ایثار محبت اور خلوص کا احساس نہ ہو سکا لیکن جب میری طبیعت سنبھلی میں نے دیکھا کہ سوائے دن کے چند گھنٹوں کے جب کہ دوسرے لوگ میرے پاس موجود ہوتے ہیں، وہ دن اور رات میرے ہی پاس گذارتی ہے۔ اُس وقت مجھے احساس ہؤا کہ مرض سے اتنی جلدی افاقہ ہو جانا صرف الفت کی توجہ کا نتیجہ ہے۔ میرا بخار اب بھی نہیں اترا تھا۔ وہ دن رات میں کتنے ہی بار کھانے کو پوچھتی رہتی۔ اور ہر وقت دریافت کرتی رہتی کہ "رافت بھائی کیسی طبیعت ہے؟"

میں نے جب کئی راتوں سے اُسے متواتر جاگتے اور ہر طرح کی تیمارداری کرتے دیکھا تو مجھ سے اُس کی مشقت اور تکلیف برداشت نہ ہو سکی۔ میں نے ایک دن کہا "الفت اب گھر جاؤ۔ میں اچھا ہو گیا" اس جملہ کو سن کر اُس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور کہنے لگی۔ "رافت بھائی! کیا تم مجھ سے خفا ہو گئے۔ میں نے کیا کیا؟" میں نے اُس کی سادگی اور خلوص کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔ "نہیں الفت! بھلا میں تم سے کیوں ناراض ہونے لگا! کتنے ہی دنوں سے تم جاگتے جاگتے تھک گئی ہو اب کچھ دنوں آرام کر لو ورنہ تم خود بیمار ہو جاؤ گی۔" یہ سُن کر اُس کے چہرہ پر مسرت کی جھلک دوڑ گئی۔ اُس نے کہا۔ "نہیں میں تو دن کو ایک دو گھنٹے سو لیتی ہوں۔ اگر میں یہاں سے چلی بھی جاؤں تو مجھے رات بھر نیند نہ آئے گی۔" میں لاجواب ہو گیا۔

وہ بہت مستعدی اور تن دہی سے میری تیمارداری کیا کرتی اور میں دل پر جبر کئے ہوئے اُس کا ممنون ہوتا رہتا۔ خدا خدا کر کے تین ہفتوں کے بعد بخار اُترا لیکن بیماری اور والدہ کے غم کے مارے کمزوری عرصہ دراز تک رفع نہ ہوئی۔ اس

زمانہ میں میری تنہا انیس وغمگسار یہی الفت تھی۔ دیہاتی بھائی بھی صبح شام آکر دیکھ جاتے تھے۔

ایک دن نقاہت اور کمزوری کی حالت میں لیٹا ہوا تھا۔ الفت آئی اور اپنے گھر اور محلہ کے حالات بیان کرتی رہی۔ تذکرۃً اُس نے پوچھا۔ "رافت بھائی! اب تم کہیں جاؤ گے تو نہیں؟"

میں نے کہا "کیوں؟"

وہ بولی "کچھ نہیں۔ میں نے یوں ہی پوچھا"

میں نے کہا "ابھی تک کچھ سوچا نہیں"

اُس نے کہا "بھیّا! تم کہیں جانا نہیں۔ یہیں رہنا"

میری زبان سے بے ساختہ نکل گیا "دیکھا جائے گا"

اِس جملہ کو سُن کر وہ مغموم سی ہو گئی۔ میں نے یہ محسوس کرتے ہوئے تسلی دینے کے لئے مذاقاً کہا "اچھا الفت میں کہیں نہ جاؤں گا۔ لیکن تم بھی کہیں نہ جانا"

پہلے جملہ سے اُس کے چہرے پر بشاشت آگئی لیکن دوسرے جملہ پر وہ کیفیت زائل ہو گئی۔ میں اُس وقت اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔

دو تین مہینوں کے بعد میں بالکل اچھا ہو گیا۔ اب میں پریشان تھا کہ کیا کروں اور کیا نہ کروں۔ دنیا اور اُس کی دلچسپیوں سے میرا دل سرد ہو گیا تھا۔ مجھے نہ کسی چیز کی تمنا تھی نہ آرزو۔ جوش مٹ چکا تھا۔ ولولے سرد ہو گئے تھے البتہ علمی ذوق کچھ باقی تھا لیکن آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا جس سے میں اپنی تعلیم جاری رکھ سکتا۔ اس لئے میں نے تعلیم کا خیال بھی چھوڑ دیا۔

مجھے لڑکپن سے پھولوں، پودوں اور تصویروں سے بہت زیادہ دلچسپی تھی۔ اور میری دلچسپی کو دیکھ کر ہی والدِ مرحوم نے اس باغیچہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ پھلوں کے کتنے ہی درخت انہیں کے لگوائے ہوئے ہیں۔ ترکاریوں کی کاشت کی ابتدا بھی انہیں نے کی تھی۔ میں نے سوچا کہ یہی مشاغل میری زندگی کے لئے کافی ہیں۔

ایک دن میرے سب دیہاتی بھائی میرے پاس آکر جمع ہوئے۔ اُن کی غرض اِس اجتماع سے میرے مستقبل پر روشنی ڈالنے کی تھی۔ بڑی طویل بحث وتمحیص کے بعد سب نے مِل کر مجھ سے کہا کہ "رافت بھائی! تم ہم لوگوں کو چھوڑ کر کہیں نہ جانا۔ اگر کہیں جاؤ گے بھی تو ہم لوگ نہ جانے دیں گے۔ تم یہیں بے فکری سے رہو اور ہم لوگ سب مل کر تمہارا کام کیا کریں گے"

اُن کے اِس خلوص و محبت سے مجھ پر بہت اثر ہوا۔ میں نے کہا " بھائیو! تم لوگ پریشان نہ ہو۔ میں تمہیں چھوڑ کر کہیں نہ جاؤں گا۔ اپنی زندگی اسی باغیچہ میں بسر کروں گا۔"

میرے اِس ارادہ سے سب بہت خوش ہوئے۔ سب نے بہت بہت دعائیں دیں۔ اُس دن سے میں نے مستقلاً یہیں رہنے کا ارادہ کر لیا۔ اور باغ کی ترتیب اور تنظیم بھی اُسی دن سے شروع کر دی۔

الفت میرے اس ارادہ سے بہت فرحان و شاداں تھی۔ باغیچہ کے اکثر انتظامات اور میرے کھانے پکانے کی ذمہ داریاں اُس نے اپنے اوپر خود بخود عائد کر لی تھیں۔

اسی طرح تین سال گذر گئے۔ مصوری کی مشق، چمن بندی، درختوں کی قطع و برید، ترکاریوں کی کاشت اور مطالعۂ کتب میری دلچسپیاں تھیں۔ اس درمیان میں الفت کی بے لوث محبت اور خلوص نے میرے دل پر گہرا نقش کر لیا۔

ایک دن کریم آیا۔ اُس نے مجھ سے تخلیہ میں کہا " رافت بھائی! الفت اب جوان ہوگئی۔ اس کی شادی ہو جانا چاہئے اُس کے چچا نے اپنے چھوٹے لڑکے وزیر کا پیغام دیا ہے۔ تمہاری کیا رائے ہے؟"

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا " تمہارا وزیر کے متعلق کیا خیال ہے؟"

کریم بولا " وزیر بہت اچھا لڑکا ہے۔ چار ہل کی کھیتی کرتا ہے۔ میرے خیال میں الفت کو اس سے اچھا گھر نہیں ملے گا۔"

میں نے پوچھا " اُس کی عمر کیا ہوگی؟"

اُس نے کہا " ستائیس اٹھائیس سال کی۔"

میں نے کہا " الفت کی بھی کسی طرح مرضی معلوم کر لیتے۔"

اُس نے ہنس کر کہا " کہیں دنیا میں ایسی باتیں بھی لڑکیوں سے پوچھی جاتی ہیں۔ شریفوں کے یہاں کہیں ایسا بھی ہوتا ہے؟"

مجھے اُس کی اس سادگی اور شرافت کے معیار پر بہت ہنسی آئی لیکن میں نے ضبط کر کے اُس سے کہا " پھر دوسروں سے رائے لینا بھی بے کار ہے۔"

وہ بولا " دنیا کا یہی طریقہ اور رواج ہے۔ سارے کام کاج بھائی بندوں ہی سے پوچھ کر کئے جاتے ہیں۔"

میں نے اُس کے اس خیال پر کوئی جرح کرنا مناسب نہ سمجھا۔ میں نے کہا " جیسا تمہیں ٹھیک اور مناسب معلوم ہو کرو۔"

اس کے بعد وہ چلا گیا۔ ایک دو ہفتہ کے اندر آئندہ ماہ میں نکاح و رخصت کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

ایک دن الفت میرے پاس بیٹھی تھی۔ میں نے مذاقاً اُس سے کہا " الفت تمہاری شادی پر میں مبارکباد دیتا ہوں

اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چہرہ پر غم کے آثار نمایاں تھے اور وہ خاموش تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے اُس سے دریافت کیا کہ آیا اُسے اپنی شادی کا علم ہے کہ نہیں اور وہ بھی اس رشتہ سے خوش ہے؟

ہر چند کہ وہ مجھ سے بہت بے تکلف تھی۔ لیکن ان معاملات میں اُس نے مجھ سے کوئی مفصل گفتگو نہیں کی۔ کچھ شرم کے جذبات اور غم کی کیفیات اس پر طاری تھیں۔ بہت مبہم لفظوں میں اُس نے مجھ پر ظاہر کیا کہ وہ شادی کرنا نہیں چاہتی۔

میں نے ذرا تفصیل سے اُسے بتایا کہ شادی کی غرض اور ضرورت کیا ہے۔ ازدواجی زندگی کس درجہ دلچسپ اور سکون دہ ہے۔ ایک عورت پر شادی ہونے کے بعد کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہو جاتی ہیں۔ عورت کے کیا کیا فرائض ہیں اور اُن کو کس طرح ادا کرنا چاہیئے اور عورت کو اپنی زندگی خاوند کی زندگی سے کس طرح وابستہ کر دینا چاہیئے۔

وہ میری تمام تقریر خاموشی کے ساتھ سنا کی جب میں خاموش ہوا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ "تم نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟"

میں اُس کے اس سوال پر لاجواب سا ہو گیا۔ کیونکہ میں نے مجردانہ زندگی بسر کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ کچھ دیر سوچ کر میں نے کہا، "الفت تم خوب واقف ہو کہ مجھ پر کیسے کیسے غم و مصیبت کے پہاڑ ٹوٹے۔ اتنا دل و دماغ کہاں تھا کہ میں اپنی شادی کے متعلق کچھ سوچتا۔ دوسرے تم لوگوں کی محبت اور خیال نے مجھے کبھی دوسرے کی ضرورت ہی نہ محسوس ہونے دی۔ آئندہ دیکھا جائے گا۔"

یہ سن کر الفت خاموش ہو گئی۔ میں متعجب تھا کہ اُس نے میری شادی کے متعلق اصرار کیوں نہیں کیا۔ اور نہ میرے جواب پر کوئی نکتہ چینی کی۔ وہ مجھے حسرت و تاسف کے ساتھ جس میں محبت کی رنگ آمیزی تھی دیکھتی رہی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے مجھ سے پھر سوال کیا "بھائی! اگر تم شادی کرو گے تو کس سے؟"

اُس کے اِس سوال پر مجھے بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا "اس بارے میں ابھی کچھ سوچا نہیں۔ تمہیں بتاؤ میں کس سے شادی کروں؟"

وہ میرے اس جواب اور استفسار پر ہنسنے لگی۔ اتفاق سے اُسی وقت اُس کی ممانی بھی وہیں آ گئی۔ الفت نے ممانی کو دیکھ کر مجھ سے کہا "یہ ممانی سے پوچھ لو۔"

اُس کی ممانی نے بہت اشتیاق کے ساتھ مجھ سے پوچھا "رافت بھائی! کیا ہے؟"

میں نے کہا "کچھ نہیں۔ الفت مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میری کس سے شادی ہو گی؟ اس پر میں نے کہا کہ

تمہیں بتادو۔"

وہ بولی "ہاں رافت بھائی! اب تم شادی کرلو تو ہم لوگوں کو بہت خوشی ہو۔"

میں نے ہنس کر کہا "پھر کیا، تمہیں کہیں نسبت لگا کے کرڈالو۔"

وہ ہنسنے لگی اور بولی "بھلا ہم غریب تمہاری نسبت کہاں لگائیں گے۔ تمہاری شادی تو تمہارے خاندان والے ہی کریں گے۔"

الفت خاموش بیٹھی رہی۔ میں نے کہا "نہیں۔ تم لگاؤ تو!"

الفت بیچ میں بول اٹھی "اچھا ہم لگائیں گے۔"

اُس کی ممانی ہنس دی۔ اُس کے بعد دوسری باتیں ہوتی رہیں اور محفل برخاست ہوئی۔

اُسی دن سے الفت کی شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ہر بات میں صلاح و مشورہ مجھ سے لیا جاتا تھا۔ کیونکہ میں شادی کے تمام اخراجات کا کفیل بن گیا تھا اور ہر کام نہایت دلچسپی اور خوشی سے انجام دیتا تھا۔ لیکن میں نے اس درمیان میں الفت کو خوش و خرم نہیں دیکھا۔ میرے پاس وہ روزانہ آتی تھی مگر اُس میں وہ پہلی سی بشاشت نہ تھی خاموش زیادہ رہتی تھی۔ میں حیران تھا کہ کیا بات ہے؟ کئی بار میں نے اس سے وجہ بھی دریافت کی مگر اُس نے کبھی خاطرخواہ دل کا حال نہیں بتایا۔

آخر نکاح کا دن آگیا۔ تمام رسمیں بہت حسن و خوبی کے ساتھ انجام پائیں۔ کھانے وغیرہ کا انتظام اچھا رہا۔ جہیز اگر زیادہ نہ تھا تو ناکافی بھی نہ تھا۔

دوسرے دن اُس کی رخصت تھی۔ میں مکان کے اندر گیا۔ وہ ایک کمرہ میں عروسانہ پوشاک پہنے لیٹی ہوئی تھی۔ میں نے اُسے مخاطب کیا "الفت!"

وہ چہرہ پر دوپٹہ ڈالے ہوئے تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے ہاتھ سے دوپٹہ ہٹا کر کہا "الفت! تم چپ کیوں ہو؟"

اُس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے اور عجیب غمگینی اور شرمندگی کی کیفیات اُس کے نورانی چہرہ پر ہویدا تھیں۔ یہ دیکھ کر اس خیال سے کہ اگر اس حالت کے متعلق کچھ استفسار وغیرہ کیا گیا اور تسلی تشفی دی گئی تو اُس کے جذبات اور بھی برانگیختہ ہوجائیں گے، میں نے گفتگو کا یہ پہلو اختیار کیا "الفت! تمہیں تین چار دن کے بعد ہمیں بلالیں گے۔"

لیکن وہ اِس پر بھی کچھ نہ بولی میں نے پھر کہا۔ "اچھا الفت! سسرال سے کچھ ہمارے لئے لاؤ گی بھی؟"

اس کا بھی اُس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھوں سے آہستہ آہستہ آنسو نکلنے لگے۔

میں نے اس طرح سے کہ گویا اُس کے آنسو دیکھے ہی نہیں اور غم کی حالت کو محسوس ہی نہیں کیا، اس سے کہا "الفت آج تو تم کچھ ناراض سی معلوم ہوتی ہو"

اس جملہ کو سن کر اُس نے ایک ہلکی سی ٹھنڈی سانس لی اور کہا "ہاں بھائی! سچ کہتے ہو۔ میں ہی تو آپ سے ناراض ہونگی"

اُس کا مجھے لفظ "آپ" سے مخاطب کرنا ایک نئی بات تھی میں متحیر تھا کہ اس کی یہ کیا حالت ہے۔ میں نے کہا۔ "ناراض نہیں تو یہ کیا کہ تم مجھ سے باتیں ہی نہیں کرتیں"

اتنے میں کریم نے مجھے آواز دی۔ میں نے الفت سے کہا "خدا تمہیں شادماں رکھے۔ جاؤ سسرال میں خوب ہنسی خوشی سے رہنا سہنا۔ ہم اکثر تمہیں بُلا لیا کریں گے"

اُس نے رو کر کہا "مجھے بھول نہ جانا"

میں نے کہا کیسی باتیں کرتی ہو۔ بھلا تم کو میں بھول جاؤں! ایسا کبھی ہو سکتا ہے؟ اچھا خدا حافظ" یہ کہہ کر میں فوراً باہر چلا آیا۔ اور اُسی دن وہ رخصت ہو کر چلی گئی۔ وزیر کی شباہت دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ اُس کی فطرت سلیم نہیں۔ اس کی روح گناہوں سے ملوث ہے۔ اُس کی سرشت میں بدگمانی اور رشک کوٹ کوٹ کر بھرا ہے۔ غصہ انتقام اور حیوانی جذبات کا پتلا ہے۔

مجھے افسوس ہوا کہ ایک پاکیزہ سیرت معصوم خوبصورت لڑکی لطیف احساسات اور بہترین جذبات رکھنے والی جس کے پہلو میں بے لوث محبت کا نازک آبگینہ ہو ایک بہیمہ صفت، سنگدل اوباش کے سپرد کر دی جائے۔ مگر میں کیا کرتا قضا و قدر کو یہی منظور تھا۔ کریم اور اُس کے تمام عزیزوں کی یہی آرزو اور تمنا تھی۔ میں نے دل کو تسلی دینے کے لئے سوچا کہ خدا کرے میرا قیافہ غلط ہو اور وزیر اُس کے حسن و عادات پر فریفتہ ہو جائے۔ مگر سرنوشت تقدیر کو کون مٹا سکتا ہے۔

الفت چلی گئی لیکن اُس کا خیال میرے دل سے نہیں گیا۔ اُس کی شکل آنکھوں میں پھرا کرتی تھی۔ میں اپنی اس حالت پر بہت متعجب اور پریشان تھا۔

چوتھی کی رسم ادا ہونے کے لئے وہ بلائی گئی۔ میں نے اُس کی آمد کی خوشی میں بہت سامان اور انتظام کیا۔ وہ آئی اُس نے مجھے دیکھا بہت خوش ہوئی۔ میں نے ایک دن اُس سے کہا کہ "خدا کا شکر ہے کہ تم ہنسی خوشی تو آئیں"

۔۔ یہ سُن کر اُس کی ساری خوشی غم میں تبدیل ہوگئی ۔ میں متحیّر رہ گیا ۔ اُس نے کہا " بھائی ! میری اس مسرت و خوشی کے یہ معنی نہیں کہ وہاں بھی اسی طرح خوش تھی ۔ اور نہ یہ وجہ ہے کہ میری شادی ہوگئی ۔ میری شادی ہونے اور یہاں سے چلے جانے کی تو خوشی آپ لوگوں کو ہوئی ۔ آہ ! آپ کو کیا معلوم اور آپ کو معلوم بھی کیسے ہوسکتا ہے ؟ اگر آپ کے پہلو میں بھی ویسا ہی دل ہوتا ۔ جیسا کہ میرے پہلو میں ، تو آپ کو اس کی حقیقت معلوم ہوتی "۔

میں نے کہا " خیر رہتے سہتے دل بہل جائیگا اور طبیعت لگ جائے گی ۔ پھر تو یہاں کا خیال بھی نہ آئے گا "

یہ جملہ اُس سے کہنے کو تو کہہ گیا مگر میں ہی جانتا ہوں کہ مجھے اس جملہ سے بعد کو کس درجہ کوفت ہوئی ۔

اُس نے یہ جملہ سنا اور آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے ۔ تھوڑی دیر میں اُس نے درد بھری آواز میں کہا " رافت بھائی آپ نے مجھے چھیڑ ہی دیا ۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ اپنا غم سُنا کر کسی کو تکلیف دوں اور اسی وجہ سے میں نے اپنے دل کا حال کبھی کسی سے نہیں کہا ۔ جیسا کہ آپ لوگ سمجھتے ہیں مجھے شادی سے خوشی نہیں ہوئی ۔ اور کیوں یہ میں نہیں بتا سکتی ۔ اور بتاؤں کیا ، میں خود نہیں جانتی ۔ میں خوب جانتی ہوں کہ دنیا میں کہیں لڑکیاں گھر میں بیٹھی نہیں رہتیں ۔ مگر میں کیا کروں میرا دل ہی شادی کرنے کو نہیں چاہتا تھا ۔ میں تو آپ کے باغیچہ کے ایک کونہ میں اپنی عمر کاٹنا چاہتی تھی ۔ مگر بدقسمت بے بس کیا کرتی ۔ کس سے دل کا حال کہتی اور کون مانتا ۔ دنیا کی شرم و حیا جان سے لگی تھی ۔ خیر آپ لوگوں کی تو خوشی ہوگئی ۔ میں آپ کی نصیحتوں کو بھولی نہیں ۔ خدا کو منظور رہے تو اپنی انتہائی کوششوں سے بالکل اسی طرح زندگی کے دن بسر کروں گی ۔ اُن کی خدمت اور فرمانبرداری سے کبھی منہ نہ موڑوں گی ۔ کیونکہ یہی خدا کی مرضی اور آپ کی خوشی ہے ۔ ہاں دل پر زور نہیں ۔ جانے کیوں ہوکیں سی اُٹھتی ہیں اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے ہیں ۔ وہاں کے لوگ مجھ پر ہنستے اور انگلیاں اُٹھاتے ہیں ۔ ایک دن میں اپنی قسمت پر رو رہی تھی ۔ رو کنے پر بھی آنسو نہ رکتے تھے کہ وہ آگئے ۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ " تمہاری یہ حالت اچھی نہیں ۔ کس کی محبت میں مر رہی ہو ۔ رو رو کر تم نے نحوست پھیلائی ہے ۔ اب کی جو آنسو نکلے تو مجھ سے بُرا کوئی نہیں ۔ اب کی گھر ہو آؤ پھر دیکھیں تمہیں کون لے جاتا ہے ۔ وہاں کی صورت بھی نہ دکھاؤں گا ۔ اُن کی یہ باتیں سن کر میرے دل پر بہت صدمہ ہوا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئی ۔ آپ کی باتیں یاد آگئیں ۔ میں نے دل کو بہت سنبھالا اور خوش رہنے کی کوشش کرنے لگی ۔ مگر ہائے کمبخت دل پر بس نہیں ، آنسو نکل ہی آتے ہیں ۔ اب اس خیال سے دل میں اور ہوک اٹھتی ہے کہ وہ مجھے پھر یہاں نہ بھیجیں گے "۔

میں نے اُس کی گفتگو پر کوئی تنقید کرنا مناسب نہ سمجھا ۔ کیونکہ میرے دل پر خود اُس کے غم سے بہت صدمہ تھا ۔ میں نے اما ، " تمہیں ڈرانے کو یوں ہی وزیر نے کہہ دیا ہوگا ۔ تم برابر اُس کی فرمانبرداری کرتی رہنا ۔ اور جہاں تک ہو

سکے کوئی بات اُس کی مرضی کے خلاف نہ کرنا۔ اُس کے طعنوں اور سخت کلامی پر دل میں کوئی اثر نہ لینا۔ خاوند کا خوش رکھنا ہی عورت کی سب سے بڑی خوبی اور دین و دنیا دونوں میں فلاح و بہبود کا ذریعہ اور وسیلہ ہے اور خود بھی ہمیشہ خوش رہنے کی کوشش کرتی رہنا۔ ورنہ رو دھو کر تو سب ہی زندگی کے دن بسر کر لیتے ہیں"۔

بہ مشکل تمام اتنا کہہ کر میں اُس کے پاس سے اُٹھ آیا۔ کیونکہ میرا دل خود بھی بھر آیا تھا۔ تین چار روز کے بعد وہ سسرال چلی گئی۔ اُس کے جانے کے بعد میں ایک سال کے لئے مصوری کی تکمیل کرنے باہر چلا گیا۔ باغیچہ کا کاروبار انہیں دیہاتی بھائیوں پر چھوڑ گیا۔

جب میں یہاں واپس آیا۔ میں نے از سرِ نو باغیچہ کی تنظیم کی۔ اور اپنی زندگی کا ایک لائحہ عمل بنا لیا اور اسی معیار کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہوں۔

یہاں آنے پر الفت کی عجیب پُر الم داستان معلوم ہوئی۔ سوءِ اتفاق، جیسا میں نے وزیر کو قیافہ سے جانا تھا وہ ویسا ہی نکلا۔

وہ ایک آوارہ مزاج شخص تھا۔ اُس کی بیوہ بھاوج کو اُس کے مزاج میں بہت دخل تھا۔ گھر کے تمام کاروبار پر وہی متصرف تھی۔ الفت کی کوئی ادا اُن دونوں کے تعلقات پر کارگر نہ ثابت ہوتی۔ بلکہ الٹا یہ اثر ہوا کہ وزیر کو الفت سے نفرت ہوگئی۔ اُس کی بھاوج نے لوگوں کے ذریعہ سے الفت کی خوب برائیاں کرائیں۔ بے بنیاد تہام لگائے پھر کیا تھا۔ وزیر کے ظلم و تعدی کے ہاتھ اُس غریب پر کھل گئے۔ اس معصوم کو سخت سے سخت سزائیں دی جانے لگیں۔ مگر وہ خدا کی بندی سوائے صبر و شکر کے زبان سے اُف بھی نہ نکالتی تھی۔ وزیر نے دن رات میری محبت کے طعنے دینا اور برا بھلا کہنا شروع کیا۔ وہ سنتی اور قسمت کو روتی۔ ڈیڑھ سال ہوگیا لیکن اُس ظالم نے اُسے ایک دن کے لئے بھی یہاں نہ بھیجا۔ اکثر اوقات وہ سنگدل اُس کو سخت سے سخت سزائیں دیتا۔ کئی کئی دن کھانا نہ کھانے دیتا اور اس قدر مارتا کہ وہ بیچاری بیہوش ہو جاتی۔ مگر الفت کو کمال حاصل تھا کہ کبھی زبان سے اُس کی شکایت میں ایک لفظ بھی نہیں نکالا۔

مجھے جب یہ حالات معلوم ہوئے دل کو سخت صدمہ اور قلق ہوا مگر کرتا تو کیا۔ وزیر کے پاس جاتا تو خدا جانے وہ ظالم اُس کا کیا حال کرتا۔ اور کون میری باتیں سنتا اور کہنا مانتا کبھی کبھی میں کریم کو سمجھانے بجھانے کے لئے بھیج دیتا تھا۔ آخر کو کریم سے بھی ضبط نہ ہوا اور دونوں میں شکر رنجی ہوگئی۔

میں اُس کی تکلیفوں کی یاد سے بے چین اور غمگین ادھر اُدھر تڑپتا پھرتا۔ کسی طرح دل کو قرار نہ آتا اور نہ کوئی چارہ کار سمجھ میں آتا۔ اسی غم اور پریشانی میں چھ سات مہینے گذر گئے۔

میرے ایک دوست نے جو قدرتی مناظر کی تصویریں لینے کشمیر جارہے تھے مجھے اپنے ہمراہ چلنے پر مجبور کیا۔ میں نے بھی دل بہلانے کا یہ موقع غنیمت سمجھا اور سفر کی تیاری کر لی۔ اُس دن جب کہ میں یہاں سے روانہ ہو رہا تھا ایک شخص الفت کی سسرال سے آیا اور اُس نے بیان کیا کہ ایک دن شام کے وقت وزیر کی بھاوج نے اُس کو کھانے میں زہر دے دیا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ اُس نے زہر کیوں دیا۔ اس کے اثر سے وزیر دو تین گھنٹے میں تڑپ کر مر گیا اور اُس کی بھاوج ایسی غائب ہوئی کہ پتہ اور نشان نہ ملا۔

میں نے کہا "اچھا ہوا۔ اپنے اعمال کی سزا پائی۔ خس کم جہاں پاک۔"

اُسی وقت میں نے کریم کو بلا کر کہا "اب الفت کو وہاں جا کر لے آنا۔ میں دو تین مہینے میں واپس آؤں گا" اور اُسی دن میں روانہ ہو گیا۔

پُورے تین مہینے کے بعد میں کشمیر سے واپس آیا۔ برسات کا موسم شروع ہو چکا تھا۔ میں اپنی قیام گاہ پر آٹھ بجے رات کو پہنچا۔ سب دیہاتی بھائی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئے میں نے چند جملوں میں اجمالاً سب کی خیریت اور حالات پوچھ کر کریم سے دریافت کیا کہ "الفت آگئی؟"

اُس نے کہا کہ "میں تو جب ہی لوا لایا تھا۔"

میں نے پوچھا "[illegible] کی طبیعت کیسی ہے اور اس وقت کہاں ہے؟"

کریم کی بیوی نے کہا۔ "اب تو اچھی ہے۔ ابھی پہاڑی پر چلی گئی۔"

میرے ساتھ کچھ سامان تھا اُسے کمرہ میں رکھ کر سیدھا پہاڑی پر چلا گیا۔

بادل آسمان پر چھائے تھے۔ چاروں طرف سبزہ ہی سبزہ نظر آتا تھا۔ ماہتاب کے ساتھ ابر کے بچے کھیل رہے تھے۔ میں نے چاروں طرف نظر اٹھا کر دیکھا تو اس پتھر پر جس کے قریب آپ بیٹھے ہیں، الفت اسی انداز سے بیٹھی تھی جیسا کہ میں نے تصویر میں دکھایا ہے۔ اُس وقت کے سمے اور کیفیات کو میں نے امکانی کوشش سے تصویر میں ظاہر کیا ہے۔ میں اُسے اس طرح بیٹھا دیکھ کر سامنے والے درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں چھپتا ہوا دبے پاؤں اُس کے قریب پہنچ گیا۔ لیکن اُسے خبر نہ ہوئی۔ میں بڑی دیر تک اُسے اسی محویت اور استغراق کے عالم میں دیکھا کیا۔

جب میں نے دیکھا کہ اُس کی خود فراموشی اور محویت حد سے گزر گئی ہے۔ میں نے اُس کے قریب جا کر اُسے مخاطب کیا۔ مجھے دیکھ کر اُس کی آنکھوں سے وفورِ مسرت کے مارے آنسو جاری ہو گئے۔ بڑی دیر تک وہ سکتہ کے عالم میں مجھے خاموش دیکھا کی۔ اُس وقت اُس کی آنکھوں کے انداز محبت کے پاکیزہ جذبات کی بہترین تفسیر کر رہے تھے۔

الفت کی وہ نگاہیں میرے دل سے کبھی نہ بھولیں گی۔

میں نے سلسلۂ گفتگو اس طرح شروع کیا "الفت کس کی یاد کر رہی تھیں؟"

اُس نے دلی جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا "کسی کی نہیں!"

میں نے اُس کو چھیڑنے کے لیئے پوچھا "کیا مجھے بھی بھول گئی تھیں؟"

یہ سن کر وہ اپنے جذبات کو زیادہ دیر تک نہ ضبط کر سکی۔ وہ بولی "بھائی! تم بہت دنوں میں آئے ہو ایک ایک دن گن گن کر کاٹتی رہی۔ آج جب دل بہت گھبرایا اس طرف آنکلی پپیہا بول رہا تھا، بادل چھائے ہوئے تھے۔ میں دل بہلانے کے لئے اس پتھر پر بیٹھ گئی۔ اس وقت تمہاری ہی یاد کر رہی تھی . . . . . . "

میں نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا "جب ہی تو میں آگیا"

بڑی دیر تک وہ اپنے غم کی داستان سناتی رہی لیکن شکایت کا ایک حرف بھی اُس کی زبان سے نہ نکلا۔ اس کے بعد ہم دونوں یہاں سے اٹھ گئے۔

الفت اب خوش تھی۔ دن رات وہ میرے باغچہ میں رہتی اور میرے سب کاموں میں حصہ لیتی رہتی۔ ہر وقت اُس پر ایک عجیب محویت کا عالم طاری رہتا تھا۔ اُس زمانہ میں مجھے اچھی طرح احساس اور یقین ہوگیا کہ الفت کو میرے ساتھ بچپن ہی سے بے غرض اور بے لوث محبت تھی۔ اور اسی محبت نے رفتہ رفتہ عشق کا درجہ حاصل کر لیا۔ وزیر کے ساتھ نکاح ہونے سے بہت پہلے وہ میرے سوا دنیا کی ہر شے سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ لیکن اُس وقت مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف نہ ہو سکا۔ میں صرف یہ سمجھتا تھا کہ الفت بہ نسبت دوسرے لوگوں کے مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔ جب میں نے کئی بار اس کی تمام زندگی کا ناقدانہ تجربہ کیا تو اُس کی ہر بات اور زندگی کا ہر پہلو میری ہی محبت سے مملو نظر آیا لیکن اُس نے بذات خود کبھی محبت کا اظہار یا اقرار نہیں کیا۔ مجھے اُس کی اِس نسائی فطرت پر بہت حیرت اور تعجب ہے۔

میں نے ایک بار اُس سے دریافت کیا کہ محبت کسے کہتے ہیں، وہ بولی، دنیا کی تمام خوشیوں کا کسی ایک ذات میں اکٹھا ہو جانا!

میں متحیر رہ گیا کہ اس نے کس درجہ سادگی سے، ایک جملہ میں محبت کی جامع تفسیر کر دی۔ میں نے پھر پوچھا "محبت کیا چاہتی ہے؟"

اُس نے ہنس کر کہا "تمام عمر محبوب کا دیدار"

"میں نے کہا، اس سے نتیجہ؟" وہ بولی "دل کا سکون - زندگی کی راحت!"

میں اُس کے اِن جوابات کو سُن کر محبت کے اعجاز کا قائل ہوگیا کہ ایک غیر تعلیم یافتہ دیہاتی عورت کو محبت نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا"

یہ کہہ کر رافت بولا "یہ تھی مختصر داستان جس کے سننے کے لئے آپ بہت مضطرب تھے"۔

میں اُس کی تمام گفتگو مجسمۂ حیرت وشوق بنا ہوا سنا کیا۔ جب وہ مخاطب ہوا میں نے پوچھا "الفت اب کہاں ہے؟"

رافت نے کہا "ایک مہینہ ہوا اُس کی بڑی بہن آئی ہوئی تھیں - وہ بہت اصرار سے اُسے مجبور کرکے اپنے ہمراہ لے گئی ہیں"۔

میں نے کہا "رافت! الفت واقعی الفت کی دیوی ہے لیکن افسوس کہ اس کی زندگی رنج وغم ہی میں بسر ہوئی - اُسے وہ راحت نہ مل سکی جس کی کہ وہ مستحق ہے"۔

رافت نے غمگین لہجہ میں کہا "مجھے بھی اسی کا صدمہ ہے"۔

میں نے کہا "اب آپ اس سے عقد کیوں نہیں کرلیتے؟"

رافت نے کچھ جواب نہیں دیا۔ میں نے پھر کہا "رافت! اگر آپ ایسا نہ کریں گے تو یہ آپ کی خود غرضی کا سب سے بڑا ثبوت ہوگا۔ کیونکہ یہی ایک ذریعہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی کے باقی ایام سکون وراحت سے بسر کرلے گی۔ ورنہ دنیا والے اُسے کسی طرح چین نہ لینے دیں گے۔ آپ کا اس سے شادی نہ کرنا آپ کی زندگی پر ایک بدنما داغ ہوگا۔ شادی نہ کرنے کے جواز میں آپ بہت سی توجیہات اور مجبوریاں پیش کرسکتے ہیں۔ مگر وہ سب بیکار ہونگی آپ ہی کے نظریہ کے مطابق میں آپ کو مجبور کرتا ہوں کہ آپ ضرور اس سے بہت جلد عقد کرلیں"۔

رافت نے کہا "میں اس مسئلہ پر عرصہ سے غور کررہا ہوں" یہ جملہ ختم کرکے اُس نے روئے سخن بدل کر مجھ سے کہا "دیر ہوگئی اب باغ واپس چلیے"۔ میں نے کہا "بہتر" اور ہم دونوں اُٹھ آئے۔

دوسرے دن میں اُس سے رخصت ہوکر وطن چلا آیا۔ چند مہینوں کے بعد مجھے رافت کا ایک خط ملا جس سے معلوم ہوا کہ رافت کی زندگی الفت کی ہستی کے ساتھ ازدواجی رشتہ میں ہمیشہ کے لئے منسلک ہوگئی۔ ہرچند اس کے تمام عزیز اور احباب نے اُسے بہت مطعون کیا، مگر اُس نے بہت جرات اور ہمت سے کام لے کر ان لوگوں کے حملوں کی کوئی پروا نہیں کی۔

شرفی رضوی

# نوائے راز

مَیں یہ کہتا نہیں کہ ہوں معصُوم
تیری رحمت سے کیوں رہوں محروم!

ہے تغیّر پسند فطرتِ دِل
شاد ہے یہ کبھی، کبھی مغموم

یُوں ہی دنیا کے کام چلتے ہیں
کوئی خادم ہے اور کوئی مخدُوم

جانتا ہوں کہ چند روزہ ہے
قیدِ ہستی میں کیوں رہوں مغموم

چوٹ سی اِک جگر پہ لگتی ہے
یاد آتا ہے جب دلِ مرحوم

طلبِ گُل کا ہے یہی حاصل
ہر خوشی دل سے ہوگئی معدوم

کہہ رہا ہوں میں راز کی باتیں
کوئی سمجھے گا کیا مرا مفہوم

---

آئینہ ہے یہ حسنِ کامل کا
اللہ اللہ مرتبہ دل کا

خلوتِ دل عجیب خلوت ہے
سب کو اس پر گماں ہے محفل کا

آج تجھ کو دکھا دیا اُس نے
میں ہوں ممنون دیدۂ دل کا

پوچھتے کیا ہو، آدمی کیا ہے
اک نمونہ ہے حسنِ کامل کا

بحرِ ہستی میں تیرنے والے!
کچھ پتا بھی ہے تجھ کو ساحل کا؟

خود نمائی ہے راہبر تیری
مِل چکا بس نشان منزل کا!

جب سے دیکھا ہے اُس کو میں نے رازؔ
کچھ عجب حال ہے مرے دل کا

ابوالفاضل رازؔ چاندپوری

# دیوِ خونخوار

سیر و تفریح کی ایک دخانی کشتی قسطنطنیہ سے ہمیں جزیرہ پرنکی پو کے ساحل پر لے آئی اور ہم وہاں اتر پڑے۔ کشتی میں کچھ زیادہ آدمی سوار نہ تھے۔ ایک پولی خاندان کے چار افراد ماں، باپ، اُن کی بیٹی اور اُس کا شوہر اور اُن کے علاوہ ہم دو، بس۔ ہاں مگر جب ہم لکڑی کے اُس پل پر سے گزر رہے تھے جو شاخِ زریں اور قسطنطنیہ کو عبور کرتا ہے تو ایک یونانی جسے نوجوان ہی کہنا چاہئے ہم سے آملا۔ یہ غالباً کوئی مصوّر تھا کیونکہ اُس نے اپنی بغل میں ایک اُس قسم کا بستہ داب رکھا تھا، جیسا مصوروں کے پاس ہوتا ہے۔ بالوں کی لمبی لمبی لٹیں اُس کے کندھوں پر پڑ رہی تھیں اُس کا چہرہ زرد تھا اور اُس کی سیاہ آنکھیں گہرے حلقوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر کے لئے مجھے اُس سے دلچسپی پیدا ہو گئی خصوصاً اس وجہ سے کہ وہ متواضع تھا اور اسے جزیرے کے مقامی حالات کا بھی علم تھا۔ لیکن وہ اتنا باتونی تھا کہ آخر میں تنگ آکر اُس کے پاس سے ہٹ گیا۔

یہ پولی گھرانا بھی نہایت خوش اخلاق واقع ہوا تھا۔ باپ اور ماں دونوں پُر تکلف تھے اور اُن کا داماد وجیہ و شکیل ہونے کے علاوہ ایک سل[illegible] ہوئی اور آزاد طبیعت کا مالک تھا۔ پرنکی پو میں یہ لوگ لڑکی کی خاطر جو کچھ مریض سی معلوم ہوتی تھی گرمیوں کے چند مہینے گزارنے آئے تھے۔ لڑکی حسین تھی مگر اُس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یا تو وہ کسی سخت بیماری سے صحت یاب ہوئی ہے یا کوئی خوفناک مرض اُس کے جسم پر اپنی گرفت مضبوط کر رہا ہے۔ وہ اکثر اپنے شوہر کے بازو کا سہارا لے کر چلتی تھی اور راہ میں عموماً دم لینے کے لئے بیٹھ جاتی تھی۔ اُس کی سرگوشیوں کو بار بار ہلکی ہلکی خشک قسم کی کھانسی منقطع کر دیتی تھی۔ راستے میں اُس کو کھانسی کا دورہ ہوتا تھا تو وہ اور اُس کا شوہر دونوں ٹھہر جاتے تھے۔ وہ اپنی ہمدردانہ تشویش کی نگاہیں اُس پر ڈالتا تھا اور یہ اُس کی طرف ایسی نظروں سے دیکھتی تھی جو کہتی تھیں: "کچھ نہیں، کچھ نہیں، میں اچھی ہوں!" اُن کا یقین صحت اور مسرت میں تھا۔

اُس یونانی کے کہنے پر، جو کشتی سے اُترتے ہی ہم سے جدا ہو گیا ہم نے پہاڑی پر کے ہوٹل میں قیام کا انتظام کر لیا ہوٹل والا کوئی فرانسیسی تھا اور اُس نے عمارت کو آرام و آسائش کے تمام سامانوں سے فرانسیسی طرز پر منظم و مزین کر رکھا تھا ناشتا ہم سب نے اکٹھا ہی کیا اور جب دوپہر کی گرمی ذرا کم ہوئی تب بھی ہم تقریباً ایک ساتھ ہی پہاڑی پر چڑھے اور وہاں سائبیریا کے چیڑوں کے جھنڈ میں بیٹھ کر کوہستان کے پُر فضا نظارہ سے مسرت حاصل کرنے لگے۔ ابھی ہم جگہ

انتخاب کر کے بیٹھے ہی تھے کہ وہ یونانی پھر نمودار ہوا۔ اُس نے ہمیں آہستہ سے سلام کیا، اِدھر اُدھر دیکھا اور پھر ہم سے چند قدم کے فاصلہ پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنا بستہ کھولا اور تصویر بنانے میں مشغول ہوگیا۔

میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ وہ جان بوجھ کر چٹانوں کی جانب پیٹھ کر کے بیٹھا ہے تاکہ ہم اُس کی تصویر کی طرف نہ دیکھ سکیں"۔

نوجوان پول نے کہا "ہمیں اس کی ضرورت بھی کیا ہے، ہمارے سامنے دیکھنے کے لئے بہت کچھ ہے"۔ ذرا ٹھہر کر اُس نے کہا "معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تصویر میں ہمیں بھی شامل کر رہا ہے، اچھا، اسے کرنے دو!"

حقیقت میں ہمارے سامنے دیکھنے کو بہت کچھ تھا۔ پرنکی پو جیسی خوبصورت اور پُرفضا جگہ ساری دنیا میں نہ ہوگی مشہور شہیدِ وطن آئرین نے جو چارلس اعظم کا ہمعصر تھا اپنی جلاوطنی کا ایک مہینہ یہیں گذارا تھا۔ اگر میں ایک مہینے تک یہاں رہ سکتا تو اپنی تمام بقیہ عمر اس مقام کے تصور کی مسرت میں گزار دیتا۔ بلکہ میں اُس ایک دن کو کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے وہاں بسر کیا۔

ہوا ایسی صاف تھی جیسے چمکتا ہوا ہیرا، اور ایسی نرم و خوشگوار کہ انسان کی ساری روح اُس کے ساتھ مل کر مصروفِ پرواز ہو جاتی تھی۔ دائیں طرف سمندر سے پرے ابنٹائی پہاڑوں کی چوٹیاں اپنے بھورے بھورے سر اٹھائے کھڑی تھیں اور بائیں جانب دُور یورپ کے ڈھلوان ساحلوں پر شفق کے بادۂ ارغواں کا [illegible] ہو رہا تھا۔ چاکی، "مجمع الجزائر سلطانیہ" کے نو جزیروں میں سے وہ جزیرہ جو ہماری ہمسائگی میں واقع تھا ایک معصوم خواب کی طرح اپنے سرو و صنوبر کے جنگلوں سمیت آسمان کی پُرامن بلندیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا اور اُس کے سر پر تاج کی طرح ایک عالی شان عمارت تھی جو اُن لوگوں کا مسکن تھی جن کے دل بیمار ہوں۔

بحیرۂ مارمورا کے پانیوں میں سے بلور کے ایک چمکدار ٹکڑے کی طرح رنگ برنگ کی لہریں اٹھتی تھیں۔ دُور پانی دودھ کی طرح سفید تھا، پھر اُس سے ادھر گلابی، دونوں جزیروں کے درمیان نارنگی کی طرح آتشیں اور ہمارے عین نیچے سبزی مائل نیلا جیسے صاف شفاف نیلم ہو اور اُس کے حسن کا پرتو خود اسی میں پڑ رہا تھا۔ اُس کی سطح پر بڑے بڑے جہاز کہیں بھی نظر نہ آتے تھے۔ صرف دو چھوٹی کشتیاں جن پر انگریزی جھنڈے لہرا رہے تھے ساحل کے ساتھ ساتھ اُڑی چلی جا رہی تھیں۔ ان میں سے ایک جو اتنی بڑی تھی جتنی کسی پہرہ دار کی کٹی ہوتی ہے دخانی کشتی تھی، دوسری کو درجن بھر آدمی چپوؤں سے چلا رہے تھے اور جب چپو یک لخت پانی سے اوپر اُٹھتے تھے تو پگھلی ہوئی چاندی کے سے قطرے اُن سے گرتے تھے۔ سادہ لوح مچھلیاں پانی سے باہر سر نکال نکال کر جھانکتی تھیں اور بگلے محراب دار اڑانیں لگاتے ہوئے اُن کے اوپر اوپر

منڈلاتے تھے کبھی کبھی نیلگوں آسمان پر دونوں براعظموں کے درمیان خاموش اور مطمئن عقاب مصروفِ پرواز نظر آتے تھے۔

پہاڑی کی ڈھلوان جس کی چوٹی پر ہم بیٹھے ہوئے تھے تمام کی تمام گلاب کے پھولوں سے ڈھنپی ہوئی تھی اور ہوا اُن کی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ اُس قہوہ خانے سے جو سمندر کے قریب واقع تھا موسیقی کی لہریں صاف ہوا کے ساتھ مل ملا کر ہم تک پہنچتی تھیں اور راستے کی دُوری سے دھیمی ہو ہو جاتی تھیں۔

یہ کیفیت مسحور کن تھی۔ ہم سب خاموش بیٹھے تھے اور اپنی روحوں کو ہم نے اس جنت کی تصویر میں غرق کر رکھا تھا۔ وہ نوجوان لڑکی اپنے سر کو اپنے شوہر کے سینے کا سہارا دیئے گھاس کے مخملیں فرش پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے زرد بیضوی نازک چہرے پر ہلکی سی سرخی نمودار ہوئی اور اُس کی نیلی آنکھوں سے یک لخت آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ یہ دیکھ کر سب کا دل بھر آیا۔ اُس کی ماں کی آنکھیں اشک آلود ہوگئیں اور میرے دل میں بھی درد کی ایک ٹیس اٹھنے لگی۔

لڑکی نے آہستہ سے کہا یہاں روح اور جسم دونوں کو اچھا ہو جانا چاہیئے۔ آہ، یہ جگہ کیسی فرحت خیز ہے"!

لڑکی کے باپ نے کہا "خدا جانتا ہے میرا کوئی دشمن نہیں ہے لیکن اگر کوئی ہو بھی تو یہاں میں اُسے معاف کر دوں"۔

اور پھر سب خاموش ہو گئے۔ ہم پر کچھ عجیب کیفیت طاری تھی۔ ایسی عجیب کہ زبان بھی اُس کے اظہار سے قاصر ہے! ہر ایک اپنے آپ میں مسرت کی ایک دنیا پاتا تھا اور ہر ایک تمام دنیا کو اس دنیائے مسرت میں شریک کر لینے پر آمادہ تھا۔ سب کے دل کی ایک سی کیفیت تھی، اور اسی لئے کوئی ایک بھی دوسرے سے تعرض نہ کرنا چاہتا تھا تقریباً ایک گھنٹے کے بعد اُس یونانی نے اپنا بستہ لپیٹا، ذرا جھک کر ہمیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا ہم وہیں بیٹھے رہے۔ ہم میں سے کسی نے اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کی۔

آخر کئی گھنٹوں کے بعد جب جنوبی منظر کی دوریوں پر تیرہ فام ادامہٹ کی سحر کاری نمایاں ہونے لگی تو لڑکی کی ماں نے کہا کہ اب واپس جانے کا وقت ہے۔ ہم اُٹھے اور بے فکرے بچّوں کی طرح ہلکے اور سبک قدم اٹھاتے ہوئے ہوٹل کی طرف روانہ ہوئے۔ وہاں پہنچ کر ہم ہوٹل کے نفیس برآمدے میں بیٹھ گئے۔

اتنے میں نیچے سے کسی کے لڑنے کی آوازیں آنے لگیں۔ ہمارا یونانی ہوٹل والے سے دست و گریباں ہو رہا تھا، ہم اُن کی لڑائی کا لطف اٹھاتے رہے، مگر یہ تماشا کچھ زیادہ دیر تک نہ رہا۔ ہوٹل والا اب زینہ کو طے کر کے ہماری طرف آرہا تھا اور غصہ میں کہہ رہا تھا "جیسے میرے پاس اور مہمان نہیں ہیں"

جب وہ قریب آپہنچا تو نوجوان پولی نے کہا "ذرا مجھے بھی بتانا یہ شخص کون ہے؟ اس کا نام کیا ہے؟"

ہوٹل والے نے زہر آلود نظروں سے نیچے جھانکتے ہوئے کہا "اس کا نام؟ اس کا نام کوئی بھی نہیں جانتا۔ ہم اسے دیو خونخوار کہا کرتے ہیں"

"یہ مصور ہے نا؟"

"بھلی تجارت ہے!" ہوٹل والے نے کہا "یہ مُردوں کی تصویریں بناتا ہے۔ اُدھر کوئی قسطنطنیہ میں یا یہاں گرد و نواح میں مرا۔ اِدھر اُس کے ہاں مرنے والے کی تصویر مکمل ہوئی۔ یہ اُس کی موت سے پہلے ہی تصویر کھینچنی شروع کر دیتا ہے ـــــ اور اس سے کبھی غلطی نہیں ہوتی ـــــ یہ گدھ ہے گدھ!"

دہشت کے مارے پولی عورت کے منہ سے ایک چیخ نکل گئی۔ اُس کی آغوش میں اُس کی بیٹی سرسوں کے پھول کی طرح زرد اور بےحس و حرکت پڑی تھی۔ اُسے غش آگیا تھا۔

ایک جست میں پولی لڑکے نے سیڑھیوں سے اتر کر یونانی کو جا دبوچا۔ ایک ہاتھ سے اُس نے اُسے قابو کیا اور دوسرے سے اُس کا بستہ چھیننے لگا۔

ہم بھی اُس کے پیچھے اُتر آئے۔ دونوں ریت میں لوٹ رہے تھے۔ بستہ کی تمام چیزیں نکال کر بکھیر دی گئیں ایک ورق پر اُس لڑکی کی تصویر تھی۔ آنکھیں بند تھیں اور ماتھے پر پھولوں کا ایک ہار تھا۔

(نیرودا) منصور احمد

---

# زندگی و عمل

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم
ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من چیستم
موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت
ہستم اگر مے روم
گر نہ روم نیستم

(اقبال)

# ہجومِ جلوہ

اِک جلوہ زارِ حسن تری بارگاہ تھی
چشمِ نظارہ جو مری حیرت پناہ تھی

پہلو میں کوئی چیز تڑپتی تو تھی ضرور
اب جانے دل تھا یا تری برقِ نگاہ تھی

دل میں نہیں ہے نام و نشانِ شکیب و صبر
اُف! کس قدر کسی کی نظر بے پناہ تھی

تاریکیٔ فراق میں عالم تھا نور کا
آنکھوں میں ایک صورتِ زیبائے ماہ تھی

میری جبینِ شوق نے دیکھا نہ اس قدر
کعبہ تھا، دیر تھا کہ کوئی خانقاہ تھی

کچھ اس طرح تھا حسن ترا دل میں جاگزیں
جس جا نظر پڑی وہ تری جلوہ گاہ تھی

تاروں میں ڈھونڈتا تھا کسی کو جنونِ شوق
آوارۂ فلک مری اِک اِک نگاہ تھی

مضطرؔ کا حال کیا کہیں رنجِ فراق سے
آنکھوں میں اشک تھے نہ کوئی لب پہ آہ تھی

رام رتن مضطرؔ

# غزل

یہ وہ فسانہ نہیں جسے ضم کوئی گلستاں کا باب کر دے
اگر لکھو میرا قصۂ غم، تو ختم ساری کتاب کر دے

جہاں تو وقفِ ستم رہا ہے وہاں کی حالت خدا ہی جانے
مجھے یہ ڈر ہے نہ چال تیری نظامِ محشر خراب کر دے

یہ خاک کے بے شمار ذرّے فلک کو حسرت سے تک رہے ہیں
زکوٰۃِ حسنِ ازل سے اُن کو بھی غیرتِ آفتاب کر دے

میں شمع بن کر جلوں تو اچھا ہیں سوزِ غم سے گھلوں تو اچھا
مگر تری بزم میں ستمگر، خدا مجھے باریاب کر دے

مشاہدہ خلق کو کرا دوں کہ پستیوں میں بھی ہے بلندی
مرے ارادوں میں آج مجھ کو اگر خدا کامیاب کر دے

حقیر ہے دیکھنے میں لیکن، کچھ ایسا ویسا نہیں ہے شاکیؔ
اگر وہ شکوے کرے تو دونوں جہان کو لاجواب کر دے

شاکی شاہجہانپوری

# محفلِ ادب

## مرزا غالب کی خود نوشتہ سوانح عمری

جب بھوپال کے سرکاری کتب خانے میں میرزا غالب کے قدیم کلام کا نسخہ ملا تو انجمن ترقیٔ اردو کی جانب سے اُس کی ترتیب وغیرہ کا کام ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم کے سپرد کیا گیا تھا۔ اس کے لئے بہت سی نئی نئی چیزیں جمع کی گئی تھیں۔ منجملہ اُن کے ایک عجیب چیز خود مرزا صاحب کے ہاتھ کے لکھے ہوئے اپنے حالات تھے جو انہوں نے کسی تذکرہ نویس کی فرمائش پر لکھے تھے۔ یہ ورق کہیں سے سید افتخار عالم مرحوم کے ہاتھ لگ گیا تھا اور انہوں نے اپنی عنایت سے مرحوم بجنوری کو بھیج دیا تھا۔ اگرچہ یہ حالات انہوں نے اس طرح لکھے ہیں جیسے کوئی غیر شخص لکھتا ہے، لیکن عبارت کا ڈھنگ صاف بتا رہا ہے کہ اس پردے میں خود مرزا نوشہ باتیں کر رہے ہیں۔ دوسرے ایک دو باتیں جو وہ لکھ گئے ہیں وہ مرزا کے دل کی ہیں وہ دوسرا شخص کہاں لکھ سکتا تھا تیسرے خط اُن کا ہے۔

اسداللہ خاں۔ غالب تخلص۔ عرف مرزا نوشہ قوم کا ترک سلجوقی سلطان برکیارق سلجوقی کی اولاد میں سے اُس کا دادا قوقان بیگ خان شاہِ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی میں آیا۔ پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے بادشاہ کا نوکر ہوا پھاسو کا پرگنہ جواب سمرو کی بیگم کو سرکار سے ملا تھا وہ اُس کی جاداد میں مقرر تھا۔ باپ اسداللہ خاں مذکور کا عبداللہ بیگ خاں دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہا۔ اسداللہ خاں اکبر آباد میں پیدا ہوا۔ سالِ ولادت ۸۔ رجب ۱۲۱۲ھ ہجری بروز یک شنبہ۔ عبداللہ بیگ خاں الور میں راؤ راجہ بختاور سنگھ کا نوکر ہوا اور وہاں ایک لڑائی میں بڑی بہادری سے مارا گیا جس حال میں کہ اسداللہ خاں مذکور پانچ چھ برس کا تھا اُس کا حقیقی چچا نصراللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کا صوبہ دار تھا ۱۸۰۳ء عیسوی میں جب جرنیل لیک صاحب اکبر آباد پر آئے تو نصراللہ بیگ خاں نے شہر سپرد کر دیا اور اطاعت کی۔ جرنیل صاحب نے چار سو سوار کا برگیڈیر کیا اور ایک ہزار سات سو کی تنخواہ مقرر کی۔ پھر جب اُس نے اپنے زورِ بازو سے سونک سونسا دو پرگنے بھرت پور کے قریب ہولکر کے سواروں سے چھین لئے جرنیل صاحب نے وہ دونوں پرگنے بہادر موصوف کو بطریقِ استمرار عطا فرمائے مگر خانِ موصوف جاگیر مقرر ہونے کے دس مہینے کے بعد بمرگِ ناگاہ ہاتھی پر سے گر کر مر گیا، جاگیر سرکار میں

بازیافت ہوئی اور اُس کے عوض نقدی مقرر ہو گئی۔ اور سرکار کو دے دلا کر ساڑھے سات سو روپیہ سال اس شخص کی ذات کو اس زرِ معافی میں سے ملتے ہیں اُس نے شاعری میں بڑا کمال پیدا کیا۔ نہ فقط شعر بلکہ نثر میں بھی دستگاہ رکھتا ہے۔ نثر کی تین کتابیں ہیں۔ پنج آہنگ۔ مہرِ نیمروز دستنبو۔ فارسی نظم کا کلیات دس ہزار بیت کا بالفعل اردو اخبار لکھنؤ میں چھاپا ہوا ہے۔ گورنمنٹ میں اس کی بڑی عزت ہے۔ اشرفیوں کے عوض قصیدۂ مدح نذر دیتا ہے اور سات پارچے جیغہ سرپیچ موتیوں کے مالا خلعت پاتا ہے۔ اب کے بار جو لاہور میں لارڈ صاحب کا دربار ہوا تو موافق سابق کے درباروں کی فہرست کے صاحب کمشنر بہادر حصار نے کہ وریں ولا قائم مقام صاحب کمشنر دہلی بھی ہیں مثل اور رئیسوں کے اور رئیس زادوں کے اس کو بھی خط لکھا۔ بیچارہ بہ سبب تہی دستی اور بے مقدوری کے لاہور نہ جا سکا۔ مجھ سے کہتا تھا ستر برس کا آدمی کانوں سے بہرا ہوں اور اکثر بیمار رہتا ہوں لیکن اگر میرے روپیہ ہوتا تو میں ان عوارض کو نہ مانتا اور بے شک لارڈ صاحب کے دربار میں حاضر ہوتا خیر آخر عمر میں یہ ایک داغ حسرت رہا۔ حق بات کو ظاہر نہ کرنا خدا پرستی اور حق شناسی کے خلاف ہے اُس شخص نے ۱۸۵۵ء کے آخر میں قصیدۂ مدح ملکہ معظمہ ولایت کو بسبیل ڈاک لارڈ ڈالہوزی گورنر سابق کی معرفت بھیجا ہے اور اوائل ۱۸۵۶ء میں تین خط انگریزی بے واسطہ انڈیا گورنمنٹ ولایت سے اس کو ڈاک میں آئے ہیں۔ اب ہم اُن تینوں خطوں کے خلاصے لکھ کر اُس کے ذکر کو ختم کرتے ہیں۔

نجم الدولہ دبیر الملک اسد اللہ خاں بہادر نظام جنگ

"اردو"

---

## باقیاتِ فانی

وہ بے خودی کے پیالے پلا دیئے تو نے
مرے حواس ٹھکانے لگا دیئے تو نے

گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر
تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے

بنا کے ہجر کی راتوں کو بے نیازِ سحر
تعیّنات کے پردے اُٹھا دیئے تو نے

دکھا کے تجزیۂ رنگ و بو کا حسنِ کمال
مشاہدات کے ٹکڑے اُڑا دیئے تو نے

دلوں کو دے کے فریبِ سکونِ بے آرام
تغیرات کے نقشے جما دیئے تو نے

یقینِ عشق کی ہلکی سی لہر دوڑا کر
توہمات کے شعلے بجھا دیئے تو نے

عطائے نعمتِ سوز و گداز کی خاطر | اذیتوں کے خزانے لٹا دیئے تو نے
سرورِ عقل و غمِ عشق کے دوراہے پر | بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا دیئے تو نے
حجابِ نطق کو معجز نوائیاں دے کر | نظر کی آڑ میں جادو جگا دیئے تو نے

جمالِ یار کا افسانہ چھیڑ کر فانی
شعاعِ نور سے دِل جگمگا دیئے تو نے

"طور"

---

## عمل

عملی آدمی کو صرف اُن چیزوں سے دلچسپی ہوتی ہے جن میں تبدیلی کا امکان ہو۔

ذوقِ عمل دو چیزوں سے پیدا ہوتا ہے۔ موجودہ حالات کو بدلنے کی ضرورت سے اور اس قوت کے احساس سے کہ ہم تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

بہت سے واقعات و حالات میں سے اُس سادہ سے مسئلہ کو نکال کر الگ کر لینا جو ضروری ہے، اسی کا نام عمل ہے۔

ہمارے سینوں میں دینے کو بس ایک دل ہے عمل کو اس میں سے جو کچھ دیا جاتا ہے محبت سے وہ چھیننا پڑتا ہے۔

اگر تم کسی عملی آدمی کو خوش کرنا چاہتے ہو تو اُس کے سامنے اُن کاموں کا ذکر نہ کرو جو وہ کر چکا ہے بلکہ اُن کا جو وہ ابھی اور کر سکتا ہے۔

سچا سردار وہ ہے جو اپنے لئے بس وہی کام رکھے جو سوائے اُس کے کوئی اور نہ کر سکے۔

عملی آدمی اپنے بڑے بڑے ارادوں کے متعلق مشکل ہی سے زبان کھولتا ہے۔

"جامعہ"

---

## رازِ الفت

جب نرگس آغوشِ مرگ میں سو گئی تو چشمہ کا آبِ شیریں آبِ شور میں تبدیل ہو گیا۔ اور بن کی دیویاں

قلبِ صحرا سے آہ و بکا کرتی ہوئی نکلیں کہ اپنے غم ربا نغموں سے اُس کے دل کو تسکین دیں۔

اور جب انہوں نے دیکھا کہ چشمہ بجائے آبِ شیریں کے تلخ آنسوؤں سے لبریز ہے تو انہوں نے اپنی زمردیں بالوں کی لٹیں بکھیر دیں اور رقت آمیز لہجہ میں کہا "آہ! نرگس اتنی حسین تھی کہ اُس کے غم میں تمہاری یہ قلبِ ماہیت چنداں تعجب خیز نہیں معلوم ہوتی،

"لیکن کیا نرگس حسین تھی؟" چشمہ نے دریافت کیا

"ہاں ——— اور تم سے زیادہ اس امر کا کسے علم ہو سکتا ہے"؟

بن کی دیویوں نے کہا "ہماری طرف تو اُس کی نگاہِ التفات کبھی بھول کر بھی نہ پڑی۔ البتہ اُس نے تمہاری جستجو کی۔ تمہارے کنارے قیام پذیر ہوئی اور وہ تمہارے ہی شفاف آئینہ میں اپنے حسن کا مشاہدہ کیا کرتی تھی"

"لیکن چشمہ نے کہا" مجھے تو نرگس اس لئے محبوب تھی کہ جب وہ کنارے سے دیکھا کرتی تھی تو مجھے اُس کی آنکھوں کے آئینہ میں اپنا ہی جمال عکس ریز نظر آتا تھا"

(آسکر وائیلڈ) "نیرنگِ خیال"

---

## حقیقی ترقی کیا ہے؟

دنیا ترقی کے لئے کوشاں ہے ہر شخص جد وجہد کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن اُسے نہیں معلوم کہ حقیقی ترقی کیا ہے اور وہ کس طرح حاصل ہوتی ہے۔

حقیقی ترقی مادی ترقی نہیں ہے بلکہ روحانی ترقی ہے اور روحانی ترقی انسان کی تکمیل کا پیام ہے۔ مادی دنیا میں لاکھوں ترقی یافتہ انسان تمہیں نظر آئیں گے۔ لیکن جب اُن کی حقیقت پر تم غور کرو گے تو تمہیں معلوم ہوگا کہ یہ ترقی نہیں کر رہے ہیں بلکہ تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔

ایک مزدور ترقی کرتے کرتے روس کا بادشاہ بن سکتا ہے۔ ایک سائیس ترقی کرتے کرتے ایران کی حکومت کو قبضہ میں لے سکتا ہے ایک معمولی سپاہی بڑھتے بڑھتے ترکی کا پریسیڈنٹ بن سکتا ہے لیکن پھر بھی تم دیکھو گے کہ حقیقی ترقی سے وہ محروم ہے۔

حقیقی ترقی کے لئے قلب کو نورانی شعاعوں سے منور کرو اور اُن شعاعوں سے پوچھو کہ ترقی کیا ہے۔ تمہیں ترقی کا سیدھا راستہ مل جائے گا۔

"دین و دنیا"

# نئی کتابیں

**مسیح کی زندگی** ۔ یہ کتاب مشہور انگریزی تصنیف "ہز لائف" کا سلیس اردو ترجمہ ہے۔ اس میں حضرتِ مسیح علیہ السلام کی مقدس زندگی کے واقعات بہ الفاظِ اناجیل اربعہ لکھے گئے ہیں، اور اناجیل ہدایت و نور کا سرچشمہ ہیں حجم تین سو صفحات سے زائد اور قیمت ۴؍ روپے ہے۔ پادری ایچ ای ایڈرسن صاحب ایم اے سہارن پور سے منگائیے۔

**صراط الحمید** ۔ مولفہ پروفیسر الیاس برنی صاحب ایم اے ایل ایل بی علیگ اڑھائی سو صفحے کی یہ مبسوط کتاب مقاماتِ مقدسہ واقع عراق، شام، فلسطین وحجاز کا سفرنامہ ہے۔ سفر کے تمام ضروری ہدایات، ملک اور شہروں کے حالات مقاماتِ متبرکہ کے عکسی نقشے، زیاراتِ مقدسہ کے انعامات، بیت اللہ کے فتوحات، حج کے احکام و مسائل اور طور وطریق نہایت وضاحت سے اس میں درج ہیں۔ قیمت ۱؍ حاجی مقتدی خاں صاحب شروانی علی گڈھ سے طلب فرمائیے

**پارسی علوم اور اسلام** ۔ مولفہ پروفیسر محمد مسلم صاحب سینٹ کولمباز کالج، ہزاری باغ (بہار) اس کتاب میں ان الزامات کی تردید کی گئی ہے جو عرب فاتحین پر پارسی ادبیات کی غارت گری کے متعلق لگائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ فارسی پر عربی کے اثرات و احسانات کو واضح کیا گیا ہے حجم ساٹھ صفحے اور قیمت بارہ آنے ہے۔ جنابِ مصنف سے مل سکتی ہے

**اسلامی مساوات** ۔ مصنفہ مولوی محمد حفیظ اللہ صاحب پھلواروی اس کتاب میں اسلامی اصولِ جمہوریت کی نہایت اچھی تشریح اور ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم کی نہایت عمدہ تفسیر کی گئی ہے۔ حجم ۸۰ صفحات اور قیمت ۸؍ ہے

**اسلام اور غلامی** ۔ مصنفِ مذکور کی دوسری کتاب ہے جس میں آزادی مساوات اور اخوت کا اسلامی نقطہ نظر پیش کیا گیا ہے حجم ۲۳ صفحے ہے اور قیمت تین آنے۔ دونوں کتابیں مسلم بک ڈپو پھلواری شریف پٹنہ سے ملتی ہیں

**تاریخ ملتان** ۔ مولفہ لالہ بالکشن صاحب بترہ، پلیڈر ملتان۔ شہر ملتان اپنی قدامت کے لحاظ سے ایک خصوصیت رکھتا ہے اور ہندوؤں کا تیرتھ اور مسلمانوں کے اولیا کا مدفن ہونے کے اعتبار سے اسے بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اردو میں یہ پہلی کتاب ہے جس میں یہاں کے واقعات سلسلہ وار درج ہیں۔ تین عکسی تصویریں بھی کتاب کی زینت ہیں۔ مولف موصوف سے طلب فرمائیے۔

**خزینۃ القواعد** ۔ فارسی زبان کی گرامر ہے جسے انگریزی طرز پر لکھنے کی کوشش کی گئی ہے ترجمہ، ضرب الامثال، محاورات اور ان کی تشریح کے ابواب کتاب کا مفید حصہ ہیں۔ آخر میں یونیورسٹی کے پیپر بھی دیے ہیں۔ حجم ۲۳۹ صفحے ہے قیمت درج نہیں ملنے کا پتہ شیخ الٰہی بخش رحیم بخش صاحبان تاجران کتب، گجرات (پنجاب)

**شعر و شاعری عصرِ جدیدِ ایران** - آقا سید محمد علی صاحب پروفیسر نظام کالج حیدرآباد دکن کی دلکش تقریر ہے جو انہوں نے ایران کے عصرِ جدید کی شاعری کے خصوصیات و تبدیلات بیان کرتے ہوئے شعبۂ جامعہ معارف کے سامنے کی حجم ۳۲ صفحے ہے - قیمت درج نہیں۔

**اقبال و شعرِ فارسی** - پروفیسر موصوف کا دوسرا لیکچر ہے جس میں انہوں نے علامہ اقبال کی فارسی شاعری سے ایرانیوں کو روشناس کرایا ہے۔ یہ رسالہ اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، پیامِ مشرق اور زبورِ عجم پر ایک فاضلانہ تبصرہ ہے حجم ۴۸ صفحے۔ دونوں کتابیں جناب پروفیسر سے طلب فرمائیے۔

**سرودِ بیستاں** - مصنفہ جناب رشید احمد صاحب صدیقی (علیگ) مسلم یونیورسٹی علی گڈھ حجم ۷۲ صفحے اس کتاب کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں اردو شعر و شاعری پر ایک نظر ڈالی ہے اور شعر کے بلند معیار کو بہت اچھی طرح واضح کیا ہے - دوسرا حصہ دیوانِ فانی کی تنقید میں ہے - اس میں جناب فانی کے کلام کو لطافتِ زبان اور نزاکتِ بیان کے اعتبار سے غالب کی ارتقا یافتہ شکل ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے - لیکن ہم اس معاملہ میں جنابِ مصنف کے متفق نہیں ہو سکے۔

**مجموعہ قصائد مومن** - مرتبہ ضیا احمد صاحب ایم، اے بدایونی - اس مجموعہ میں ہندوستان کے مشہور نازک خیال حکیم مومن خاں مومن دہلوی کے اردو قصائد درج کئے گئے ہیں - قابل مرتب نے مقدمہ اور حواشی میں اچھے اچھے نکات پیدا کئے ہیں حجم ۱۰۲ صفحے اور قیمت ۱۲ر ہے - الناظر پریس لکھنؤ سے طلب فرمائیے۔

**دیوانِ ولایت، پنجرقعۂ ولایت اور ملتقط نگارش عاری** } یہ تینوں کتابیں ایک بزرگ کی ہیں جن کی ساری عمر زبانِ فارسی میں کمال حاصل کرنے میں صرف ہوئی یہ وہی ولایت ہیں جنہوں نے ارادت ایرانی کے پنجرقعہ کا جواب لکھ کر غالب کے پاس بغرض اصلاح بھیجا تھا - غالب نے کہا تھا کہ "خوشامد فقیر کا شیوہ نہیں، تمہاری تحریر پنجرقعۂ سابق سے کہیں بہتر ہے اصلاح کی مطلق گنجائش نہیں - موجد سے مقلد بہتر نکلا یعنی تم نے خوب لکھا، ع نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول" پنجرقعہ کے آخر میں فاضل مصنف کے مختصر حالات بھی درج ہیں تینوں کتابوں کی قیمت علی الترتیب عہ - ۸ر اور ۱۲ر ہے ملنے کا پتہ سید اشرف علی صاحب ڈپٹی کلکٹر، گورکھپور

**مسدسِ کریما** - ادب و اخلاق کی کتابوں میں یہ کتاب مقبولِ عام ہے اور مولانا سعدی علیہ الرحمۃ سے منسوب کی جاتی ہے - جناب الٰہی بخش صاحب ناصر محلہ کرار خاں شہر جالندھر نے ہندوستانی بچوں کی سہولت کے لئے نظم و نثر میں اس کا ترجمہ کیا ہے - ہمارے خیال میں نثر کافی تھی نظم تکلف ہے قیمت چار آنے مقرر کی گئی ہے ۔

# فہرست مضامین

جلد ۱۴     بابت ماہ دسمبر ۱۹۲۸ء     نمبر ۶

تصویر:- زینۂ زرّیں


| نمبر شمار | مضمون | صاحب مضمون | صفحہ |
|---|---|---|---|
| ۱ | آپ اور ہم | | ۸۶۶ |
| ۲ | سالگرہ نمبر | مینجر | ۸۶۷ |
| ۳ | جہاں نما | | ۸۶۸ |
| ۴ | طلوعِ سحر (نظم) | منصور احمد | ۸۷۲ |
| | تصویر:- زینۂ زرّیں | | |
| ۵ | فنِ تقریر | جناب مولوی ابوسعید محمد عبدالقیوم صاحب بنگلوری | ۸۷۳ |
| ۶ | رباعیات | جناب ضامن حسین صاحب گویا جہان آبادی | ۸۸۴ |
| ۷ | دمینتی | جناب فضل محمد صاحب جگرانوی | ۸۸۵ |
| ۸ | غم نصیب (نظم) | جناب سیّد علی اختر صاحب | ۸۸۹ |
| ۹ | شہرِ بابل | جناب مولانا محمد حامد صاحب دہلوی | ۸۹۰ |
| ۱۰ | جستجوئے محبت (نظم) | جناب روشن صدیقی | ۸۹۲ |
| ۱۱ | ہندوستان اور فرانس | فلک پیما | ۸۹۴ |
| ۱۲ | خیال اور تعمیر حیات | جناب عاشق حسین صاحب بٹالوی بی، اے | ۸۹۸ |
| ۱۳ | تجلیات (نظم) | جناب مولانا جلال الدین صاحب اکبر بی اے آنرز | ۹۰۱ |
| ۱۴ | چپ کی داد (ڈراما) | جناب محمد عمر نور الٰہی صاحبان | ۹۰۲ |
| ۱۵ | وجدانیات (نظم) | جناب سید عابد علی صاحب عابد بی اے۔ ایل ایل بی | ۹۱۲ |
| ۱۶ | راتوں کو ( " ) | بل | ۹۱۳ |
| ۱۷ | محبت کی دنیا (افسانہ) | جناب شیخ علاؤالدین صاحب | ۹۱۴ |
| ۱۸ | ایک بچھڑی ہوئی بہن کی یاد میں (نظم) | جناب محترمہ ع۔ب صاحبہ | ۹۲۵ |
| ۱۹ | سنہ ۱۸۷۲ء کی ہندی | جناب پنڈت دینا ناتھ صاحب راجانک | ۹۲۶ |
| ۲۰ | فرید (افسانہ) | منصور احمد | ۹۲۷ |
| ۲۱ | محفلِ ادب | | ۹۳۲ |
| ۲۲ | نئی کتابیں | | ۹۳۶ |

# آپ اور ہم

یہ سال کا آخری نمبر ہے، اور اس کی اشاعت کے ساتھ ہمایوں اپنی عمر کی سات منزلیں طے کر رہا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمایوں کے بلند مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اس سال بھی کامیاب و کامران رہے ہیں، اپنی استعداد کے مطابق ہم نے جتنی کوششیں بھی کی ہیں وہ بنظرِ استحسان دیکھی گئی ہیں۔

اس وقت ملک کے بعض رسائل کا ہر پرچہ ہر مہینے کئی ایک بلند بانگ دعاوی لے کر نکلتا ہے اور اس میں شک نہیں کہ اپنے دعاوی کی کسی حد تک پاسداری میں وہ ترقی کی دوڑ میں بھی چند قدم حاصل کر لیتا ہے، لیکن اس کے برخلاف ہمایوں اپنے معاونین کو کبھی کوئی ایسی امید یا توقع نہیں دلانا چاہتا جس کو بعد میں پورا نہ کر کے اُسے شرمسار ہونا پڑے۔ وہ ہمیشہ اپنی کوششوں کا کم از کم اندازہ کرتا ہے۔ ہمایوں کے سرورق کے آخری صفحے پر آپ نے اکثر یہ فقرہ ملاحظہ کیا ہو گا کہ

"ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتر صفحے ماہوار اور ۸۶۴ صفحے سالانہ ہوتی ہے"

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہمایوں نے اپنی موعودہ ضخامت کے ۸۶۴ صفحے نومبر ہی میں پورے کر لئے تھے۔ اس لئے اگر بہتر صفحے کے حساب سے دیکھا جائے تو ہمایوں نے سال بھر میں بارہ کی بجائے تیرہ پرچے دیئے۔

اپنی اعانت کو جاری رکھتے ہوئے ہماری مساعی کی جو قدر افزائی آپ نے کی ہے اُس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہیں اور وہ ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم آئندہ رسالہ کو بہتر بنانے کے لئے ہر ممکن تدبیر کو عمل میں لائیں، لیکن اِن تدابیر کو قابلِ عمل بنانے کے لئے ہم محسوس کرتے ہیں کہ آپ کی مدد کی اشد ضرورت ہے۔ یہ وہی مدد ہے جس کا مطالبہ ہم کئی بار آپ سے کر چکے ہیں۔ یعنی توسیعِ اشاعت کے لئے کوشش۔ اس معاملہ میں ہم اُن حضرات کے ممنون ہیں جنہوں نے ہماری گزشتہ سال کی اپیل پر توجہ فرمائی اور اُس وقت سے لے کر اب تک اس توجہ کو ہمارے شاملِ حال رکھا۔ لیکن کیا ہمارے مخاطب یہی چند نیک دل اصحاب تھے؟ نہیں! ہم تو آپ سب سے اپنی کوششوں کی عملی داد لینا چاہتے تھے۔ پھر کیا اب ہم امید کریں کہ آپ ترقی و توسیعِ ہمایوں کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ مبذول فرمائیں گے؟

# سالگرہ نمبر

ہمایوں کا آئندہ پرچہ سالگرہ نمبر ہوگا اور ہماری رائے میں ہمایوں کے تمام سابقہ خاص نمبروں سے زیادہ مفید زیادہ دلکش اور زیادہ دلچسپ ہوگا۔ اس کا حجم ڈیڑھ سو صفحات سے زائد تجویز کیا گیا ہے اور ان صفحات کے لئے ملک کے بلند پایہ اور مشہور ادبا و فضلا کی نظم و نثر کے تازہ ترین اور بہترین مضامین حاصل کئے گئے ہیں۔ تصاویر کا اہتمام وانتخاب نہایت محنت اور صرفِ کثیر سے کیا گیا ہے۔ تمام کی تمام تصویریں دنیا کے مشہور و مقبول مصوروں کے شاہکار ہوں گی اور حسبِ معمول تمام خیالی تصاویر کے ساتھ نظمیں ہوں گی۔ گویا مصوّر اور شاعر کے احساساتِ لطیف کے دو آئینے ہوں گے جن کی کرشمہ زائیاں ایک دوسرے میں منعکس نظر آئیں گی۔

علمی مضامین میں مذہب اور سائنس کی دیرینہ کشمکش اور بالآخر اُن کے ملاپ پر ایک نئے انداز اور نئی قسم کا مضمون ہوگا جس میں رُوح اور روحانیت کے مسائل پر ایک بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے۔

ہمایوں کے فلک پیما نامہ نگارِ خصوصی کے شوخ و شگفتہ قلم سے ایک ڈرا ماہوگا جس کا انوکھا پن اور نکتہ طرازی قابل دید ہونگے۔

اس کے علاوہ تین مختلف النوع تاریخی وادبی دلچسپ افسانے ہونگے جنہیں آپ کئی کئی بار پڑھنا چاہیں گے۔

صاحبِ "مبادیٔ سیاسیات" کے قلم سے ایک تاریخی سیاسی مضمون ہوگا جس میں ایک نوزائیدہ اسلامی سلطنت کے سیاسیات اور حالات لکھے ہیں۔

ہندوستان کے ایک فطرت نگار عالم کے قلم سے ایک خیالی سیرت کا خاکہ ہوگا جس کا ایک ایک فقرہ آپ کے دل میں پیوست ہوتا چلا جائے گا۔

ایک شہرۂ آفاق مغربی شاعر کے متعلق ایک مضمون ہوگا جس میں اُس کے مختصر حالات، اُس کے کلام کی تنقید اور اُس کے اشعار کے نظم و نثر میں نمونے دیئے جائیں گے۔

"جدید خیال" کا ایک مفصل و مبسوط مضمون ہوگا جو ارادوں میں عزم اور فیصلوں میں قوت پیدا کرے گا۔

ایک نادر فلسفیانہ مضمون ہوگا جسے ہمارے ایک خاص مقالہ نگار نے لکھا ہے۔

دوسرے عالی پایہ مضامین، دل افروز نظمیں اور خوبصورت یک رنگی و سہ رنگی تصاویر بھی قابلِ دید ہوں گی۔

یہ نمبر کثیر تعداد میں چھپوایا جارہا ہے لیکن پھر بھی آپ اپنے دوستوں کے لئے یہ تحفہ حاصل کرلینے کا جلد انتظام کیجیے۔ اس کی قیمت ایک روپیہ ہوگی۔ سالانہ خریداروں سے چندہ بہ دستور سابق صرف پانچ روپے علاوہ محصول لیا جائے گا جس میں یہ بے نظیر پرچہ بھی شامل ہوگا۔

مینجر

# جہاں نما

## ترکی کی نسوانی تحریک

اسلامی دنیا کی نگاہیں اس وقت ترکی کی طرف لگ رہی ہیں جو مغرب کے معیار ترقی پر پورا اُترنے اور دور حاضر کے ترقی یافتہ وسائل سے مستفید ہونے کے اعتبار سے ایشیائی حکومتوں کا سرتاج سمجھا جاتا ہے۔ افغانستان اور ایران پوری سرگرمی اور مستعدی کے ساتھ ترکی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ ایشیا کی اس انقلابی تحریک کا سب سے نمایاں پہلو نسوانی تحریک ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز انقلاب نہیں ہے کہ وہی قومیں جو صدیوں سے اپنی عورتوں کو چار دیواری میں بند رکھنے اور اُن کی زندگی کے مشاغل کو پُراسرار بنانے کی خوگر تھیں۔ آج انہیں مردوں کے دوش بدوش دنیا کی جدوجہد سے عہدہ برآ ہونے کی تعلیم دے رہی ہیں تاکہ اُن کا وجود ملک اور ملت کے لئے زیادہ مفید ثابت ہو۔

"انٹرنیشنل ریویو آف مشنس" میں ایک مغربی خاتون کا جسے ٹرکی میں قیام کئے ہوئے ایک عرصہ گذر چکا ہے ترکی کی نسوانی تحریک کے متعلق ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے جس کا حسب ذیل اقتباس قارئین کرام کی ضیافت طبع کے لئے درج کیا جاتا ہے۔

"قسطنطنیہ میں عورتوں نے نسوانی حقوق کے تحفظ کی غرض سے ایک خاص انجمن قائم کی ہے جس کا نام "انجمن تحفظ حقوق نسوان" ہے پچھلے دنوں ترکی کی روشن خیال اور بیدار مغز خواتین کا ایک وفد انگورہ پہنچا اور اُس نے اپنے حقوق کے متعلق مجوزہ اصلاحات کا پروگرام اس معقولیت اور استقلال کے ساتھ پیش کیا کہ حکومت کے لئے اسے منظور کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا۔

"اس کے علاوہ خود حکومت یہ چاہتی ہے کہ عورتیں پردہ کی قید سے آزاد ہوکر مردوں سے سوشل تعلقات پیدا کریں۔ ٹریم کشتی اور دیگر پبلک مقامات میں "حرم کا پردہ" ہٹا دیا گیا ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں اکثر عورتیں چارشف کے بجائے مغربی طرز کا ایک ہلکا سا نقاب استعمال کرتی ہیں جو کبھی چہرہ پر نہیں ڈالا جاتا بلکہ سر کے گرد لپیٹ لیا جاتا ہے۔ بعض خواتین ہیٹ زیب سر کرتی ہیں۔ مگر ٹرکی کے اندرونی قصبات میں معاشرتی تغیرات کی رفتار مدھم نظر آتی ہے۔ یہاں جدید اصلاحات کا انحصار زیادہ تر مقامی حالات پر ہے۔ نئی تعلیم ترکی کی نسوانی اور خانگی زندگی پر ایک خاص اثر ڈال رہی ہے۔ عورتیں خانہ داری کے متعلق یورپین مصنفوں کی کتابوں اور رسالوں کو بڑے شوق سے پڑھتی ہیں۔ ترکی خواتین

کے لئے یہ امر قابلِ ستائش ہے کہ انہوں نے کسی قسم کی بے اعتدالی کے بغیر وقار اور سرگرمی کے ساتھ اپنی حالت میں تغیر پیدا کرنے کی اہلیت کا ثبوت دیا ہے۔ بہت سی عورتوں کے دلوں میں ملکی خدمت کا جذبہ موجزن ہے۔ وہ ملک کے لئے اپنی ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے کوئی خاص خدمت انجام دینا چاہتی ہیں۔ عورتوں کی فلاح و بہبود کے متعلق ان کی کئی انجمنیں ہیں جو بہت مفید کام کر رہی ہیں۔ انجمن ہلالِ احمر اپنی صنعتی تحریک کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا چاہتی ہے۔ وہ غریب لڑکیوں کو قدیم ترکی سوزن کاری کی تعلیم دے رہی ہے جو خوبصورتی اور نفاست کے لئے مشہور ہے۔ انجمنِ ہلالِ اخضر نے جو زیادہ تر عورتوں پر مشتمل ہے انسدادِ مسکرات کا بیڑا اُٹھا رکھا ہے۔ اسی طرح کئی اور نسوانی انجمنیں ہیں جنہوں نے یتیم بچوں کی غور و پرداخت اور اُن کی پرورش کا فرض اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔

"نسوانی تحریک کی نشو و نما کا حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ ترکی عورتیں تعلیم کے معاملہ میں خاص دلچسپی لے رہی ہیں۔ حکومت نے یہ دیکھ کر کہ لڑکیوں کے لئے تحتانی مدارس کی تعداد کافی نہیں ہے نارمل سکولوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا ہے۔ طریقۂ تعلیم میں بھی اصلاح کر دی گئی ہے۔ ان مدارس کی طالبات کو کوئی فیس نہیں دینی پڑتی لیکن اس رعایت کے معاوضہ میں فارغ التحصیل طالبات کو چند سال کے لئے سرکاری ملازمت کا پابند ہونا پڑتا ہے۔

حکومت نے گذشتہ تین سال سے استنبول کے نارمل سکول کے لئے ایک امریکن اُستانی کی خدمات حاصل کر رکھی ہیں۔ یہ استانی ترکی لڑکیوں کو خانہ داری کی تعلیم دیتی ہے جو ترکی میں ایک نیا اور اہم مضمون ہے۔ استنبول کی یونیورسٹی نے جس کے نظام کی باگ بالکل ترکی ہاتھوں میں ہے۔ ترکی لڑکیوں کے لئے باقاعدہ جماعتیں کھول دی ہیں۔ طب اور قانون کی علمی شاخوں سے اُسے خاص شغف ہے۔ طبی مدرسہ کے رجسٹر میں چار سو پچاس طالبات کا نام درج ہے۔ جن میں سے تیس اس سال فارغ التحصیل ہو چکی ہیں ملک کے اندرونی قصبات میں طبی گریجوایٹوں کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ بعض ترکی لڑکیاں طب کا مزید علم حاصل کرنے کے لئے یورپ اور امریکا کو روانہ ہو گئی ہیں۔ ان میں چند ایسی بھی ہیں جنہوں نے مغربی ممالک میں اپنی تقریروں سے خراجِ تحسین وصول کیا ہے۔

"ترکی میں لڑکیوں کی جسمانی تربیت کے لئے بھی بہت سی جماعتیں کھول دی گئی ہیں۔ مدرسوں اور یتیم خانوں میں محکمۂ حفظانِ صحت کی طرف سے جسمانی تربیت کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا ہے۔ تعلیم کا یہ جدید شعبہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا ہے کہ وزیرِ تعلیم نے سرکاری نارمل مدارس میں لڑکے اور لڑکیوں کی جسمانی نشو و نما کے لئے سویڈش استاد مقرر کئے ہیں جو اس فن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں۔"

# جمہوریۂ چین کا جدید دستور

جمہوریہ چین کے جدید دستور کے متعلق جو اطلاعات اِس وقت تک موصول ہوئی ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ چین کی قومی حکومت حکمرانی کے اختیارات اور فوج کی اعلیٰ کمان کی باگ اپنے ہاتھ میں رکھے گی۔ حکومت پانچ "یوان" (مجالس) یعنی منتظمہ، مقننہ، عدلیہ، ممتحنہ اور ناظرہ پر مشتمل ہوگی۔ جمہوریہ کا ایک صدر ہوگا جو حکومت کا اصلی نمایندہ اور فوج کا سپہ سالار ہوگا۔

بارہ سے سولہ تک مشیرانِ حکومت ہونگے۔ جن میں سے پانچ "یوان" کے صدر اور نائب صدر مقرر کئے جائیں گے مجلسِ منتظمہ کی حیثیت سب سے اعلیٰ ہوگی یہی جمعیت وزرا اور کسی مجوزہ قانون کا فیصلہ کرنے کے لئے کمیشن مقرر کرے گی۔ ہر قانون مجلسِ مقننہ میں پیش کیا جائے گا۔ یہ جماعت علاوہ قانون کے ملکی بجٹ، امن کے مسائل اور جنگ کے معاہدات وغیرہ کی ذمہ دار ہوگی۔ عدلیہ عدالتی انتظام کی ذمہ دار ہوگی۔ ممتحنہ امتحانات کی نگرانی اور سرکاری خدمت کے لئے ضروری قابلیت کا فیصلہ کرے گی۔ ہر شخص کو سرکاری خدمت کے لئے امتحان دینا پڑے گا۔ مجلسِ ناظرہ احتساب اور حساب کی پڑتال کے فرائض انجام دے گی۔

# جدید اٹلی کا بانی

ڈاکٹر فونس پریذیڈنٹ براؤن یونیورسٹی نے اپنی ایک تقریر کے دوران میں جدید اٹلی کے متعلق مسولینی کا ذکر کرتے ہوئے کہا: "تمہارا جی چاہے تو تم مسولینی کو جابر اور ظالم کہہ سکتے ہو۔ میرے خیال میں بھی وہ جابر ہے لیکن اُس نے اپنی قوم کی روح کو ایسا بدل دیا ہے کہ اطالوی ایک مرتبہ پھر اپنے آپ کو اُس قدیم اور باجبروت رومن قوم کا جانشین کہہ سکتے ہیں جس کے یہ اخلاف ہیں۔

"آج سے بارہ سال پہلے اگر ہم اٹلی کی سرزمین میں داخل ہوتے تو ہمیں ایسے حسین اور بااخلاق لوگوں سے سابقہ پڑتا جو آسمان تلے سورج کی روشنی میں کسی نظام کے پابند نہ تھے۔ موسیقی اور نقاشی اُن کا بہترین مشغلہ تھا اور وہ اپنے وقت کا بیشتر حصہ اپنے شاندار ماضی کی داستان بیان کرنے یا سننے میں صرف کرتے تھے۔ مگر اب مسولینی نے ان کو ایک ایسی شے دی ہے جس سے وہ صدیوں سے ناآشنا تھے۔ یہ وہ شے ہے جس نے روما کو رفعت و عظمت کے بام تک پہنچایا۔ اُس نے اپنے شدید ضابطہ، بے رحمانہ ضبطِ نفس، قانون کی پابندی اور اپنے جبر و ستم کی بدولت (اگر تم اسے جبر و ستم ہی کہنا چاہتے ہو) اطالوی قوم سے ہر ایسے شخص کو ملک بدر کر دیا ہے جو محض عیش و عشرت کا دلدادہ ہے اور جو اپنے مفاد کو ملک کے

مفاد پر مقدم سمجھتا ہے۔ اُس نے ضابطہ اور آئین کی شدید پابندی کے عمل سے اٹلی کے اُن باشندوں میں قوتِ عمل کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیا ہے جنہوں نے مسرت اور راحت کی زندگی بسر کرنا اپنی زندگی کا مقصدِ وحید قرار دے رکھا تھا۔ اُس نے مذکورہ بالا عمل سے اٹلی میں حقیقی مسرت اعتماد اور غیر فانی امید کے جذبات کی لہریں ازسرِنو پیدا کر دی ہیں۔ اٹلی نے ایک اعلیٰ نصب العین کے حصول کی خاطر صدیوں کی غفلت اور کمزوری کی نیند سے بیدار ہو کر ایک ایسی وادی میں قدم رکھا ہے جہاں خوشی کے پھول اپنی بہار دکھاتے ہیں۔

## امریکا کا ایک سفری مدرسہ

پروفیسر ڈاکٹر جی۔ ایس کرشنیا نے ٹسکیگی (امریکا) میں زراعت اور اقتصادیات کے ایک سفری مدرسہ کے حالات لکھے ہیں جس کے پرنسپل امریکا کے مشہور قوم پرست حبشی مسٹر بوکر ٹی واشنگٹن ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ مسٹر موصوف نے امریکا کی حبشی آبادی کے مستقبل کے متعلق ایک موقع پر کہا "ہم جس قدر محنت اور مشقت سے کام کرنا اپنے لئے باعثِ عزت سمجھیں گے اور زندگی کے روزانہ مشاغل میں دماغی طاقت اور چابکدستی سے کام لیں گے اسی قدر خوشحالی کی منزلِ مقصود کے نزدیک پہنچیں گے" اسی نصب العین کو مدنظر رکھ کر مسٹر واشنگٹن نے ایک بہت بڑا انسٹیٹیوٹ قائم کیا جس کا یہ مقصد تھا کہ حبشی کسان اور اُن کے خاندان زراعت کے بہترین طریقوں پر عمل پیرا ہو کر اپنی آمدنی کو بڑھائیں اور معاشرتی حالت کو درست کریں حبشی لڑکے اور لڑکیاں اپنے زراعتی کاروبار میں دلچسپی لیں اور اُسے ترقی دیں۔ اس طریقہ سے امریکا کے حبشیوں پر یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو گئی ہے کہ وہ اپنی حالت میں ایک خوشگوار تبدیلی پیدا کر سکتے ہیں۔

توسیعِ زراعت کا جو لائحۂ عمل امریکا کے حبشیوں کے لئے تیار کیا گیا اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لئے پچیس یا تیس سال ہوئے ایک سفری مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ یہ سفری مدرسہ سال میں ملک کے تمام حصوں اور بالخصوص ان مقامات کا دورہ کرتا رہتا ہے جہاں ریل نہیں جاتی ایگریکلچر ایجنٹ اپنے علاقہ میں سفری مدرسہ کی آمد سے پہلے ہی لوگوں کو آگاہ کر دیتا ہے۔ اور کسانوں سے سفری مدرسہ کے لئے کچھ زمین حاصل کر لیتا ہے جہاں ہفتہ بھر کے لئے مدرسہ کی تمام ضروریات مہیا کی جاتی ہیں۔ یہاں سفری مدرسہ علمی تعلیم اور نمائش سے کسانوں کے بچوں کے دلوں میں دلچسپی اور شوق کا جذبہ پیدا کرتا ہے غرضکہ سفری مدرسہ کی علمی تعلیم اور نمائش کو ہر پہلو سے کامیاب بنانے کے لئے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا جاتا۔ بڑے بڑے اشتہاروں اور دیگر طریقوں سے زراعتی جلسوں کے لئے جگہ اور وقت کا پورے طور پر اعلان کر دیا جاتا ہے۔ تاکہ کسان بہ تعدادِ کثیر ان جلسوں سے مستفید ہو سکیں۔

# طلوعِ سحر

طلسمِ شب تیرہ و تار ٹوٹا وہ مشرق سے اِک چشمۂ نُور پھُوٹا
کیا جس نے سیراب سارے جہاں کو منوّر کیا جس نے کون و مکاں کو
سنہری شعاعوں کا زینہ بنا ہے کہ بحرِ ضیا میں سفینہ بنا ہے
اور اس میں فرشتے بہے آرہے ہیں شعاعوں میں مل کر چلے آرہے ہیں
بندھا عرش سے فرش تک ایک تانتا خداوندِ عالم کے پیغامیوں کا
فلک سے یہ پیغامِ حق لا رہے ہیں ضیا علم و حکمت کی پھیلا رہے ہیں
صداقت کا یہ بول بالا کریں گے
دلوں کے جہاں میں اجالا کریں گے

منصور

# فنِ تقریر

## اِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا

جس وقت چارلس ڈبلیو ایلاٹ، ہارورڈ کے صدر تھے، وہ ہمیشہ کہا کرتے تھے کہ ہر مرد و زن کے لئے تعلیم سے پہلے اپنی مادری زبان کا صحیح استعمال جاننا نہایت اہم اور ضروری ہے۔

سچ پوچھتے ہو تو تسخیرِ قلوب کا بہترین ذریعہ اور اجنبی لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالنے کا واحد طریقہ صرف حسنِ تقریر ہے۔ تم اپنی خوش بیانی کے ذریعہ سے اُن کی توجہات کو اپنی طرف منعطف کرسکتے ہو۔ شیریں کلامی نہ صرف تمہیں لوگوں کے دلوں پر اپنا اثر ڈالنے میں ممد و معاون ثابت ہوگی بلکہ یہ تمہاری زندگی میں آسانیاں بھی پیدا کرے گی۔ یہ، وکالت پیشہ افراد کے لئے موکل، ڈاکٹروں کے لئے بیمار اور تاجروں کے لئے گاہک کھینچ کرلائے گی۔ غرض شیریں کلامی کی وجہ سے ہر مجلس اور ہر سوسائٹی میں تمہاری قدر و منزلت کی جائے گی اگرچہ تم غریب اور مفلس ہی کیوں نہ ہو۔

ایک ایسا آدمی جو اپنے خیالات کو نہایت دلچسپ پیرایہ میں خوش اسلوبی کے ساتھ ظاہر کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور لوگوں کو اپنی تقریر کے ذریعہ سے دلچسپی کا سامان مہیّا کرسکتا ہے اُس شخص سے بدرجہا افضل ہے جو ہزار عالم و فاضل ہو مگر اپنے خیالات کو آسانی سے یا فصاحت کے ساتھ بیان کرنا نہ جانتا ہو۔

ممکن ہے تم کسی خاص ہنر یا علم میں مہارت رکھتے ہو یا تمہیں کسی فن میں خاص امتیاز حاصل ہو مگر تم اپنے کمال کو ہر وقت اور ہر جگہ لوگوں پر اس طرح ظاہر نہیں کرسکتے جس طرح فنِ تقریر کو ہر وقت کام میں لاسکتے ہو۔ فرض کرو، تمہیں علم موسیقی میں خوب واقفیت حاصل ہے اور اس علم کے حاصل کرنے میں تمہیں سینکڑوں روپیہ برباد اور کئی سال بہترین اساتذہ کے سامنے زانوئے شاگردی تہ کرنا پڑا ہے مگر باایں ہمہ سعی و کوشش تمہارے قدر دانوں کا حلقہ بالکل محدود ہوگا اور بہت کم لوگ تمہارے کمال اور جوہر سے واقف ہونگے جب تک تم میں قابلیتِ اظہار نہ ہو۔

اگر تم بہترین قوال ہو اور تم نے گانے بجانے میں وہ مشق بہم پہنچائی ہے کہ اپنی خوش الحانی کے ذریعہ سے حاضرین کو مسحور کرسکتے ہو تو تمہارے جوہر سے کوئی شخص اُس وقت تک واقف نہ ہوسکے گا جب تک کہ تم اپنے کمال کو اس کے سامنے ظاہر نہ کرو۔ کوئی شخص دنیا کا چکر لگائے مگر جب تک اُس کو اپنے کمال کے اظہار کا موقع نہ ملے کوئی اُس کو آنکھ اٹھا کر بھی

نہ دیکھے گا۔ اِس کے برعکس جس شخص کو فنِ تقریر میں کافی بہرہ حاصل ہو وہ کیسی ہی مجلس میں کیوں نہ جائے اور اُس کی ظاہری حالت کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ ضرور اپنے کمال کے ذریعہ سے خراجِ تحسین وصول کرے گا۔

فرض کرو کہ تم مصور ہو اور تم کو اس فن کے سلسلہ میں بڑے بڑے اساتذہ سے شرفِ تلمذ حاصل ہے۔ اور تم نے اپنی عمر کا ایک گران قدر حصہ صرف کرنے کے بعد اتنی استعداد بہم پہنچائی ہے کہ اب تمہاری تصویریں شاہی محلات اور بڑی بڑی نمائش گاہوں میں آویزاں ہونے کے قابل بن گئی ہیں مگر اس کے باوجود صرف معدودے چند افراد ہونگے جن کو تمہاری تصویروں کے دیکھنے کا اتفاق ہؤا ہوگا۔ لیکن اگر تم مصورِ تقریر ہو تو جو شخص تم سے ملے گا تمہاری زندگی کی تصویر اُس کے سامنے ہوگی، جس پر تم نے دورانِ تقریر میں نقش و نگار کیا تھا۔

غرض آپ جس کسی فن میں کامل دستگاہ حاصل کریں گے، اُس سے بالکل کم لوگوں کو مستفیض ہونے کا موقع ملے گا۔ لیکن اگر تم فنِ تقریر میں کمال پیدا کرو گے تو جس شخص سے تم ہمکلام ہوگے، وہ تمہاری ذہانت اور فراست کی داد دینے لگے گا۔

ایک سوسائٹی کا قابل ترین لیڈر جس کو فنِ تقریر میں خاص ملکہ حاصل ہے، اپنے افراد کو یوں نصیحت کرتا ہے کہ "کہے جاؤ، کہے جاؤ، اس کی کچھ زیادہ پروا نہیں کہ تم کیا کہتے ہو، مگر آہستگی اور خوبی کے ساتھ کہے جاؤ۔ ایک ایسے آدمی کو جو نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ بات چیت کرتا ہے، کوئی چیز ہراساں اور خوفزدہ نہیں کر سکتی"۔ اس نصیحت میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تقریر سیکھنے کے لئے تقریر کرنا چاہیئے۔ وہ لوگ جو سوسائٹی سے بالکل نامحرم ہیں اور تقریر کرنے سے ابھی جھجکتے ہیں۔ اُن کے لئے ضروری ہے کہ دوسروں کی تقریر کو غور سے سنا کریں۔

ہر مجلس یا دعوت میں عمدہ مقررین کو طلب کیا جاتا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ فلاں شخص کو کھانے پر یا کسی مجلس میں مدعو کیا جائے کیونکہ وہ بہترین مقرر ہے اور اُس کی باتوں سے کچھ دیر کے لئے احباب کا دل بہل جاتا ہے گو اس میں سینکڑوں عیوب ہی کیوں نہ ہوں مگر لوگ اُس کی صحبت سے محظوظ ہوتے ہیں کیونکہ وہ خوش بیان ہے۔

شستہ اور بلیغ تقریر نہایت مؤثر اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ وہ شخص جو اپنے خیالات کو صفائی کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش نہیں کرتا اور بغیر فکر و تامل کے الفاظ زبان سے نکالنے لگتا ہے، عمدہ مقرر نہیں کہلا سکتا اور ایسی فضول تقاریر سے، جو فائدہ کہ متصور ہے حاصل نہیں ہو سکتا۔

کتنے افسوس کی بات ہے کہ ہزاروں نوجوان اپنے قیمتی اوقات کو اور اپنے چھٹی کے دنوں کو صرف ہرزہ سرائی اور بیہودہ گوئی میں صرف کئے جاتے ہیں اور انہیں اپنے نقصان کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ صبح سے شام تک۔ ایسی باتیں

کرتے رہتے ہیں جو مذاقِ سلیم پر ناگوار گذرتی ہیں۔ اور سوائے پھوہڑ، نامعقول اور اخلاق سوز باتوں کے کوئی عمدہ بات اُن کی زبان سے نہیں نکلتی۔ آپ نے سڑکوں پر، گاڑیوں میں اور شاہراہوں پر لوگوں کو آہستہ یا جلدی نہایت بُرے تلفظ کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے سنا ہوگا۔

"ابے کیا بولتا"، "یہ ٹوپی بولو"، "وہ بھوت لچّا آدمی ہے"، "مار توں دیکھ اب" وغیرہ وغیرہ ایسے ہی بہتیرے مہمل اور نامعقول جملے اکثر سننے میں آتے ہیں۔

بات چیت سے انسان کی تمام بھلائیاں اور برائیاں معرضِ ظہور میں آجاتی ہیں۔ بات چیت ہی سے ہر شخص کو اس بات کا اندازہ لگانے کا موقع مِل جاتا ہے کہ تم کتنے پانی کے آدمی ہو۔ اسی سے ہر شخص کی علمی قابلیت بھی معلوم ہو جاتی ہے۔ تقریر ہی تمہاری کل زندگی کا مرقع سننے والے کے سامنے پیش کرتی ہے۔ تم جو کچھ کہوگے اور جس طرح کہوگے، اس سے ہر شخص تمہاری قدر وقیمت کا اندازہ لگا سکے گا۔ جب تک انسان بات نہیں کرتا اُس کے تمام راز پوشیدہ رہتے ہیں۔ مگر جب وہ منہ کھول دیتا ہے تو اُس کے عیبُ ہنر صاف نظر آنے لگتے ہیں ؎

تا مرد سخن نہ گفتہ باشد
عیب و ہنرش نہفتہ باشد

میٹھی باتوں کے سوا کوئی ایسا کمال یا ہنر نہیں جس کو ہم ہمیشہ کماحقہٗ استعمال کر سکیں اور اُس کے ذریعہ سے دوستوں کے لئے تفریح کا سامان بھی مہیا ہو جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ زبان جیسی نعمت ہمیں اس لئے عطا کی گئی ہے کہ ہم اس کو درجۂ کمال تک پہنچا دیں مگر سخت افسوس ہے کہ ہم میں سے اکثر افراد اپنے غلط استعمال سے اس کی مٹی پلید کیا کرتے ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہم نے تقریر کو ایک خاص فن کی حیثیت نہیں دی۔ ہم کو عمدہ گفتگو سیکھنے کی زحمت اٹھانا تک گوارا نہیں۔ گفتگو کرنے سے پہلے کچھ دیر سوچنا اور اپنے خیالات کو آسان اور فصیح پیرایہ میں ادا کرنے کی کوشش کرنا ہم پر گراں گزرتا ہے۔ ٹوٹی پھوٹی زبان میں جُوں تُوں اپنا مطلب ادا کر دینا ہمیں آسان معلوم ہوتا ہے جو لوگ تقریر میں بالکل پیچھے ہیں وہ ترقی کرنے اور سیکھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اپنے آپ کو یہ کہہ کر بچا لینا چاہتے ہیں کہ "عمدہ مقررین فطرتاً پیدا ہوتے ہیں اور بنائے نہیں جاتے"۔ اگر یہ سچ ہے تو اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں تمام قابل وکلا، عمدہ فلاسفر اور بڑے بڑے تجار بھی فطرتاً پیدا ہوتے ہیں اور بنائے نہیں جاتے۔ حالانکہ اُن میں سے کوئی بھی بغیر کوشش اور جہدِ بلیغ کے اس درجۂ کمال کو نہیں پہنچا۔ یہ قابلیت صرف اُن کی ذاتی محنت اور مشقت کا ثمرہ ہے۔

اکثر مشہور و معروف افراد کی ترقی اور شہرت کا دار و مدار صرف اُن کی قوتِ تقریر پر ہے۔ لوگوں کے لئے اپنی گفتگو میں دلچسپی

پیدا کرنا اور اُن کو اپنی طرف مائل کرنا، ایک بہت بڑا کمال ہے۔ وہ آدمی جو گفتگو میں لڑکھڑاتا ہے اور کوئی بات جانتا ہے مگر اُس کو منطقی، دلچسپ اور زوردار زبان میں ادا نہیں کرسکتا، وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتا ہے۔

میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جس نے فنِ تقریر میں اتنی استعداد بہم پہنچائی ہے کہ ہر شخص کا جی یہی چاہتا ہے کہ اُس کی باتوں کو سنا کرے۔ اُس کی زبان میں سلاست کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اُس کے الفاظ نہایت صاف ستھرے مزے دار اور چٹ پٹے ہوا کرتے ہیں۔ اُس کی گفتگو میں اتنا مزہ حاصل ہوتا ہے کہ جو شخص اُس کی بات چیت سنتا ہے، اُس پر جھٹ فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اُس نے اپنی تمام زندگی میں عمدہ نظم و نثر کا غور کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور تقریر کو ایک فن کی حیثیت سے سیکھا ہے۔

تم خیال کرتے ہوگے کہ تم مفلس و قلاش ہو اور عرصۂ حیات تم پر بالکل تنگ ہے۔ ممکن ہے تم پابندی کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہو، تمہاری ذات سے دوسروں کی زندگیاں وابستہ ہیں اور تمہیں کسی مدرسہ یا کالج جانے کی بھی فرصت نہ ملتی ہو یا تم میں اتنی طاقت نہ ہو کہ موسیقی یا کوئی ہنر جس کو تم سیکھنا چاہتے ہو، حاصل کرو۔ ممکن ہے کہ تم کسی ناموافق صورتِ حالات کی بنا پر افکار و آلام میں گھرے ہوئے ہو مگر تاہم تم ایک عمدہ اور خوش بیان مقرر بن سکتے ہو بشرطیکہ ہر ایک جملہ کو جو تمہاری زبان سے نکلے، عمدہ اور بلیغ پیرایہ میں ادا کرنے کی عادت ڈالو۔ ہر کتاب جس کا تم مطالعہ کرتے ہو اور ہر فصیح گو جس سے تم بات چیت کرتے ہو تمہاری مدد کے لئے کافی ہے۔

بہت کم لوگ بات چیت کرنے سے پہلے یہ سوچتے ہیں کہ وہ اپنے خیالات کا کس طرح اظہار کر رہے ہیں۔ جو لوگ فنِ تقریر میں ابھی پیچھے ہیں، ان میں سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ جیسے الفاظ اُن کی زبان پر آتے ہیں، فوراً بول اُٹھتے ہیں۔ وہ اتنی دیر تامل نہیں کرتے کہ بولنے سے پہلے ایک جملہ بنالیں جو خوبصورت شستہ اور زوردار ہو۔ الفاظ ابھی ترتیب بھی نہیں پا چکتے کہ اُن کی زبان سے پھسلتے ہوئے نکل جاتے ہیں۔

ہم کو کتنی فرحت اور خوشی حاصل ہوتی ہے جب ہم ایک ایسے شخص سے ملاقات کرتے ہیں جو فنِ تقریر میں مہارتِ تامہ رکھتا ہو۔ بخلاف اِس کے ہم کو کتنا تعجب ہوتا ہے جب ہم لوگوں کو اپنی کج مج بولی کے ذریعے سے زبان کی مٹی پلید کرتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ حالانکہ اگر تقریر کو ترقی دی جائے تو یہ ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کرنے کے قابل ہے۔

مجھے اپنی عمر میں تقریباً ایک درجن ایسے اشخاص سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے، جنہوں نے مجھے فنِ تقریر کی ایسی ایسی عظیم الشان قابلیتوں کے نمونے دکھائے ہیں کہ اُن کے ہوتے ہوئے میری نظر میں تمام فنون ہیچ نظر آتے ہیں۔

میں ایک دفعہ باسٹن میں وینڈل فلپ کے گھر ملاقات کی غرض سے گیا ہوا تھا۔ اس پُرلطف صحبت کی یاد اب تک

میرے ذہن میں باقی ہے۔ فلپ کی آواز کی شیرینی اور اُن کی جادو بھری تقریر اب تک میرے کانوں میں گونج رہی ہے وہ پیارے پیارے الفاظ وہ میٹھی میٹھی باتیں مجھے عمر بھر نہ بھولیں گی۔ وہ میرے پاس بیٹھ کر اس طرح باتیں کیا کرتے تھے جیسے کوئی اپنے پرانے ہم جماعت سے باتیں کرتا ہے۔ جب وہ مجھ سے باتیں کرنے لگتے تھے تو مجھ کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں نے کبھی ایسی پیاری اور میٹھی زبان نہیں سنی۔ غرض میں نے ایسے ہی بہتیرے آدمیوں سے ملاقات کی ہے، جو صحیح معنوں میں "تقریر کا جوہر جو سننے والوں کو مسحور کر دیتا ہے" رکھتے تھے۔

ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جو اوروں کو اپنا ہم خیال بنانے میں بہت جلد کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ بذاتِ خود اپنی بات لوگوں سے نہیں منواتے بلکہ صرف اُن کی دلاویز تقریر اور میٹھی زبان دوسروں کو فوراً ماننے پر مجبور کرتی ہے۔

بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو بالکل کم سخن ہوا کرتے ہیں مگر اُن کے الفاظ پُر مغز اور زوردار ہوتے ہیں۔ اور جو بات وہ ہمیں سمجھانا چاہتے ہیں فوراً ہمارے دلوں پر کالنقش فی الحجر ہو جاتی ہے۔

فنِ تقریر نے قدیم زمانہ میں آج سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ صورت اختیار کر لی تھی۔ مگر موجودہ دورِ تہذیب و تمدن نے اس میں ایک انقلابِ عظیم پیدا کر دیا اور اُس کی ترقی محدود ہو گئی۔ پہلے تمام تعلیم زبانی دی جاتی تھی۔ تبادلۂ خیالات کا ذریعہ بھی صرف زبان تھی۔ نہ اخبارات و رسائل جاری تھے اور نہ کتابیں بکثرت تصنیف ہوا کرتی تھیں۔

بیش قیمت جمادات و معدنیات کے انکشافات نے انسان کے لئے دولتِ بے کراں حاصل کرنے کا راستہ کھول دیا اور انسان کی زندگی میں ایک فجائی انقلاب رونما ہو گیا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج جس کو دیکھئے صرف حصولِ جاہ و ثروت کے لئے سرگرمِ عمل نظر آتا ہے۔ فکر و تامل اور غور و خوض کے لئے مہلت ہی کس کو ہے جو فنِ تقریر کو ترقی دینے کی کوشش کرے آج کل اخبارات و رسائل کی وہ بھرمار ہے کہ ہر شخص دنیا بھر کی خبریں اور مفید ترین معلومات جن کی تدوین کے لئے ہزاروں روپے خرچ کئے جاتے ہیں، صرف چند پیسوں میں گھر بیٹھے حاصل کر سکتا ہے آج خیالات کو تقریر کے ذریعہ سے ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی جتنی کہ پہلے تھی۔ آج کل طباعت اتنی ارزاں ہو گئی ہے کہ ایک غریب سے غریب آدمی چند روپے خرچ کر کے اتنی کتابیں حاصل کر سکتا ہے جتنی قرونِ وسطیٰ میں بڑے سے بڑے بادشاہوں کو ہزاروں روپیہ خرچ کرنے پر بھی حاصل نہ ہو سکتی تھیں۔

انہی وجوہ کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ فنِ تقریر آج گویا ایک کھویا ہوا فن ہے۔ آج جس طرح عمدہ اور نغز گو مقررین کا کال ہے اُسی طرح کسی کو شستہ اور میٹھی زبان بولتے ہوئے سننا بھی نہایت مشکل ہے۔

فنِ تقریر کے سیکھنے میں مطالعہ سے بھی زیادہ مدد مل سکتی ہے۔ بہترین کتابوں کا مطالعہ صرف معلومات کو وسیع نہیں کرتا، بلکہ اس سے نئے نئے الفاظ بھی معلوم ہوتے ہیں اور ہمارے دماغ میں الفاظ کا بہت بڑا ذخیرہ محفوظ رہتا ہے جس سے تقریر کے دوران میں ہمیں سب سے زیادہ مدد ملتی ہے۔ بہت سے لوگ عمدہ خیالات رکھتے ہیں مگر انہیں الفاظ کی

قلت کی وجہ سے ظاہر نہیں کر سکتے۔ اُن کے پاس اپنے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنانے اور دلچسپ بنانے کے لئے بہترین الفاظ ہی نہیں ہوتے۔ وہ بات چیت کرتے ہیں تو اپنے خیالات کے اظہار کی کوشش میں ایک ہی بات کو بار بار دہراتے ہیں اور ایک ہی دائرہ میں چکر لگاتے ہیں مگر اُن کو کوئی ایسا جامع لفظ نہیں ملتا جو اُن کو صاف طور پر ظاہر کر سکے۔

اگر تم ایک بہترین مقرر بننا چاہتے ہو تو تمہیں چاہئے کہ جہاں تک ممکن ہو، عمدہ مقررین کی صحبت اختیار کرو۔ اور بہترین سوسائٹی میں نشست و برخاست جاری رکھو۔ اگر تم عزلت نشین بن جاؤ گے تو ہرگز فنِ تقریر میں ترقی نہ کر سکو گے۔ اگرچہ تم عالم و فاضل ہی کیوں نہ ہو۔

مجھے اُن تمام لوگوں کے ساتھ اور خصوصاً اُن ڈرپوک اور شرمیلے افراد کے ساتھ نہایت ہمدردی ہے جنہیں اپنے خیالات کا گلا گھونٹ کر دبا رکھنا پڑتا ہے۔ جب وہ اُن کے اظہار کی کوشش کرتے ہیں تو شرم اور گھبراہٹ انہیں بولنے سے روک دیتی ہے۔ شرمیلے نوجوانوں کو اکثر کالج یا سکولوں میں تقریر کرتے ہوئے اسی مصیبت سے دوچار ہونا پڑتا ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ کمزوری اُن ہی کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ ہر ایک مقرر اور خوش بیان کو بھی پہلے پہل پبلک میں تقریر کرتے ہوئے ایسی ہی حالت پیش آتی ہے اور اپنی لغزشوں اور غلطیوں کی بدولت اُس کو بھی پہلے پہل ندامت اُٹھانی پڑتی ہے۔ فصیح و بلیغ گفتگو کرنے اور بہترین مقرر بننے کا یہی ایک طریق ہے کہ ہمیشہ اپنے خیالات کو زیادہ تر خوش اسلوبی اور سلاست کے ساتھ ظاہر کرنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔

اگر دورانِ تقریر میں خیالات تمہارے دماغ سے نکل جائیں اور تم تتلانے لگو یا سٹپٹا جاؤ اور الفاظ تمہارے ذہن میں نہ آئیں تو یقین رکھو کہ تم اپنے خیالات کو مجتمع کرنے کی جتنی بھی کوشش کرو گے خواہ اُس میں ناکامی ہی کیوں نہ ہو تمہیں دوسرے وقت تقریر کرنے میں اتنی ہی آسانی پیدا ہو گی۔ یہ بخوبی یاد رہے کہ جو شخص لگاتار کوشش کرتا رہے گا وہ بہت جلد اپنے نقائص و اسقام کو دور کرنے میں کامیاب ہو جائے گا اور اُس کے لئے اپنے خیالات کے حسنِ اظہار میں آسانیاں پیدا ہوتی جائیں گی۔

ہم بہت سے لوگوں کو نقصان اُٹھاتے ہوئے دیکھتے ہیں صرف اس لئے کہ وہ اپنے خیالات کو دلچسپ اور زور دار زبان میں ظاہر کرنا نہیں جانتے۔ ہم عام جلسوں میں جہاں اہم مسائل پر مباحثہ ہو رہا ہو، اکثر ہوشیار اور صاحبِ فراست آدمیوں کو خاموش بیٹھے ہوئے دیکھتے ہیں کیونکہ ان میں اتنی قابلیت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے خیالات کو بخوبی ظاہر کر سکیں، حالانکہ انہیں اُن لوگوں سے زیادہ معلومات حاصل ہوتے ہیں جو باوصف اپنی ہیچمدانی کے زیادہ تر تقریر میں حصہ لیتے ہیں۔

اکثر لوگ اور خصوصاً طلبہ یہ خیال کرتے معلوم ہوتے ہیں کہ اُن کے لئے زندگی میں سب سے زیادہ اہم اور ضروری

کام یہ ہے کہ جتنی قیمتی باتیں دماغ میں سما سکیں حاصل کرلیں۔ گو یہ خیال ایک حد تک مفید ہے، لیکن اگر وہ اسی پر اکتفا کرنا پسند کرتے ہیں تو یہ اُن کی سخت غلطی ہے کیونکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی نہایت ضروری ہے کہ اپنے معلومات کو کس طرح دلچسپ پیرایہ میں ظاہر کیا جائے۔ تم ایک طالب علم بن سکتے ہو، تم تاریخ اور پولیٹکس میں خوب مہارت حاصل کر سکتے ہو۔ تم سائنس علمِ ادب اور اَور فنون میں تعجب خیز کمال پیدا کرسکتے ہو تاہم اگر تمہارے معلومات صرف تمہارے دماغ میں بند رہیں تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔ اور تم ہمیشہ گھاٹے میں رہوگے۔

وہ لیاقت جو کسی پر ظاہر نہ کی جائے، انفرادی طور پر کسی حد تک تسکین بخش ہو سکتی ہے، مگر یہ ضروری ہے کہ اُس کو بجائے بند رکھنے کے میدان میں لایا جائے اور اُس کو جہاں تک ہو سکے دل نشین انداز میں ظاہر کرنے کی کوشش کی جائے۔ تاکہ دنیا کو اُس کے حسن و قبح کے اندازہ لگانے کا موقع ملے۔

وہ ہیرا جو ابھی پتھر کے اندر چھپا ہوا ہو، خواہ کتنا ہی بیش قیمت کیوں نہ ہو، کوئی شخص اُس کی قدر نہیں کریگا۔ تاوقتیکہ اُس کو قلبِ حجر سے نکال کر باہر نہ لایا جائے اور اُس کی آب و تاب لوگوں پر ظاہر نہ ہو جائے۔ اسی طرح انسان کی وہ قابلیت اور کمال جو سینہ کے اندر محفوظ ہو اُس ہیرے کے مانند ہے جو پتھر کے اندر چھپا ہوا ہو۔ تقریر انسان کے کمالات کو نہیں بڑھاتی بلکہ منظرِ عام پر لاتی ہے۔ اسی طرح، جیسے ہیرے کو جلا دینے سے اس میں کچھ اضافہ نہیں ہوتا بلکہ صرف اُس کی قدر و قیمت ظاہر ہوتی ہے۔

بہت کم والدین کو اُس نقصان کا احساس ہوتا ہے جو وہ اپنے بچوں کو فنِ تقریر کی بیش قیمت قابلیتوں سے نابلد اور مجہول رکھنے کی صورت میں پہنچاتے ہیں۔ بچوں کو گھروں کے اندر بالکل بے ترتیبی کے ساتھ گفتگو کرنے کی اجازت دے کر زبان کی مٹی پلید کی جاتی ہے۔

ہر قسم کے مضمون پر عمدہ، دلچسپ اور نفیس گفتگو کرنے کی بلاناغہ مشق کرنے سے انسان کے دماغ اور اخلاق پر بھی نیک اثر پڑتا ہے۔ اپنے خیالات کو پاک زبان اور دلچسپ صورت میں ظاہر کرنے کی باقاعدہ کوشش کرنا بھی ایک شاندار فن ہے۔ ہم بہت سے ایسے لوگوں کو جانتے ہیں جنہوں نے گو بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم نہیں حاصل کی مگر ایسی عمدہ اور شستہ تقریر کا ملکہ رکھتے ہیں کہ سننے والے کے دل میں اُن کی عظمتِ شان اور تبحرِ علمی کا گہرا نقش بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس بہتیرے کالج کے تعلیم یافتہ مگر فنِ تقریر سے بے بہرہ افراد محفلوں میں مقررین کا صرف منہ تکتے رہ جاتے ہیں اور خود تقریر میں حصہ لینے سے ہچکچاتے ہیں۔ لوگ اُن کی خاموشی کو کم مائیگی پر محمول کرتے ہیں اور عمدہ مقرر اپنی بے بضاعتی کے باوجود لوگوں سے خراجِ تحسین وصول کرلیتا ہے۔

. . کسی علم کے حاصل کرنے کے لئے طالب علم کو ایک محدود سکول یا کالج میں چند سال تک صرف چند گھنٹے روزانہ حاضر رہنا پڑتا ہے، مگر فنِ تقریر کے سیکھنے کے لئے کسی مقررہ وقت یا جگہ کی ضرورت ہی نہیں۔ اس کی تعلیم ایک ایسے مدرسہ میں ہوتی ہے جو ہمیشہ کے لئے کھلا رہتا ہے۔ اور جس کا جی چاہے اس مدرسہ میں اپنی کوشش سے عمدہ ترین مقرر بن سکتا ہے۔

تقریر ہی کے ذریعہ سے آدمی کی لیاقت اور اُس کا علم وفضل ظاہر ہوتا ہے۔ یہی چیز خیالات کو متحرک کرتی ہے اسی کے ذریعہ سے اپنی قابلیت اور استعداد بڑھائی جاسکتی ہے۔ اگر ہم بہترین مقرر بن جائیں اور لوگوں کے دل اپنی خوش بیانی کے ذریعہ سے مسخر کرنا سیکھ لیں تو خود اعتمادی اور خودداری کا جذبہ بھی ہمارے دلوں میں خود بخود پیدا ہو جائیگا

کوئی شخص خود اپنی ذاتی لیاقت اُس وقت تک نہیں جان سکتا، جب تک کہ وہ اپنی قابلیت لوگوں پر ظاہر کرنے کی کوشش نہ کرے۔ لوگوں پر اپنی استعداد ظاہر کرنے سے دماغ کے راستے کھل جاتے ہیں اور ذہنی قویٰ میں چستی وچالاکی عود کر آتی ہے۔ ہر عمدہ مقرر سامع کے ذریعہ سے اپنے آپ میں ایک ایسی قوت محسوس کرتا ہے جس کو پہلے اُس نے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ یہ قوت اکثر مقرر کے دل میں تازہ جدوجہد کی روح پھونک دیتی ہے۔ جس طرح دو کیمیائی اجزا کی ترکیب سے ایک تیسری چیز پیدا ہوتی ہے، اسی طرح ایک خیال کے دوسرے خیال کے ساتھ اور ایک دماغ کے دوسرے دماغ کے ساتھ ملنے سے ایک نیا حوصلہ اور طاقت پیدا ہو جاتی ہے۔

عمدہ تقریر کرنے کے لئے اوروں کی تقریر کو غور کے ساتھ سننا بھی نہایت ضروری ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر شخص کی تقریر سے عمدہ عمدہ باتیں اخذ کرنی چاہئیں تاکہ اُن سے اپنی تقریر میں کچھ مدد مل سکے۔

ہم صرف تقریر ہی میں پیچھے نہیں ہیں بلکہ کسی کی بات سننے میں بھی تکاہل وتکاسل سے کام لیا کرتے ہیں۔ ہم میں یہ بُری عادت ہے کہ کسی کی تقریر سننے کے وقت نہایت بے صبری کا اظہار کرتے ہیں۔ نہایت توجہ اور شوق کے ساتھ سننا تو درکنار، مقرر کی عزت کا لحاظ کرتے ہوئے خاموش بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ اِدھر اُدھر بے صبری کے ساتھ نظر دوڑاتے ہیں۔ اور غالبًا اپنی گھڑی کی زنجیر کے ساتھ کھیلتے ہیں یا اپنی انگلیوں سے کسی میز یا کرسی پر طنبور بجانے لگتے ہیں۔ کبھی متجسسانہ نظروں کے ساتھ اس طرح اِدھر اُدھر دیکھنے لگتے ہیں گویا کوئی چیز گم ہو گئی ہے۔ غرض اپنی بیہودہ حرکات سے مقرر کو اپنی تقریر بھی پوری نہیں کرنے دیتے۔ ہم میں اتنی جلد بازی اور بے صبری ہے کہ ہم پوری تقریر سننا بھی پسند نہیں کرتے حصولِ دولت کی کوشش میں ادھر اُدھر پھرنا اور ہجوم کو چیرتے پھاڑتے ہوئے اپنا راستہ بنا لینا ہمیں خوب آتا ہے لطیفے، غزلیات وغیرہ سننے کے لئے ہمارے پاس وقت ہے

فضول اور بیہودہ باتیں کرنے کے لئے ہمیں فرصت مل جاتی ہے۔ مگر اپنی تقریر میں شیرینی اور الفاظ میں نفاست پیدا کرنے کے لئے یا کسی کی تقریر کو غور سے سننے کے لئے ہمیں وقت نہیں ملتا۔

قدیم زمانہ میں کسی بہترین مقرر کی تقریر کو سننا باعثِ فخر سمجھا جاتا تھا۔ لوگ نہایت دلی شوق اور خوشی کے ساتھ مقرر کے اردگرد کثیر تعداد میں جمع ہو جایا کرتے تھے۔ نیز وہ تقریریں بھی اتنی موثر اور کارآمد ہوا کرتی تھیں کہ موجودہ دورِ تہذیب و تمدن کے لکچروں اور بیش قیمت کتابوں کی پند آموز تحریروں میں بھی وہ اثر اور فائدہ نہیں پایا جاتا۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ اُن تقریروں میں مقرر کی شخصیت کا زیادہ تر اثر ہوا کرتا تھا۔ اُس کی خوش خلقی اور پسندیدہ اوضاع و اطوار میں ایک سحر ہوتا تھا، ایک مقناطیسی کشش ہوا کرتی تھی جو لوگوں کے قلوب کو اپنی طرف مائل کر لیتی تھی۔ اُن لوگوں کے لئے جو علم کی حقیقی پیاس رکھتے تھے ایسی تقریریں شاہی ضیافتوں سے کم نہیں ہوا کرتی تھیں ۔۔۔۔ مگر آج ہر کام اور ہر بات میں جلد بازی اور بے پروائی ہمارا نصب العین ہے۔ ہم کو چلتے چلتے کچھ دیر توقف کرنے اور اچھی طرح سلام کرنے تک کی مہلت نہیں ملتی۔ بجائے "السلام علیکم" کے صرف "سام" اور "خیریت" کے بجائے صرف "خیت" کہنے پر اکتفا کرتے ہیں تعظیم کے لئے سر جھکانا بھی تضیع اوقات سمجھا جاتا ہے۔ صرف سر کا اشارہ کر دینے سے اپنا مطلب نکال لینا چاہتے ہیں۔ ہمارے پاس اخلاقِ حسنہ پیدا کرنے کے لئے وقت ہی نہیں اور دوسرے بیہودہ افعال کے لئے خوب وقت نکل آتا ہے۔ ہم میں تہذیب و تمدن کیا آئے قدیم زمانہ کی برکتیں اور دلچسپیاں نیست و نابود ہو گئیں۔ ہم نے اپنے اوقات کی تقسیم اس طرح کی ہے کہ دن کو خوب کام کریں اور شام کو کسی تھیٹر یا تفریح گاہ میں جا بیٹھیں۔

ہم اپنی تفریح کے لئے اوروں کو تو اُجرت دیتے ہیں مگر اپنی تفریح کا سامان آپ مہیا کرنے یا اپنی طبعی ظرافت اور خوش طبعی کو کام میں لانے کی ہرگز کوشش نہیں کرتے۔ ہماری مثال اُن لڑکوں کی سی ہے جو صرف اپنے اساتذہ پر بھروسا کئے بیٹھے رہتے ہیں تاکہ وہ امتحان میں انہیں کامیاب بنا دیں اور آپ تھوڑی سی بھی تکلیف اٹھائے بغیر علم و لیاقت کو بنی بنائی چیز کی طرح خرید لیں۔

ہماری زندگی میں بناوٹ اور تکلف بھرا ہوا ہے۔ ہمارے طرزِ معاشرت و تمدن میں بے لوث اور پاک و صاف زندگی کا امکان ہی نہیں پایا جاتا۔ طبعی ظرافت اور اپنی شخصیت کی سحر آفرینی ہم میں مفقود ہے۔

فنِ تقریر میں ہمارے اس درجہ تنزل و انحطاط کا سبب یہ ہے کہ ہم میں ہمدردیِ بنی نوعِ انسان کا کال ہے۔ ہماری طبیعت میں خود غرضی پائی جاتی ہے۔ اور ہر کام میں صرف ذاتی بہبود کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے۔ اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانا، اور صرف اپنے فائدے کی تدابیر سوچنا ہمارا معمول ہے۔ یاد رکھو کہ وہی تقریر سب سے عمدہ ہو سکتی ہے جس میں محاسن صوری کے ساتھ معنوی خوبیاں بھی موجود ہوں اور وہی مقرر بہترین کہلا سکتا ہے جس کی زبان فصیح ہونے کے ساتھ

ساتھ اُن کے دل میں انسانی ہمدردی بھی موجود ہو اور دوسروں کی زندگی میں وہ دخل پیدا کرنے کی قابلیت بھی رکھتا ہو۔

والٹر بسنٹ ایک عورت کے متعلق کہا کرتے تھے کہ وہ ایک بہترین بذلہ سنج اور شیریں بیان کی حیثیت سے لوگوں میں نہایت عزت کی نگاہ سے دیکھی جاتی تھی حالانکہ وہ بولتی بالکل کم تھی۔ وہ نہایت ہمدرد اور خیر خواہ تھی اور حتی الامکان شرمیلے اور ڈرپوک مقررین کو ہمت دلانے میں کبھی کوتاہی نہ کرتی تھی۔ وہ ہمیشہ اس بات کی کوشش کرتی تھی کہ مقرر اپنے آپ کو گھر میں بیٹھے باتیں کرتا ہوا سمجھے۔ ڈرپوک نوجوانوں کے دلوں سے ڈر اور گھبراہٹ دور کرنے کی ہر ممکن طریقہ سے کوشش کیا کرتی تھی چنانچہ اکثر لوگ جن کی زبان دوسرے مواقع پر دورانِ تقریر میں لڑکھڑانے لگتی تھی اس کی موجودگی میں ایسی شستہ اور فصیح و بلیغ تقریر کرنے لگتے تھے کہ سننے والوں کو حیرت ہوتی تھی۔ لوگ اس کو بہترین مقررہ کہتے تھے کیونکہ اُس میں دوسروں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ موجود تھا

اگر تم ہر دلعزیز بننا چاہتے ہو اور فنِ تقریر میں شانِ امتیاز پیدا کرنے کی خواہش رکھتے ہو تو تمہیں لازم ہے کہ اُن لوگوں کی زندگی میں دخل پیدا کرو جن کے سامنے تم تقریر کر رہے ہو۔ جو کچھ کہو، اُن کے رجحان اور دلچسپی کے مطابق کہو۔ گو کسی مضمون کے متعلق تمہارے معلومات کتنے ہی وسیع کیوں نہ ہوں لیکن اگر اس سے سامعین نے کچھ دلچسپی نہ لی تو تمہاری تمام کوششیں اکارت جائیں گی۔

بڑے بڑے مقررین اکثر ناصح ہوا کرتے ہیں وہ اپنی خوش طبعی کے ذریعہ سے لوگوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ اگر تم بھی لوگوں کا دل بہلانا چاہو تو اتنا ضرور یاد رکھو کہ اس کوشش میں کہیں اُن کی دل آزاری نہ ہو جائے۔ اُن کے خاندان کی دبی ہوئی ہڈیاں نہ اکھیڑو۔ بعض لوگوں میں یہ عمدہ صفت ہے کہ وہ صرف ہماری خوبیوں کو ڈھونڈتے ہیں اور بعض ایسے ہیں جو صرف برائیوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی تقریر آزاردہ ہونے کے سوا کچھ سودمند نتائج پیدا نہیں کر سکتی۔ بلند پایہ مقرر ہمیشہ ایسی باتوں سے احتراز کرتا ہے جن سے اوروں کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ ہو۔ وہ کبھی اُن پہلوؤں پر گفتگو نہیں کرتا جن سے کسی کے عیوب و نقائص کا اظہار ہو۔ اُس کی نظر ہمیشہ لوگوں کے عیوب کے بجائے محاسن پر پڑتی ہے۔

لنکن اپنی ذات کو لوگوں کی تفریح اور دلچسپی کا ذریعہ بنانے میں نہایت کامیاب استاد تھا۔ وہ اپنی مزیدار کہانیوں اور لطیفوں سے لوگوں کو اس قدر خوش کیا کرتا تھا کہ لوگ اپنے دلی خزانے اُس کے سامنے بلاکم و کاست کھول کر رکھ دیتے تھے اور انہیں اس بات کا احساس تک نہ ہوتا تھا کہ اُن کا مخاطب ایک پرایا شخص ہے۔ اجنبی لوگ اس کی صحبت سے حظ اٹھایا کرتے تھے کیونکہ وہ نہایت بذلہ سنج تھا اور لوگوں کو اپنے معلومات کے ذریعہ سے بے حد فائدہ پہنچایا کرتا تھا۔

گو طبعی ظرافت جیسا کہ لنکن میں موجود تھی، تقریر کی دلپذیری اور زور و قوت میں اضافہ کرتی ہے مگر ہر شخص بذلہ سنج اور ظریف نہیں بن سکتا۔ اگر تم میں یہ صفت نہیں ہے تو حتی الامکان اس کے پیدا کرنے کی کوشش کرو۔

باکمال مقرر بالکل ہی سنجیدہ اور خشک مزاج نہیں ہوتا۔ وہ ہمیشہ حقائق ہی سے بحث نہیں کرتا خواہ وہ کتنے ہی اہم کیوں نہ ہوں۔ صرف حقائق اور حالات تمدن کے متعلق گفتگو کرنے سے سننے والا تھک جاتا ہے مقرر کے لئے سب سے زیادہ اہم اور ضروری امر یہ ہے کہ وہ زندہ دل ہو۔ جس طرح روشنی کی زیادتی آنکھوں کو خیرہ کردیتی ہے اسی طرح ثقیل گفتگو بھی انسان کی طبیعت کو منغص کردیتی ہے۔

بلند پایہ مقرر بننے کے لئے اپنے آپ میں بے تکلفی، خوش طبعی اور زندہ دلی پیدا کرنی چاہیئے۔ دل میں عمدہ خیالات اور ہمدردیِ بنی نوعِ انسان کا احساس ہونا بھی نہایت ضروری ہے۔ تقریر کا موضوع ایسا ہونا چاہیئے کہ عام لوگ اس سے مستفید ہوسکیں۔ جہاں تک ہوسکے لوگوں کی توجہات کو اپنی طرف پھیرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اور تم اپنی اس کوشش میں اُسی وقت کامیاب ہو سکو گے۔ جب کہ تم میں انسانی ہمدردی اور غمخواری کا جذبہ موجود ہو۔ اگر تم سرد مہر، خشک مزاج اور شقی القلب ہو تو کوئی تمہاری طرف توجہ تک نہ کرے گا۔

ہر مقرر کے لئے ضروری ہے کہ وہ آزادمنش اور وسیع الخیال ہو۔ ایک تنگ خیال اور کوتاہ نظر آدمی ہرگز اچھی طرح تقریر نہیں کرسکتا۔ دورانِ تقریر میں اس بات کا خیال ضرور رکھنا چاہیئے کہ تمہاری باتوں سے لوگوں کے دل زخمی نہ ہوں۔ کیونکہ جب وہ آدمی جو تمہارے جذبات و حسیات کو صدمہ پہنچانے کا باعث ہو کبھی تمہاری نظر میں محبوب نہیں ہوسکتا تو تمہاری تقریر بھی جب سے لوگوں کے جذبات کو صدمہ پہنچے کس طرح مقبولِ عام ہونے کا شرف حاصل کرسکے گی۔ غرض دل آزار تقریر کا نتیجہ یہی ہوگا کہ لوگ اپنے دل کے راستے تمہارے لئے بند کردیں گے اور تمہاری قوتِ جاذبہ منقطع ہوجائے گی جس کے بعد تمہاری تقریر کے بے معنی اور مردہ ہونے میں کیا باقی رہ جاتا ہے۔

ہر ایک مقرر کو چاہیئے کہ سامع کو اپنے نزدیک لانے کی کوشش کرے اور خوب دل کھول کر اپنے خیالات کو آزادانہ طور پر ظاہر کرے۔ سامع کے دل میں جن جن شکوک اور اعتراضات کے پیدا ہونے کا اندیشہ ہو اُن کے تشفی بخش جواب دے تاکہ سامع کے دل میں مقرر کی عظمت اور تبحرِ علمی کا نقش بیٹھ جائے۔

جس کسی شخص نے کہیں بھی کامیابی حاصل کی ہے وہ ضرور اپنی شخصیت یا قوتِ تقریر کے ذریعہ سے کی ہے۔ کسی باکمال مقرر کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی علمی قابلیت کا لوگوں میں تذکرہ کرتا پھرے بلکہ صرف اُس کی تقریر ہی لوگوں کے دلوں پر اُس کی عظمت کا سکہ بٹھادے گی۔ غرض ہر شخص کی قابلیت و استعداد کا مظہر صرف تقریر ہے۔

آخر میں میں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ تمہاری طبعی لیاقت یا تمہارا علم و فضل یا لباس فاخرہ کچھ کام نہ آئے گا۔ یہاں تک کہ دولت بھی تمہیں لوگوں کی نظروں میں محبوب نہ بنا سکے گی جب تک کہ تم اپنی لیاقت کو عمدہ تقریر کے ذریعہ سے ظاہر نہ کرو گے۔

(ترجمہ)

ابوسعید محمد عبدالقیوم

# رباعیات

### خدا

تو وہ ہے جسے غم میں پکارا ہم نے
تو وہ ہے جسے پایا ہے دل میں ہم نے
تو وہ ہے سنی جس نے دعاے مضطر
لیکن دی ترے [illegible] ہم نے

### توحید

بے شکل مثال میں کہاں سے لاؤں
بالفرض محال میں کہیں سے لاؤں
جو ہو نہ خلاف تیری یکتائی کے
یارب وہ خیال میں کہاں سے لاؤں

### توحید

یکتائی میں تو جیسے ہے حیرانی ہے
تحقیق خدائی کی جسے ارزانی ہے
ہے وجہ نہیں صداقتِ نظم حیراں
مقصود کہ وہ واحد و لاثانی ہے

### تشبیہ

غنچے میں نہیں ہے تبسم کو یارب
اور پھول میں ہے تبسم انشاء اللہ
عبرت کا مقام ہے تبسم کو یارب
[illegible] تبسم کو یارب

گویا
جہاں آبادی

# غم نصیب

سیاہ بادل ہیں آسماں پر ہوائے سرشار آ رہی ہے
ہر ایک ذرہ چمک رہا ہے ہر اک کلی مسکرا رہی ہے

نظر کے آگے کھلے ہوئے ہیں تمام بھولے ہوئے مناظر
کہ دھیمی دھیمی صدائے بارش، دماغ کو گدگدا رہی ہے

ترانہ بر دوش آ رہی ہیں کچھ اس طرح جاں فزا ہوائیں
کہ جیسے کچھ دور اک دوشیزہ ستار کی دھن پہ گا رہی ہے

پہ کھل رہا ہے کہ بال کھولے، بہار کی عشوہ کار دیوی
جو ہیں نہاں جنبشِ نظر میں، وہ قوتیں آزما رہی ہے

حریمِ گلشن میں ہیں فروزاں، گلوں کی لبریزِ نور شمعیں
فضائے صحرا میں ہر طرف اک حیاتِ نو مسکرا رہی ہے

مثالِ آغوشِ عشق وا ہے، حریمِ دل کا ہر اک دریچہ
کہ حسن کی اک لطیف تابش نظر کے پردے جلا رہی ہے

زمیں کے سینہ میں مضطرب ہیں چمن کی ترتیبِ نو کے جلوے
فروغِ بزمِ خزاں ہوئی تھی جو شمع اب جھلملا رہی ہے

حسین جلووں کی اس جھلک سے دھوئیں ہیں ان تیرہ بادلوں کے
یہ ہے نمایاں کہ صبحِ روشن، نقابِ فطرت اٹھا رہی ہے

---

مگر وہی کشمکش ہے اب بھی مرے طرب ناشناس دل میں
وہی غم انگیز کیفیت ہے جو روح پر میری چھا رہی ہے

گرفتہ خوابِ حزن اب بھی ہے جنبشِ خوں مری رگوں میں
اگرچہ سوتی ہوئی حسوں کو ہوائے تازہ جگا رہی ہے

گزر رہا ہے مرا تصور، انہیں خزاں پوش وادیوں سے
اگرچہ پیشِ نظر، عروسِ بہارِ نو مسکرا رہی ہے

مری اذیت نصیب آنکھوں سے بہ رہا ہے لہو ابھی تک
اگرچہ رُت کی نمو طرازی، نئے شگوفے کھلا رہی ہے

وہ آگ رگ رگ میں شعلہ زن ہے جو دل کی تہ میں سلگ رہی تھی
طرب فزا تازگی میں ڈوبی ہوئی ہوا گرچہ آ رہی ہے

نشاط رکھا ہے نام جس کا کبھی تہِ آسماں ملے گی؟
مجھے بھی ہستی کی منزلوں میں کہیں زمیں پر اماں ملے گی؟

سید علی اختر

# شہرِ بابل

بیا ساقی کہ ایں ویرانہ از بسیار کس ماندہ نہ در جانم ہوا باقی نہ اندر دل ہوس ماندہ

شہر بابل ایک مربع قطعہ پر واقع تھا۔ انگریزی میلوں سے ۶۰ میل میں اس کا دور تھا۔ شہر پناہ کی ہر دیوار میں پچیس دروازے تھے۔ شہر کے مربع کلاں میں پچیس بازار تھے اور ہر ایک دوسرے کو اس طرح قطع کرتا تھا کہ تمام شہر چھ سو چھہتر مربعوں میں تقسیم ہو گیا تھا۔ ہر بازار ایک دروازہ سے شروع ہو کر اپنے مقابل کے دروازہ پر ختم ہوتا تھا۔ اس طرح چوسر (چوپڑ) کے پچاس بازار بن گئے تھے اور اُن کی درمیانی زمین پر دلفریب و دل کشا پائیں باغ لگے ہوئے تھے۔ شارعِ عام پچاس تھے جو ایک دوسرے کو زاویۂ قائمہ میں قطع کرتے تھے۔ ہر بازار کا طول پندرہ میل اور ہر مربع کا دور دو میل تھا۔ چار خوشنما سڑکیں فصیل کے متصل دو سو فیٹ عرض میں تھیں۔ اور باقی ایک سو پچاس فیٹ چوڑی تھیں۔ ان کے علاوہ اور بھی چھوٹے چھوٹے صاف ستھرے بازار تھے اس لئے شہر چھ سو چھہتر مربعوں پر تقسیم ہو گیا تھا جس کا ہر ضلع طول میں کم و بیش آٹھ سو اسی گز تھا۔ اِن چھ سو چھہتر مربعوں میں تین تین چار چار منزل کے عالیشان خوبصورت و خوش قطع مکانات تعمیر کئے گئے تھے۔ درمیانی نصف حصہ باغوں اور سیر گاہوں کے لئے مخصوص تھا۔

قدیم حصۂ شہر دریا کے داہنے کنارہ پر اور جدید شہر تعمیر کردہ بخت نصر ثانی بائیں کنارہ پر آباد تھا۔ بیچ میں دریائے فرات جزن تھا۔ اُس کے کنارے کنارے سرتاسر اعلیٰ و نفیس گھاٹ پختہ اینٹوں سے بنائے گئے تھے۔ بخت نصر ثانی نے رعایا کے آرام اور سہولت کی غرض سے دریائے فرات پر بائیس گز طویل اور دس گز عریض ایسا ناد رپل بنایا تھا جو شب کو بند ہو جاتا تھا اور دن کو کھول دیا جاتا تھا [۱]۔

بقول ہراڈوٹس اور حکیم ڈی سیاس کوچہ و بازار کی نفاست، عمارات کی شان و شوکت حیطۂ بیان سے باہر اور دلفریب و دلکشا باغات کی شادابی رشکِ ارم تھی۔ رونق و عظمت اور شان و شوکت میں شہرِ بابل دنیا میں فرد اور لاثانی تھا۔ مگر "یہ ہزارہا سال ماسبق کا پارینہ افسانہ ہے"۔ بہر حال سخنورانِ عالم ہمیشہ شہر بابل کی رونق و جلال اور عظمت و کمال میں رطب اللسان رہے۔ افسوس زمانۂ ناسازگار کی دستبرد سے اب صرف پتھر اور مٹی کے ڈھیر اس عظیم الشان شہر کی یادگار ہیں۔

گیا حسن خوبانِ دل خواہ کا ہمیشہ رہے نام اللہ کا

---

[۱] بادشاہ عاہیرابی نیز اُس کے جانشینوں کے زمانہ میں دریا کو کشتی کے ذریعہ سے عبور کیا جاتا تھا لیکن بخت نصر ثانی نے مذکورہ بالا پل فرات پر تعمیر کر دیا۔ دریا کو ایسا قابو میں کیا تھا کہ بروقتِ ضرورت پانی تہ تک نکال سکتے تھے۔ پل بناتے وقت ایسا ہی کیا گیا تھا تاکہ پشتہ کے وزنی اور بڑے بڑے گھڑے ہوئے پتھروں کو کاریگر بہ آسانی لوہے کے پتروں سے جڑ کر سیسہ پلا سکیں۔

دریائے فرات جو کبھی اس میں موجیں مارتا تھا اس پریشان حالی میں وہ بھی ساتھ نہ دے سکا اور اپنا راستہ بدل کر جدا ہو گیا۔ سچ ہے "سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے"

ایک وہ زمانہ تھا کہ مال و اسباب سے لدے پھندے خوبصورت خوبصورت جہاز یہاں آ کر لنگر انداز ہوتے تھے یا اب کوسوں پانی نظر نہیں آتا۔

کیانانی شاہانِ ایران کے عہد میں شہرِ بابل کچھ زیادہ بے رونق و زوال پذیر حالت میں نہ تھا بلکہ داراب ثانی نے سنگِ مرمر کی ایک خوشنما عمارت قصر میں تعمیر کر کے اپنی یادگار چھوڑی تھی۔

مورخ کرٹیس کا قول ہے کہ سکندرِ اعظم کے زمانہ میں شہرِ بابل کی آبادی صرف گیارہ میل میں رہ گئی تھی باقی حصہ پر زراعت ہونے لگی تھی۔ بادشاہ موصوف نے شہر کی صفائی کے واسطے دس ہزار مزدور مقرر کر کے دوبارہ اس کو معمور کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن عمر نے وفا نہیں کی۔

سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد بابل بالکل تباہ و برباد ہو گیا[1]۔ ۲۹۴ء ق م، سلیوکس نائی کیٹر بادشاہ نے شہرِ بابل کے متصل دوسرا شہر سلیوسی کے نام سے بنایا۔ اور شہرِ بابل کے باشندوں سے زیادہ تر اُس کو آباد کیا۔ عہدِ پارتھیا[2] میں اُس کی نہایت بے وقعتی رہی جو اُس کی تباہی کا اور زیادہ باعث ہوا۔

شہرِ بابل کے زوال اور تباہی کے متعلق مورخ ڈائڈورس سائکیوس نے ۲۴ء ق م، اسٹریبو نے ۳۰ء ق م، پاسانیاس نے ۱۵۰ء میں اور پوسی بیس کے بقول میکسی مس ٹائرس اور بادشاہ کانسٹنٹائن اعظم نے ۳۲۵ء میں اُس کی تباہی و بربادی کی شہادت دی۔

انتہا کی تباہی اور بربادی کے متعلق آخر بیان مورخ جروم کا ہے جو لکھتا ہے کہ ۳۸۰ء میں شاہانِ ایران نے بابل کی دوہری فصیل کے سالم حصوں میں شکار کھیلنے کے لئے وحشی درندے پالے تھے۔

افسوس و صد ہزار افسوس۔

آں قصر کہ بہرام در و جام گرفت  روبہ بچہ کرد و شیر آرام گرفت

**محمد حامد (دہلوی)**

---

[1] سکندرِ اعظم کی وفات کے بعد اُس کے جنرل سلیوکس کے حصہ میں حکومتِ بابل آئی تھی لیکن دوسرے جنرلوں سے ۳۱۲ء ق م نمبر جنگ ممالکِ میڈیا یعنی عراق عجم۔ آذربائجان۔ طہران) سوسیانہ اور ایران اُس کے قبضہ میں آ گئے تھے۔

[2] پارتھیا یعنی خراسان۔ خاندان اشکانیاں کا پہلا بادشاہ ارسس یعنی اردشیر تھا اُس کا تعلق خراسان سے تھا، سلیوسڈ خاندان (یعنی سلیوکس کے خاندان) کو مٹا کر ملکِ ایران اور بابل پر قابض ہوا تھا۔

# جستجوئے محبت

رازِ ہستی ہے کہاں مقصدِ فطرت ہے کہاں
نفسِ ایماں ہے کہاں اصلِ شریعت ہے کہاں
شمعِ عرفاں ہے کہاں خضرِ طریقت ہے کہاں
رنگ بخشِ گلِ فردوسِ مسرت ہے کہاں
اہتمامِ دلِ انسان کی بشارت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

آبشاروں میں وہ جلوے ہیں نہ کہساروں میں
وادیوں میں وہ نظارے ہیں نہ گلزاروں میں
اب نہ ذروں میں وہ تابش ہے نہ سیاروں میں
زاہدوں میں وہ حقیقت ہے نہ میخواروں میں
منتظر روح ہے جس کی وہ لطافت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نہ عبادت میں نیاز اور نہ ارادت میں خلوص
نہ نمازوں میں تقدس نہ ریاضت میں خلوص
نہ کبھی معتکفِ گوشۂ خلوت میں خلوص
نہ کسی زاہدِ مرتاض کی نیت میں خلوص
آخرش جذبۂ تقدیس کی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

بزمِ فطرت کے نظاروں میں تبسم بھی ہے
بربطِ دہر کے نغموں میں ترنم بھی ہے
بزمِ خورشید بھی ہے محفلِ انجم بھی ہے
میکدہ بھی ہے قدح خوار بھی ہے خم بھی ہے
وہ سرورِ مئے عنابیِ جنت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

دل تو ہیں پریم کے مندر کے پجاری نہ رہے
آہ! دربارِ محبت کے بھکاری نہ رہے
جن سے تقدیس کے چشمے ہوئے جاری نہ رہے
عشق تھا جن کا پسندیدۂ باری نہ رہے
جس کی حسرت تھی فرشتوں کو وہ عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

زمزمے موجۂ جمنا نے سنائے جس کے
پھول ہر لہر نے مندر میں چڑھائے جس کے
گیت ہر روز نئے "شیام" نے گائے جس کے
خواب رادھا نے نگاہوں میں بسائے جس کے
وہ زمانے کے مذاہب کی حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

سحرِ کُن آج بھی ہے ساحرۂ وادیِ نیل
نغمہ گر آج بھی ہے مطربۂ وادیِ نیل
بے اثر کیوں ہے مگر زمزمۂ وادیِ نیل
کیا ہوئی شانِ تقدس کدۂ وادیِ نیل
عصمتِ خوابِ زلیخا کی حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

عربستاں بھی ہے اور نجد کی محفل بھی ہے
کارواں بھی ہیں مسافر بھی ہیں منزل بھی ہے
قیس والے بھی ہیں اور لیلیٰ محمل بھی ہے
اس حقیقت میں مگر جلوۂ باطل بھی ہے
قیسِ عامر کو جو بخشی تھی وہ وحشت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

ارضِ مغرب ہے تو مشرق بھی ہے دیوانۂ نفس
"ذوق والوں" کے لئے عام ہے میخانۂ نفس
کچھ کلیسا نہیں، ہے دیر بھی کاشانۂ نفس
رقصِ مرتاض ہے یا لغزشِ مستانۂ نفس
اب وہ معصومیِ جذباتِ عبادت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

جلوہ ریزی بھی ہے دیدار بھی ہے طور بھی ہے
ارتقا بھی ہے ہم آوازیِ منصور بھی ہے
حسن والے بھی ہیں اور عشق کا دستور بھی ہے
خسروِ عشق تو ہیں پر کوئی مزدور بھی ہے؟
وہ اولعزمیِ فرہاد کی رفعت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

علم ہے اور جہالت کی نشیبی منزل
لفظ ہے اور سفاہت کی نشیبی منزل
مرکزِ زہد ہے شہوت کی نشیبی منزل
"اوجِ انسان ہے" ذلت کی نشیبی منزل
پیکرِ خاک کو بخشی ہوئی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نہ وہ احساس ہے باقی نہ وہ خودداری ہے
نہ وہ ایثارِ محبت نہ وفاداری ہے
بندۂ نفس ہیں تقدیس سے بیزاری ہے
فرضِ انساں ہے اگر کچھ تو دل آزاری ہے
دلِ محدود کی کھوئی ہوئی وسعت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

اب کہاں وہ کششِ جذبۂ محمود و ایاز
اب کہاں عشق و محبت کے مقدس انداز
اُن کے جذبات کی تکمیل تھی تقدیسِ نیاز
آج عارف ہی حقیقت کو بناتے ہیں مجاز
ظلمتِ عام ہے وہ شمعِ حقیقت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

نظمِ ہستی ہے تو شعریتِ معصوم نہیں
مے پرستی ہے تو کیفیتِ معصوم نہیں
عبد ہیں پر وہ عبودیتِ معصوم نہیں
بےخودی بھی ہے تو محویتِ معصوم نہیں
فرش پر عرش سے اُتری ہوئی عظمت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

طلبِ گل، خلشِ خار سے اقدامِ گریز
ہوسِ ذرہ ہے کہسار سے اقدامِ گریز
شوقِ مے، لغزشِ میخوار سے اقدامِ گریز
جستجو، اور رہِ دشوار سے اقدامِ گریز
جو بعید از عمِ منزل ہے وہ حسرت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

یا خدا تیرے حبیبِ عربی کا صدقہ
آلِ اطہار کا اصحابِ نبی کا صدقہ
یا خدا روحِ اویسِ قرنی کا صدقہ
یا خدا عشقِ بلالِ حبشی کا صدقہ
نکہتِ غنچۂ فردوسِ نبوت ہے کہاں
اے محبت کے خداوند محبت ہے کہاں

روح بخشی ہے تو اسبابِ لطافت بھی دے
تو نے احساس دیا ہے تو مسرت بھی دے
خاک سے تو نے بنایا ہے تو عظمت بھی دے
تو نے جذبات جو بخشے ہیں تو عصمت بھی دے
میں امیں ہوں تو مرے دل کی امانت بھی دے
اے محبت کے خداوند محبت بھی دے

روشؔ صدیقی

# فرانس اور ہندوستان

ساری دنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔ جسے یہ باور نہ ہو فرانسیسی بیوی سے شادی کر کے خود آزمالے۔ اور ملکوں میں سادگی کی کچھ نہ کچھ انتہا ہے مگر فرانس کو دنیا سو دفعہ دھوکا دے چکی ہے اور ابھی سو دفعہ اور دے گی پر اس پر بھی فرانس والے بھولے پن کی بانکپن نہ چھوڑیں گے۔ نہر سویز بنائی فرانس کے سپوت فرڈینینڈ ڈی لسیپس نے، اڑا لے گئے کوئی اور۔ مگر پاناما نہر کا جب چرچا ہوا تو فرانس کا سونا پانی کی طرح بہا۔ پہلا تلخ تجربہ کسی کام نہ آیا اور آخر فرانس کا شروع کیا ہوا کام امریکا نے تیس سال بعد اکتوبر ۱۹۱۳ء میں پورا کیا۔ اس سودے میں فرانس کے حصے میں گھاٹا، ندامت اور بدنظمی آئے اور امریکا کے حصہ میں تجارت، اقتدار اور طاقت جنگِ عظیم میں تو فرانس کے بھولے پن کی ہزاروں مثالیں زبان زدِ خلق ہیں مگر وہی ایک ذکر کافی ہے کہ جب ایک خاص نازک موقع پر شہرۂ آفاق موسیو کلیمنسو سے پوچھا گیا کہ آپ کی پالیسی کیا ہے تو فرمانے لگے:۔

"گھر میں لڑتا ہوں۔ باہر لڑتا ہوں۔ زندگی کے اخیر پندرہ منٹ تک لڑوں گا۔ اور میری پالیسی کیا ہے؟"

اور ان چند سادہ جملوں کا وہ برقی اثر ہوا کہ فرانس کی اس وقت کی سیاسی زندگی کے قالب میں گویا نئی روح پھک گئی۔ چار سو ڈپٹیوں نے ہاں میں ہاں ملادی اور فرانس کے سپاہی کٹنے مرنے پر تلے رہے۔ بھولے فرانس نے ایک دفعہ بھی نہ پوچھا کہ صاحب آپ لڑتے تو ہیں مگر نتیجہ؟ جنگِ عظیم کے بعد جب انگلستان اور امریکا دونوں سے توقع اُٹھ گئی تو فرانس نے جرمنی پر اعتبار کر لیا۔ جرمنی نے روکھا پھیکا سا جواب دیا تو فرانس اپنے جانی دشمن پوپ سے علیک سلیک کر کے خوش ہو گیا۔ اور جب وہاں سے بھی نامرادی نظر آئی تو پھر انگلستان سے بات چیت ہونے لگی۔

یہ تو خیر ساری دنیا کو علم ہو چکا ہے کہ فرانس کا روپیہ سمیٹنا ہو تو فرانس کی دوستی کا دم بھرو اور کوئی بودی سی کمپنی چلاؤ۔ فرانس میں اس کا چرچا کرو اور پھر اگر قسمت یاوری کرے تو روپیہ کا کال نہیں رہتا۔ اس مجرب نسخے سے کئی غیر فرانسیسی کمپنیاں مالا مال اور کئی ہزار غریب فرانسیسی خاندان برباد ہو چکے ہیں اور ابھی تک فرانس میں بے اعتباری پیدا نہیں ہوئی۔ روس نے تو فرانس کا ہزاروں من سونا کچا چبا لیا مگر اُس زمانے میں روس کا ہاضمہ تیز تھا اور یہ کچھ تعجب خیز نہیں۔ تعجب خیز یہ ہے کہ مریض ترک بھی لقمۂ طلائی سے پرہیز نہ کر سکا۔

بقول ایک مورخ "اگر مورخ تاریخ کی کتابوں میں واقعات درج نہ کریں اور واقعات سے نتائج اخذ کرنے کی علت چھوڑ دیں تو تاریخوں میں کس قدر بیش بہا اضافہ ہو!" فرانس کی جبلی عادت ہے کہ اپنے آپ کو بھولے پن سے دھوکا دے کر خوش ہو۔ فرانس والے خوش رہنا چاہتے ہیں۔ خوشی ایک قسم کا دھوکا ہے نتیجہ یہ کہ ساری دنیا میں سب سے بھولا ملک فرانس ہے۔

(۲)

ساری دنیا میں سب سے چالاک ملک ہندوستان ہے جسے یہ باور نہ ہو ہندوستانی بیوی سے شادی کر کے خود آزما لے۔ آج شادی کل بچہ پرسوں اُس کی تقریب۔ ساتھ کے ساتھ بیماری پھر اپنا مرنا۔ اس قدر چالاک بیویاں ہیں کہ کسی اور پر شوہر کو مرنے کی فرصت ہی نہیں دیتیں۔ جو حال ہندوستان کی بیویاں اپنے شوہروں کا کرتی ہیں وہی حال ہندوستان اپنے غیر ہندوستانی حکمرانوں کا کرتا ہے مگر اس کی تہ میں جو چالاکی ہے اُس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔ ابھی کل کی بات ہے کہ انگلستان اور ہندوستان کی شادی ہوئی تھی۔ رنگون میں سارے ہندوستان کا آخری دہلوی تاجدار اور کلکتہ میں لکھنو کا آخری لکھنوی فرمانروا شاید ابھی نظروں کے سامنے تھے یا یونہی سے اوجھل ہوئے تھے کہ ملکہ معظمہ نے قیصر ہند کے شاندار لقب سے مغرب مشرق کا عقد رچایا تھا۔ غدر کے بعد کا اعلان گویا منگنی تھی۔ قیصری دربار گویا بیاہ۔ چٹ منگنی پٹ بیاہ اور ساتھ ہی کانگرس سی بے چین بچی۔ یہ بھی ہندوستان کی چالاکی تھی کہ پلوٹھی کا بچہ بجائے لڑکے کے لڑکی۔ اب اس بچی نے بھی بچہ دے ڈالا یعنی آل پارٹیز کانفرنس۔ دیکھا چاہیئے کہ یہ نئی بی کیا گل کھلاتی ہیں مگر ہندوستان کی اصل چالاکی ایک گہرا فطرتی راز ہے۔ کئی ہزار سال سے ہندوستان کا منصوبہ یہ ہے کہ غیر ملکوں سے لوگوں کو ورغلا کر یہاں لایا جائے۔ انہیں حکومت پسندی سکھا کر کمزور کیا جائے اور یہ چال یہاں تک کھیلی جائے کہ ساری دنیا میں کوئی اس دلدل سے بچ نہ سکے۔ اصلی آریہ لوگوں کو یہاں بلا کر خوار کیا گیا۔ پھر بیچارے سکندر اعظم کو کشاں کشاں لایا گیا (جاتے ہی جان سے گیا) پھر وسط ایشیا کے "تاتاری آئے۔ چغتائی آئے۔ ایران کا قزلباش۔ افغانستان کا دُرّانی اور کیا کیا۔ ہندوستان کا وہی ایک پرانا منصوبہ ہے کہ باری باری سب کو ضعیف کر دیا جائے۔ آج کل انگریز بچارے تختۂ مشق ہیں۔ اس قدر انہیں حکومت پسند بنایا جا رہا ہے کہ جب واپس جاتے ہیں تو خود اُن کے اہل وطن اُن کی "کوئی ہے؟" کی ہانک سے چونک اٹھتے ہیں۔ اصل منشا یہی ہے کہ جب باری باری سب قومیں (کیا انگریز کیا جاپانی کیا چینی) ہندوستان پر حکومت کر کے کمزور ہو جائیں تو پھر ہندوستان ایک دم ساری دنیا پر حاوی ہو کر شاہنشاہی کرنے لگے۔ یہاں کی غربت، افلاس، بیماریاں سب کی سب اس ہر کری

چالاکی کی معاون تدابیر ہیں۔ اگر یہ نہ ہوں تو ہندوستان کو مجبوراً خوش ہونا پڑے مگر خوشی ایک دھوکا ہے (ہندوستان کے فلاسفر پہلے ہی یہ لکھ چکے ہیں) اور اس لئے اس دھوکے سے بچنے کے لئے انسان کو بیمار اور مفلس اور محکوم اور مظلوم رہنا لازمی ہے

(۳)

سوال یہ ہے کہ قدیم ہندوستان کی یہ خوفناک سازش جسے آج پہلی دفعہ ہمایوں میں طشت ازبام کیا جارہا ہے، مگر جس کا دراصل دنیا کے پاس علاج کچھ نہیں کیونکہ جب انگریزوں جیسی قوم ہندوستان کے دامِ فریب میں گرفتار ہو چکی تو باقی قومیں کس گنتی میں ہیں، جب پوری طرح کامیاب ہوگی اور اس میں کچھ شک نہیں کہ ضرور کامیاب ہوگی تو کیا اُس وقت بھی فرانس بھولا ہی رہے گا۔ اور ہندوستان بدستور چالاک رہے گا۔ یا ان خصائل میں ردوبدل ہوگا؟ ایک بات تو قطعی یقینی ہے یعنی یہ کہ عارضی وفا کی وہ دیوی جسے غلط العام میں فرانسیسی عورت کہا جاتا ہے اور دائمی جفا کی وہ کالی ماتا جسے اصطلاحاً ہندوستانی بیوی کہا جاتا ہے اپنی عادت نہ بدلیں گی۔ اول الذکر بچہ پیدا کرنا نہیں چاہتی، موخر الذکر کو بچہ پیدا کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔

مگر جس بات سے شک پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ جہاں ہندوستان میں اور لاکھوں متعدی بیماریاں ہیں وہاں کہیں خوشی کا مرض لاحق نہ ہو جائے۔ فرانس کا تجربہ یہ ثابت کرتا ہے کہ خوشی ضرور متعدی ہے۔ ہندوستانی دانشمندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہندوستان میں خوشی نہ آئے کیونکہ خوشی آئی تو ہندوستان گیا۔ گویا یہ لازم ہوا کہ ہندوستان اور فرانس کے درمیان معاشرتی پردہ مستحکم کیا جائے ورنہ بالکل ممکن ہے کہ اگر یہ پردہ قائم نہ رہا تو فرانس سے خوشی کا مرض ہندوستان میں پھیل جائے اور یہاں بجائے اُس ریں ریں کے چرخے کے (جس کے مسٹر گاندھی بڑے پیغمبر ہیں) ناچ اور رنگ کی محفلیں قائم ہو جائیں اور ہندوستان کا اصل مطلب یعنی یہ کہ ہندوستان ساری دنیا سے اپنے اوپر حکومت کرکے پھر ساری دنیا پر مسلط ہو فوت ہو جائے۔ کیونکہ اگر ہندوستان خوش ہوا تو ہندوستان ہی نہیں رہے گا تو پھر ساری دنیا پر ہماری حکومت کس کام کی۔

(۴)

جو چالاک ہوتے ہیں وہ ثابت قدم ضرور ہوتے ہیں۔ نہ الجھتے ہیں نہ گرتے ہیں۔ پڑے پڑے پٹا کرتے ہیں اس اپنی اصلی دھن میں کہ پیٹنے والے خود تھک تھکا کر دفع ہو جائیں گے اور پھر ہم اٹھ کر سب کچھ سنبھال لیں گے۔ اُن میں فرانسیسیوں والی عادت نہیں ہوتی کہ "لڑیں گے اور مریں گے" وہ نفع نقصان سوچا کرتے ہیں۔ تیل دیکھتے ہیں تیل کی دھار دیکھتے ہیں۔ یہ قدرتی پردہ تو بھلے اور چالاکوں میں ضرور ہے مگر وہ معاشرتی پردہ جس کی ہندوستان کو ضرورت ہے اور جس کے

بغیر فرانس ہماری آنے والی عظمت کے لئے ایک مہلک خطرہ ہے کس طرح قائم ہو؟ سب سے پہلے تو یہ لازم ہے کہ فرانس کے خلاف ایک بھاری پروپیگنڈا شروع کیا جائے کہ ہندوستان کا اگر کوئی دشمن ہے تو فرانس ہے۔ اس شدت سے اس امر کی تلقین کی جائے کہ ہندوستان میں ہر کہ و مہ فرانس کے نام سے بیزار ہو جائے۔ اور اس پروپیگنڈا کا ابھی شروع کرنا نہایت ضروری ہے کیونکہ جس طرح ہمارے بزرگوں نے کئی ہزار سال پہلے یہ پالیسی اختیار کرلی تھی کہ دنیا کی قوموں کو یکے بعد دیگرے کمزور کرنا چاہئے اسی طرح ہم کو بھی اپنی آئندہ عظمت سے کئی ہزار سال پہلے اس خطرہ کا تدارک کرنا چاہئے جو تب ہمارے لئے شاید نمودار ہو۔ وہ قومیں محض بے وقوف ہیں جو اپنی پالیسی دس بیس سال کے مستقبل کو مدنظر رکھ کر قائم کرتی ہیں جس طرح روحانی معاملات میں ہندوستان نے آواگون کے چوراسی لاکھ قالب کے جال کو پھاڑ کر صرف نروان مدنظر رکھا ہے اسی طرح سیاسی معاملات میں بھی ہم کو چوراسی ہزار سال نہیں تو کم از کم چوراسی سو سال پیشتر اپنی پالیسی قائم کرنی چاہئے۔ باقی سب دنیا سے ہم نپٹ سکتے ہیں اور ضرور نپٹ لیں گے صرف وقت کی دقّت ہے اور اس کی ہمیں کچھ پروا نہیں مگر فرانس، بھولا فرانس، جہاں اوروں سے تو خیر ہوا خود میاں کا بیوی سے گزارا لبھانی ہے، وہ مہیب خطرہ ہے جس کا فوری تدارک لازم ہے۔ اس لئے اگر ہمیں کامیاب ہونا ہے تو اولین فرض یہ ہے کہ حسب ذیل تجاویز پر عمل کیا جائے۔

ا۔ جو ہندوستانی بیوی تیس سال کی عمر میں نانی اور چالیس سال کی عمر میں بڑھیا نہ ہو اُسے دو تین من سونا پہنا کر کافی گہری جگہ گنگا اشنان دیا جائے۔ وہ سونا پھر کام آسکتا ہے۔

ب۔ خوشی کے برخلاف ہر بندرگاہ میں، ہر شہر میں، ہر گاؤں میں بلکہ ہر روح میں ایک quaran tine. قرنطینہ قائم کی جائے۔ اس پر بھی اگر خوش رہنے کا مرض پھیلے یعنی کوئی کسی کو دیکھ کر یا یاد کر کے خوش ہو تو اسے فوراً قتل کر دیا جائے۔

ج۔ فی شہر فی قوم کم از کم تین لیڈر ہونے لازمی ہیں۔ ان میں سے ایک مذہب کا، ایک ماضی کا، اور ایک مستقبل کا حامی ہو مگر سب کے سب خوشنما ساڑھی، پتلی کمر سے محبت کرنے کے برخلاف ہوں۔ نہ صرف اُن کا لباس بلکہ اُن کی روح بھی موٹے کھدر کی ہو۔

فلک پیما

# خیال اور تعمیر حیات

ہم وہی ہیں جو ہمارے خیالات ہمیں بنا دیں۔ کائنات روز ازل سے ایسی ہی تھی جیسی آج ہے۔ فطرت کے دامن میں کانٹے بھی تھے اور پھول بھی۔ پھر کیا وجہ ہے کہ بعض دفعہ تو دنیا سراسر پھولوں اور پنکھڑیوں سے لدی ہوئی گویا عروسِ بہار معلوم ہوتی ہے اور دوسرے ہی لمحہ میں یہ لہلہاتا ہوا گلشن، جو شگوفوں اور کلیوں کی کثرت سے جنتِ نگاہ بن رہا تھا، یک لخت خارزار اور لق و دق ریگستان میں تبدیل ہو جاتا ہے جہاں قدم قدم پر کانٹوں سے پاؤں لہولہان اور جسم بادِ سموم کے آتشیں تھپیڑوں سے جھلس جاتا ہے؟ یہ ہماری نگاہ کی تبدیلی نہیں تو اور کیا ہے؟ آپ کہیں گے پھر یہ تمام دکھ اور مصیبتیں جن سے دنیا بھرپور ہے جن کے ہاتھوں ہر انسان نالاں ہے اور جو بھڑوں کی طرح ہمیں کاٹ رہی ہیں حقیقت میں کوئی وجود نہیں رکھتیں؟ حیران نہ ہو جیے میرا یہی جواب ہے، کہ فی الحقیقت ان کا کوئی وجود نہیں۔ یہ سب کچھ جسے ہم دکھ اور تکلیف سمجھ رہے ہیں۔ ہمارے ہی تخیل کی بے راہ روی اور خیال کی بغاوت کا نتیجہ ہے!

ہم دنیا کو رنگین چشموں سے دیکھنے کے عادی ہیں۔ رنگوں کا اختلاف اشیا کی نوعیت ماہیت نہیں بدل سکتا۔ لیکن کتنے عقلمند لیسے ہیں جن کی زندگیاں اس نظریہ کا عملی ثبوت پیش کر سکتی ہیں؟ اگر چشمہ گدلا ہے تو بلاشبہ کل جہاں گدلا نظر آئے گا۔ اور صاف و خوشرنگ ہے تو زمان و مکان تبسم نظر آئیں گے۔ یقین نہ آئے تو آزما دیکھو۔ آخر وہ چشمہ کیا ہے جو ہماری حیات کی تعمیر و تخریب میں اس قدر دسترس رکھتا ہے؟ وہ خاموش خیالات ہیں جو ہر لمحہ انسانی زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھال رہے ہیں۔ تم بے خبری کے عالم میں اونگھ رہے ہو اور دلپذیر مواقع کی سوچ میں ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا بیٹھے ہو اور وہ بظاہر نحیف و کمزور خیالات، جو تمہارے نزدیک لاشئے محض ہیں، جن پر توجہ کرنا بھی تم نے کبھی گوارا نہیں کیا، اندر ہی اندر ایک خاص کیمیاوی ترکیب سے تمہارے گرد آہنی زنجیروں کا جال بچھا رہے ہیں جس سے تم چاہو بھی تو نہ نکل سکو گے۔ تمہارے دل کی دنیا میں برقی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر ہر لحظہ تمہارے ماحول کی تخلیق میں مصروف ہیں اور تم خارجی اسباب کے انتظار میں ہو جو خود بخود آ کر تمہاری قسمت تبدیل کر دیں گے۔

خارجی اسباب؟ ہم ایک حیرت ناک مغالطہ اور فریبِ نفس میں مبتلا ہیں۔ یہ نہ سمجھیے کہ میں حالاتِ نامساعد اور واقعاتِ مخالف کی حقیقت سے انکار کرتا ہوں۔ میں بلیات و مصائب کی طرف سے آنکھ بند نہیں کر سکتا جب کہ

خود ایک طویل عرصہ تک حوادثِ دہر اور بلائے آسمانی کا شکار رہ چکا ہوں۔ لیکن زندگی کی ترتیب میں ہم کلیتہً کیوں بیرونی اسباب کے ماتحت چلتے ہیں؟ قصرِ حیات کی ذمہ داری تین حصے تمہارے سر عائد ہوتی ہے اور ایک حصہ اُن امور پر جو بظاہر پردۂ غیب سے از خود نمودار ہو کر تمہاری مساعی پر فتح و شکست کی مہر ثبت کرتے ہیں۔ میں نے اس میں بھی رعایت سے کام لیا ہے۔ ورنہ وہ لوگ جنہوں نے محض اپنے بل بوتے سے مخالف قوتوں پر غلبہ پایا، جنہوں نے اپنے دست و بازو سے متصادم عناصر کو زیر کرکے اس اژدہام کو چیر کر اپنی راہ آپ بنائی یہی کہیں گے کہ

نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

اُن کے سامنے "قسمت" کا نام لینا گویا انسانیت اور اُن محیر العقول طاقتوں کی جو اس ایک لفظ انسانیت میں مضمر ہیں ہتک کرنا ہے۔ آپ میرے سامنے کئی مثالیں لے آئیں گے "فلاں شخص نے سالہا سال کوشش کی پھر بھی اپنے حالات تبدیل نہ کرسکا۔ وہ کئی برس جدوجہد میں مصروف رہنے پر بھی بدقسمتی اور نحوست کو جو اس کے گرد احاطہ کئے ہوئے تھی رفع نہ کرسکا۔ اُس نے مدتوں مشکلات کی سنگین دیواروں سے بے سود ٹکریں ماریں لیکن دَرِ مقصود ہاتھ نہ آیا۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاید آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ انسان حالات کا غلام ہے اور تقدیر کے زنداں سے نکل نہیں سکتا۔ الفاظ کا غلط استعمال نہ صرف انسانی تعلقات کو بہت کشیدہ کرسکتا ہے بلکہ ہمارے علم کو غیر صحیح اور ناقص بنا دیتا ہے۔ کسی چیز کی خواہش کرنے یا چاہنے اور اس کے حصول کی "کوشش" کرنے میں نمایاں فرق ہے۔ ہم میں سے ننانوے فیصدی لوگ اپنے مطامحِ نظر کو بہت بلند کرلیتے ہیں۔ اُن کی نگاہیں فرشِ خاکی سے بلند ہو کر فضائے آسمان کی سیر میں مصروف رہتی ہیں اور وہ چاہتے ہیں کہ ایک ہی جست میں دنیا اور اُس کی آلودگیوں کو چھوڑ کر عالم بالا میں پہنچ جائیں۔ مگر قوائے عمل اور استقلال کی یہ حالت ہے کہ اس پہنائے عظیم کو طے کرنے کی ہمت تو کجا اُس کی وسعت پر نگاہ ڈال کر ہی دل بیٹھ جاتا ہے۔ جب تخیل اور عمل، خواہش اور کوشش میں اتنا بعد اور فرق ہو تو اطمینانِ قلب کیونکر پیدا ہوسکتا ہے۔ شاعرِ بے نظیر نے سچ کہا ہے۔

غمِ آرزو کا حسرت سبب اور کیا بتاؤں
مری ہمتوں کی پستی مرے شوق کی بلندی

جب کبھی تم ایسے شخص کو دیکھو جو کسی چیز کا خواہشمند ہے اور بظاہر اُس کے حصول میں کوشاں بھی ہے لیکن پھر ناکام رہتا ہے تو سمجھ لو کہ اُس کی کوششوں میں نقص ہے۔ ناممکن ہے کہ تم سیدھے راستہ پر گامزن رہو اور پھر منزلِ مقصود پر نہ پہنچ سکو۔ سو میں ننانوے ناکامیاں ایسی ملیں گی جن کی وجہ خواہش کی موجودگی اور کوشش کا فقدان ہوتا ہے۔

پہاڑ کی سب سے اونچی چوٹی تک پہنچنے، امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے اور اپنے ہم جنسوں میں دنیوی اعزاز و امتیاز پانے کے لئے جہاں تمہارے اندر شدید خواہش اور آتش خیز ولولہ کی ضرورت ہے، ایسا ولولہ جو تمہارے جسم اور روح میں ایک برقی رو دوڑا دے۔ جو اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے تمہیں بے قرار رکھے۔ وہاں یہ بات بھی اشد ضروری ہے کہ تمہارا عمل ایسا محکم، ارادہ ایسا مصمم اور ہمت اس قدر مضبوط ہو کہ راستے کی مشکلات تمہارے ماتھے پر شکن تک نہ ڈال سکیں۔

ا۔ ب دو طالب علم ایک جماعت اور ایک ہی مدرسہ میں پڑھتے ہیں۔ دونوں یکساں طور پر ذہین اور محنتی ہیں دونوں کی مالی اور معاشری حالت بھی قریب قریب ایک جیسی ہے۔ دونوں بیک وقت امتحان میں شامل ہوتے ہیں۔ اور سوء اتفاق سے دونوں ہی ناکام رہتے ہیں۔ اسی ناکامی سے ا اس قدر متاثر ہوتا ہے کہ اپنی طبیعت کا توازن بھی قائم نہیں رکھ سکتا۔ ہر وقت متفکر و مغموم۔ افکار اُس کے دماغ کو پریشان کئے دیتے ہیں۔ دل برداشتہ ہو کر وہ مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس ہو جاتا ہے اور آخر سال بھر حزن و ملال کا شکار رہ کر ناچار ایک معمولی سے سلسلہ روزگار میں منسلک ہو جاتا ہے۔ ادھر ب کے لئے امتحان میں ناکامی کی خبر، ہر چند کہ بالکل غیر متوقع تھی ایک تازیانہ کا کام دیتی ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ اُس کی محنت بار آور نہیں ہوئی لیکن مایوس نہیں ہوتا۔ ایک نئی ہمت نئی زندگی، نئے ارادے کو دل میں جگہ دے کر غم ماضی کو بالکل فراموش کر کے وہ پھر کتاب پکڑ کر مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے سال بھر کے بعد امتیازی کامیابی حاصل کر کے آئندہ تعلیم جاری رکھتا ہے اور سالہا سال کے بعد مکمل تعلیمی سلسلہ کو بخیر و خوبی ختم کر کے ایک بہت بڑے عہدے پر فائز ہو جاتا ہے۔

اب بتائیے، اگر ہم خارجی حالات کے غلام ہوتے تو امتحان کی ناکامی نے ا اور ب دونوں کی زندگیوں پر کیوں ایک سے جیسے نتائج مرتب نہ کئے۔

عاشق حسین

---

# پھُول

یہ اُن ہزاروں کی مانند ایک تھا جو اپنی خاموش خوبصورتی میں بڑھتے ہیں۔
مگر آہ اِس سے کتنے محبت کے افسانے پھوٹ پڑے جب تم نے اسے توڑ کر مجھے دے دیا۔

محسن

# تجلّیات

شیدائے آرزو دلِ محزوں نہیں ہے اب    شاید نگاہِ حسن میں افسوں نہیں ہے اب
جو کچھ ملے کسی سے محبت میں ہے قبول    یعنی وہ کاہشِ کم وافزوں نہیں ہے اب
پیشِ نظر صحیفۂ الفت ہے رات دن    مجھ کو دماغِ علمِ فلاطوں نہیں ہے اب
بیٹھا ہوا ہوں خاک بسر کوئے یار میں    سر میں ہوائے فرِ فریدوں نہیں ہے اب
اتنا کیا ہے تیری محبت نے سرفراز    میری نظر میں گنبدِ گردوں نہیں ہے اب
لیلےٰ ہو کس کے واسطے زحمت کشِ وفا    عاشق تو ہیں مگر کوئی مجنوں نہیں ہے اب

---

اب بھی ہے چشمِ عشق سے خونابِ دل رواں   ق   پر آستینِ حسن ہی گلگوں نہیں ہے اب
اب بھی ہمارے جام وسبو ہیں بھرے ہوئے    لیکن وہ شوق زالبِ میگوں نہیں ہے اب
صہبا وہی ہے خُم بھی وہی جام بھی وہی    لیکن وہ بزمِ عیشِ ہمایوں نہیں ہے اب
اب بھی نہیں ہے تنگ کوئی عرصۂ حیات    ہنگامہ خیز دل میں مگر خوں نہیں ہے اب
دنیا کے مخمصوں سے فراغت نہیں مجھے   ق   والد کا سر پہ ظلِّ ہمایوں نہیں ہے اب

اکبر غمِ معاش میں کچھ سوجھتا نہیں
سچ ہے کہ میری نظم میں مضموں نہیں ہے اب

جلال الدین اکبر

# چُپ کی داد

(اناتول فرانس کے رنگ میں ایک مختصر کومیڈی)

## ارکان

| | | | |
|---|---|---|---|
| دانیال | ایک جج | شگوفہ | نوکرانی |
| ادہم | ایک وکیل | سائمن | ڈاکٹر |
| نکہت | جج کی بیوی | سررشتہ دار | |

(مقام لاہور۔ وقت ۹ بجے سے ۱۲ بجے صبح تک۔ مسٹر جسٹس دانیال کی کوٹھی کا بائیں کمرہ۔ داہنے طرف کا دروازہ کھولئے تو گرجا اور ڈاک گھر صاف نظر آتے ہیں۔ بائیں طرف سے سیڑھیاں بالاخانے کو جاتی ہیں دیوار سے ججوں کی ہیبت ناک تصویریں آویزاں ہیں۔ متعدد الماریوں میں بے شمار کتابیں قرینہ سے رکھی ہیں۔ ایک میز پر بہت سی مثلیں پڑی ہیں۔ کتابیں اتارنے کے لئے ایک سیڑھی ہے جسے پہیئے لگے ہیں۔ لکھنے کی میز صوفے۔ کرسیاں۔ ایک کونے میں میز پر ایک خوبصورت چرخا اور سینے پرونے کا سامان ہے۔ تمام عمل اسی ایک کمرہ میں ہوتا ہے)

## پہلا سین

(دانیال اور ادہم باتیں کر رہے ہیں)

دانیال۔ بغداد سے آنے کے بعد؟ نہیں یوں کہئے کالج چھوڑنے کے بعد یہ پہلی ملاقات ہے۔

ادہم۔ اس عرصہ میں کیسے رہے۔ یہ ہے پہلا سوال جو مجھے پوچھنا چاہیئے (چاروں طرف نظر ڈال کر) مگر یہ محض تکلف ہے۔

دانیال۔ لیکن جو تمہیں نظر آرہا ہے۔ یہ میرے دل کی کیفیت کا عکس نہیں۔

ادہم۔ یوں شہر کی فکر میں دبلا ہونا منظور ہو تو اور بات ہے ورنہ ماشاءاللہ جج ہو (چرخے کی طرف اشارہ کرکے) ایک خوبصورت عورت کے خاوند ہو، عزت ہے، رُعب ہے، رسوخ ہے، روپیہ ہے، صحت ہے۔ خدا لگتی کہوں تو قدرت

تمہاری شکل دیکھ کر اپنی دین کا معیار بھول جاتی ہے۔

دانیال۔ یہ تمہاری بھول ہے۔ بھائی قدرت کی ترازو رنج و راحت کا توازن کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ ظاہر میں کو خواہ کچھ نظر آئے مگر بات یہ ہے کہ وہ آج جتنا ہنسائے گی کل اتنا ہی رُلا کر دم لے گی۔ مجھی کو لو جج ہوں مگر ہر ایک چیز بازار سے خریدتا ہوں۔ بیوی رکھتا ہوں مگر نہ میری سنے نہ اپنی کہے۔ رعب ہے مگر اُن پر جو میرے سامنے گرفتار ہو کر آئیں اور اپیل کی توفیق نہ ہو۔ عزت ہے مگر صرف انہی کی آنکھوں میں جن کے حق میں فیصلہ صادر کروں۔ رہی صحت تو اس کا حال ان سے پوچھئے (ایک الماری کھول کر دکھاتا ہے جس میں دواؤں کی شیشیاں رکھی ہیں)

ادہم۔ بہرحال بیوی اِن سب مشکلوں کا تدارک کر سکتی ہے۔ بیوی کے دامن میں سب عیب ثواب میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بسا اوقات وہ لیاقت کی ضامن اور ترقی کی کفیل ثابت ہوتی ہے۔

دانیال۔ اسے کہتے ہیں دل کی بات پانا! بھائی بیوی ہی کا تو رونا ہے۔ وہ خوبصورت ہے چنچل ہے، شوخ ہے، بے باک ہے مگر اس کا کیا علاج کہ بالکل خاموش ہے۔

ادہم۔ او ناشکر گذار جج تمہیں اپنی قسمت پر ناز کرنا چاہیئے۔ کم سخن عورت تو قدرت کے نوادر سے ہے۔

دانیال۔ کم سخن نہیں گونگی ہے۔ بے زبان ہے ارے اُس کا منہ تو بالکل سنسان ہے۔

ادہم۔ وہ گونگی تھی تو تم اندھے نہ تھے۔ پہلے ہی دیکھ لیا ہوتا۔

دانیال۔ میں جو تمام دن اہلِ مقدمہ کی غلغشار، چپراسیوں کی چیخ پکار، اور وکیلوں کی بک بک، جھک جھک میں گذارتا ہوں۔ اس سنگ مرمر کے بُت کو سامنے بٹھا کر کیا کروں۔ بات تو جب ہے کہ جج کی بیوی ہو، بیوی کی آواز ہو، آواز میں تاثیر ہو، تاثیر میں جذب ہو، جذب میں یہ کرشمہ ہو کہ اچھی خاصی رشوت کو معصوم تحفہ میں تبدیل کر دے۔

ادہم۔ کفرانِ نعمت کی حد ہو گئی۔ اماں! یہ بیوی تو تمہیں خلعتِ دیانت دیتی ہے۔ لیکن تم نے بدن ہی ایسا پایا ہے کہ راس نہیں آتی۔

دانیال۔ (ہنستا ہے) بچّوں کی باتیں پیاری ہوتی ہیں، مگر منطق سے علاقہ نہیں رکھتیں۔ ست جگ میں گھوم رہے ہو کیا؟ آج کل دیانت داری کا کون گاہک ہے۔ وزبانِ خلق کے نقارہ سے یہ آواز آتی ہے کہ سرِ فلک کوٹھیاں موٹروں کی قطاریں، زرق برق لباس، بنکوں میں حساب کی فراوانی تنخواہ سے میسّر نہیں آتی۔ البتہ بیوی اس کی پردہ پوش ہو سکتی ہے مگر میرے یہاں تو وہ بولتی ہی نہیں۔

ادہم۔ اب تم یہی چاہتے ہو نا کہ تمہاری بیوی کی زبان کھل جائے۔ بس۔

دانیال - اور کیا - (کان میں) بھائی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ میں بسا اوقات فیصلہ بھی اشاروں میں سنا دیا کرتا ہوں۔

ادہم - تو ڈاکٹر سامئن سے رجوع لاؤ اس نے ہزاروں گونگے کتوں پر تجربہ کیا ہے اور اس کی دوا سے وہ گھن گرج آواز سے بھونکنے لگے ہیں - تمہارے پڑوس میں رہتے ہیں اور آج تک خبر نہ ہوئی تمہیں - سچ ہے جج وہی اچھا ہے جسے مثل کے سوا دنیا و مافیہا کی کوئی خبر نہ ہو کان کھول کر سنو - ایک انجکشن میں طوطے کی طرح نہ چہکنے تو کہنا۔

دانیال - کیا کہنے ڈاکٹروں کے، مگر بھائی کہیں بنا تو نہیں رہے ہو۔

ادہم - عدالت میں تھوڑی کھڑا ہوں جو جھوٹ بولنا فرض ہو

دانیال - تو پھر ڈاکٹر کو بلاؤں۔

ادہم - مگر سوچ لو، کم سخن بیوی روز روز نہیں ملتی - اگر ایک دفعہ یہ سوتا پھوٹ پڑا تو بند کرنا مشکل ہو جائے گا - ہاں یہ کہنا بھول گیا کہ تمہاری عدالت میں سرکار بنام چھینگا ایک مقدمہ ہے اور اُس میں مَیں وکیل ہوں - یہ میرا پہلا مقدمہ ہے مثل تو مکمل ہو چکی ہے (کاغذ جیب سے نکال کر دیتا ہے) یہ عذر قابلِ غور ہیں - اس کا ذرا خیال رکھنا سمجھے۔

دانیال - اور اُسے بھی تو کہو ذرا میرا خیال رکھے۔

ادہم - اس وقت تو حوالات میں ہے بچارا - بعد میں جب کام شروع کرے گا تو دیکھا جائے گا۔

دانیال - بعد میں دعا یا دغا۔ (ادہم جاتا ہے)

## دوسرا سین

جج اور سررشتہ دار

دانیال - کچھ کہنا ہے تو جلد کہو۔

سررشتہ دار - کیا کہنا ہے حضور، دنیا کافی کہہ رہی ہے۔

دانیال - آخر دنیا کیا کہہ رہی ہے؟

سررشتہ دار - یہی کہ جج صاحب بیوی سے کھیلتے رہتے ہیں اور کام نہیں کرتے۔

دانیال - اس کم بخت دنیا نے جج کو کیا سمجھ رکھا ہے؟ بیان لکھے، وکیلوں کی روک تھام کرے، فیصلہ سنائے اور اس میں انشا کے کرشمے دکھائے، پھانسی کے وقت ملک الموت کا قائم مقام بنے، اس کے سوا ادھر اُدھر نہ دیکھے۔

دنیا جہان بیویاں کرتا ہے تو کوئی انہیں پوچھتا تک نہیں۔ لیکن میں جو شادی کر بیٹھا تو سب کٹے مرتے ہیں کمبخت اچھا جاؤ۔

(سررشتہ دار جاتا ہے ادہم آتا ہے)

ادہم۔ کہئے وہ فیصلہ لکھ چکے؟

دانیال۔ ارے بھائی ادہم فیصلہ لکھنا کوئی بچوں کا کھیل ہے۔ چار شخصوں کے متحدہ جھوٹ سے سچ ڈھونڈ نکالنا تنہائی چاہتا ہے۔ سکون چاہتا ہے۔ مگر مجھے یہ کہاں نصیب پہاڑوں کی چوٹیوں پر، غاروں کی تہ میں جنگلوں، بیابانوں مرگھٹ قبرستانوں میں مثلیں سر پر اُٹھائے اُٹھائے پھر اگر قسم لے لو جو یکسوئی خاطر حاصل ہوئی ہو۔

ادہم۔ پھر؟

دانیال۔ پھر یہ کہ مثلیں جوں کی توں میز پر پڑی ہیں اور فصاحت و بلاغت کے دریا دل میں اُمنڈ رہے ہیں مگر کاغذ پر نہیں آسکتے۔ اور وجہ میری بیوی۔

ادہم۔ اُسے کیا ہوا؟

دانیال۔ تمہارے کہنے پر ڈاکٹر سائمن کو بلوا بیٹھا اُس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ انجکشن کر مارا۔

ادہم۔ زبان نہیں کھلی؟

دانیال۔ نہیں کھلی! ارے بھائی ادھم اُس وقت سے بند کب ہوئی تھی۔

ادہم۔ کیا گویائی صاف نہیں؟

دانیال۔ صاف ہے مگر بہت زیادہ ہے اگر اُس کی گفتار کی رفتار یہی رہی تو مجھے عدالت سے فرار پر قرار کرنا پڑے گا۔

ادہم۔ یہ گیند مدت سے مٹھی میں بند تھی، اس لئے غیر معمولی تیزی سے ابھری ہے۔ اعتدال اُسے خود زمین پر لے آئیگا ذرا صبر سے کام لو اور میرے مقدمہ سے جی بہلاؤ۔

دانیال۔ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرتا ہوں۔

## تیسرا سین

(دانیال مثل دیکھ رہا ہے۔ نکہت چرخہ کات رہی ہے)

جج (مثل کا عنوان پڑھتا ہے) سرکار بنام چھینگا (لکھتا ہے اور ساتھ ساتھ پڑھتا جاتا ہے) ۱۸ اور ۱۹۔ اکتوبر ۱۸۹۳ء کی

دریباتی شب کو آسمان پر سیاہ بادلوں نے گھٹا ٹوپ ڈال رکھا تھا۔ رعد گرج رہا تھا۔ بجلی کوندرہی تھی۔ ہوا بڑے بڑے تناور درختوں کا سرِ غرور خم کر رہی تھی۔ ٹھنڈ اس بلا کی تھی کہ لحاف کو خاطر تلے نہ لاتی تھی۔ بڑے بڑے کارخانوں کے پُل اور چھت برف کی چادر بن رہے تھے۔ وہ بازار جن میں آدھی رات تک میلا لگا رہتا تھا ایسے سنسان پڑے تھے کہ شہرِ خموشاں کا گمان ہوتا تھا۔ بجلی کے ہنڈے تک روپوش ہو گئے تھے۔ ایسے مہیب سماں میں چھینگا۔۔۔۔

نکہت (چرخہ چھوڑ کر) میاں کیا کر رہے ہو۔ آگ لگے اس کام کو تم نے تو اپنی ہلکاسی جان ہلکان کر دی اور سمیہ بھی نہیں کرایا۔ آرام بھی کیا چاہئے کسی وقت۔ جب وقت دیکھو مشل۔ دو بول بات کرنے کے بھی روادار نہیں۔ اے ہے اب ہو کیا رہا ہے آخر؟

دانیال۔ بیگم۔

نکہت۔ تو کوئی راز کی بات ہے؟

دانیال۔ دیکھونا

نکہت۔ اس میں جھگڑا ہی کیا ہے۔ نہ بتاؤ۔ قصہ ختم۔

دانیال۔ کچھ کہنے دو تو بتاؤں۔ ایک مقدمہ کا فیصلہ لکھ رہا ہوں۔

نکہت۔ بس اتنی بات کے لئے یہ جھنجھٹ۔ مگر میاں یہ تو بڑی ذمہ داری کا کام ہوگا؟

دانیال۔ ذمہ داری سی ذمہ داری۔ پھر یہ کہ آنکھ پر پٹی باندھ کر صرف کان سے سننا ہے۔ لوگوں کی عزت، دولت، بیوی بلکہ جان تک جج کی نوکِ قلم پر ہوتی ہے۔ باوجود ان قیدوں کے اگر فیصلہ میں روزمرہ کی صفائی، محاورہ کی درستی تواتر سے پرہیز، فقروں کا مناسب دروبست اور انشاپردازی کے جوہر نہ ہوں تو فیصلہ رپورٹ میں چھپتا ہی نہیں۔

نکہت۔ اوہو یہ بات ہے تو دل لگا کر لکھے میں چپ چاپ بیٹھی رہوں گی۔

دانیال۔ شاباش۔ اس مہیب سماں میں چھینگا اپنے گھر سے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

نکہت۔ ذرا یہ تو بتانا گلابی ساری کے ساتھ کس رنگ کا بلوز پھبتا ہے۔ نگوڑی بہار کہتی تھی اگر ہی ساری اور دھانی بلوز گنوارن کو اتنا معلوم نہیں کہ اس سے زیادہ انمل رنگ اور کیا ہوں گے۔

دانیال۔ بھاڑ میں جائیں یہ رنگ مجھے۔۔۔

نکہت۔ میں کام والی ساری پسند کرتی ہوں۔ ہاں پھول کھلے کھلے ہوں۔ کوئی یہاں کوئی وہاں۔ یہ نہ ہو میاں پورا گلدستہ سینہ پر سوار ہو جائے۔ رہا رنگ۔

دانیال ۔ میں پھر کہتا ہوں کہ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
نکہت ۔ تو یہ آنکھ چاہتا ہے، ہاں سروتے کے ہوتے گنڈیریاں چھیلنے کے لئے گنڈاسے کی بھلا کیا ضرورت ہے۔ میں سروتے سے ایسی خوبصورت گنڈیریاں ۔ ۔ ۔
دانیال ۔ درست ہے مگر ۔ ۔ ۔
نکہت ۔ ہاں یہ پوچھنا تو بھول گئی، میاں دیکھو عورتوں کے لئے یہ بال جان کا جنجال ہو رہے ہیں۔ اگر اس بوجھ کو ذرا ہلکا کر دیں تو مردوں کے کیوں بارِ خاطر ہو ——
دانیال ۔ یہ کیا قصہ ہے؟
نکہت ۔ ہاں تمہیں فیصلہ لکھنا ہے۔ میاں ایسا لکھو کہ چھپ کر پری نکلے۔ مدرسوں کے نصاب میں داخل ہو جائے۔
دانیال ۔ تو تھوڑی دیر کے لئے زبان کو لگام دو۔ یہ نہیں ہو سکتا تو کہیں اور جا کر بولنے کی مشق کرو۔ زمین و آسمان گھوم رہا ہے اور میں فضا میں معلق لٹک رہا ہوں۔ یہ نقشہ ہے۔ سنا۔
نکہت ۔ بگڑتے کیوں ہو میاں! قسم لے لو جو ایک لفظ بھی منہ سے نکالوں۔
دانیال ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ چھینگا اپنے گھر سے باہر نکلا۔
نکہت (اخبار دیکھ کر) میاں یہ نہرو رپورٹ کس جماعت میں پڑھائی جاتی ہے۔ دو لفظوں میں خلاصہ کہہ ڈالو گے۔
دانیال ۔ اچھا اچھا۔ اور چھینگا نے رحیمن کے مکان کا رخ کیا۔
نکہت ۔ آخر مولوی مدن کو اس عمر میں سوجھی کیا جو عورتوں کے لباس کے خلاف وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ اگر عورتوں کے لباس اور سنگار کا یہی عالم رہا تو ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ کوئی اس بھلے مانس سے پوچھے کہ ہندوستان کی تباہی کو اجلی گی دھلائی سے کیا واسطہ۔
دانیال (دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر) دیوانہ، دیوانہ، میں دیوانہ ہو رہا ہوں۔
نکہت ۔ میری باتوں سے ہرج ہوتا ہوگا؟ اب بالکل چپ رہوں گی۔
دانیال ۔ مرحبا۔
نکہت ۔ دیکھو بت بنی بیٹھی ہوں۔ میری چپ کی داد دینا۔ بس حالی جیسی ہو۔
دانیال ۔ بے شک۔
نکہت ۔ اب مزے سے کام کئے جاؤ۔

دانیال :- اچھا۔

نکہت - اور جیبن سے فیصلہ لکھو جلد ختم ہو جائے گا۔

دانیال - اگر زبان بند نہ ہوگی تو کبھی نہ ہوگا (لکھتا ہے) رحیمن کے خاوند نے دروازہ کھولا مکان بہت صاف و ستھرا تھا۔

نکہت - کیا ہوگیا تمہیں۔ اتنا بھی خیال نہیں کہ ہندی لفظوں میں واو عطف کی نہیں آتی۔

دانیال - خدا کے واسطے میرے دماغ پر رحم کرو اور اس کمبخت کو روکو (غراتا ہے)

نکہت - کہتی تھی اتنی محنت نہ کرو، ڈاکٹر کو بلاؤں۔

دانیال - اُسی کی تو یہ عنایت ہے۔

نکہت - آرام کرو آرام۔

دانیال - یہ کترنی کبھی بند نہ ہوگی؟

نکہت - یہ بات ہے تو میں خاموش رہوں گی۔

دانیال - خدا تمہیں ہمت دے (قلم اُٹھاتا ہے)

نکہت - تم نے نام لیا تو دھیان آیا۔ بعض کہتے ہیں ہمت عورت کا تخلص ہے اور بعض کہتے ہیں مرد کا۔ بہرحال اُس بلند پایہ شاعر کے جگت استاد ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ کچہری سے لوٹتے وقت ........

دانیال (کانوں میں انگلیاں دے کر) الامان - (مثل بغل میں داب کر الماری پر چڑھتا ہے نکہت پہلے زینہ پر کھڑی ہے)

نکہت - یہ جمن جو آتی ہے سر مسی بیچنے بڑی ایک ہے۔ بس کی گانٹھ ہے۔ میں نے آج نکال باہر کیا مردار کو۔

دانیال - ہٹ جاؤ۔ سرک جاؤ۔ میرے سامنے نہ آؤ۔ میں اپنے آپ میں نہیں ہوں کوئی جرم دفعہ کی ہدایت کے خلاف کر بیٹھوں گا۔ شگوفہ! شگوفہ! اری او شگوفہ کی بچی (شگوفہ آتی ہے) کم بخت یہ دیدے پھاڑ پھاڑ کر میرا منہ کیا تکتی ہے۔ جا جیا ٹے سے ڈاکٹر سائمن کو بلا لا۔ اُسے کہنا مرض نے پلٹا کھایا ہے۔

شگوفہ - ابھی گئی ابھی آئی۔ (جاتی ہے)

نکہت - بہت بے قرار ہو۔ میں جانوں گرمی چڑھ گئی دماغ کو۔ میاں آئس کریم اور فالودہ کھاؤ۔ اللہ بخشے میری انا کہتی تھی ......

دانیال۔ جہنم میں جائے تیری اماں اور چولہے میں پڑے تیری زبان۔

(کاغذوں کا ایک پلندا اُٹھا کر نکہت کی طرف پھینکتا ہے۔ جو زینہ سے اتر کر بالاخانہ کو بھاگتی ہے)

نکہت۔ اے لوگو دوڑو، دوڑو، میرا خاوند دیوانہ ہو گیا۔

## چوتھا سین

ادہم۔ تو کیا فیصلہ لکھا گیا؟

دانیال۔ ہاں مگر کیا بتاؤں کن جان جوکھوں سے تمہارے موکل کو بری کیا ہے۔ سنو گے کیا؟

ادہم۔ فرمائیے۔

دانیال (فیصلہ پڑھتا ہے) عرض کیا ہے۔ ایسے مہیب سماں میں چھینگا اپنے گھر سے نکلا اور رحیمن کے گھر کا رخ کیا۔ اُس کی انا کہتی ہی رہی کہ اندھیرے میں باہر نہ جاؤ۔ چھینکتی چلاتی عورتیں راستہ روک لیتی ہیں۔ جب رحیمن کے مکان پر گیا تو وہ اگرئی ساری اور دھانی بلوز پہنے کھڑی تھی۔ حالانکہ اُس کے خاوند نے کہا تھا کہ کام والی ساری پہنا کرو۔ دیرپا ہوتی ہے۔ اور قیمتی کپڑے نہ پہنا کرو، کہ ان سے ہندوستان تباہ ہو جائے گا۔ رحیمن نے بگڑ کر کہا مجھے نہرو رپورٹ کی قسم ہے کہ میں بالوں کے جنجال سے جلد فارغ البال ہو جاؤں گی۔ ہمت شاعرہ ہو یا شاعر اس سے بحث نہیں مگر بات پتے کی کہی ہے کہ عورت خواہ جن ہو مگر بس کی گانٹھ ہوتی ہے۔ بھلا اجلی کی دھلائی کو ہندوستان کی تباہی سے کیا نسبت اس پر رحیمن کے خاوند کو حرارہ آ گیا۔ اور اُس نے گنڈاسے سے رحیمن پر حملہ کیا۔ یہ رحیمن کی غلطی تھی کہ سر دتے کے ہوتے گنڈاسا منگوایا۔ بس ایک وار میں رحیمن چل بسی اور رحیمن کے خاوند نے خودکشی کر لی۔ پولیس موقع پر پہنچی تو چھینگا کو گرفتار کر کے عدالت میں لے آئی۔ مگر میں نظام سقے کے مشکیزے کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ وہ بے گناہ ہے اور میں اُسے آزاد کرتا ہوں۔ درج رہے کہ گو دو ہندی لفظوں میں واو عطف کی نہیں آتی۔ مگر اس کے خلاف سندات موجود ہیں۔

ادہم۔ یہ کیا الم غلم لکھ مارا ہے جس کا سر ہے نہ پیر۔

دانیال۔ بس جج کا قلم ہے جدھر چل گیا چل گیا۔ کوئی مرے یا جئے، مگر قسمت کا لکھا اور جج کا فیصلہ نہیں ٹل سکتا۔

ادہم۔ مگر یہ نتائج تم نے کس شہادت سے اخذ کئے۔

دانیال۔ کیا دقیانوسی باتیں کرتے ہو آج کل تو جج کی کہی درشنی ہنڈی ہوتی ہے۔ جو ہر جگہ پرمان ہو سکتی ہے۔ وہ زمانہ

گیا جب جج کو اپنی رائے کا ثبوت دینا پڑتا تھا۔

(ڈاکٹر آتا ہے)

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب بہت راہ دکھائی۔ بہت ضروری کام ہے۔

ڈاکٹر۔ فرمائیے کیا حکم ہے کیا آپ کے دشمنوں کو کوئی تکلیف ہے۔

دانیال۔ نہیں میری بیوی کا علاج کیجئے۔

ڈاکٹر۔ کیا بولنے میں کچھ دقت محسوس ہوتی ہے۔

دانیال۔ مجھے اس کے بولنے سے تکلیف ہوتی ہے۔

ڈاکٹر۔ تکلیف آپ کو علاج بیوی کا۔ یہ کیا معما ہے۔

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب وہ اس قدر باتیں کرتی ہے کہ خدا کی پناہ۔ میں چاہتا ہوں کہ پھر سے گونگی ہو جائے باتوں کا یہ طوفان ہے کہ تھمنے ہی میں نہیں آتا۔ میں دیوانہ ہو جاؤں گا مجھے اُس کی زبان سے بچاؤ۔ میں نے آپ کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اسے پھر گونگا کر دیں۔

ڈاکٹر۔ بالکل ناممکن۔

دانیال۔ کیا کہہ رہے ہو؟

ڈاکٹر۔ ہم عورتوں کی زبان کھول تو سکتے ہیں۔ مگر بند کرنا قدرت کے بس سے بھی باہر ہے۔

دانیال۔ تو میں مایوس ہو جاؤں؟

ڈاکٹر۔ افسوس ہے کہ حبوب، لبوب، جوارش، معجون، سفوف، جوشاندہ، خساندہ، خمیرہ۔ کوئی عورت کی زبان نہیں روک سکتا۔

دانیال۔ مذاق تو نہیں کر رہے ہے؟

ڈاکٹر۔ یہ میرے پیشہ کے خلاف ہے۔

دانیال۔ تو میں کہیں کا نہیں رہا۔ بس اب گلے میں سل باندھ کر راوی میں کودے پڑتا ہوں۔ بلا سے ڈوب جاؤں گا مگر اس چیخم دھاڑ سے تو نجات ملے گی۔

ڈاکٹر۔ آپ کی بیوی کا تو علاج نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ تو قابلِ علاج ہیں۔

دانیال۔ تو پھر کچھ کر دکھاؤ۔

ڈاکٹر۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ بیوی کی دانتا کلکل سے نجات پانے کا یہی علاج ہے، کہ خاوند کو بہرا کر دیا جائے۔
دانیال۔ یہ کہہ کیا رہے ہیں آپ؟
ادہم۔ آپ نہیں سمجھے بات یہ ہے کہ گو بیوی گونگی نہیں ہوسکتی مگر آپ بہرے ہوسکتے ہیں۔
دانیال۔ ہمیشہ کے لئے؟
ڈاکٹر۔ نہیں صرف مرتے دم تک اور اس ذمہ داری کے ساتھ کہ کبھی آپ کی بیوی کا ایک لفظ بھی آپ کے کانوں تک نہ پہنچے۔
دانیال مگر اس میں دقتیں ہیں۔
ادہم۔ مگر یہ علاج کس طرح ہوتا ہے جناب؟
ڈاکٹر۔ پہلے تو سیسہ پگلا کر کان میں ڈالا جاتا تھا۔
دانیال۔ میں قطعاً اس کے لئے تیار نہیں۔
ڈاکٹر۔ مگر اب یہ سفید سفوف استعمال کیا جاتا ہے۔
دانیال۔ شکریہ۔ مگر میں بہرا ہونا نہیں چاہتا۔ اِس پڑیا کو اپنی جیب میں رہنے دیجئے۔

(شگوفہ گھبرائی ہوئی داخل ہوتی ہے)

شگوفہ (کانوں میں انگلیاں ڈالے) سرکار میرا استعفا۔ میرا سر چکر کھا رہا ہے اِس قدر باتیں توبہ! توبہ! بیگم صاحبہ کا حرام ہے جو ایک منٹ کے لئے بھی چپ رہتی ہوں۔
دانیال۔ سب مِل کر اسے ایک کمرے میں بند کر دو۔ یہاں نہ آنے پائے روکو۔

(نکہت آتی ہے)

ڈاکٹر۔ بیگم کہئے زبان کا کیا حال ہے۔
نکہت۔ شکریہ اب تو دو چار باتیں کر لیتی ہوں اور کافی ہے اتنا ہی، کیونکہ باتونی عورت کو کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ مگر یہ دیکھا آپ نے، جج صاحب کو میری باتیں نہیں بھاتیں۔ بس اتّی بات ہوئی وہ فیصلہ لکھ رہے تھے میں چپکے سے پاس بیٹھ گئی۔ لوگو بتاؤ اِس میں مجھ کمبخت نے کیا گناہ کیا؟ (خاوند سے) میں حیران ہوں کہ آخر آپ بگڑے کیوں، اماں جانی جنت آشیانی کہا کرتی تھیں کہ میاں بیوی میں کوئی راز نہ ہونا چاہیئے اور سچ کہتی تھیں۔

دانیال۔ ڈاکٹر صاحب سفوف۔ سفید سفوف جلد نکالئے اور کان میں ڈال ہی دیجئے۔

(ڈاکٹر دانیال کے کان میں دوا ڈال دیتا ہے)

نکہت۔ اور یہ ہیں کہ بات تک کے روادار نہیں آخر میں بھی منہ میں زبان رکھتی ہوں۔

دانیال۔ واہ۔ واہ دوا کیا ہے اکسیر ہے۔ سناٹا ہی سناٹا، ہو کا عالم، بس یہ سمجھ لیجئے کہ قبرستان میں بیٹھا ہوں۔

(پردہ گرتا ہے)

نور الٰہی

محمد عمر

# وجدانیات

یہاں میں مضطرب ہوں کاہشِ اندوہ فرقت سے
وہاں نغمے نکلتے ہیں کسی کی بزمِ عشرت سے

یہاں سوزِ دروں سے میرے دل کا خون ہوتا ہے
وہاں دستِ نگاریں سرخ ہیں مہندی کی رنگت سے

یہاں سینے میں میرے سانس بھی رک رک کے آتا ہے
وہاں آنا نہیں مشکل ہوا فرطِ نزاکت سے

یہاں پھولوں کو میں اپنے کلیجے سے لگاتا ہوں
وہاں رنگیں ہے محفل گیسوئے مشکیں کی نکہت سے

یہاں مجھ کو خمارِ عشق نے برباد کر ڈالا
وہاں ظاہر ہے مستی نرگسِ میگوں کی حالت سے

یہاں اک شمع کو میرا سیہ خانہ ترستا ہے
وہاں مہتاب بھی اک داغ ہے جوشِ لطافت سے

عابد علی عابد